زیرِ نظر

اُستادِ محقّق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۱

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رح

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ



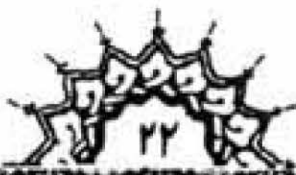
فہرست

سورۂ حمد



سورۂ بقرۃ





















مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لغت میں "تفسیر" کا معنی ہے چہرے سے نقاب ہٹانا۔

تو کیا قرآن پر جو نور، کلام مبین اور تمام مخلوق کی ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی واضح گفتگو ہے کوئی پردہ اور نقاب پڑا ہوا ہے جسے ہم ہٹانا چاہتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

قرآن کے چہرے پر تو کوئی نقاب نہیں یہ تو ہم ہیں جن کے چہرے پر سے نقاب ہٹانا چاہیے اور ہماری عقل و ہوش کی نگاہ سے پردہ اٹھنا چاہیے تاکہ ہم قرآن کے مفاہیم کو سمجھ سکیں اور اس کی روح کا ادراک کر سکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کا صرف ایک چہرہ نہیں۔ اس کا وہ چہرہ جو سب کے لئے کھلا ہے، نور مبین ہے اور ہدایت خلق کی رمز ہے عمومی چہرہ ہے۔

رہا اس کا دوسرا پہلو تو اس کا ایک چہرہ بلکہ کئی چہرے اور ہیں۔ جو صرف غور و فکر کرنے والوں، حق کے پیاسوں، راستے کے متلاشیوں اور زیادہ علم کے طلب گاروں پر آشکار رہتے ہیں۔ اس میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے ظرف، خلوص اور کوشش سے حصہ ملتا ہے۔

ان چہروں کو احادیث کی زبان میں "بطونِ قرآن" کہتے ہیں۔ چونکہ ہر شخص ان کی تجلی نہیں دیکھ پاتا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر آنکھ انہیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی لہٰذا تفسیر آنکھوں کو توانائی دیتی ہے اور پردوں کو ہٹاتی ہے اور ہمارے اندر دیکھنے کی اہلیت پیدا کرتی ہے ـــــ جتنا کہ ہمارے لئے ممکن ہے۔

قرآن کے کئی چہرے ایسے ہیں جن سے زمانہ گزرنے اور انسانی لیاقت و استعداد میں اضافے اور بالیدگی سے پردہ اٹھتا ہے مکتب علیؑ کے ہونہار شاگرد ابن عباس اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

القرآن یفسرہ الزمان

زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ایک مشہور حدیث کے مطابق:

القرآن یفسر بعضہ بعضاً

قرآن خود اپنی تفسیر بیان کرتا ہے اور اس کی آیات ایک دوسرے کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

قرآن کا نور اور کلام مبین ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ ایک اکیلا ہے اس طرح کہ دوسرے سے پیوستہ بھی ہے اور



ایک ایسا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا اور یہ سارے کا سارا نور اور کلام مبین ہے اگرچہ اس کی بعض آیات کچھ دیگر آیات کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

یہ کوشش کب شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچی

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی تفسیر اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ کے زمانے سے اور آنحضرتؐ کے پاکیزہ دل پر اس کی اولین آیات کے نازل ہونے سے شروع ہوئی اور پھر اس علم کے بزرگ اور عظیم لوگ اپنی سندوں کا سلسلہ پیغمبرؐ کے شہر علم کے در تک لے جاتے ہیں۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو مختلف زبانوں میں اور مختلف طرز و طریقہ کی ہیں۔ بعض ادبی ہیں اور بعض فلسفی، کچھ کی نوعیت اخلاقی ہے اور کچھ احادیث کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں، بعض تاریخ کے حوالے سے رقم کی گئی اور بعض علوم جدیدہ کی اساس پر لکھی گئی ہیں۔ اس طرح ہر کسی نے قرآن کو ان علوم کے زاویے سے دیکھا ہے جن میں وہ خود تخصص رکھتا ہے پھولوں سے لدے ہوئے اس باغ سے کسی نے دل انگیز اور شاعرانہ مناظر حاصل کیے، کسی نے علوم طبیعی کے استاد کی طرح برگِ گل، پھول، شاخوں اور جڑوں کے اصول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، کسی نے غذائی مواد سے استفادہ کیا ہے اور کسی نے دواؤں کے خواص سے، کسی نے اسرار آفرینش سے یہ سب شگوفے اور رنگا رنگ گل چنے ہیں اور کوئی اس فکر میں ہے کہ کون سے گل سے بہترین عطر کشید کرے اسی طرح کوئی ایسا بھی ہے جس نے فقط شہد کی مکھی کی طرح شہد گل چوسنے اور اس سے انگبیں حاصل کرنے کی جستجو کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ راہ تفسیر کے راہیوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک مخصوص آئینہ تھا جس سے انہوں نے قرآن کی ان زیبائیوں اور اسرار کو منعکس کیا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب چیزیں باوجودیکہ قرآن کی تفسیریں ہیں ان میں سے کوئی بھی قرآن کی تفسیر نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے ایک رخ سے پردہ ہٹاتی ہے نہ کہ تمام چہروں سے اور اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو پھر بھی وہ قرآن کے چند چہروں کی نقاب کشائی ہوگی نہ کہ تمام چہروں کی۔

قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے لامتناہی علم کی تراوش ہے اور اس کا کلام اس کے علم کا رنگ اور اس کا علم اس کی ذات کا رنگ رکھتا ہے اور وہ سب لامتناہی ہیں۔ اس بنا پر یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ نوع انسانی قرآن کے تمام چہروں کو دیکھ لے۔ کیونکہ دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری فکر و نظر کا ظرف جس قدر وسیع ہو گا اتنا ہی زیادہ ہم اس بحر بیکراں کو اپنے اندر سما سکیں گے۔

اس لئے تمام علماء اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ کسی زمانے میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جائیں۔ قرآن مجید کے زیادہ سے زیادہ حقائق کے انکشاف کے لئے اپنی پے در پے مخلصانہ سعی و کوشش جاری و ساری رکھیں۔ قدماء اور گذشتہ علماء (خداوند عالم کی رحمتیں ان کی ارواح پاک پر ہوتی رہیں) کے ارشادات سے فائدہ اٹھائیں لیکن انہی پر قناعت نہ کریں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:



لا تحصی عجائبہ ولا تبلی غرائبہ
قرآن کی خوبیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی اور اس کی عجیب و غریب نئی باتیں کبھی پرانی نہ ہوں گی۔

ایک خطرناک غلطی

تفسیر قرآن کے سلسلے میں یہ روش بہت زیادہ خطرناک ہے کہ انسان مکتب قرآن میں شاگردی اختیار کرنے کی بجائے اس عظیم آسمانی کتاب کے مقابلے میں استاد بن بیٹھے یعنی قرآن سے استفادہ کرنے کی بجائے اس پر اپنے افکار کا بوجھ ڈال دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے ماحول، تخصیص علمی، مخصوص مذہب اور اپنی ذاتی رائے کو قرآن کے نام پر اور قرآن کی صورت میں پیش کرنے لگے اور یوں قرآن ہمارا امام، پیشوا، رہبر، قاضی اور فیصلہ کرنے والا نہ رہے بلکہ الٹا وہ ہمارے اپنے نظریات کی مسند نشینی اور ہمارے اپنے افکار و نظریات کی جلوہ نمائی کا ذریعہ بن جائے۔

قرآن کی تفسیر کا یہ طریقہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں قرآن کے ذریعے اپنے افکار کی تفسیر کا یہ ڈھنگ اگرچہ ایک گروہ میں رائج ہے جو کچھ بھی ہے خطرناک ہے اور ایک دردناک مصیبت ہے جس کا نتیجہ راہِ حق کی طرف ہدایت کے حصول کی بجائے صراط مستقیم سے دوری اور غلطیوں اور شبہات کو پختہ کرنے والی بات ہے۔

قرآن سے اس طرح فائدہ اٹھانا تفسیر نہیں بلکہ تحمیل ہے۔ اس سے فیصلہ لینا نہیں بلکہ اس کے اوپر حکم چلانا ہے۔ یہ ہدایت نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے۔ اس طرح تو ہر چیز دگرگوں ہو جاتی ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ اس تفسیر میں ہم انشاء اللہ یہ روش اختیار کریں اور واقعاً قرآن کے سامنے دل و جان سے زانوئے تلمذ تہ کریں اور بس۔

تقاضے اور احتیاج

ہر زمانے کی کچھ خصوصیات، ضرورتیں اور تقاضے ہوتے ہیں جو زمانے کی بدلتی ہوئی کیفیت، تازہ مسائل اور منشاد شہود پر آنے والے نئے معانی و مفاہیم سے ابھرتے ہیں۔ اسی طرح ہر دور کی کچھ اپنی مشکلات اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور یہ سب معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی تبدیلیوں کا لازمہ ہوتا ہے۔

کامیاب افراد اور صاحبانِ توفیق وہ ہیں جو ان ضروریات اور تقاضوں کو سمجھ سکیں جنہیں "عصری مسائل" کہا جا سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو ان مسائل کے ادراک سے عاری ہیں یا ادراک تو رکھتے ہیں لیکن وہ خود کسی دوسرے ماحول اور زمانے کی پیداوار ہیں جس میں یہ مسائل نہ تھے اس لئے وہ سرد مہری اور لاپرواہی سے ان مسائل کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو بے کار کاغذوں کی طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پے در پے شکستوں کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

ایسے افراد ہمیشہ زمانے کی وضع و کیفیت کا شکوہ کرتے رہتے ہیں، زمین و آسمان کو برا کہتے ہیں اور گزرے ہوئے سنہرے اور خواب و خیال کے زمانے کی یاد میں غمزدہ، افسردہ اور پُر حسرت رہتے ہیں۔ ایسے لوگ روز بروز زیادہ بدظن، بدبین اور مایوس



ہوتے رہتے ہیں اور آخر کار معاشرے سے دُوری اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ زمانے کے تقاضوں اور مشکلات کو سمجھ نہیں پاتے یا وہ ایسا چاہتے ہی نہیں۔ ایسے لوگ ایک تاریکی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور چونکہ حوادث کے علل و اسباب اور ان کے نتائج کی تشخیص نہیں کر پاتے اس لئے ان کے مقابلے میں گھبرائے ہوئے، وحشت زدہ، بے دماغ اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے رہتے ہیں ایسے لوگ چونکہ تاریکی میں محوِ گردش ہوتے ہیں اس لئے ہر قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور کیا خوب کہا ہے، سچے پیشوا نے :

جو شخص اپنے زمانے کے حالات و کوائف سے آگاہ ہے وہ اشتباہات اور غلطیوں سے بچا رہتا ہے[1]

ہر زمانے کے علماء اور دانشوروں کے لئے یہ پیغام ہے کہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ پوری چابکدستی سے ان مسائل، تقاضوں، احتیاجات اور روحانی کمزوری اور اجتماعی خالی نقاط کا ادراک کریں اور انہیں صحیح شکل و صورت میں پُر کریں تاکہ وہ دوسرے امور سے پُر نہ ہو جائیں کیونکہ ہماری زندگی کے محیط و ماحول میں خلاء ممکن نہیں ہے۔

مایوس اور منفی فکر حضرات کے گمان کے برخلاف جن مسائل کو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق واضح طور پر معلوم کیا ہے اور پرکھا ہے ان میں سے ایک نسلِ نو کی مفاہیم اسلام اور مسائلِ دینی جاننے کی پیاس ہے، بلکہ یہ پیاس فقط سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں چکھنے، چھونے اور آخر کار ان پر عمل کرنے کی ہے۔

ان مسائل نے نسلِ نو کی رُوح اور وجود کو بے قرار کر رکھا ہے لیکن یہ فطری امر ہے کہ یہ سب استفہام کی صورت میں ہے۔ ان خواہشات اور تقاضوں کا جواب دینے کے لئے پہلا قدم میراث علمی اور اسلامی تہذیب و تمدن کو عصرِ حاضر کی زبان میں ڈھالنا اور عالی مفاہیم کو موجودہ دور کی زبان میں موجودہ نسل کی رُوح، جان اور عقل میں منتقل کرنا ہے اور دوسرا قدم یہ ہے کہ اس زمانے کی مخصوص ضرورتوں اور تقاضوں کو اسلام کے اصولوں سے استنباط کر کے پورا کیا جائے۔

یہ تفسیر انہی دو اہداف و مقاصد کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

کس تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے

یہ ایسا سوال ہے جو بارہا مختلف طبقوں خصوصاً نوجوان طبقے کی طرف سے ہمیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ ہیں جو خلوص سے ملی ہوئی پیاس کے ساتھ قرآن کے صاف و شفاف چشمے کے جویا ہیں اور اس محفوظ آسمانی وحی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے سوال میں یہ جملہ پوشیدہ ہے کہ ہمیں ایسی تفسیر چاہیے جو تقلید کے حوالے سے نہیں بلکہ تحقیق کے حوالے سے ہمیں عظمتِ قرآن سے روشناس کرا سکے اور دورِ حاضر میں ہماری ضرورتوں، دکھوں اور مشکلوں میں راہنمائی کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے لوگوں کے لئے مفید بھی ہو اور جس میں پیچیدہ علمی اصطلاحات اس کی صاف و شفاف راہوں اور شاہراہوں میں ناہمواریاں

---

[1] امام صادق علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث میں یہ مضمون یوں منقول ہے۔

العالم بزمانہ لا تہجم علیہ اللوابس



پیدا نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ فارسی زبان میں آج ہمارے پاس کئی ایک تفاسیر موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ وہ تفاسیر ہیں جو ہمارے قدماء بزرگوں کی میراث ہیں یا بعد میں عصرِ حاضر کے علماء نے انہیں تحریر کیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جو چند صدیاں پہلے لکھی گئی تھیں اور ان کی مخصوص نثر علماء و ادباء سے مخصوص ہے۔

موجود تفاسیر میں بعض اس سطح پر ہیں کہ صرف خواص کے طبقے کا حصہ ہیں اور دیگر طبقات ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اور بعض قرآن کے خاص گوشوں کو بیان کرتی ہیں۔ ان کی مثال ایک گلدستہ کی سی ہے جسے کسی تر و تازہ باغ سے چنا گیا ہو جس میں باغ کی نشانیاں تو ہیں لیکن باغ نہیں ہے۔

اس طرح اس بار بار کے سوال کا کوئی ایسا جواب نہ مل سکا یا بہت کم ملا کہ جو قانع ہو، وجدان کو مطمئن کرے اور پیاسے متلاشی کی تشنگیٔ روح کو سیراب کر سکے۔

اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کا جواب عمل سے دینا چاہیئے کیونکہ اس وقت اس کا صرف زبانی جواب ممکن نہیں ہے لیکن مشکلات اور روز افزوں مشاغل کے ہوتے ہوئے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک ایسا بیکراں سمندر ہے جس میں آسانی سے اور ساز و سامان، تیاری، وقت اور کافی غور و فکر کے بغیر داخل نہیں ہوا جا سکتا اور یہ وہ بحرِ ناپیدا کنار ہے جس میں بہت سے لوگ غرق ہوئے اور ڈوب چکے ہیں۔ حسرت و اندوہ کے عالم میں اس دریا کے کنارے کھڑا میں اس کی امواجِ فروشاں کا نظارہ کر رہا تھا کہ ایسے میں اچانک ایک بجلی سی نگاہوں میں کوند گئی۔ امید کا دریچہ کھلا اور مسئلے کی راہِ حل کھائی دینے لگی اور وہ تھی گروپ سسٹم میں کام کرنے کی سوچ اور پھر دس فاضل، مخلص، محقق، آگاہ اور باخبر نوجوان جو "عشرہ کاملہ" کے مصداق میں میرے رفیقِ راہ بن گئے۔ ان کی شبانہ روز پُرخلوص کوششوں سے مختصر سی مدت میں یہ پودا ثمر آور ہو گیا اور توقع سے بھی جلدی اس کی پہلی جلد چھپ گئی (البتہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس جلد میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ چونکہ یہ پہلی جلد ہے اس لئے اختصار کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے لیکن انشاء اللہ آئندہ جلدوں میں اس کی تلافی کر دی جائے گی)۔[1]

اس بناء پر کہ کوئی نکتہ عزیز قارئین کے لئے مبہم نہ رہنے پائے ہم اپنے طریقۂ کار کی بھی اجمالاً تشریح کئے دیتے ہیں۔

پہلے آیات قرآنی مختلف حصوں میں ان محترم علماء میں تقسیم کر دی جاتی تھیں (ابتداء میں دو دو افراد کے پانچ گروپ تھے)۔ ضروری ہدایات و رہنمائی کی روشنی میں وہ ان مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرتے جو اس تفسیر کا منبع اور اصلی کتب ہیں جنہیں اس فن کے عظیم محققین نے سپردِ قلم لیا ہے۔ چاہے وہ محققین سنی ہوں یا شیعہ سب کا مطالعہ کیا جاتا۔ ہمارے زیرِ نظر

---

[1] یہ جلد جو اردو کے قارئین کے ہاتھوں میں ہے اس پہلی چھپی ہوئی جلد کا ترجمہ نہیں جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں آیا ہے بلکہ نظرِ ثانی شدہ جلد ہے جو ابھی فارسی میں طبع نہیں ہو سکی تھی کہ اس سے پہلے اردو کے لباس میں پیش کر دی گئی تھی۔ زیرِ نظر مقدمہ پہلے شائع کی گئی جلد سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)



رہنے والی تفاسیر میں سے بعض یہ ہیں :

تفسیر مجمع البیان تالیف شیخ المفسرین محقق عالی قدر جناب طبرسی

تفسیر انوار التنزیل تالیف قاضی بیضاوی

تفسیر الدر منثور تالیف جلال الدین سیوطی

تفسیر برہان تالیف محدث بحرانی

تفسیر المیزان تالیف استاد علامہ طباطبائی

تفسیر المنار از محمد عبدہٗ مصری

تفسیر فی ظلال تالیف مصنف معروف سید قطب

اور تفسیر مراغی تالیف احمد مصطفیٰ مراغی

اس کے بعد وہ معلومات اور ما حصل جو موجودہ زمانے کے احتیاجات اور تقاضوں پر منطبق ہوتے انہیں رشتہ تحریر میں لایا جاتا۔ بعدازاں اس گروپ کی اجتماعی نشستیں ہفتے کے مختلف دنوں میں منعقد ہوتیں اور یہ تحریریں پڑھی جاتیں اور ان کی اصلاح کی جاتی۔ ان نشستوں میں ہی قرآن کے بارے میں جن نئی معلومات کا اضافہ ضروری ہوتا وہ کیا جاتا۔ پھر اصلاح شدہ تحریروں کو صاف کر کے لکھا جاتا۔ صاف کر کے لکھنے کے بعد ان سب تحریروں کو ان میں سے چند منتخب علماء پھر سے پڑھتے اور انہیں منضبط کرتے۔ آخری شکل دینے کے لئے آخر میں میں خود پورے اطمینان سے اس کا مطالعہ کرتا اور بعض اوقات اسی حالت میں محسوس ہوتا کہ اس میں چند پہلوؤں کا مزید اضافہ کیا جانا چاہئے اور پھر یہ کام انجام دیا جاتا۔ ضمنی طور پر آیات کا رواں ترجمہ بھی میں اسی موقع پر کر دیتا تھا۔

عام مطالب (آیات کے ذیلی ترجمہ اور بعض پہلوؤں کے علاوہ جن کا یہ حقیر اضافہ کرتا) چونکہ ان محترم حضرات کے قلم سے ہوتے تھے اور فطری طور پر مختلف ہوتے تھے اس لئے میں ان تحریروں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے بھی ضروری کاوش انجام دیتا تھا اور ان تمام زحمات و مشقات کا ثمر یہ کتاب ہے جو عزیز قاری کی نظر سے گزر رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ تمام لوگوں کے لئے عمدہ، مفید اور سود مند ثابت ہو گی۔

اس تفسیر کی خصوصیات

اس بناء پر کہ عزیز و محترم قارئین زیادہ بینش و آگہی کے ساتھ اس تفسیر کا مطالعہ کر سکیں اس تفسیر کے مطالب کا ذکر یہاں ضروری ہے شاید ان میں سے کچھ ان کے گمشدہ مطالب ہوں :

(۱) قرآن چونکہ کتابِ زندگی ہے۔ اس لئے آیات کی ادبی و عرفانی وغیرہ تفسیر کے زندگی کے مادی، معنوی، تعمیر کرنے والے، اصلاح کنندہ، زندگی سنوارنے والے اور بالخصوص اجتماعی مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اور زیادہ تر انہی مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جو فرد اور معاشرے کی زندگی سے نزدیک کا تعلق رکھتے ہیں۔



(۲) آیات میں بیان کیے گئے عنوانات کو ہر آیت کے ذیل میں جچی تلی اور مستقل بحث کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سود، طلاق، عورتوں کے حقوق، حج کا فلسفہ، قمار بازی کی حرمت کے اسرار، شراب، سور کا گوشت، جہاد اسلامی کے ارکان و اہداف وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے تاکہ قارئین اس ایک اجمالی مطالعے کے لئے دوسری کتب کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز ہو جائیں۔

(۳) کوشش کی گئی ہے کہ آیات ذیل میں ترجمہ رواں، سلیس منہ بولتا لیکن گہرا اور اپنی نوسا کے لحاظ سے پر کشش اور قابل فہم ہو۔

(۴) لاحاصل ادبی بحثوں میں پڑنے کی بجائے خصوصی توجہ اصل لغوی معانی اور آیات کے شان نزول کی طرف دی گئی ہے کیونکہ قرآن کے دقیق معانی سمجھنے کے لیے یہ دونوں چیزیں زیادہ مؤثر ہیں۔

(۵) مختلف اشکالات، اعتراضات اور سوالات جو بعض اوقات اسلام کے اصول و فروع کے بارے میں کیے جاتے ہیں ہر آیت کی مناسبت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا جچا تلا اور مختصر سا جواب دے دیا گیا ہے۔ مثلاً شبہ اکل و ماکول (وہ جانور جو دوسرے جانوروں کو کھا جاتے ہیں)، معراج، تعداد ازواج، عورت اور مرد کی میراث کا فرق، عورت اور مرد کے خون بہا میں اختلاف، قرآن کے حروف مقطعات، احکام کی نسخ، اسلامی جنگیں اور غزوات، مختلف الٰہی آزمائشیں اور ایسے ہی بیسیوں سوالوں کے جوابات اس طرح دیئے گئے ہیں کہ آیات کا مطالعہ کرتے وقت محترم قاری کے ذہن میں کوئی استفہامی علامت باقی نہ رہے۔

(۶) ایسی پیچیدہ علمی اصطلاحات جن کے نتیجے میں کتاب ایک خاص صنف سے مخصوص ہو جائے، سے دوری اختیار کی گئی ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت علمی اصطلاح کا ذکر کرنے کے بعد اس کی واضح تفسیر و تشریح کر دی گئی ہے۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس راہ میں ہماری مخلصانہ کوشش نتیجہ بخش ثابت ہوں گی اور تمام طبقوں کے لوگ اس تفسیر کے ذریعہ اس عظیم آسمانی کتاب سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں گے جس کا نام بعض دوستوں کی تجویز پر تفسیر نمونہ رکھا گیا ہے۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ، قم
تیر ماہ ۱۳۵۲ بمطابق جمادی الثانی ۱۳۹۳

سُورَۃ حَمۡدٌ





سورۂ حمد کی خصوصیات

یہ سورت قرآن مجید کی دیگر سورتوں کی نسبت بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ ان امتیازات کا سرچشمہ مندرجہ ذیل خوبیاں ہیں:

(۱) لب و لہجہ اور اسلوب بیان: یہ سورت دیگر سورتوں سے اس لحاظ سے واضح امتیاز رکھتی ہے کہ وہ خدا کی گفتگو کے عنوان کی حامل ہیں اور یہ بندوں کی زبان کے طور پر نازل ہوئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس میں خداوند عالم نے بندوں کو خدا سے گفتگو اور مناجات کا طریقہ سکھایا ہے۔

سورۃ کی ابتداء خداوند عالم کی حمد و ثنا سے کی گئی ہے۔ خدا شناسی اور قیامت پر ایمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بندوں کے تقاضوں، حاجات اور ضروریات پر کلام کو ختم کیا گیا ہے۔

بیدار مغز اور ذی فہم انسان جب اس سورہ کو پڑھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر عالم بالا کی طرف محو پرواز ہے اور عالم روحانیت و معنویت میں لمحہ بہ لمحہ خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔

یہ نکتہ بڑا جاذب نظر ہے کہ خود ساختہ یا تحریف شدہ مذاہب جو خالق و مخلوق کے درمیان معاملہ میں واسطہ کے قائل ہیں ان کے برخلاف اسلام انسانوں کو یہ دستور دیتا ہے کہ وہ کسی بھی واسطہ کے بغیر خدا سے اپنا رابطہ برقرار رکھیں۔

خدا و انسان اور خالق و مخلوق کے درمیان اس نزدیکی اور بے واسطہ تعلق کے سلسلے میں یہ سورۃ آئینہ کا کام دیتی ہے۔

یہاں انسان صرف خدا کو دیکھتا ہے۔ اسی سے گفتگو کرتا ہے اور فقط اس کا پیغام اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مرسل یا ملک مقرب بھی درمیان میں واسطہ نہیں بنتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی پیوند و ربط جو براہ راست خالق و مخلوق کے درمیان ہے۔ قرآن مجید کا آغاز ہے۔

(۲) اساس قرآن: نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق سورۂ حمد اُم الکتاب ہے۔ ایک مرتبہ جابر بن عبداللہ انصاری آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

الا اعلمك افضل سورة انزلها الله فى كتابه قال فقال له جابر بلى بابى انت وامى يارسول الله علمنيها فعلمه الحمد ام الكتاب ....



کیا تمہیں سب سے فضیلت والی سورت کی تعلیم دوں جو خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہے؟ جابر نے عرض کیا جی ہاں میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس کی تعلیم دیجئے۔ آنحضرت نے سورہ حمد جو ام الکتاب ہے انہیں تعلیم فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سورہ حمد موت کے علاوہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔[1]

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہ ما انزل اللہ فی التوراۃ ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثلھا ھی ام الکتاب۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے خداوند عالم نے تورات، انجیل، زبور یہاں تک کہ قرآن میں بھی ایسی کوئی سورۃ نازل نہیں فرمائی اور یہ ام الکتاب ہے۔[2]

اس سورت میں غور و فکر کرنے سے اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ سورۃ پورے قرآن کے مضامین کی فہرست ہے۔ اس کا ایک حصہ توحید اور صفات خداوندی سے متعلق ہے دوسرا حصہ قیامت و معاد سے گفتگو کرتا ہے اور تیسرا حصہ ہدایت و گمراہی کو بیان کرتا ہے جو مومنین و کفار میں حد فاصل ہے۔

اس سورہ میں پروردگار عالم کی حاکمیت مطلقہ اور مقام ربوبیت کا بیان ہے نیز اس کی لامتناہی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جن کے دو حصے ہیں ایک عمومی اور دوسرا خصوصی (رحمانیت اور رحیمیت)۔ اس میں عبادت و بندگی کی طرف بھی اشارہ ہے جو اسی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سورۃ میں توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال اور توحید عبادت سب کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورۃ ایمان کے تینوں مراحل کا احاطہ کرتی ہے:

۱۔ دل سے اعتقاد رکھنا۔

۲۔ زبان سے اقرار کرنا۔

۳۔ اعضاء و جوارح سے عمل کرنا۔

ہم جانتے ہیں کہ ام کا مطلب ہے بنیاد اور جڑ۔ شاید اسی بنا پر عالم اسلام کے مشہور مفسر ابن عباس کہتے ہیں:

ان لکل شیء اساسا و اساس القرآن الفاتحۃ۔

ہر چیز کی کوئی اساس و بنیاد ہوتی ہے اور قرآن کی اساس سورۃ فاتحہ ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ نور الثقلین آغاز سورہ حمد

[2] ""



انہی وجوہ کی بنا پر اس سورۃ کی فضیلت کے سلسلے میں رسول اللہ سے منقول ہے :

ایما مسلم قرء فاتحة الکتاب اعطی من الاجر کانما قرء ثلثی القرآن و اعطی من الاجر کانما تصدق علی کل مومن و مومنة۔

جو مسلمان سورہ حمد پڑھے اس کا اجر و ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے دو تہائی قرآن کی تلاوت کی ہو (ایک اور حدیث میں پورے قرآن کی تلاوت کے برابر ثواب مذکور ہے) اور اسے اتنا ثواب ملے گا گویا اس نے ہر مومن اور مومنہ کو ہدیہ پیش کیا ہو۔[1]

سورہ فاتحہ کے ثواب کو دو تہائی قرآن کے تلاوت کے برابر قرار دینے کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن کے ایک حصے کا تعلق خدا سے ہے، دوسرے کا قیامت سے اور تیسرے کا احکام و قوانین شرعی سے ان میں سے پہلا اور دوسرا حصہ سورہ حمد میں مذکور ہے۔ دوسری حدیث میں پورے قرآن کے برابر فرمایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا خلاصہ ایمان اور عمل ہے اور یہ دونوں چیزیں سورہ حمد میں جمع ہیں۔

۲۔ **پیغمبر اکرمؐ کے لئے اعزاز:** یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنی آیات میں سورہ حمد کا تعارف آنحضرتؐ کے لئے ایک عظیم انعام کے طور پر کرایا گیا ہے اور اسے پورے قرآن کے مقابلے میں پیش فرمایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝

ہم نے آپ کو سات آیتوں پر مشتمل سورہ حمد عطا کیا جو دو مرتبہ نازل کیا گیا اور قرآن عظیم بھی عنایت فرمایا گیا (حجر، آیہ ۸۷)

قرآن مجید اپنی تمام تر عظمت کے باوجود یہاں سورہ حمد کے برابر قرار پایا۔ اس سورۃ کا دو مرتبہ نزول بھی اس کی بہت زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔[2]

اسی مضمون کی ایک روایت رسول اللہ سے حضرت امیرالمومنینؑ نے بیان فرمائی ہے :

ان اللہ تعالی افرد الامتنان علیّ بفاتحة الکتاب وجعلها بازاء القرآن العظیم وان فاتحة الکتاب اشرف ما فی کنوز العرش۔

خداوند عالم نے مجھے سورہ حمد دے کر خصوصی احسان جتایا ہے اور اسے قرآن کے مقابل قرار دیا ہے عرش کے مخزانوں میں سے اشرف ترین سورہ حمد ہے۔

---

[1] مجمع البیان آغاز سورہ حمد

[2] 'سبعا من المثانی' قرار دینے کی وجہ اور سورہ حمد کی کچھ مزید خوبیاں اسی تفسیر (نمونہ) میں سورۂ حجر کی آیت ۸۷ کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔



(۴) تلاوت کی تاکید: سورۂ حمد کی فضیلتوں کے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احادیث اسلامی میں جو شیعہ و سنی کتب میں موجود ہیں۔ اس سورہ کی تلاوت کے متعلق اتنی تاکید کیوں کی گئی ہے۔

اس کی تلاوت انسان کو روح ایمان بخشتی ہے اور اسے خدا کے نزدیک کرتی ہے۔ اس سے دل کو جلا ملتی ہے اور روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسانی ارادے کو کامیابی میسر آتی ہے۔ اس سورہ کی تلاوت سے خالق و مخلوق کے مابین انسانی جستجو فزوں تر ہو جاتی ہے۔ نیز انسان اور گناہ و انحراف کے درمیان رکاوٹ بنتی ہے۔ اسی بناء پر حضرت صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

ان لابلیس اربع رنات اولهن یوم لعن وحین اهبط الی الارض وحین بعث محمد علی حین فترة من الرسل وحین انزلت ام الکتاب۔

شیطان نے چار دفعہ نالہ و فریاد کیا۔ پہلا وہ موقع تھا جب اسے راندۂ درگاہ کیا گیا۔ دوسرا وہ وقت تھا جب اسے بہشت سے زمین کی طرف اتارا گیا۔ تیسرا وہ لمحہ تھا جب حضرت محمدؐ کو مبعوث برسالت کیا گیا اور آخری وہ مقام تھا جب سورہ حمد کو نازل کیا گیا۔[1]

سورۂ حمد کے موضوعات

اس سورہ کی سات آیات میں سے ہر ایک ایک اہم مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے:

'بسم اللہ' ہر کام کی ابتداء کا سرنامہ ہے اور ہر کام کے شروع کرتے وقت ہمیں خدا کی ذات پاک سے مدد طلب کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

'الحمد للہ رب العالمین' یہ اس بات کا درس ہے کہ تمام نعمتوں کی برگشت اور تمام موجودات کی پرورش و تربیت کا تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے۔ یہ امر اس حقیقت سے مربوط ہے کہ تمام عنایات کا سرچشمہ اسی کی ذات پاک ہے۔

'الرحمٰن الرحیم' یہ اس بات کا تکرار ہے کہ خدا کی خلقت، تربیت اور حاکمیت کی بنیاد رحمت و عطوفت پر ہے اور دنیا کا نظام تربیت اسی قانون پر قائم ہے۔

'مالک یوم الدین' یہ آیت معاد، اعمال کی جزا و سزا اور اس عظیم عدالت میں خداوند عالم کی حاکمیت کی جانب توجہ دلاتی ہے۔

'ایاک نعبد و ایاک نستعین' یہ توحید عبادتی کا بیان ہے اور انسانوں کے لئے اس اکیلے مرکز کا تذکرہ ہے

---

[1] نور الثقلین جلد اول ص۳



جو سب کا آسرا اور سہارا ہے۔

'اھدنا الصراط المستقیم' یہ آیت بندوں کی احتیاج ہدایت اور اشتیاق ہدایت کو بیان کرتی ہے۔ یہ آیت اس طرف بھی توجہ دلاتی ہے کہ ہر قسم کی ہدایت اسی کی طرف سے ہے۔

سورۃ کی آخری آیت اس بات کی واضح اور روشن نشانی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد ان لوگوں کی راہ ہے جو نعمات الٰہیہ سے نوازے گئے ہیں اور یہ راستہ مغضوب اور گمراہوں کے راستے سے جدا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک حصہ خدا کی حمد و ثنا ہے اور دوسرا بندے کی ضروریات و حاجات۔

'عیون اخبار الرضا' میں سرکار رسالتؐ سے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

> خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ میں نے سورہ حمد کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ لہٰذا میرا بندہ حق رکھتا ہے کہ وہ جو چاہے مجھ سے مانگے۔ جب بندہ کہتا ہے 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' تو خدائے بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے میرے بندے نے میرے نام سے ابتدا کی ہے مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کے کاموں کو آخر تک پہنچادوں اور اسے ہر حالت میں برکت عطا کروں۔ جب وہ کہتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین' تو خداوند تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد و ثنا کی ہے۔ اس نے سمجھا ہے کہ جو نعمتیں اس کے پاس ہیں وہ میری عطا کردہ ہیں لہٰذا میں مصائب کو اس سے دور کیے دیتا ہوں۔ گواہ رہو کہ میں دنیا کی نعمتوں کے علاوہ اسے دار آخرت میں بھی نعمات سے نوازوں گا اور اس جہان کے مصائب سے بھی اسے نجات عطا کروں گا۔ جیسے اس دنیا کی مصیبتوں سے اسے رہائی دی ہے جب وہ کہتا ہے 'الرحمن الرحیم' تو خداوند عالم فرماتا ہے میرا بندہ گواہی دے رہا ہے کہ میں رحمٰن و رحیم ہوں۔ گواہ رہو کہ میں اس کے حصے میں اپنی رحمت و عطیات زیادہ کیے دیتا ہوں۔ جب وہ کہتا ہے 'مالک یوم الدین' تو خدا فرماتا ہے کہ گواہ رہو جس طرح اس نے روز قیامت میری حاکمیت و مالکیت کا اعتراف کیا ہے حساب و کتاب کے دن میں اس کے حساب و کتاب کو آسان کر دوں گا۔ اس کی نیکیوں کو قبول کر لوں گا اور اس کی برائیوں سے درگذر کروں گا۔ جب وہ کہتا ہے 'ایاک نعبد' تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ سچ کہہ رہا ہے وہ صرف میری عبادت کرتا ہے۔ میں تمہیں گواہ قرار دیتا ہوں کہ اس خالص عبادت پر میں اسے ایسا ثواب دوں گا کہ وہ لوگ جو اس کے مخالف تھے اس پر رشک کریں گے۔ جب وہ کہتا ہے 'ایاک نستعین' تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے مجھ سے مدد چاہی ہے اور صرف مجھ سے پناہ مانگی ہے گواہ رہو اس کے کاموں میں میں اس کی مدد کروں گا۔ سختیوں اور تنگیوں میں اس کی فریاد کو پہنچوں گا اور پریشانی کے دن اس کی دستگیری کروں گا جب وہ کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم صراط .... ولا الضالین تو خداوند عالم فرماتا ہے میرے بندے کی یہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ وہ چاہتا ہے مجھ



سے مانگے میں اس کی دعا قبول کروں گا۔ جس چیز کی امید لگائے بیٹھا ہے وہ اسے عطا کروں گا، اور جس چیز سے خائف ہے اس سے مامون قرار دوں گا۔[1]

اس سورۃ کا نام "فاتحۃ الکتاب" کیوں ہے؟

فاتحۃ الکتاب کا معنی ہے آغاز کتاب (قرآن) کرنے والی۔ مختلف روایات جو نبی اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سورت آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔ یہیں سے دنیائے اسلام کے ایک اہم ترین مسئلے کی طرف فکر کا دریچہ کھلتا ہے اور وہ ہے جمع قرآن کے بارے میں۔ ایک گروہ میں یہ بات مشہور ہے کہ قرآن مجید نبی اکرمؐ کے زمانے میں منتشر و پراگندہ صورت میں تھا اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر یا حضرت عثمان کے زمانے میں جمع ہوا لیکن "فاتحۃ الکتاب" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اسی موجود صورت میں جمع ہو چکا تھا اور اسی سورۂ حمد سے اس کی ابتداء ہوتی تھی۔ ورنہ یہ کوئی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ تو نہیں جو یہ نام رکھا جائے اور نہ ہی اس سورۃ کے لئے "فاتحۃ الکتاب" نام کے انتخاب کے لئے کوئی دوسری دلیل موجود ہے۔ بہت سے دیگر مدارک بھی ہمارے پیش نظر ہیں جو اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ قرآن مجید بصورت مجموعہ جس طرح ہمارے زمانے میں موجود ہے اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں آپ کے حکم کے مطابق جمع ہو چکا تھا۔ ان میں سے چند ایک ہم پیش کرتے ہیں:

(۱) علی بن ابراہیم نے حضرت امام صادقؑ سے روایت کیا ہے:

رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ قرآن ریشم کے ٹکڑوں، کاغذ کے پرزوں اور ایسی دوسری چیزوں میں منتشر ہے اسے جمع کر دو۔ اس پر حضرت علیؑ مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کو زرد رنگ کے پارچے میں جمع کیا اور پھر اس پر مہر لگا دی۔

انطلق علی فجمعه فی ثوب اصفر ثم ختم علیه[2]

(۲) اہل سنت کے مشہور مؤلف حاکم نے کتاب مستدرک میں زید بن ثابت سے نقل کیا ہے:

ہم پیغمبر کی خدمت میں قرآن کے پراگندہ ٹکڑوں کو جمع کرتے تھے اور ہر ایک کو نبی اکرمؐ کی راہنمائی کے مطابق اس کے مناسب محل و مقام پر رکھتے تھے لیکن پھر بھی یہ تحریریں متفرق تھیں چنانچہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ وہ انہیں ایک جگہ جمع کریں (اس جمع آوری کے بعد) اب آپ ہمیں اسے ضائع

---

[1] المیزان ج اول ص۳۴ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

[2] تاریخ القرآن، ابو عبداللہ زنجانی ص۲۴



کرنے سے ڈراتے تھے۔

(۳) اہل تشیع کے بہت بڑے عالم سید مرتضیٰ کہتے ہیں:

قرآن رسول اللہ کے زمانے میں اسی حالت میں اسی موجودہ صورت میں جمع ہو چکا تھا۔[1]

(۴) طبرانی اور ابن عساکر نے شعبی سے یوں نقل کیا ہے:

انصار میں سے چھ افراد نے قرآن کو پیغمبرؐ کے زمانے میں جمع کیا تھا۔[2]

(۵) قتادہ ناقل ہیں:

میں نے انس سے سوال کیا کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں کس شخص نے قرآن جمع کیا تھا۔ اس نے کہا چار افراد تے جو سب کے سب انصار میں سے تھے۔ ابی بن کعب، معاذ، زید بن ثابت اور ابوزید[3]

ان کے علاوہ بھی روایات ہیں جن کا ذکر کرنا طول کا باعث ہوگا۔ بہرحال یہ احادیث جو شیعہ و سنی کتب میں موجود ہیں ان سے قطع نظر اس سورہ کے لئے فاتحۃ الکتاب نام کا انتخاب اس موضوع کے اثبات کا زندہ ثبوت ہے۔

ایک اہم سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا کہ اس بات کو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ قرآن رسول اللہ کے زمانے میں جمع ہوا جب کہ علماء کے ایک گروہ میں مشہور ہے کہ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے بعد جمع ہوا ہے (حضرت علیؑ کے ذریعے یا دیگر اشخاص کے ذریعے)۔

جواب: جو قرآن حضرت علیؑ نے جمع کیا تھا وہ قرآن، تفسیر، شان نزول آیات وغیرہ کا مجموعہ تھا باقی رہا حضرت عثمان کا معاملہ تو ہمارے پاس ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اختلاف قرأت کو روکنے کے لئے اسے ایک قرأت اور نقطہ گذاری کے ساتھ معین کیا کیونکہ اس وقت تک نقطے لگانا معمولات میں داخل نہیں تھا۔

رہا بعض لوگوں کا یہ اصرار کہ قرآن کسی طرح بھی رسول اللہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا اور یہ اعزاز حضرت عثمان، خلیفہ اول یا خلیفہ دوم کو حاصل ہوا ہے۔ شاید اس سے زیادہ تر مقصود فضیلت سازی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر گروہ اس فضیلت کی نسبت خاص شخصیت کی طرف دیتا ہے اور اسی سے متعلق روایت پیش کرتا ہے۔ اصولی اور بنیادی طور پر یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس اہم ترین کام کو نظر انداز کر دیا ہو حالانکہ آپؐ تو چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرف بھی توجہ دیتے تھے جب کہ قرآن اسلام کا اصول اساسی ہے، تعلیم و تربیت کی عظیم کتاب ہے اور تمام اسلامی پروگراموں اور عقاید کی بنیاد ہے۔ کیا نبی اکرمؐ کے زمانے میں جمع نہ ہونے سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے یا مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو جائیں؟

---

[1] مجمع البیان، جلد اول صہ ۱۵

[2] منتخب کنز العمال جلد دوم صہ ۵۲

[3] صحیح بخاری جلد ۶ صہ ۱۰۳



علاوہ ازیں حدیث ثقلین جسے شیعہ و سنی دونوں نے نقل کیا ہے گواہی دیتی ہے کہ قرآن کتابی صورت میں رسول اللہؐ کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں اور تم میں دو چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں خدا کی کتاب اور میرا خاندان۔

وہ روایات جو دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ کی زیر نگرانی صحابہ نے قرآن جمع کیا تھا ان میں صحابہ کی تعداد مختلف بیان ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر روایت نے چند ایک کی نشاندہی کی ہے اس سے کام فقط ان شخصیتوں میں منحصر نہیں ہو جاتا لہٰذا یہ پہلو باعث اختلاف نظر نہیں ہونا چاہیئے۔



۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
۲۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ
۳۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ
۴۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ
۵۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ
۶۔ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ
۷۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪

ترجمہ

۱۔ اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔
۲۔ حمد مخصوص اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔
۳۔ وہ خدا جو مہربان اور بخشنے والا ہے (جس کی رحمت عام وخاص سب پر محیط ہے)۔
۴۔ وہ خدا جو روز جزا کا مالک ہے۔
۵۔ پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔
۶۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔
۷۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تونے انعام فرمایا ان کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کہ جو گمراہ ہوگئے۔

تفسیر

۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام لوگوں میں یہ رسم ہے کہ ہر اہم اور اچھے کام کا آغاز کسی بزرگ کے نام سے کرتے ہیں۔ کسی عظیم عمارت کی پہلی اینٹ



اس شخص کے نام پر رکھی جاتی ہے۔ جس سے بہت زیادہ قلبی لگاؤ ہو یعنی اس کام کو اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام منسوب کر دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ کسی پروگرام کو دوام بخشنے اور کسی مشن کو برقرار رکھنے کے لئے ایسی ہستی سے منسوب کیا جائے جو پائیدار، ہمیشہ رہنے والی ہو اور جس کی ذات میں فنا کا گزر نہ ہو۔ اس جہان کی تمام موجودات کہنگی پذیر ہیں اور زوال کی طرف رواں دواں ہیں، صرف وہی چیز باقی رہ جائے گی، جو اس ذاتِ لایزال سے وابستہ ہو گی۔

انبیاء و مرسلین کے نام باقی ہیں تو پروردگار عالم سے رشتہ جوڑنے اور عدالت و حقیقت پر قائم رہنے کی وجہ سے اور یہ وہ رشتہ ہے جو زوال آشنا نہیں۔ اگر حاتم کا نام باقی ہے تو سخاوت کے باعث جو زوال پذیر نہیں۔ تمام موجودات میں سے فقط ذاتِ خدا ازلی و ابدی ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ تمام امور کو اس کے نام سے شروع کیا جائے۔ اس کے سائے میں تمام چیزوں کو قرار دیا جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے۔

اسی لئے قرآن کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ اپنے امور کو برائے نام خدا سے وابستہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ حقیقتاً اور واقعتاً خدا سے رشتہ جوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ربط انسان کو صحیح راستہ پر چلائے گا اور ہر قسم کی کجروی سے باز رکھے گا۔ ایسا کام یقیناً تکمیل کو پہنچے گا اور باعث برکت ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

کل امر ذی بال لم یذکر فیه اسم اللہ فهو ابتر۔

جو بھی اہم کام خدا کے نام کے بغیر شروع ہو گا ناکامی سے ہمکنار ہو گا۔[1]

امیرالمومنینؑ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

انسان جس کام کو انجام دینا چاہے چاہیے کہ بسم اللہ کہے اور جو عمل خدا کے نام سے شروع ہو وہ مبارک ہے۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں:

جب کوئی کام شروع کرنے لگو، بڑا ہو یا چھوٹا بسم اللہ کہو تاکہ وہ بابرکت بھی ہو اور پُر از امن و سلامتی بھی۔

خلاصہ یہ کہ کسی عمل کی پائیداری و بقا اس کے ربطِ خدا سے وابستہ ہے۔ اسی مناسبت سے جب خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ پر پہلی وحی نازل فرمائی تو انہیں حکم دیا کہ تبلیغ اسلام کی عظیم ذمہ داری کو خدا کے نام سے شروع کریں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تعجب خیز اور نہایت سخت طوفان کے عالم میں حضرت نوحؑ کشتی پر سوار ہوئے۔ پانی کی موجیں

---

۱ تفسیر البیان جلد اول صد ۴۶۲ بحوالہ بحار جلد ۱۶ باب ۵۸۔



پہاڑوں کی طرح بلند تھیں اور ہر لحظہ بے شمار خطرات کا سامنا تھا۔ ایسے میں منزلِ مقصود تک پہنچنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ کشتی کے چلتے اور رکتے بسم اللہ کہو۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ط (ہود۔ آیہ ۴۱)

چنانچہ ان لوگوں نے اس پر خطر سفر کو توفیق الٰہی کے ساتھ کامیابی سے طے کر لیا اور امن و سلامتی کے ساتھ کشتی سے اترے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰى أُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ط

حکم ہوا اے نوح (کشتی سے) ہماری طرف سے سلامتی اور برکات کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اتریے۔ (ہود۔ آیت ۴۸)

جناب سلیمانؑ نے جب ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کا سرنامہ بسم اللہ ہی کو قرار دیا

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ ....

یہ (مراسلہ) ہے سلیمان کی طرف سے اور بے شک یہ ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم .... (نمل۔ آیت ۳۰)

اسی بنا پر قرآن حکیم کی تمام سورتوں کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے تاکہ نوعِ بشر کی ہدایت و سعادت کا اصلی مقصد کامیابی سے ہمکنار ہو اور بغیر کسی نقصان کے انجام پذیر ہو۔ صرف سورہ توبہ ایسی سورت ہے جس کی ابتدا میں ہمیں بسم اللہ نظر نہیں آتی کیونکہ اس کا آغاز مکہ کے مجرموں اور معاہدہ شکنوں سے اعلان جنگ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایسے موقع پر خدا کی صفاتِ رحمان و رحیم کا ذکر مناسب نہیں۔

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ کہ ہر جگہ بسم اللہ کہا جاتا ہے بسم الخالق یا بسم الرزاق وغیرہ نہیں نہیں کہا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اللہ خدا کے تمام اسماء اور صفات کا جامع ہے۔ اس کی تفصیل عنقریب آئیگی۔ اللہ کے علاوہ دوسرے نام بعض کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً خالقیت، رحمت وغیرہ۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر کام کی ابتدا میں بسم اللہ کہنا جہاں خدا سے طلب مدد کے لئے ہے وہاں اس کے نام سے شروع کرنے کے لئے بھی ہے۔ اگرچہ ہمارے بزرگ مفسرین نے طلب مدد اور شروع کرنے کو ایک دوسرے سے جدا قرار دیا ہے اور ہر ایک نے یہاں پر کوئی ایک مفہوم مراد لیا ہے لیکن حقیقت میں ہر مفہوم کی برگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے۔ خلاصہ یہ کہ آغاز کرنا اور مدد چاہنا ہر دو مفہوم یہاں پر لازم و ملزوم ہیں۔

بہر حال جب تمام کام خدا کی قدرت کے بھروسہ پر شروع کئے جائیں تو چونکہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے اس لئے ہم اپنے میں زیادہ قوت و طاقت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ زیادہ مطمئن ہو کر کوشش کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مشکلات کا خوف نہیں رہتا اور مایوسی پیدا نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے انسان کی نیت اور عمل زیادہ پاک اور زیادہ خالص رہتا ہے۔



اس آیت کی تفسیر میں جتنی گفتگو کی جائے کم ہے کیونکہ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ ابتدائے شب سے صبح تک ابن عباس کے سامنے بسم اللہ کی تفسیر بیان فرماتے رہے صبح ہوئی تو آپ بسم اللہ کی "ب" سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ آنحضرتؐ ہی کے ایک ارشاد سے ہم یہاں اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ آئندہ مباحث میں اس سلسلے کے دیگر مسائل پر گفتگو ہوگی۔

عبداللہ بن یحییٰ امیرالمؤمنین کے محبوں میں سے تھے ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بسم اللہ کہے بغیر اس چارپائی پر بیٹھ گئے جو وہاں پڑی تھی اچانک وہ جھکے اور زمین پر آگرے۔ اُن کا سر پھٹ گیا۔ حضرت علیؑ نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ان کا زخم مندمل ہو گیا۔ آپ نے فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی اکرمؐ نے خدا کی طرف سے یہ حدیث مجھ سے بیان فرمائی ہے کہ جو کام نام خدا کے بغیر شروع کیا جائے بے انجام رہتا ہے (عبداللہ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان میں یہ جانتا ہوں اور اب کے بعد پھر اسے ترک نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا پھر تو تم سعادتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔

امام صادقؑ نے اسی حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے بعض شیعہ کام کی ابتداء میں بسم اللہ ترک کر دیتے ہیں اور خدا انہیں کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ وہ بیدار ہوں اور ساتھ ساتھ یہ غلطی بھی ان کے نامۂ عمل سے دھو ڈالی جائے۔[1]

کیا بسم اللہ سورۂ حمد کا جزء ہے؟

شیعہ علماء و محققین میں اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد اور دیگر سور قرآن کا جزء ہیں۔

بسم اللہ کا متن تمام سورتوں کی ابتداء میں ثبت ہونا اصولی طور پر اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ جزوِ قرآن ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ متن قرآن میں کوئی اضافی چیز نہیں لکھی گئی اور بسم اللہ زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر اب تک سورتوں کی ابتداء میں موجود ہے۔ رہا یہ ہے علمائے اہلسنت تو صاحب تفسیر المنار نے ان کے اقوال درج کئے ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

گذشتہ علمائے اہل مکہ، فقہاء قاری حضرات جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں، اہل کوفہ کے قراء میں سے عاصم اور کسائی اور اہل مدینہ میں سے بعض صحابہ اور تابعین اسی طرح شافعی اپنی کتاب جدید میں اور اس کے پیروکار نیز ثوری اور احمد اپنے قول میں اس بات کے معتقد ہیں کہ بسم اللہ جزء سورہ ہے۔ اسی طرح علماء امامیہ اور ان کے قول کے مطابق صحابہ میں سے علیؑ، ابن عباس، عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ، علماء تابعین میں سے سعید بن جبیر، عطاء، زہری اور ابن مبارک بھی اسی نظریے

---

[1] سفینۃ البحار، جلد اول صـ ۶۳۳



کے حامل تھے۔

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ان کی اہم ترین دلیل یہ ہے کہ صحابہ اور ان کے بعد برسر کار لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ برأت کے سوا تمام سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ مذکور ہے جب کہ وہ بالاتفاق ایک دوسرے کو وصیت کرتے تھے کہ ہر اس چیز سے جو جزو قرآن نہیں قرآن کو پاک رکھا جائے اسی لئے تو آمین، کو انہوں نے سورۂ فاتحہ کے آخر میں ذکر نہیں کیا۔

اس کے بعد انہوں نے مالک اور ابو حنیفہ کے پیروکاروں اور بعض دوسرے لوگوں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ کو مستقل آیت سمجھتے تھے جو سورتوں کی ابتداء کے بیان اور ان کے درمیان حدِ فاصل کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے اہل سنت کے معروف فقیہ اور بعض قارئین کوفہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ کو سورہ حمد کا تو جزء سمجھتے تھے لیکن باقی سورتوں کا جزء نہیں سمجھتے تھے۔[1]

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی یقینی اکثریت بھی بسم اللہ کو سورت کا جزء سمجھتی ہے۔

اب ہم بعض روایات پیش کرتے ہیں جو شیعہ و سنی طرق سے اس سلسلے میں نقل ہوئی ہیں (ہمیں اعتراف ہے کہ اس ضمن کی تمام احادیث کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں اور ان کا تعلق فقہی بحث سے ہے)۔

۱۔ معاویہ بن عمار (جو امام صادقؑ کے محب و موالی تھے) کہتے ہیں "میں نے امامؑ سے پوچھا کہ جب میں نماز پڑھنے لگوں تو کیا الحمد کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھوں؟" آپ نے فرمایا "ہاں"۔[2]

۲۔ دارقطنی نے جو علماء اہل سنت میں سے ہیں سند صحیح کے ساتھ حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے:
ایک شخص نے آپ سے پوچھا "سبع مثانی کیا ہے؟" فرمایا: "سورہ حمد"۔ اس نے عرض کیا "سورہ حمد کی تو چھ آیتیں ہیں"۔ آپ نے فرمایا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی اس کی ایک آیت ہے"۔[3]

۳۔ اہل سنت کے مشہور محدث بیہقی سند صحیح کے ساتھ ابن جبیر کے طریق سے اس طرح نقل کرتے ہیں:
استرق الشیطان من الناس اعظم اٰیۃ من القراٰن بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
شیطان صفت اشخاص نے قرآن کی بہت بڑی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو چرا لیا ہے (یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سورتوں کے شروع میں اسے نہیں پڑھا جاتا)۔[4]

ان سب کے علاوہ ہمیشہ مسلمانوں کی یہ سیرت رہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت بسم اللہ ہر سورت کی ابتداء

---

[1] تفسیر المنار جلد اول صفحہ ۳۹، ۴۰
[2] کافی جلد ۳ صفحہ ۳۱۲
[3] الاتقان جلد اول صفحہ ۱۳۶
[4] بیہقی جلد ۲ صفحہ ۵۰



میں پڑھتے رہے ہیں تواتر سے ثابت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چیز جزو قرآن نہ ہو اسے پیغمبر اور مسلمان ہمیشہ قرآن کے ضمن میں پڑھتے رہے ہوں اور سدا اس عمل کو جاری رکھا ہو۔

باقی رہا بعض کا یہ احتمال کہ بسم اللہ مستقل آیت ہے جو جزو قرآن تو ہے لیکن سورتوں کا حصہ نہیں تو یہ احتمال نہایت ضعیف اور کمزور دکھائی دیتا ہے کیونکہ بسم اللہ کا مفہوم اور معنی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ ابتدار اور آغاز کے لئے ہے نہ کہ یہ ایک علیحدہ اور مستقل اہمیت کی حامل ہے۔ دراصل یہ فکر جمود اور سخت تعصب کی غماز ہے۔ یوں لگتا ہے گویا اپنی بات کو برقرار رکھنے کے لئے ہر احتمال پیش کیا جا رہا ہے اور بسم اللہ جیسی آیت کو مستقل اور سابق و لاحق سے الگ ایک آیت قرار دیا جا رہا ہے جس کا مضمون پکار پکار کر اپنے سرنامہ اور بعد والی ابحاث کے لئے ابتدار ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

ایک اعتراض البتہ قابل غور ہے جسے مخالفین اس مقام پر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب قرآن کی سورتوں کی آیات شمار کرتے ہیں (سوائے سورہ حمد کے) تو بسم اللہ کو ایک آیت شمار نہیں کیا جاتا بلکہ پہلی آیت بسم اللہ سے بعد والی آیت کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں وضاحت کے ساتھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> کوئی حرج نہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد میں تو الگ ایک آیت ہو اور دوسری سورتوں میں پہلی آیت کا جزر قرار پائے (اس طرح مثلاً سورہ کوثر میں بسم الله الرحمٰن الرحیم انا اعطیناك الکوثر سب ایک آیت شمار ہو)

بہرحال مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ کہتے ہیں:

> ایک دن معاویہ نے اپنی حکومت کے زمانے میں نماز باجماعت میں بسم اللہ نہ پڑھی تو نماز کے بعد مہاجرین و انصار کے ایک گروہ نے پکار کر کہا: "اسرقت ام نسیت" یعنی کیا معاویہ نے بسم اللہ کو چرا لیا ہے یا بھول گیا ہے؟[1]

خدا کے ناموں میں سے اللہ جامع ترین نام ہے

بسم اللہ کی ادائیگی میں ہمارا سامنا سب سے پہلے لفظ "اسم" سے ہوتا ہے۔ عربی ادب کے علمار کے بقول اس کی اصل "سمو" بروزن "علو" ہے جس کے معنی ہیں ارتفاع اور بلندی۔ تمام ناموں کو اسم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ہر چیز کا مفہوم اخفار سے ظہور و ارتفاع کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ نام ہو جانے کے بعد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ مہمل اور بے معنی کی منزل سے نکل آتا ہے اور اس طرح ارتفاع و بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

بہرحال کلمہ "اسم" کے بعد ہم کلمہ "اللہ" تک پہنچتے ہیں جو خدا کے ناموں میں سے سب سے زیادہ جامع ہے، خدا

---

[1] بیہقی جزء دوم ص۴۹۔ حاکم نے مستدرک جزء اول ص۲۳۳ میں اس روایت کو درج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔



کے ان ناموں کو جو قرآن مجید یا دیگر مصادر اسلامی میں آئے ہیں اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کی کسی ایک صفت کو منعکس کرتے ہیں لیکن وہ نام جو تمام صفات و کمالات الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے دوسرے لفظوں میں جو صفات جلال و جمال کا جامع ہے وہ صرف ' اللہ ' ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے دوسرے نام عموماً کلمہ ' اللہ ' کی صفت کی حیثیت سے کہے جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے :

غفور و رحیم : یہ صفت خدا کی صفت بخشش کی طرف اشارہ ہے :
فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿ بقرہ ۲۲۶ ﴾

سمیع و علیم : ' سمیع ' اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ خدا تمام سنی جانے والی چیزوں سے آگاہی رکھتا ہے اور ' علیم ' اشارہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے ۔
فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿ بقرہ ۲۲۷ ﴾

بصیر : یہ لفظ بتاتا ہے کہ خدا تمام دیکھی جانے والی چیزوں سے آگاہ ہے :
وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿ حجرات ۱۸ ﴾

رزاق : یہ صفت اس کے تمام موجودات کو روزی دینے کے پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اور ' ذوالقوۃ ' اس کی قدرت کو ظاہر کرتی ہے اور ' متین ' اس کے افعال اور پروگرام کی پختگی کا تعارف ہے ۔
اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ﴿ ذاریات ۵۸ ﴾

خالق اور باری : اس کی آفرینش اور پیدا کرنے کی صفت کی طرف اشارہ ہے اور ' مصور ' اس کی تصویر کشی کی حکایت کرتا ہے ۔
ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ﴿ حشر ۲۴ ﴾

ظاہر ہوا کہ ' اللہ ' ہی خدا کے تمام ناموں میں سے جامع ترین ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نام ' اللہ ' قرار پائے ہیں :

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ؕ

اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ حاکم مطلق ہے ، منزہ ہے ، ہر ظلم و ستم سے پاک ہے ، امن بخشنے والا ہے ، سب کا نگہبان ہے ، توانا ہے کسی سے شکست کھانے والا نہیں اور تمام موجودات پر قاہر و غالب اور باعظمت ہے ۔ ﴿ حشر ۲۳ ﴾

اس نام کی جامعیت کا ایک واضح شاہد یہ ہے کہ ایمان و توحید کا اظہار صرف ' لا الٰہ الا اللہ ' کے جملے سے ہو سکتا ہے اور جملہ ' لا الٰہ الا العلیم ..... الا الخالق ..... الا الرزاق اور دیگر اس قسم کے جملے خود سے توحید و اسلام کی دلیل نہیں ہو سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگ جب مسلمانوں کے معبود کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں



تو لفظ "اللہ" کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ خداوند عالم کی تعریف و توصیف لفظ "اللہ" سے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

خدا کی رحمت عام اور رحمت خاص

مفسرین کے ایک طبقے میں مشہور ہے کہ صفت "رحمان" رحمت عام کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو دوست و دشمن، مومن و کافر، نیک و بدغرض سب کے لئے ہے۔ کیونکہ اس کی بے حساب رحمت کی بارش سب کو پہنچتی ہے، اور اس کا خوانِ نعمت ہر کہیں بچھا ہوا ہے۔ اس کے بندے زندگی کی گوناگوں رعنائیوں سے بہرہ ور ہیں اپنی روزی اس کے دستر خوان سے حاصل کرتے ہیں جس پر بے شمار نعمتیں رکھی ہیں۔ یہ وہی رحمت عامی ہے جس نے عالم ہستی کا احاطہ کر رکھا ہے اور سب کے سب اس دریائے رحمت میں غوطہ زن ہیں۔

رحیم خداوند عالم کی رحمتِ خاص کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو اس کے مطیع، صالح اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ انہوں نے ایمان اور عمل صالح کی بنا پر یہ شائستگی حاصل کر لی ہے کہ وہ اس رحمت و احسانِ خصوصی سے بہرہ مند ہوں جو گنہ گاروں اور غارت گروں کے حصے میں نہیں ہے۔

ایک چیز جو ممکن ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو یہ ہے کہ لفظ "رحمان" قرآن میں ہر جگہ مطلق آیا ہے جو عمومیت کی نشانی ہے جب کہ رحیم کبھی مقید ذکر ہوا ہے مثلاً "وکان بالمومنین رحیما" (خدا مومنین کے لئے رحیم ہے) (احزاب ۴۳) اور کبھی مطلق ہے جیسے کہ سورہ حمد میں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا:

واللہ الہ کل شیئ الرحمان بجمیع خلقه الرحیم بالمومنین خاصة[1]

خدا ہر چیز کا معبود ہے۔ وہ تمام مخلوقات کے لئے رحمان اور مومنین پر خصوصیت کے ساتھ رحیم ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رحمان صیغہ مبالغہ ہے جو اس کی رحمت کی عمومیت کے لئے خود ایک مستقل دلیل ہے اور رحیم صفت مشبہ ہے جو ثبات و دوام کی علامت ہے اور یہ چیز مومنین کے لئے ہی خاص ہو سکتی ہے۔

ایک اور شاہد یہ ہے کہ رحمان خدا کے مخصوص ناموں میں سے ہے اور اس کے علاوہ کسی کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جاتا جب کہ رحیم ایسی صفت ہے جو خدا اور بندوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جیسے نبی اکرمؐ کے لئے ارشاد الٰہی ہے:

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

تمہاری تکلیف و مشقت نبی پر گراں ہے، تمہاری ہدایت اسے بہت پسندیدہ ہے اور وہ مومنین کے

---

[1] المیزان بسند کافی، توحید صدوق اور معانی الاخبار



لئے مہربان اور رحیم ہے۔ (توبہ ۱۲۸)

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

الرحمٰن اسم خاص بصفة عامة والرحيم اسم عام بصفة خاصة

رحمٰن اسم خاص ہے لیکن صفت عام ہے اور رحیم اسم عام ہے لیکن صفت خاص ہے[1]

یعنی رحمٰن ایسا نام ہے جو خدا کے لئے مخصوص ہے لیکن اس میں اس کی رحمت کا مفہوم سب پر محیط ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ رحیم ایک صفت عام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے البتہ اس میں (صفت خاص کے طور پر استعمال ہونے میں) کوئی مانع نہیں جو فرق بنایا گیا ہے وہ تو اصل لغت کے لحاظ سے ہے لیکن اس میں استثنائی صورت پائی جاتی ہے۔ امام حسینؑ کی ایک بہترین اور مشہور دعا جو دعائے عرفہ کے نام سے معروف ہے کے الفاظ ہیں:

یارحمان الدنیا والاخرة ورحیمهما

اے وہ خدا جو دنیا و آخرت کا رحمان اور دونوں ہی کا رحیم ہے۔

اس بحث کو ہم نبی اکرمؐ کی ایک پُرمعنی اور واضح حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان الله عزوجل مأة رحمة وانه انزل منها واحدة الى الارض فقسمها بين خلقه بها يتعاطفون ويتراحمون واخر تسع وتسعين لنفسه يرحم بها عباده يوم القيامة

خداوند تعالیٰ کی رحمت کے سو باب ہیں جن میں سے اس نے ایک کو زمین پر نازل کیا ہے اور (اس رحمت) کو اپنی مخلوق میں تقسیم کیا ہے۔ لوگوں کے درمیان جو عطوفت، مہربانی اور محبت ہے وہ اسی کا پرتو ہے لیکن ننانوے حصے رحمت اس نے اپنے لئے مخصوص رکھی ہے اور قیامت کے دن اپنے بندوں کو اس سے نوازے گا[2]

خدا کی دیگر صفات بسم اللہ میں کیوں مذکور نہیں؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی تمام سورتیں (سوائے سورۂ برات کے جس کی وجہ بیان ہو چکی ہے) بسم اللہ سے شروع ہوتی ہیں اور بسم اللہ میں مخصوص نام 'اللہ' کے بعد صرف صفت رحمانیت و رحیمیت کا ذکر ہے اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر باقی صفات کا ذکر کیوں نہیں۔

اگر ہم ایک نکتے کی طرف توجہ کریں تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر کام کی ابتدا میں ضروری ہے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱ صفحہ ۲۱

[2] مجمع البیان، جلد ۱



کہ ایسی صفت سے مدد لی جائے جس کے آثار تمام جہان پر سایہ فگن ہوں، جو تمام موجودات کا احاطہ کئے ہو اور عالم بحران میں مصیبت زدوں کو نجات بخشنے والی ہو مناسب ہے کہ اس حقیقت کو قرآن کی زبان سے سنا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

میری رحمت تمام چیزوں پر محیط ہے۔ (اعراف ۱۵۶)

ایک اور جگہ ہے حاملان عرش کی ایک دعا کو خداوند کریم نے یوں بیان فرمایا ہے:

ربنا وسعت کل شیٔ رحمۃ

پروردگار! تونے اپنا دامن رحمت ہر چیز تک پھیلا رکھا ہے۔ (المومن ۷)

ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام نہایت سخت اور طاقت فرسا حوادث اور خطرناک دشمنوں کے چنگل سے نجات کے لئے رحمتِ خدا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں قوم موسیٰ فرعونیوں کے ظلم سے نجات کے لئے پکارتی ہے:

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

خدایا ہمیں (ظلم سے) نجات دلا اور اپنی رحمت (کا سایہ) عطا فرما۔ (یونس ۸۶)

حضرت ہودؑ اور ان کے پیروکاروں کے سلسلے میں ارشاد ہے:

فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا

ہودؑ اور ان کے ہمراہیوں کو ہم نے اپنی رحمت کے وسیلے سے نجات دی۔ (اعراف ۷۲)

اصول یہ ہے کہ جب ہم خدا سے کوئی حاجت طلب کریں تو مناسب ہے کہ اسے ایسی صفات سے یاد کریں جو اس حاجت سے میل اور ربط رکھتی ہوں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ مائدہ آسمانی (مخصوص غذا) طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

بار الٰہا! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما اور ہمیں روزی عطا فرما اور تو بہترین روزی رساں ہے۔ (مائدہ ۱۱۴)

خدا کے عظیم پیغمبر حضرت نوحؑ بھی ہمیں یہی درس دیتے ہیں۔ وہ جب ایک مناسب جگہ کشتی سے اترنا چاہتے ہیں تو یوں دعا کرتے ہیں:

رَبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبَارَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ

پروردگارا! ہمیں منزل مبارک پر اتار کہ تو بہترین اتارنے والا ہے۔ (مومنون ۲۹)

حضرت زکریاؑ خدا سے ایسے فرزند کے لئے دعا کرتے ہوئے جو ان کا جانشین و وارث ہو اُس کی خیر الوارثین سے توصیف کرتے ہیں:

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

خداوندا! مجھے تنہا نہ چھوڑ تو تو بہترین وارث ہے۔ (انبیاء ۸۹)



کسی کام کو شروع کرتے وقت جب خدا کے نام سے شروع کریں تو خدا کی وسیع رحمت کے دامن سے وابستگی ضروری ہے ایسی رحمت جو عام بھی ہو اور خاص بھی۔ کاموں کی پیش رفت اور مشکلات میں کامیابی کے لئے کیا ان صفات سے بہتر کوئی اور صفت ہے؟ قابل توجہ امر یہ ہے کہ وہ توانائی جو قوت جاذبہ کی طرح عمومیت کی حامل ہے جو دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی ہے وہ یہی صفتِ رحمت ہے لہٰذا مخلوق کا اپنے خالق سے رشتہ استوار کرنے کے لئے بھی اسی صفتِ رحمت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ سچے مومن اپنے کاموں کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تمام جگہوں سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنے دل کو صرف خدا سے وابستہ کر لیتے ہیں اور اسی سے مدد و نصرت طلب کرتے ہیں، وہ خدا جس کی رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے اور کوئی موجود ایسا نہیں جو اس سے بہرہ ور نہ ہو۔

بسم اللہ سے واضح طور پر درس بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کے ہر کام کی بنیاد رحمت پر ہے اور بدلہ یا سزا تو استثنائی صورت ہے۔ جب تک قطعی عوامل پیدا نہ ہوں سزا متحقق نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم دعا میں پڑھتے ہیں:

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ خدا کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے[1]

انسان کو چاہیئے کہ وہ زندگی کے پروگرام پر یوں عمل پیرا ہو کہ ہر کام کی بنیاد رحمت و محبت کو قرار دے اور سختی و درشتی کو فقط بوقت ضرورت اختیار کرے۔ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۱۱۳ کی ابتداء رحمت سے ہوتی ہے اور فقط ایک سورہ توبہ ہے جس کا آغاز بسم اللہ کی بجائے اعلانِ جنگ اور سختی سے ہوتا ہے۔

۲- الحمد للہ رب العالمین

حمد و ثنا اس خدا کے لئے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک ہے۔

تفسیر

سارا جہان اس کی رحمت میں ڈوبا ہوا ہے۔

بسم اللہ جو سورت کی ابتداء ہے اس کے بعد بندوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عالم وجود کے عظیم مبداء اور اس کی غیر متناہی نعمتوں کو یاد کریں۔ وہ بے شمار نعمتیں جنہوں نے ہمارے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔ پروردگار عالم کی معرفت کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ بلکہ اس راستے کا سبب ہی یہی ہے کیونکہ کسی انسان کو جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ فوراً چاہتا ہے کہ اس نعمت کے بخشنے والے کو پہچانے اور فرمانِ فطرت کے مطابق اس کی سپاس گزاری کے لئے کھڑا ہو اور اس کے شکریے کا حق ادا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء علم کلام (عقاید) اس علم کی پہلی بحث میں جب گفتگو معرفت خدا کی علت و سبب کے

---

[1] دعائے جوشن کبیر



متعلق ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ فطری وعقلی حکم کے مطابق معرفت خدا اس لئے واجب ہے چونکہ محسن کے احسان کا شکریہ واجب ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پروردگار عالم کی معرفت کی رہنمائی اس کی نعمتوں سے حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ (مبدا) خدا کو پہچاننے کا بہترین اور جامع ترین راستہ اسرار آفرینش وخلقت کا مطالعہ کرنا ہے ان میں خاص طور پر ان نعمتوں کا وجود ہے جو نوع انسانی کی زندگی کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہیں۔ ان دو وجوہ کی بنا پر سورہ فاتحہ کتاب 'الحمد للہ رب العالمین' سے شروع ہوتی ہے۔ اس جملے کی گہرائی اور عظمت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ حمد، مدح اور شکر کے درمیان فرق اور اس کے نتائج کی طرف توجہ کی جائے۔

حمد: نیک اختیاری کام یا نیک صفت کی تعریف کو عربی زبان میں حمد کہتے ہیں یعنی جب کوئی سوچ سمجھ کر کوئی اچھا کام انجام دے یا کسی اچھی صفت کو انتخاب کرے جو نیک اختیاری اعمال کا سرچشمہ ہو تو اس پر کی گئی تعریف و توصیف کو حمدُ ستائش کہتے ہیں۔

مدح: مدح کا معنی ہے ہر قسم کی تعریف کرنا چاہے وہ کسی اختیاری کام کے مقابلے میں ہو یا غیر اختیاری کام کے۔ مثلاً اگر ہم کسی قیمتی موتی کی تعریف کریں تو عرب اسے مدح کہیں گے۔

دوسرے لفظوں میں مدح کا مفہوم عام ہے جب کہ حمد کا مفہوم خاص ہے۔

شکر: شکر کا مفہوم حمد اور مدح دونوں سے زیادہ محدود ہے۔ شکر فقط انعام واحسان کے مقابلے میں تعریف کو کہتے ہیں انعام واحسان بھی وہ جو کسی دوسرے سے اس کی رضا ورغبت سے ہم تک پہنچے[1]

اب اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ کریں کہ اصطلاحی مفہوم میں 'الحمد' کا الف اور لام جنس ہے اور یہاں عمومیت کا معنی دیتا ہے تو نتیجہ نکلے گا کہ ہر قسم کی حمد وثنا مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا مالک و پروردگار ہے یہاں تک کہ جو انسان بھی خیر وبرکت کا سرچشمہ ہے وہ پیغمبر اور خدائی رہنما نور ہدایت سے دلوں کو منور کرتا ہے اور درس دیتا ہے، جو سخی بھی سخاوت کرتا ہے اور جو کوئی طبیب جان لیوا زخم پر مرہم پٹی لگاتا ہے ان کی تعریف کا مبدا بھی خدا کی تعریف ہے اور ان کی ثنا دراصل اسی کی ثنا ہے۔ بلکہ اگر خورشید نور افشانی کرتا ہے، بادل بارش برساتا ہے اور زمین اپنی برکتیں ہمیں دیتی ہے تو یہ سب کچھ بھی اس کی جانب سے ہے لہٰذا تمام تعریفوں کی بازگشت اسی ذاتِ بابرکات کی طرف ہے دوسرے لفظوں میں 'الحمد للہ رب العالمین' توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال کی طرف اشارہ ہے (اس بات پر خصوصی غور کیجئے گا)۔

یہاں اللہ کی توصیف 'رب العالمین' سے کی گئی ہے اصولی طور پر یہ مدعیٰ کے ساتھ دلیل پیش کی گئی ہے۔ گویا کوئی سوال کر رہا ہو کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے کیوں مخصوس ہیں تو جواب دیا جا رہا ہے کہ چونکہ وہ رب العالمین ہے یعنی تمام

---

[1] البتہ ایک جہت سے شکر میں خصوصیت بھی ہے کیونکہ شکریہ زبان وعمل دونوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ حمد ومدح عموماً فقط زبان سے ہوتی ہے۔



جہانوں میں رہنے والوں کا پروردگار ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ

یعنی۔ خداوہ ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کو بہترین صورت میں انجام دیا۔ (سجدہ۔ ۷)

نیز فرمایا:

وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا

زمین میں چلنے والے ہر کسی کی روزی خدا کے ذمے ہے۔ (ہود۔ ۶)

کلمہ حمد سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے یہ تمام عطیات اور نیکیاں اپنے ارادہ و اختیار سے ایجاد کی ہیں اور یہ بات ان لوگوں کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا بھی سورج کی طرح ایک مبداء مجبور فیض بخش ہے یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حمد صرف ابتدائے کار میں ضروری نہیں بلکہ اختتام کار پر بھی لازم ہے جیسا کہ قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے۔

اہل بہشت کے بارے میں ہے۔

دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا سُبۡحٰنَکَ اللّٰہُمَّ وَتَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ

پہلے تو وہ کہیں گے کہ اللہ تو ہر عیب و نقص سے منزہ ہے ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کہیں گے اور ہر بات کے خاتمے پر کہیں گے۔ الحمد للہ رب العلمین۔ (یونس۔ ۱۰)

کلمہ 'رب' کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا مالک یا صاحب جو اس کی تربیت و اصلاح کرتا ہو۔ کلمہ 'ربیبہ' کسی شخص کی بیوی کی اس بیٹی کو کہتے ہیں جو اس کے کسی پہلے شوہر سے ہو۔ لڑکی اگرچہ دوسرے شوہر کے ہاں ہوتی ہے لیکن منہ بولے باپ کی نگرانی میں پرورش پاتی ہے۔

لفظ 'رب' مطلق اور اکیلا تو صرف خدا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اگر غیر خدا کے لئے استعمال ہو تو ضروری ہے کہ اضافت بھی ساتھ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں رب الدار (صاحب خانہ) یا رب السفینہ (کشتی والا) [1]

تفسیر مجمع البیان میں ایک اور معنی بھی ہیں: 'بڑا شخص، جس کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہو۔ بعید نہیں کہ دونوں معانی کی بازگشت ایک ہی اصل کی طرف ہو [2]

---

[1] قاموس اللغات، مفردات راغب، تفسیر مجمع البیان، تفسیر البیان۔

[2] یاد رہے کہ رب کا مادہ 'ر ب ب' ہے نہ کہ 'ر ب و' یعنی یہ مضاعف ہے ناقص نہیں لیکن رب کے اصلی معنی میں پرورش اور تربیت ہے اسی لئے فارسی میں عموماً اس کا ترجمہ پروردگار کرتے ہیں۔



لفظ "عالمین" عالم کی جمع ہے اور عالم کے معنی ہیں مختلف موجودات کا وہ مجموعہ جو مشترک صفات کا حامل ہو یا جن کا زمان ومکان مشترک ہو، مثلاً ہم کہتے ہیں عالم انسان، عالم حیوان یا عالم گیاہ یا پھر ہم کہتے ہیں عالم مشرق، عالم مغرب، عالم امروز یا عالم دیروز۔ لہٰذا عالم اکیلا جمعیت کا معنی رکھتا ہے اور جب عالمین کی شکل میں جمع کا صیغہ ہو تو پھر اس سے اس جہان کے تمام مجموعوں کی طرف اشارہ ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ "ی"، "ن" والی جمع عموماً ذوی العقول کے لئے آتی ہے جب کہ اس جہان کے سب عالم تو صاحبِ عقل نہیں ہیں اسی لئے بعض مفسرین یہاں لفظ عالمین سے صاحبانِ عقل کے گروہوں اور مجموعوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً فرشتے، انسان اور جن۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جمع تغلیبی ہو (جس کا مقصد مختلف صفات کے حامل مجموعے کو بلند تر صنف کی صفت سے متصف کیا جاتا ہے)۔

صاحب تفسیر المنار کہتے ہیں ہمارے جد امام صادق (ان پر اللہ کا رضوان ہو) سے منقول ہے کہ عالمین سے مراد صرف انسان ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بھی عالمین اسی معنی کے لئے آیا ہے جیسا کہ لیکون للعالمین نذیراً۔ یعنی۔ خداوند عالم نے قرآن اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ عالمین کو ڈرائے۔ (فرقان - ۱)[1]

لیکن اگر عالمین کے موارد استعمال قرآن میں دیکھے جائیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اگرچہ بہت سے مقامات پر لفظ عالمین انسانوں کے معنی میں آیا ہے تاہم بعض موارد میں اس سے وسیع تر مفہوم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اس سے انسانوں کے علاوہ دیگر موجودات بھی مراد ہیں۔ مثلاً:

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تعریف وستائش مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو آسمانوں اور زمین کا مالک و پروردگار ہے۔ جو مالک و پروردگار ہے عالمین کا۔ (الجاثیہ - ۳۶)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۝

فرعون نے کہا عالمین کا پروردگار کون ہے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا پروردگار۔ (شعراء - ۲۳، ۲۴)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں جو شیخ صدوق نے عیون الاخبار میں حضرت علیؑ سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ امام نے الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا:

رب العالمین ھم الجماعات من کل مخلوق من الجمادات والحیوانات

رب العالمین سے مراد تمام مخلوقات کا مجموعہ ہے چاہے وہ بے جان ہوں یا جاندار[1]

یہاں یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ شاید ان روایات میں کوئی تضاد ہے کیونکہ لفظ عالمین کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے

---

[1] تفسیر الثقلین جلد ۱ ص۱۸



لیکن تمام موجوداتِ عالم کا سہرا مہرہ انسان ہے لہٰذا بعض اوقات اس پر انگشت رکھ دی جاتی ہے اور باقی کائنات کو اس کا تابع اور اس کے زیر سایہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اگر امام سجادؑ کی روایت میں اس کی تفسیر انسان کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مجموعہ کائنات کا اصلی ہدف و مقصد انسان ہی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض نے عالم کی دو حصوں میں تقسیم کی ہے عالم کبیر اور عالم صغیر۔ عالم صغیر سے ان کی مراد انسان کا وجود ہے کیونکہ ایک انسان کا وجود مختلف توانائیوں اور قویٰ کا مجموعہ ہے اور اس بڑے عالم پر حاکم ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان تمام کائنات میں ایک نمونہ اور ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے عالم سے یہ جو وسیع مفہوم مراد لیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ لفظ عالمین جملہ الحمد للہ کے بعد آیا ہے۔ اس جملے میں تمام تعریف و ستائش کو خدا کے ساتھ مختص قرار دیا گیا ہے اس کے بعد رب العالمین کو بطور دلیل ذکر کیا گیا ہے گویا ہم کہتے ہیں کہ تمام تعریفیں مخصوص ہیں خدا کے لئے کیونکہ ہر کمال، ہر نعمت اور ہر بخشش جو عالم میں وجود رکھتی ہے اس کا مالک و صاحب اور پروردگار وہی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) تمام ارباب انواع کی نفی: تاریخ ادیان و مذاہب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح توحید سے منحرف لوگ ہمیشہ اس جہان کے لئے ارباب انواع کے قائل تھے۔ اس غلط فکر کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے گمان کے مطابق موجودات کی ہر نوع ایک مستقل رب نوع کی محتاج جو اس نوع کی تربیت و رہبری کرتا ہے گویا وہ خدا کو ان انواع کی تربیت کے لئے کافی نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ وہ عشق، عقل، تجارت اور جنگ جیسے امور کے لئے بھی رب نوعی کے قائل تھے۔ یونانی بارہ بڑے خداؤں کی عبادت کرتے تھے (جن میں سے ہر کوئی رب النوع تھا) یونانیوں کے بقول وہ اُلمپ کی چوٹی پر بزم خدائی سجائے بیٹھے تھے ان میں سے ہر ایک انسان کی ایک صفت کا مظہر تھا۔[1]

ملک آشور کے پایہ تخت کلاہ میں لوگ پانی کے رب نوع، چاند کے رب نوع، سورج کے رب نوع اور زہرہ کے رب نوع کے قائل تھے۔ انہوں نے ہر ایک کیلئے الگ الگ نام رکھا تھا اور ان سب کے اوپر ماردوک کو رب الارباب سمجھتے تھے روم میں بھی بہت سے خدا مروج تھے۔ شرک، تعدد خدا اور ارباب انواع کا بازار شاید وہاں سب سے زیادہ گرم تھا۔

اہل روم تمام خداؤں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے: گھریلو خدا اور حکومتی خدا۔ خدایانِ حکومت سے لوگوں کو زیادہ لگاؤ نہ تھا (کیونکہ وہ ان کی حکومت سے خوش نہ تھے) ان خداؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی کیونکہ ہر خدا کی ایک خاص پوسٹ (POST) تھی اور وہ محدود معاملات میں دخیل ہوتا تھا۔ عالم یہ تھا کہ گھر کے دروازے کا ایک مخصوص خدا تھا بلکہ ڈیوڑھی اور صحن خانہ کا بھی الگ الگ رب النوع تھا۔

---

[1] اعلام القرآن صہ ۲۰۲



ایک مؤرخ کے بقول اس میں تعجب کی بات نہیں کہ رومیوں کے ۳۰ ہزار خدا ہوں۔ جیسا کہ ان کے ایک بزرگ نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کے خداؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ گذرگاہوں اور محافل میں وہ افرادِ قوم سے زیادہ ہیں۔ ان خداؤں میں سے زراعت، باورچی خانہ، غلہ خانہ، گھر، گیس، آگ، میوہ جات، دروازہ، درخت، تاک، جنگل، حریق، شہر روم کے بڑے دروازے اور قومی آتشکدہ کے رب نوع شمار کئے جا سکتے ہیں۔ [1]

خلاصہ یہ کہ گذشتہ زمانے میں انسان قسم قسم کے خرافات سے دست و گریباں تھا جیسا کہ اب بھی اس زمانے کی یادگار بعض خرافات باقی رہ گئے ہیں۔

نزول قرآن کے زمانے میں بھی بہت سے بتوں کی پوجا اور تعظیم کی جاتی تھی اور شاید وہ سب یا ان میں سے بعض پہلے ارباب انواع کے جانشین بھی ہوں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات خود انسان کو بھی عملی طور پر رب قرار دیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے جو احبار (علماء یہود) اور رہبانوں (تارک الدنیا مرد اور عورتیں) کو اپنا رب سمجھتے تھے قرآن کہتا ہے:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر علماء اور راہبوں کو خدا بنا رکھا تھا۔ (توبہ۔ ۳۱)

بہر حال علاوہ اس کے کہ یہ خرافات انسان کو عقلی پستی کی طرف لے گئے تھے۔ تفرقہ پسندی، گروہ بندی اور اختلاف کا سبب بھی تھے۔ پیغمبران خدا بڑی پامردی سے ان کے مقابلے میں کوٹے ہوئے یہاں تک کہ بسم اللہ کے بعد پہلی آیت جو قرآن میں آئی ہے وہ اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے.... الحمد للہ رب العالمین یعنی تمام تعریفیں مخصوص ہیں اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اس طرح قرآن نے تمام ارباب انواع پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور انہیں ان کی اصلی جگہ... وادی عدم میں بھیج دیا اور ان کی جگہ توحید و یگانگی اور ہمبستگی و اتحاد کے پھول کھلائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ روزانہ اپنی شب و روز کی نمازوں میں کم از کم دس مرتبہ یہ جملہ پڑھیں اور اس اللہ کے سایہ رحمت میں پناہ لیں جو ایک اکیلا خدا ہے جو تمام موجودات کا مالک، رب، سرپرست اور پرورش کرنے والا ہے تاکہ کبھی توحید کو فراموش نہ کریں اور شرک کی پُرپیچ راہوں میں سرگرداں نہ ہوں۔

(۲) **خدائی پرورش، خدا شناسی کا راستہ:** کلمہ 'رب' دراصل مالک و صاحب کے معنی میں ہے لیکن ہر مالک و صاحب کے لئے نہیں بلکہ وہ جو تربیت و پرورش بھی اپنے ذمہ لے اسی لئے فارسی میں اس کا ترجمہ 'پروردگار' کیا جاتا ہے۔

زندہ موجودات کی سیر تکامل اور بے جان موجودات کا تحول و تغیر نیز موجودات کی پرورش کے لئے حالات کی سازگاری واہتمام جو ان میں نہاں ہے اس پر غور و فکر کرنا خدا شناسی کے راستوں میں سے ایک بہترین راستہ ہے۔

ہمارے اعضائے بدن میں ایک ہم آہنگی ہے جو زیادہ تر ہماری آگاہی کے بغیر قائم ہے یہ بھی ہماری بات پر ایک

---

[1] تاریخ آلبر مالہ، ج ۱، فصل ۴، تاریخ روم



زندہ دلیل ہے۔ ہماری زندگی میں جب کوئی اہم حادثہ پیش آتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ ہم پوری توانائی کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تو ایک مختصر سے لمحے میں ہمارے تمام اعضاء و ارکانِ بدن کو ہم آہنگی کا حکم ملتا ہے تو فوراً دل دھڑکنے لگ جاتا ہے، سانس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، بدن کے تمام قویٰ مجتمع ہو جاتے ہیں، غذا اور آکسیجن خون کے راستے فراوانی سے تمام تک پہنچ جاتی ہے، اعصاب آمادہ کار، عضلات اور پٹھے زیادہ حرکت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، انسان میں قوت تحمل بڑھ جاتی ہے۔ درد کا احساس کم ہو جاتا ہے، نیند آنکھوں سے اڑ جاتی ہے اور اعضاء میں سے تکان اور بھوک کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

کون ہے جو یہ عجیب و غریب ہم آہنگی اس حساس موقع پر اس تیزی کے ساتھ وجودِ انسانی کے تمام ذرات میں پیدا کر دیتا ہے؟ کیا یہ پرورش خدائے عالم و قادر کے سوا ممکن ہے۔ اس پرورش و تربیت کے سلسلے میں بہت سی قرآنی آیات ہیں جو انشاء اللہ اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی اور ان میں سے ہر ایک معرفت خدا کی واضح دلیل ہے۔

۳۔ الرحمٰن الرحیم

وہ خدا جو مہربان اور بخشنے والا ہے (اس کی عام و خاص رحمت نے سب کو گھیر رکھا ہے)۔

تفسیر

رحمان و رحیم کے معنی و مفہوم کی وسعت اور ان کا فرق ہم اللہ کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اب تکرار کی ضرورت نہیں۔

جس نکتے کا یہاں اضافہ ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں صفات جو اہم ترین اوصافِ خداوندی ہیں ہر روز کی نماز میں کم از کم ۳۰ مرتبہ ذکر ہوتی ہیں (دو مرتبہ سورہ حمد میں اور ایک مرتبہ بعد والی سورت میں) اس طرح ۶۰ مرتبہ ہم خدا کی توصیف صفتِ رحمت کے ساتھ کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ تمام انسانوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی میں ہر چیز سے زیادہ اس اخلاق خداوندی کے ساتھ متصف کریں۔ علاوہ ازیں واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ بے رحم مالک اپنے غلاموں سے جو سلوک روا رکھتے ہیں ہماری نگاہ میں جچنے لگے۔

غلاموں کی تاریخ میں ہے کہ ان کے مالک ان سے عجیب قساوت و بے رحمی سے پیش آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غلام ان کی خدمات کی انجام دہی میں معمولی سی کوتاہی کرتا تو اسے سخت سزا سے دوچار ہونا پڑتا۔ اسے کوڑے مارے جاتے، بیڑیوں میں جکڑا جاتا، چکی سے باندھا جاتا، کان کنی پر لگایا جاتا، زیرِ زمین اور تاریک و ہولناک قید خانوں میں رکھا جاتا اور اس کا جرم زیادہ ہوتا تو سولی پر لٹکا دیا جاتا۔[1]

---

[1] تاریخ آلبرماله تاریخ رم جلد ۱ ص ۱۵



ایک اور جگہ لکھا ہے کہ محکوم غلاموں کو درندوں کے پنجروں میں پھینک دیا جاتا اگر وہ جان بچا لیتے تو دوسرا درندہ پنجرے میں داخل کر دیا جاتا۔

یہ تو تھا نمونہ، مالکوں کے اپنے غلاموں سے سلوک کا لیکن خداوندِ جہاں بار بار قرآن میں انسانوں کو یہ فکر دیتا ہے کہ اگر میرے بندوں نے میرے قانون کو خلاف عمل کیا ہو اور وہ پشیمان ہو جائیں تو میں انہیں بخش دوں گا، انہیں معاف کر دوں گا کہ میں رحیم اور مہربان ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ

کہیے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے (قانونِ الٰہی سے سرکشی کر کے) خود اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ خدا تمام گناہوں سے درگذر فرمائے گا (یعنی توبہ کرو رحمت خدا کے بے پایاں دریا سے بہرہ مند ہو جاؤ)۔ (زمر - ۵۳)

لہٰذا رب العالمین کے بعد الرحمن الرحیم کو لانا اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم قدرت کے باوجود جو کہ ہماری عین ذات ہے، اپنے بندوں پر مہربانی اور لطف و کرم کرتے ہیں۔ یہ بندہ نوازی اور لطف بندے کو خدا کا ایسا شیفتہ و فریفتہ بنا دیتا ہے کہ وہ انتہائی شغف سے کہتا ہے "الرحمن الرحیم"۔

یہاں سے انسان اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے اپنے بندوں سے اور مالکوں کے اپنے ماتحتوں سے سلوک میں کس قدر فرق ہے۔ خصوصاً غلامی کے بدقسمت دور میں۔

۴۔ مالك يوم الدين

وہ خدا جو روزِ جزا کا مالک ہے۔

تفسیر

قیامت پر ایمان دوسری اصل ہے۔

یہاں اسلام کی دوسری اہم اصل یعنی قیامت اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے۔ وہ خدا جو جزا کے دن کا مالک ہے (مالك يوم الدين) اس طرح محور اور مبداء و معاد جو ہر قسم کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی بنیاد ہے، وجودِ انسانی میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہاں قیامت خدا کی ملکیت سے تعبیر کی گئی ہے اور یہ بات اُس دن کے لئے خدا کے انتہائی تسلط اور اشیاء و اشخاص پر اس کے نفوذ کو مشخص کرتی ہے۔ وہ دن کہ جب تمام انسان اس بڑے دربار میں حساب کے لئے حاضر ہوں گے۔ لوگ اپنے مالک حقیقی کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اپنی تمام کہی ہوئی باتیں، کیے ہوئے کام یہاں تک کہ سوچے ہوئے افکار



کو اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ حتیٰ کہ سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی بات نابود نہ ہوگی اور فراموش نہ کی گئی ہوگی۔ اب وہ انسان حاضر ہے جسے اپنے تمام اعمال وافعال کی جواب دہی کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا۔ نوبت یہ ہوگی کہ جن امور کو وہ خود بجا نہیں لایا بلکہ کسی طریقہ یا پروگرام کا بانی تھا اس میں بھی اسے اپنے حصے کی جواب دہی کا سامنا ہوگا۔

اس میں شک و شبہ نہیں کہ خداوند عالم کی یہ مالکیت اس طرح سے اعتباری نہیں جس طرح اس دنیا میں چیزیں ہماری ملک ہیں کیونکہ ہماری مالکیت تو ایک قرارداد کی بنا پر ہے یا اعزازی واسنادی ہے۔ دوسرے اسناد و اعزاز کے ساتھ یہ مالکیت ختم بھی ہو سکتی ہے لیکن جہانِ ہستی کے لئے خدا کی مالکیت حقیقی ہے اور موجودات کا خدا کے ساتھ ایک ربط ہے کہ اگر ایک لحظ کیلئے منقطع ہو جائے تو نابود ہو جائیں جیسے بجلی کے قمقموں کا رابطہ اپنے بجلی گھر سے ٹوٹ جائے تو اسی لمحہ روشنی ختم ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی مالکیت خالقیت اور ربوبیت کا نتیجہ ہے وہ ذات جس نے موجودات کو خلق کیا، اپنی رحمت کے زیر نظر ان کی پرورش کی اور لحہ بہ لحہ انہیں فیض وجود ہستی بخشا وہی موجودات کا حقیقی مالک ہے۔

ایک حقیر سا نمونہ مالکیت حقیقی کا ہم اپنی ذات میں اپنے اعضاء بدن کے بارے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہم آنکھ، کان، دل اور اپنے اعصاب کے مالک ہیں۔ اس سے مراد اعتباری مالکیت نہیں بلکہ ایک قسم کی حقیقی مالکیت ہے جس کا سرچشمہ ربط، تعلق اور احاطہ ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا اس جہان کا مالک نہیں؟ اگر ہے تو پھر کیوں ہم اسے مالک روز جزا کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف متوجہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی مالکیت اگرچہ دونوں جہانوں پر محیط ہے لیکن اس مالکیت کا ظہور قیامت کے دن بہت زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اس دن تمام مادی رشتے اور اعتباری ملکیتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس دن کسی شخص کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ شفاعت بھی فرمانِ خدا سے ہوگی۔

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝

وہ دن کہ جب کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ ہوگا کہ اس کے ذریعے کسی کی مدد کر سکے اور تمام معاملات خدا کے ہاتھ میں ہوں گے۔ (الانفطار۔ ۱۹)

دوسرے الفاظ میں اس دنیا میں انسان دوسرے کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی زبان سے، کبھی مال سے، کبھی افرادی قوت سے اور کبھی مختلف کاموں سے دوسرے کو اپنی حمایت و مدد فراہم کرتا ہے لیکن اس دن ان امور میں سے کوئی چیز بھی نہ ہوگی اسی لئے تو جب لوگوں سے سوال ہوگا:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ؟

(آج کس کی حکومت ہے)

تو جواب آئے گا:

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

(صرف خدائے یگانہ، کامیاب و کامران کی حکمرانی ہے) (المومن۔ ۱۶)



قیامت کے دن پر اور اس بڑی عدالت گاہ پر ایمان کہ جس میں تمام چیزوں کا بڑی باریک بینی سے حساب لیا جائے گا انسان کو غلط اور ناشائستہ اعمال سے روکنے کے لئے بہت موثر ہے۔ نماز کے قبیح اور برے اعمال سے روکنے کی ایک وجہ یہی ہے کہ ایک تو یہ انسان کو مبداء کی یاد دلاتی ہے جو اس کے تمام کاموں سے واقف ہے اور دوسرے عدل خدا کی بڑی عدالت کو بھی یاد دلاتی ہے۔

روز قیامت خدا کی مالکیت پر ایمان کا فائدہ یہ بھی ہے کہ قیامت کا اعتقاد رکھنے والا مشرکین اور منکرین قیامت کے مقابل قرار پاتا ہے کیونکہ آیات قرآنی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان ایک عمومی عقیدہ تھا یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے سوال ہوتا تھا کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا کون ہے تو کہتے تھے "خدا"۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو ضرور کہیں گے "اللہ"۔
(لقمان - ۲۵)

جب کہ وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ سے قیامت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب انکار کرتے اور اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ

کافر کہتے ہیں کیا تمہیں ایسے شخص سے متعارف کرائیں جو یہ کہتا ہے کہ جب تم خاک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تمہارے ان منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے پھر سے زندہ کیا جائے گا۔ جانے وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا دیوانہ ہے۔ (سبا - ۷،۸)

ایک حدیث میں امام سجادؑ کے بارے میں ہے کہ آپؑ جب آیت مالك يوم الدين تک پہنچتے تو اس کا اس طرح سے تکرار کرتے کہ یوں لگتا جیسے آپ کی روح بدن سے پرواز کر جائے گی۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

"كان على ابن الحسين اذا قرء مالك يوم الدين يكررها حتى يكاد ان يموت" [1]

باقی رہا لفظ یوم الدین ... یہ تعبیر قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوئی اس سے مراد قیامت ہے جیسا کہ قرآن میں سورہ انفطار کی آیات ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ میں صراحت کے ساتھ اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے (یہ تعبیر قرآن مجید میں دس سے زیادہ مرتبہ اسی معنی میں استعمال ہوئی ہے)۔

اب رہی یہ گفتگو کہ اس دن کو یوم الدین کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن جزا کا دن ہے اور دین لغت

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۱۹



میں جزا کے معنی میں ہے اور قیامت کا واضح ترین پروگرام جزا و سزا اور عوض و ثواب ہے۔ اس دن پردے ہٹ جائیں گے اور تمام اعمال کا تمام تر باریک تفصیلات کے ساتھ محاسبہ ہوگا اور ہر شخص اپنے اچھے برے اعمال کی جزا و سزا پالے گا۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"یوم الدین سے مراد روز حساب ہے" ؎

اس روایت کے مطابق تو یہاں دین حساب کے ہم معنی ہے۔ شاید یہ تعبیر ذکر علت اور ارادہ معلول کے قبیل میں سے ہو کیونکہ ہمیشہ حساب جزا کی تمہید اور مقدمہ ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ بھی ہے کہ قیامت کے دن کو یوم الدین اس لئے کہا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص اپنے دین و آئین کے مطابق جزا و سزا پائے گا لیکن پہلا معنی (حساب و جزا) زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۵- ایاك نعبد و ایاك نستعین

پروردگارا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر

یہاں سے ابتدا ہوتی ہے انسان کے دربار خدا میں پیش ہوکر مناجات اور تقاضوں کو بیان کرنے کی۔ حقیقت میں گفتگو کا لب و لہجہ یہاں سے بدل جاتا ہے کیونکہ گذشتہ آیات میں خدا کی حمد و ثنا اور اس کی ذات پاک پر ایمان کا اظہار نیز قیامت کا اعتراف تھا۔ لیکن یہاں سے گویا بندہ اس محکم عقیدہ اور معرفتِ پروردگاری کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کے حضور اور اس کی ذات پاک کے روبرو دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسے مخاطب کرکے پہلے اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس سے طلب امداد کے لئے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں (ایاك نعبد و ایاك نستعین)۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب گذشتہ آیات کے مفاہیم انسان کی روح میں سرایت کر جاتے ہیں، اس کے وجود کی گہرائیاں اس اللہ کے نور سے روشن ہوجاتی ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور اس کی عمومی و خصوصی رحمت اور روزِ جزا کی مالکیت کو جان لیتا ہے تو اب عقیدے کے لحاظ سے فرد کامل نظر آنے لگتا ہے۔ توحید کے اس گہرے عقیدے کا پہلا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف انسان خدا کا خالص بندہ بن جاتا ہے، بتوں، جباروں اور شہوات و خواہشات کی عبادت کے دائرے سے نکل آتا ہے اور دوسری طرف طلب امداد کے لئے اس کی ذات پاک کی طرف ہاتھ پھیلانے کے قابل ہوجاتا ہے۔

؎ مجمع البیان، ذیل آیہ مذکورہ



واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ آیات توحید ذات وصفات بیان کر رہی ہیں اور یہاں توحید عبادت اور توحید افعال سے متعلق گفتگو ہے۔

توحید عبادت یہ ہے کہ کسی شخص یا چیز کو ذات خدا کے علاوہ پرستش کے لائق نہ سمجھا جائے، صرف اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے، صرف اس کے قوانین واحکام کو قبول کیا جائے اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی کی کسی قسم کی عبادت و بندگی کرنے اور کسی اور کے سامنے سرافگندہ ہونے سے پرہیز کیا جائے۔

توحید افعال یہ ہے کہ سارے جہاں میں مؤثر حقیقی اسی کو سمجھا جائے (لامؤثر فی الوجود الا اللہ یعنی اللہ کے علاوہ کوئی مؤثر وجود نہیں رکھتا)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عالم اسباب کا انکار کر دیا جائے اور سبب کی تلاش نہ کی جائے بلکہ ہمیں یہ اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ ہر سبب کی یہ تاثیر حکم خدا کے تابع ہے وہی ہے جس نے آگ کو جلانے، سورج کو روشنی دینے اور پانی کو حیات بخشنے کی تاثیر دی ہے۔

اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان صرف اللہ پر بھروسہ کرے گا اور قدرت وعظمت کو اسی سے مربوط سمجھے گا اور اس کا غیر اُس کی نظر میں فانی، زوال پذیر اور فاقد قدرت ہوگا۔

صرف خدا کی ذات قابل اعتماد وستائش ہے اور یہی لیاقت رکھتی ہے کہ انسان اسے تمام چیزوں میں اپنا سہارا قرار دے یہ فکر اور اعتماد انسان کا ناطہ تمام موجودات سے توڑ کر صرف خدا سے جوڑ دے گا۔ یہاں تک کہ اب وہ عالم اسباب کی تلاش بھی حکم خدا کے تحت کرتا ہے یعنی اسباب میں بھی وہ قدرت خدا کا مشاہدہ کرتا ہے کیونکہ خدا ہی مسبب الاسباب ہے۔

چند اہم نکات

(۱) آیت میں حصر کا مفہوم : عربی ادبیات کے قواعد کے مطابق جب مفعول، فاعل پر مقدم ہو جائے تو اس سے حصر کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایاك کا نعبد اور نستعین پر مقدم ہونا دلیل حصر ہے۔ اور اس کا نتیجہ وہی توحید عبادت اور توحید افعال ہے جسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بندگی اور عبودیت میں بھی ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں اور اس کے لئے بھی ہم اسی سے طلب اعانت کرتے ہیں تاکہ کہیں انحراف، خودپسندی، ریاکاری اور ایسے دیگر امور میں گرفتار نہ ہو جائیں کیونکہ یہ چیزیں عبودیت کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم پہلے جملے میں کہتے ہیں کہ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں اس میں کچھ نہ کچھ استقلال کی بُو آتی ہے لہٰذا فوراً ایاك نستعین سے ہم اس کی اصلاح کر لیتے ہیں اس طرح بین الامرین (نہ جبر نہ تفویض) کو اپنی عبادت میں جمع کر لیتے۔ یہ حالت ہمارے تمام کاموں کے لئے ایک نمونہ ہے۔

(۲) نعبد و نستعین اور اسی طرح بعد کی آیات میں جمع کے صیغے آئے ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عبادت اور خصوصاً نماز کی اساس جمع وجماعت پر رکھی گئی ہے یہاں تک کہ جب بندہ خدا کے سامنے راز ونیاز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو جماعت و اجتماع کے ساتھ شمار کرے چہ جائے کہ اس کی زندگی کے دیگر کام۔ اس بنا پر ہر قسم کی انفرادیت علیحدگی، گوشہ نشینی اور اس قسم کی چیزیں قرآن اور اسلام کی نظر میں مردود قرار پاتی ہیں۔



نماز میں اذان و اقامت (جو نماز کے لئے اجتماع کی دعوت ہے) سے لے کر حی علی الصلوٰۃ (نماز کی طرف جلدی آؤ) سے گزرتے ہوئے سورہ الحمد تک جو نماز کی ابتداء اور السلام علیکم تک جو نماز کا اختتام ہے، سب اس امر کی دلیل ہے کہ یہ عبادت دراصل اجتماعی پہلو رکھتی ہے یعنی اسے صورتِ جماعت میں انجام پذیر ہونا چاہیئے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نماز فرادیٰ بھی اسلام میں صحیح ہے لیکن عبادت فرادیٰ جنبہ فرعی کی حامل ہے اور ایسی عبادت دوسرے درجے کی عبادت قرار پاتی ہے۔

(۳) طاقتوں کے ٹکراؤ کے وقت استعانتِ خدا کی طلب: انسان اس جہاں میں کئی ایک طاقتوں سے نبرد آزما ہے، چاہے وہ طاقتیں طبیعی و مادی ہوں یا انسان کے اندر کی طاقتیں۔ تباہ و برباد اور منحرف کرنے والی چیزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کو یار و مددگار کی ضرورت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے تئیں پروردگار کے سایہ حمایت کے سپرد کرتا ہے۔ ہر روز انسان بستر خواب سے اٹھتا ہے اور ایاک نعبد و ایاک نستعین کے تکرار سے پروردگار کی عبودیت کا اعتراف کرکے اس کی ذات پاک سے اس بڑے مقابلے میں مدد حاصل کرتا ہے اور شام کے وقت بھی اسی جملے کی تکرار سے سر اپنے بستر پر رکھتا ہے گویا اس کی یاد سے اٹھتا ہے اور اسی کو یاد کرتے ہوئے طلب استعانت کے بعد سوتا ہے۔ ایسا شخص کتنا خوش نصیب ہے۔ یہی شخص ایمان کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ پھر کسی سرکش و طاقتور کے سامنے سر نہیں جھکاتا اور مادیات کی کشش کے مقابلے میں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیتا اور وہ پیغمبرؐ اسلام کی پیروی میں کہتا ہے:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ

یقیناً میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس خدا کے لئے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔ (الانعام - ۱۶۲)

۶- اهدنا الصراط المستقیم

ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔

تفسیر

صراطِ مستقیم پر چلنا

پروردگار کے سامنے اظہار تسلیم، اس کی ذات کی عبودیت، اس سے طلب استعانت کے مرحلے تک پہنچ جانے کے بعد بندے کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ اسے سیدھی راہ، پاکیزگی و نیکی کی راہ، عدل و داد کی راہ اور ایمان و عمل صالح کی راہ کی ہدایت نصیب ہو۔ تاکہ خدا جس نے اُسے تمام نعمتوں سے نوازا ہے ہدایت سے بھی سرفراز فرمائے۔

اگرچہ یہ انسان ان حالات میں مومن ہے اور اپنے خدا کی معرفت رکھتا ہے لیکن یہ امکان ہے کہ کسی لحظے یہ نعمت کچھ عوامل کے باعث اس سے چھن جائے اور یہ صراط مستقیم سے منحرف اور گمراہ ہو جائے لہٰذا چاہیئے کہ شب و روز میں دس مرتبہ اپنے خدا سے خواہش کرے کہ اسے کوئی لغزش و انحراف درپیش نہ ہو۔

یہ صراط مستقیم جو بالفاظ دیگر آئین و دستورِ حق ہے کے کئی مراتب و درجات ہیں تمام افراد ان مدارج کو برابر طے نہیں کرتے انسان جس قدر ان درجات کو طے کرے اس سے بلند تر درجات موجود ہیں۔ پس صاحب ایمان کو چاہیئے کہ وہ خدا سے خواہش و دعا کرے کہ وہ اسے ان درجات کی ہدایت کرے۔

یہاں یہ مشہور سوال سامنے آتا ہے کہ ہم ہمیشہ خدا سے صراط مستقیم کی ہدایت کی درخواست کرتے رہتے ہیں، کیا ہم گمراہ ہیں؟ اور اگر بالفرض یہ بات ہمارے لئے درست ہے تو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہل بیت جو انسانِ کامل کا نمونہ ہیں ان کے لئے کیونکر صحیح ہے ؟؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں:۔

جیسے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ انسان کے لئے راہ ہدایت میں ہر لحظہ لغزش و کجروی کا خوف ہے لہٰذا چاہیئے کہ اپنے آپ کو پروردگار کے اختیار میں دیدے اور اس سے تقاضا کرے کہ وہ اسے سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھے۔ ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وجود ہستی اور دیگر تمام نعمات ہر لحظہ اس مبداء عظیم ہی سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے کہ ہماری اور تمام موجودات کی مثال بجلی کے بلب کی سی ہے اگر ہم دیکھیں کہ بلب کی روشنی مسلسل پھیل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر لحظہ بجلی کے مرکز سے قوت حاصل کر رہی ہے کیونکہ بجلی کے مرکز سے ہر لحظہ نئی روشنی کی تولید جاری ہے اور یہ مربوط تاروں کے ذریعے اسے بلب تک پہنچاتا ہے۔ ہمارا وجود بھی بلب کی روشنی کی طرح جو بظاہر ایک مستقل پھیلے ہوئے وجود کی طرح ہے لیکن حقیقت میں ہمیں مرکز ہستی، آفریدگارِ فیاض سے ہر لحظہ ایک نیا وجود ملتا رہتا ہے۔ چونکہ ہمیں ہر لمحہ ایک تازہ وجود میسر آتا ہے اس لئے ہر لمحہ ہم نئی ہدایت کے محتاج ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ خدا اور ہمارے درمیان رابطے کی معنوی تاروں میں اگر کوئی مانع پیدا ہو جائے مثلاً بے راہ روی، ظلم، ناپاکی وغیرہ تو اس سے منبع ہدایت کے ساتھ ہمارا رابطہ منقطع ہو جائے گا اور یوں ہم صراط مستقیم سے منحرف ہو جائیں گے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں یہ موانع پیش نہ آئیں اور ہم صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں طریق تکامل کو طے کرنا یعنی انسان تدریجاً مراحل نقص پیچھے چھوڑتا جائے اور مراحل بلند تک پہنچتا جائے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ راہ کمال یعنی ایک کمال سے دوسرے کمال تک پہنچنے کا راستہ نامحدود ہے گویا یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

اس بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام بھی خدا سے صراط مستقیم کی ہدایت کا تقاضہ کریں کیونکہ کمال مطلق تو صرف ذاتِ خدا ہے اور باقی سب بلا استثناء سیر تکامل میں ہیں لہٰذا کیا حرج ہے کہ وہ بھی خدا سے بالاتر درجات کی تمنا کریں۔

کیا ہم نبی اکرمؐ پر درود و سلام نہیں بھیجتے؟ اور کیا درود دراصل محمد و آل محمد پر پروردگار عالم سے نئی رحمت کا تقاضا نہیں؟؟

کیا رسول اللہ نہیں فرماتے تھے؟

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ط

خدایا میرے علم (اور ہدایت) کو زیادہ فرما۔

کیا قرآن یہ نہیں کہتا:



وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى

یعنی ... خدا ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔ (مریم - ۷۶)

یہ بھی قرآن میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝

یعنی جو ہدایت یافتہ ہیں خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں تقویٰ عطا کرتا ہے۔ (محمد - ۱۷)

اسی سے نبی اکرمؐ اور آئمہ علیہم السلام پر درود بھیجنے کے متعلق سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی وضاحت کے لئے ذیل کی دو حدیثوں کی طرف توجہ فرمائیں۔

(۱) حضرت امیرالمؤمنین علیؑ جملہ اهدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

یعنی ادم لنا توفیقك الذی اطعناك به فی ماضی ایامنا حتی نطیعك كذلك فی مستقبل اعمارنا۔

خداوندا جو توفیقات تو نے ماضی میں ہمیں عنایت کی ہیں، جن کی برکت سے ہم نے تیری اطاعت کی ہے انہیں اسی طرح برقرار رکھ تاکہ ہم آئندہ بھی تیری اطاعت کرتے رہیں۔[۱]

(۲) حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

یعنی ارشدنا للزوم الطریق المؤدی الی محبتك والمبلغ الی جنتك والمانع من ان نتبع اهوائنا فنعطب او ان ناخذ بآرائنا فنهلك۔

خداوندا ہمیں اس راستہ پر جو تیری محبت اور جنت تک ہے ثابت قدم رکھ یہی راستہ ہلاک کرنے والی خواہشات اور انحرافی وتباہ کرنے والی آراء سے مانع ہے۔[۲]

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

آیات قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صراط مستقیم آئین خدا پرستی، دین حق اور احکام خداوندی کی پابندی کا نام ہے۔ جیسے سورہ انعام کی آیت ۱۶۱ میں ہے:

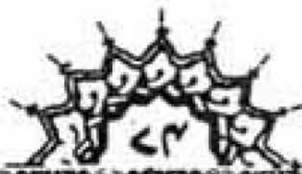
قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

یعنی ... کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے صراط مستقیم کی ہدایت کی ہے جو سیدھا دین ہے وہ کہ

---

[۱] تفسیر صافی (آیہ مذکورہ) بحوالہ معانی الاخبار و تفسیر حسن عسکری

[۲] ایضاً



جو اس ابراہیم کا آئین ہے جس نے کبھی خدا سے شرک نہیں کیا۔

دین ثابت یعنی وہ دین جو اپنی جگہ قائم ہے، ابراہیم کے آئین توحیدی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کا تعارف یہاں پر صراط مستقیم کے عنوان سے ہوا ہے اور یہی بات اس اعتقادی پہلو کو مشخص کرتی ہے۔

سورۂ یٰس آیت ۶۰، ۶۱ میں ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد و پیمان نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا (اس کے احکام پر عمل نہ کرنا) کیونکہ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی صراط مستقیم ہے۔

یہاں دین حق کے عملی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو ہر قسم کے شیطانی فعل اور عملی انحراف کی نفی ہے۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۱ میں قرآن کے مطابق صراط مستقیم تک پہنچنے کا طریقہ خدا سے تعلق اور ربط پیدا کرنا ہے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

جنہوں نے اللہ کے دامن رحمت کو تھامے رکھا انہی نے صراط مستقیم کی ہدایت پائی۔

اس نکتے کی طرف بھی نظر ضروری ہے کہ صراط مستقیم صرف ایک ہی راستہ ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہوسکتا ہے جو نزدیک ترین راستے کو تشکیل دیتا ہے۔

لہٰذا اگر قرآن کہتا ہے کہ صراط مستقیم دراصل اعتقادی و عملی پہلوؤں سے دین و آئین الٰہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دین ہی نزدیک ترین راستہ ہے خدا سے ربط پیدا کرنے کا اور یہی وجہ ہے کہ دین حقیقی و واقعی ہے بھی فقط ایک۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ

دین خدا کے نزدیک اسلام (ہی) ہے۔ (آل عمران - ۱۹)

انشاء اللہ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اسلام ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر وہ آئین توحید شامل ہے جو کسی بھی زمانے میں جاری تھا اور کسی نئے آئین سے منسوخ نہیں ہوا۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ مفسرین نے صراط مستقیم کی جو مختلف تفاسیر بیان کی ہیں ان سب کی برگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

بعض نے اس کے معنی اسلام کئے ہیں بعض نے قرآن، کچھ مفسرین نے اس سے رسول و آئمہ برحق مراد لئے ہیں اور کچھ نے اللہ کا آئین کہ جس کے علاوہ خدا کو کوئی چیز قبول نہیں۔ ان تمام معانی کی برگشت اسی دین و آئین الٰہی کی طرف ہے تمام تر اعتقادی و عملی پہلوؤں کے ساتھ۔

جو روایات مصادر اسلامی میں اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ہر ایک اس مسئلے کے ایک زاویے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سب کی بازگشت ایک ہی اصل کی طرف ہے۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:



الصراط المستقیم صراط الانبیاء وھم الذین انعم اللہ علیھم

صراطِ مستقیم انبیار کا راستہ ہے اور انبیار وہ ہستیاں ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔

امام صادقؑ کا ارشاد اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں یوں ہے:

الطریق معرفۃ الامام

اس سے مراد امام کا راستہ اور اس کی معرفت ہے [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ ہی سے منقول ہے:

واللہ نحن الصراط المستقیم

بخدا ہم صراطِ مستقیم ہیں [2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ نے فرمایا:

صراطِ مستقیم امیرالمومنین علیؑ ہیں [3]

یہ مسلم ہے کہ رسول اکرمؐ، امیرالمومنینؑ اور دیگر آئمہ اہل بیتؑ سب کے سب اسی آئین توحید کی دعوت دیتے رہے ہیں وہ دعوت جس میں اعتقاد بھی ہے اور عمل بھی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ راغب نے کتاب مفردات میں صراط کے معنی میں کہا ہے کہ صراط کے معنی ہیں سیدھا راستہ لہٰذا مستقیم ہونے کا مفہوم خود صراط میں مضمر ہے گویا مستقیم ساتھ بطور صفت ہے جو اس مسئلے پر تاکید کے مفہوم میں ہے۔

۷۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کہ جو گمراہ ہو گئے۔

تفسیر

دو انحرافی خطوط

یہ آیت حقیقت میں صراطِ مستقیم کی واضح تفسیر ہے جسے ہم گذشتہ آیت کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں۔ دعا ہے کہ مجھے ان لوگوں کے راستے کی ہدایت فرما جنہیں قسم قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے (نعمتِ ہدایت و نعمتِ توفیق، مردانِ حق کی رہبری کی نعمت، نعمتِ علم و عمل اور نعمتِ جہاد و شہادت)۔ ان لوگوں کی راہ نہیں جن کے بُرے اعمال اور ٹیڑھے عقائد کے باعث تیرا غضب انہیں

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، صفحہ ۲۰، صفحہ ۲۰

[2] ایضاً

[3] ایضاً



دامن گیر ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کی راہ جو شاہراہ حق کو چھوڑ کر بے راہ روی کے عالم میں ہیں، گمراہ و سرگرداں ہیں صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہم راہ و رسم ہدایت سے پورے طور سے آشنا نہیں لہٰذا خدا ہمیں دستور ہدایت دے رہا ہے کہ ہم انبیاء، صالحین اور دیگر وہ لوگ جو نعمت والطاف الٰہی سے نوازے گئے ہیں ان کے راستے کی خواہش کریں۔ نیز ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے سامنے دو ٹیڑھے خطوط موجود ہیں، خطِ مغضوب علیھم اور خطِ ضالین ان دونوں کی تفسیر ہم بہت جلد ذکر کریں گے۔

چند اہم نکات

(۱) الذین انعمت علیھم کون ہیں: سورۂ نساء آیت ۶۹ میں اس گروہ کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝

جو لوگ خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں خدا انہیں ان لوگوں کے ساتھ قرار دے گا جنہیں نعمات سے نوازا گیا ہے اور وہ ہیں انبیاء، صدیقین، شہدائے راہ حق اور صالح انسان اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں اس آیت میں شاید اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک صحیح و سالم، ترقی یافتہ اور مومن معاشرے کی تشکیل کے لئے پہلے انبیاء اور رہبران حق کو میدان عمل میں آنا چاہیئے ان کے بعد سچے اور راست باز مبلغ ہوں جن کی گفتار اور کردار میں ہم آہنگی ہو تاکہ وہ اس راستے سے انبیاء کے مقاصد کو تمام اطراف میں پھیلا دیں۔ فکری تربیت کے اس پروگرام پر عمل درآمد کے دوران میں بعض گمراہ عناصر راہِ حق میں حائل ہونے کی کوشش کریں گے۔ ان کے مقابل ایک گروہ کو قیام کرنا چاہیئے ان میں سے کچھ لوگ شہید ہوں گے اور اپنے خونِ مقدس سے شجرِ توحید کی آبیاری کریں گے چوتھے مرحلے میں ان کوششوں کے نتیجے میں صالح لوگ وجود میں آئیں گے اور یوں ایک پاک و پاکیزہ، شائستہ اور معنویت و روحانیت سے پُر معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

اس لئے ہم روزانہ صبح و شام سورہ حمد میں پے بہ پے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم بھی ان چار گروہوں کے طریق حق کے راہی قرار پائیں حق کا راستہ انبیاء کا راستہ، صدیقین کا راستہ، شہداء کا راستہ اور صالحین کا راستہ ہے۔

واضح ہے کہ ہر زمانے کو انجام تک پہنچانے کے لئے ہمیں ان میں سے کسی خط کی پیروی میں اپنی ذمہ داری کو انجام دینا ہوگا۔

(۲) مغضوب علیھم اور ضالین کون ہیں: ان دونوں کو آیت میں الگ الگ بیان کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے۔

دونوں میں فرق کے سلسلے میں تین تفسیریں موجود ہیں:

(ا) قرآن مجید میں دونوں الفاظ کے استعمال کے مواقع سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغضوب علیہم کا مرحلہ ضالین سے سخت تر اور



بدتر ہے۔ بالفاظِ دیگر ضالین سے مراد عام گمراہ لوگ ہیں اور مغضوب علیہم سے مراد لجوج (گمراہی پر مصر) یا منافق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک موقعوں پر ایسے لوگوں کے لئے خدا کے غضب اور لعنت کا ذکر ہوا ہے۔

سورۂ نحل آیت ۱۰۶ میں ہے:

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

جنہوں نے کفر کے لئے اپنے سینوں کو کھول رکھا ہے ان پر اللہ کا غضب ہے۔

سورۂ فتح آیت ۶ میں ہے:

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ

منافق مرد اور عورتیں اور مشرک مرد اور عورتیں جو خدا کے بارے میں برے گمان کرتے ہیں خدا ان سب پر عذاب نازل کرے گا۔ ان سب پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے وہ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھتا ہے اور انہی کے لئے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

بہرحال مغضوب علیہم وہ ہیں جو راہ کفر میں لجاجت و عناد اور حق سے دشمنی رکھنے کے علاوہ رہبرانِ الٰہی اور انبیاء مرسلین کو ہر ممکن اذیت و آزار پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

سورہ آل عمران آیت ۱۱۲ میں ہے:

بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ؗ

ان (یہودیوں) پر خدا کا غضب ہوا اور انہیں رسوائی نصیب ہوئی کیونکہ وہ انبیاء الٰہی کو ناحق قتل کرتے تھے اور حدودِ شریعت سے تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے۔

(۲) مفسرین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ضالین سے منحرف عیسائی اور مغضوب علیہم سے منحرف یہودی مراد ہیں یہ نظریہ ان دونوں گروہوں کے دعوت اسلام کے مقابلے میں ردعمل کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ قرآن جس طرح مختلف آیات میں صراحت کے ساتھ یاد دہانی کراتا ہے کہ یہودی دعوت اسلام کے بارے میں مخصوص کینہ و عداوت کا مظاہرہ کرتے تھے اگرچہ ابتدا میں انہی کے علماء لوگوں کو اسلام کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ کئی ایک وجوہ (جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں) کی بناء پر وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہوگئے ان وجوہ میں ایک ان کے مادی مفادات کا خطرے میں پڑجانا بھی تھا۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی پیش رفت روکنے کے لئے ہر ممکن رکاوٹیں کھڑی کرتے (آج بھی صیہونیوں کا مسلمانوں کے بارے میں وہی طریق کار ہے)۔

ان حالات میں انہیں مغضوب علیہم سے تعبیر کرنا درست معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہ تعبیر حقیقت میں ان کے عمل کے باعث تطبیق کی صورت ہے نہ کہ مغضوب علیہم سے صرف یہودی مراد ہیں۔ رہے نصاریٰ تو اسلام کے بارے میں ان کا موقف



اس قدر سخت نہ تھا بلکہ وہ فقط آئین حق کی پہچان میں گمراہ تھے لہٰذا لفظ ضالین سے عیسائی مراد لئے گئے ہیں اور یہ بھی ایک تطبیق ہے۔ احادیث اسلامی میں بارہا مغضوب علیہم سے یہودی اور ضالین سے عیسائی مراد لئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ پہلے ہی بیان کی جاچکی ہے۔[1]

(iii) یہ احتمال بھی ہے کہ ضالین سے وہ گمراہ لوگ مراد ہیں جو دوسروں کو گمراہ کرنے پر مصر نہیں جب کہ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جو خود تو گمراہ ہیں ہی دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنا ہم رنگ بنانے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ اس بات کی دلیل وہ آیات ہیں جو ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو راہِ راست کی ہدایت حاصل کرنے کے لئے کوشاں دوسرے لوگوں کے درمیان میں حائل ہوجاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے:

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں۔ (اعراف - ۴۵)

سورہ شوریٰ آیت ۱۶ کے الفاظ ہیں:

وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝

وہ لوگ جو مومنین کی طرف سے دعوت اسلام قبول ہونے کے بعد نبی اکرمؐ سے جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی دلیل و حجت بے اساس ہے۔ ان پر اللہ کا غضب ہے اور سخت عذاب اُن کا منتظر ہے۔

باوجود اس کے یوں نظر آتا ہے کہ ان تفاسیر میں جامع تر وہی پہلی تفسیر ہے اور وہ ایسی تفسیر ہے جس میں باقی تفسیریں بھی مجتمع ہیں۔ حقیقت میں باقی تفاسیر اس کے مصادیق میں شمار ہوتی ہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم آیت کے وسیع مفہوم کو محدود کردیں۔

والحمد للہ رب العالمین

(تفسیر سورۂ حمد اختتام کو پہنچی)

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱، صہ ۲۴، صہ ۲۳



سورۂ بقرہ کے موضوعات

یہ سورت جو قرآن مجید کی طویل ترین سورتوں میں سے ہے مسلماً تمام کی تمام یک دم نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف وقفوں سے مدینہ میں اسلامی معاشرے کی گوناگوں ضروریات کے مطابق نازل ہوئی۔

اس کے باوجود اسلام کے اصولِ اعتقاد اور بہت سے عملی مسائل کی رو سے (جن میں عبادتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل شامل ہیں) اس کی جامعیت ناقابلِ انکار ہے۔ اس کے موضوعات ایک نظر میں یہ ہیں:

(۱) توحید اور خداشناسی کے متعلق بحثیں خصوصاً وہ جو اسرارِ آفرینش کے موضوع سے متعلق ہیں۔

(۲) قیامت اور موت کے بعد سے متعلق بحثیں بالخصوص حسی مثالیں، جیسے حضرت ابراہیم کا واقعہ، پرندوں کا مرنے کے بعد زندہ ہونا اور حضرت عزیر کا واقعہ۔

(۳) قرآن کے معجزہ ہونے کی بحثیں اور اس آسمانی کتاب کی اہمیت۔

(۴) یہودیوں اور منافقین کے بارے میں مفصل اور طویل بحثیں۔ اسلام اور قرآن کے بارے میں ان کے مخصوص اعتراضات اور اس سلسلے میں ان کی کارستانیاں اور رکاوٹیں۔

(۵) بڑے بڑے انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی تاریخ کے سلسلے کی بحثیں۔

(۶) اسلام کے مختلف احکام سے متعلق ابحاث۔ جن میں نماز، روزہ، جہاد فی سبیل اللہ، حج، تغیر قبلہ، نکاح، طلاق، احکام تجارت و قرض، سود کے بعض اہم احکام اور بہت سی دیگر مخصوص بحثیں شامل ہیں۔

راہِ خدا میں خرچ، مسئلہ قصاص، کئی ایک حرام گوشت، قمار، حرمتِ شراب، بعض احکام وصیت وغیرہ بھی اس کے موضوعات میں سے ہیں۔

اس کے نام — البقرہ — کی بناء ایک واقعہ ہے جو بنی اسرائیل میں ایک گائے کے سلسلے میں ہے جس کی تفصیل آیت ۶۷ تا ۷۳ میں انشاء اللہ آئے گی۔

سُورۂ بقرہ کی فضیلت

اس سورت کی فضیلت سے متعلق کتب اسلامی میں بہت سی روایات موجود ہیں اس سلسلے میں مرحوم طبرسی نے ایک روایت رسول اکرمؐ سے مجمع البیان میں نقل کی ہے۔

آپؐ سے پوچھا گیا:



ای سورة القرآن افضل ؟
(قرآن کی کون سی سورت افضل ہے ؟)
قال البقرة
(فرمایا: سورہ بقرہ)
قیل ای آیة البقرة افضل ؟
(عرض کیا گیا سورہ بقرہ کی کون سی آیت افضل ہے ؟)
قال آیة الکرسی
(فرمایا: آیة الکرسی)[1]

ظاہراً اس سورت کی فضیلت اس کی جامعیت کی وجہ سے ہے اور آیة الکرسی کی فضیلت اس بناء پر ہے کہ اس میں توحید کے بارے میں بعض اہم امور بیان ہوئے ہیں جس کی تفصیل انشاء اللہ اس کی تفسیر میں آئے گی۔

یہ بات اس سے اختلاف نہیں رکھتی کہ قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی کئی ایک جہات کی وجہ سے برتری بیان ہوئی ہے کیونکہ ان کی یہ فضیلت دیگر وجوہ کے پیش نظر ہے۔

حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کی وساطت سے رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات، آیة الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور اس سورہ کی آخری تین آیات پڑھے وہ کبھی بھی اپنی جان و مال میں ناخوشگواری نہ پائے گا، شیطان اس کے نزدیک نہیں آئے گا اور وہ قرآن کو نہیں بھولے گا۔[2]

ہم یہاں اس اہم حقیقت کا تکرار ضروری سمجھتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن یا سورتوں اور مخصوص آیات کے لئے جو ثواب، فضیلتیں اور اہم فائدے بیان ہوئے ہیں ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان انہیں بطور ورد پڑھے اور صرف زبان چلاتے پر اکتفا کرے بلکہ قرآن کا پڑھنا سمجھنے کے لئے اور سمجھنا غور و فکر کے لئے ہے اور غور و فکر عمل کرنے کے لئے ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو فضیلت کسی سورت یا آیت کے متعلق ذکر ہوئی ہے وہ اس سورت یا آیت کے موضوع سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

مثلاً ہم سورۂ نور کی فضیلت کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ جو اسے پڑھے گا خداوند عالم اسے اور اس کی اولاد کو زنا کی آلودگی سے محفوظ رکھے گا۔ تو یہ اس بنا پر ہے کہ سورۂ نور کے مضامین میں جنسی کجرویوں سے مقابلے کے لئے اہم رہنمائی موجود ہے۔ مجرد اشخاص کو جلد شادی کرنے کا حکم ہے، پردے کا حکم ہے، بری نگاہ اور ہوس رانی کی نگاہ ترک کرنے کا حکم ہے، ناروا اور غلط نسبتوں کی ممانعت ہے اور آخر میں زناکار مردوں اور عورتوں کے لئے حد شرعی کے اجراء کا حکم دیا گیا ہے۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۱ ص ۲۶ و مجمع البیان ج ۱ ص ۳۲
[2] نور الثقلین ج ۱ ص ۲۶ بحوالہ کتاب "ثواب الاعمال"۔



واضح ہے کہ سورۂ نور کے مفاہیم و موضوعات کسی معاشرے یا خاندان میں عملی جامہ پہن لیں تو وہ زنا سے آلودہ نہیں ہوگا۔
اسی طرح سورہ بقرہ کی وہ آیات جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے سب توحید، ایمان بالغیب، خدا شناسی اور شیطانی وسوسوں سے پرہیز کے بارے میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دل و جان سے ان پر عمل پیرا ہو تو یقیناً سب فضائل مذکورا سے حاصل ہونگے۔
یہ درست ہے کہ قرآن کا پڑھنا بہرحال باعث ثواب ہے لیکن اصلی، اساسی اور آثار چھوڑنے والا ثواب اسی وقت ملے گا جب تلاوت غور و فکر اور عمل کے لئے مقدمہ و تمہید ہو۔



سورۂ بقرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۔ ال م

۲۔ یہ وہ باعظمت کتاب ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ پرہیزگاروں کی ہدایت کی بنیاد ہے۔

تفسیر

قرآن کے حروف مقطعات کے متعلق تحقیق

انیس[۹] سورتوں کی ابتدا میں ہمیں حروف مقطعات دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ حروف ایک دوسرے سے منقطع اور الگ الگ ہیں اور ان سے کوئی ایسا لفظ نہیں بنتا جو کچھ میں آسکے۔ قرآن کے حروف مقطعات ہمیشہ قرآن کے اسرار آمیز کلمات میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ مفسرین نے ان کی کئی ایک تفاسیر بیان کی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور علماء کی جدید تحقیقات سے ان کی نئی تفسیریں سامنے آئیں گی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا کہ جہالِ عرب اور مشرکین نے قرآن کی کئی ایک سورتوں کی ابتدا میں موجود ان حروف مقطعات کی وجہ سے رسول اکرم پر اعتراض کیا ہو یا ان کے باعث استہزاء و تمسخر کیا ہو۔ یہ امر اس بات کی خبر دیتا ہے کہ گویا وہ لوگ بھی حروفِ مقطعات کے وجود کے اسرار سے بالکل بے خبر نہ تھے۔

بہر حال تفاسیرِ مذکورہ میں سے چند ایک ایسی ہیں جو زیادہ اہم اور معتبر لگتی ہیں اور وہ اس سلسلے کی آخری تحقیقات سے ہم آہنگ ہیں ہم چند ایک کو تدریجاً اس سورت، آلِ عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اس وقت ان میں سے اہم ترین کا ذکر کیا جا رہا ہے:

یہ حروف اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب اس عظمت واہمیت کے باوجود کہ اس نے عرب وعجم کے تمام



سخنوروں کو حیران کر دیا ہے۔ اور علماء و محققین کو عاجز کر دیا ہے انہی حروف کا مجموعہ و نمونہ ہے جن کا استعمال سب کے اختیار میں ہے۔

باوجودیکہ قرآن انہی حروفِ الف با اور عام کلمات سے مرکب ہے لیکن یہ ایسے موزوں کلمات اور عظیم معانی کا حامل ہے جو انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں انسان کی روح تحیّر اور تحسین کی کیفیات سے دوچار ہو جاتی ہے اور ان کے مطالعے سے افکار و عقول ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی جملہ بندی مرتب ہے، اس کے کلمات بلند ترین بنیادوں کے حامل ہیں اور اس میں بلند معانی زیبا ترین الفاظ کے قالب میں اس طرح سے ڈھلے ہوئے ہیں جس کی کوئی مثل و نظیر نہیں ملتی۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بات صرف دعوٰی نہیں کیونکہ خالق کائنات جس نے اس کتاب کو اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے اس نے تمام انسانوں کو اس کی مثل پیش کرنے کی دعوت دی ہے اور ان سے کہا ہے کہ اس جیسا قرآن یا اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ۔ اس نے دعوت دی ہے کہ تمام جہانوں کے باسی (جن و انس) ہم گام و ہم فکر ہو کر اس کی نظیر پیش کریں۔ لیکن سب کے سب عاجز و ناتواں رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے خداوند عظیم نے اس مٹی سے انسان کو اس تعجب خیز جسم کے ساتھ تخلیق کیا، قسم قسم کے خوبصورت پرندے اور جانور پیدا کئے، طرح طرح کے سبزے اور رنگ برنگے پھول بنائے اور انہی کی طرح اور موجودات کو پیدا کیا اور ہم اس مٹی سے پیالے، کوزے اور اسی قسم کی چیزیں بناتے ہیں۔ ایسے ہی خداوند تعالیٰ حروف الف بار اور معمولی کلمات سے بلند ترین مطالب و معانی کو خوبصورت الفاظ اور موزوں کلمات کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور انہیں ایسا اسلوب دیتا ہے جس سے تمام انگشت بدنداں ہیں۔ بیشک یہی حروف انسانوں کے اختیار میں بھی ہیں لیکن ان میں یہ طاقت نہیں کر قرآن جیسی تراکیب اور جملہ بندی ایجاد کر سکیں۔

ادبیات عرب کا عہد زریں

یہ بات قابل غور ہے کہ زمانۂ جاہلیت ادبیات کے لحاظ سے ایک عہد زریں تھا۔ وہی پا برہنہ اور نیم وحشی بادیہ نشین بدو تمام تر اقتصادی و معاشرتی محرومیوں کے باوجود ادبی ذوق اور سخن سنجی سے سرشار تھے۔ یہاں تک کہ آج بھی اُن کے اشعار اُن کے سنہری زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے بہترین اور قیمتی اشعار ادبیاتِ عرب کا سرمایہ ہیں اور حقیقی عربی ادب کے متلاشیوں کے لئے ایک گراں بہا ذخیرہ ہیں۔ یہ بات اس وقت کے عربوں کے تفوقِ ادبی اور ذوقِ سخن پروری کی بہترین دلیل ہے۔

عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں ایک سالانہ میلہ لگتا تھا جو بازار عکاظ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ایک ادبی اجتماع کے ساتھ ساتھ سیاسی و عدالتی کانفرنس بھی تھی۔ اسی بازار میں بڑے بڑے اقتصادی سودے بھی ہوتے۔ شعراء اور سخنور اپنی اپنی تخلیقات اس کانفرنس میں پیش کرتے ان میں سے بہترین کا انتخاب ہوتا جسے شعرِ سال کا اعزاز حاصل ہوتا۔ ان میں سے سات یا دس قصیدے سبعہ یا عشرہ معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس عظیم الشان ادبی مقابلے میں کامیابی شاعر اور اُس کے قبیلے کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تصور کی جاتی تھی۔

ایسے زمانے میں قرآن نے اپنی مثل لانے کی دعوت انہی لوگوں کو دی اور سب نے اظہار عجز کیا اور اس کے سامنے سر جھکا



لئے۔ اس کی مزید تشریح اس سورۃ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں آئے گی جہاں قرآن کے چیلنج اور عرب سخنوروں کے عجز کا تذکرہ ہے۔

واضح گواہ

حروف مقطعہ کی اس تفسیر کا زندہ ثبوت وہ حدیث ہے جو امام سجاد علی بن الحسین علیہما السلام سے منقول ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

کذب قریش والیهود بالقران وقالوا هذا سحر مبین تقوله فقال الله: الٓمّٓ ۔ ذٰلک الکتاب۔۔۔ ای یا محمد هذا الکتاب الذی انزلته الیک الحروف المقطعة التی منها الف ولام ومیم وهو بلغتکم فاتوا بمثله ان کنتم صٰدقین۔۔۔۔

قریش اور یہودیوں نے یہ کہہ کر قرآن کی طرف غلط نسبت دی کہ قرآن جادو ہے یہ خود ساختہ ہے اور اسے خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ خدا نے انہیں خبردار کیا اور فرمایا الٓمّٓ ذٰلک الکتاب یعنی اے محمد جو کتاب ہم نے آپ پر نازل کی ہے وہ انہی حروف مقطعہ (الف، لام، م) وغیرہ پر مشتمل ہے جو تمہارے زیر استعمال ہیں۔۔۔ اور اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل پیش کرو۔[1]

دوسری شہادت وہ حدیث ہے جو امام علی ابن موسیٰ رضا سے مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

ثم قال: ان الله تبارک و تعالیٰ انزل هذا القران بهذه الحروف التی یتداولها جمیع العرب ثم قال: قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القران

خداوند تعالیٰ نے قرآن کو انہی حروف میں نازل فرمایا جنہیں تمام اہل عرب بولتے ہیں۔ پھر فرمایا: ان سے کہیے کہ اگر انس و جن قرآن کی مثل لانے کے لئے جمع ہو جائیں تب بھی وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے۔[2]

ایک اور نکتہ جو قرآن کے حروف مقطعہ کے بارے میں اس نظریے کی تائید کرتا ہے یہ ہے کہ قرآن میں ۲۴ مقامات ایسے ہیں جہاں سورتوں کی ابتداء جب ان حروف سے ہوتی ہے تو بلا فاصلہ قرآن اور اس کی عظمت سے متعلق گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بات خود نشاندہی کرتی ہے کہ حروف مقطعہ اور قرآن میں ربط موجود ہے۔

ایسے چند ایک مقامات یہ ہیں:

(۱) الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝

(۲) طٰسٓ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝

(۳) الٓمّٓ ۝ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ۝

---

[1] تفسیر برہان، جلد اول، ص۵۴

[2] توحید صدوق، ص۱۶۲ طبع ۱۳۰۵ھ



(۴) الٓمٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ....

ان موارد میں قرآن کی دیگر سورتوں کے آغاز میں بہت سے مواقع پر حروف مقطعہ کے ذکر کے بعد قرآن سے متعلق بات کی گئی ہے اور اس کی عظمت بیان ہوئی ہے۔

اس سورہ (بقرہ) کے آغاز میں بھی حروف مقطعہ کو بیان کرنے کے بعد اس آسمانی کتب کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ وہی باعظمت کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ (ذٰلک الکتاب لاریب فیہ)

یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ خدا نے اپنے رسول سے وعدہ کیا ہو کہ وہ انسانوں کی رہنمائی کے لئے اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جو تمام طالبان حق کے لئے باعث ہدایت ہوگی اور حقیقت کے متلاشیوں کے لئے اس میں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا۔ اور اب اس نے اپنے اس وعدے کو ایفا کیا ہو۔

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں صرف ایک دعویٰ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ اس قرآن میں ہے وہ خود اپنی حقانیت پر گواہی دیتا ہے۔ گویا عطار کے صندوقچہ کی طرح ہے، خاموش ہے مگر اپنا کمال دکھا رہا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح سے آثار صدق و عظمت، نظم و استحکام، معانی کی گہرائی، الفاظ و تعبیرات کی مٹھاس اور فصاحت اس میں نمایاں ہے کہ ہر قسم کا وسوسہ اور شک دور ہوتا چلا جاتا ہے اور 'آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است' کا مصداق ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ رفتار زمانہ نہ فقط اس شگفتگی و تازگی کو کم نہیں کر سکی بلکہ علوم کی پیش رفت اور اسرار کائنات کے آشکار ہونے سے اس کے حقایق روشن تر ہوتے جا رہے ہیں اور علم جتنا مائل بکمال ہے اس کی آیات زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس سے ہم انشاء اللہ اسی تفسیر میں آگاہ ہوں گے۔

چند اہم نکات

(۱) دور کا اشارہ کیوں؟ : ہمیں معلوم ہے کہ لفظ 'ذٰلک' لغت عرب میں دور کے لئے اسم اشارہ ہے۔ اس بنا پر 'ذٰلک الکتاب' کا مفہوم ہے 'وہ کتاب'۔ حالانکہ یہاں نزدیک کے اسم اشارہ سے استفادہ کیا جانا چاہیئے تھا اور 'ھٰذا الکتٰب' ہونا چاہیئے تھا کیونکہ قرآن لوگوں کی دسترس میں تھا۔ یہ اس لئے ہوا کہ کبھی بعید کا اسم اشارہ کسی چیز یا شخص کی عظمت کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے گویا اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ آسمانوں کی بلندی کا حامل ہے۔ فارسی میں بھی ایسی تعبیرات موجود ہیں۔ مثلاً کسی عظیم شخصیت کے حضور میں ہم کہتے ہیں:

"اگر آن سرور اجازہ دھند"

یعنی "اگر وہ سردار اجازت دیں"

حالانکہ یہاں 'این سرور' یعنی 'یہ سردار' کہنا چاہیئے۔ یہ صرف بیان عظمت اور مقام بلند کے باعث ہے۔ کئی ایک دوسری آیات میں بھی تلک کا استعمال ہوا ہے اور یہ بھی اشارہ بعید ہے مثلاً



دانش، جسمانی قوتیں، مقام اور منصب اجتماعی غرض اپنا ہر قسم کا سرمایہ صاحبانِ حاجت پر خرچ کرتے ہیں اور اس خواہش کے بغیر کہ ان لوگوں سے اس کا کچھ عوض ملے گا۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انفاق اور خرچ کرنا جہان آفرینش کا ایک عمومی قانون ہے یہ قانون خاص طور پر موجوداتِ زندہ میں نظر آتا ہے۔ مثلاً انسان کا دل صرف اپنے لئے کام نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ بدن کے تمام خلیوں پر خرچ کرتا ہے۔ مغز، جگر اور بدن انسانی کے کارخانے کا ہر جزء اپنے کام کے ماحصل کو ہمیشہ خرچ کرتا ہے۔ اصولی طور پر جو لین دین کرتے ہیں، انفاق کے بغیر اُن کی زندگی کا کوئی مفہوم نہیں [1]

دوسرے انسانوں سے رابطہ درحقیقت خدا سے ربط و تعلق کا نتیجہ ہے۔ جس انسان کا خدا سے تعلق ہے اور جو ومما رزقنٰھم کے مطابق روزی کو خدا کی عطا سمجھتا ہے، اسے اپنی پیدا کردہ نہیں سمجھتا بلکہ خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ چند دن کے لئے اس کے پاس بطور امانت ہے۔ وہ انفاق و بخشش سے تکلیف نہیں بلکہ راحت محسوس کرے گا کیونکہ اس نے خدا کی عطا خدا کے بندوں کو دی ہے البتہ اس کے مادی و معنوی نتائج و برکات خود حاصل کئے ہیں۔ یہ طرز فکر روح انسانی کو بخل و حسد سے پاک کر دیتا ہے اور تنازعہ کی دنیا کو تعاون کی دنیا میں بدل دیتا ہے۔ ایسی دنیا کہ جس میں ہر شخص اپنے آپ کو مقروض سمجھتے ہوئے وہ نعمات جو اُس کے پاس ہیں حاجت مندوں کے سپرد کر دیتا ہے، وہ آفتاب کی طرح نور افشانی کرتا ہے اور کسی عوض کا خواہاں نہیں ہوتا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ امام صادقؑ نے ممّا رزقنٰھم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

ان معناہ و مما علمناھم یبثون

یعنی جن علوم و احکام کی ہم نے انہیں تعلیم دی ہے وہ ان کی نشر و اشاعت کرتے ہیں اور جو ان کی احتیاج رکھتے ہیں انہیں تعلیم دیتے ہیں [2]

واضح ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انفاق اور خرچ کرنا علم کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ مسئلہ انفاق میں نگاہیں چونکہ مالی انفاق کی طرف متوجہ تھیں لہٰذا امام نے معنوی انفاق کا ذکر فرما کر اس مفہوم کی وسعت کو روشن کر دیا۔

ضمنی طور پر یہاں یہ بھی پورے طور پر واضح ہو گیا کہ زیر بحث آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد فقط زکوٰۃ واجب یا واجب و مستحب دونوں نہیں بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے جو ہر قسم کی بلا عوض مدد پر محیط ہے۔

(۴) **پرہیزگاروں کی ایک اور خصوصیت:** متقی انسانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام انبیاء اور خدائی پروگراموں پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ آپؐ پر اور آپؐ سے پہلے نازل ہوا ہے اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔ والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

---

[1] انفاق، اس کی اہمیت اور اس کے اثرات کی بحث اسی تفسیر کی جلد ۔۔۔ صفحہ ۔۔۔ تا صفحہ ۔۔۔ میں ملاحظہ کریں۔

[2] نور الثقلین و مجمع البیان ذیل آیہ مذکورہ۔



اس لحاظ سے قرآن نہ صرف یہ کہ اصول و اساس کی نظر سے دعوتِ انبیاء میں اختلاف نہیں سمجھتا بلکہ انہیں ایک ایسا معلم و مربی سمجھتا ہے جن میں سے ہر کوئی جہانِ انسانیت کی عظیم درسگاہ میں انسانوں کی تکمیل کے لئے قدم بڑھاتا ہے۔ انبیاء نہ صرف یہ کہ ادیانِ آسمانی کو فرقہ بندی اور نفاق کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ انسانوں کے درمیان ربط و تعلق کے لئے انہیں وسیلہ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس طرزِ نظر کے حامل ہیں وہ اپنی روح کو تعصب سے پاک کر لیتے ہیں، پیغمبرانِ خدا جو کچھ انسانی ہدایت و تکمیل کے لئے لے کر آئے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں اور راہِ توحید کے سب ہادیوں اور رہنماؤں کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔

البتہ گذشتہ انبیاء کے دستورات پر ایمان انہیں اپنے فکر و عمل کو آخری نبی کے آئین سے منطبق کرنے سے نہیں روکتا (کیونکہ آخری نبی کا لایا ہوا آئین تکاملِ ادیان کے سلسلے کا آخری حلقہ ہے) اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے مرحلۂ تکمیل میں قدم بڑھانے کی بجائے ہٹا لیا ہے۔

(۵) قیامت پر ایمان: یہ وہ آخری صفت ہے جو پرہیزگاروں کی صفات کے سلسلے میں بیان ہوئی ہے فرمایا گیا ہے کہ وہ آخرت پر یقیناً ایمان رکھتے ہیں **(وبالاخرۃ ھم یوقنون)**۔

وہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان مہمل، عبث اور بے مقصد پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی تخلیق اُس کے آگے بڑھنے کے لئے ہے اور اس کا سفر موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ اگر معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تو یقیناً چند دن کی زندگی کے لئے یہ شور و غوغا فضول اور بیکار تھا۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ پروردگار کی عدالتِ مطلقہ سب کے انتظار میں ہے اور یہ نہیں کہ اس دنیا میں ہمارے اعمال بے حساب اور بغیر جزا و سزا کے رہ جائیں۔

جب وہ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہا ہوتا ہے تو قیامت کا اعتقاد اُس میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور کام کا بوجھ اس کے لئے باعثِ تکلیف نہیں رہتا بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کا استقبال کرتا ہے۔ حوادث کے مقابلے میں کوہِ گراں کی مانند کھڑا ہو جاتا ہے۔ غیر عادلانہ سلوک کے مقابلے میں سر نہیں جھکاتا۔ وہ مطمئن ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے نیک و بد کام کی جزا و سزا ہے، موت کے بعد ایک زیادہ وسیع جہان کی طرف منتقل ہوتا ہے اور رحمتِ وسیع اور الطافِ پروردگار سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

آخرت پر ایمان کا مطلب ہے عالمِ مادہ کی سرحد سے باہر نکل آنا اور ایک بلند تر عالم میں قدم رکھنا جو ایسا جہان ہے کہ ہماری دنیا اس کے لئے کھیتی ہے وہاں کی زندگی کے لئے زیادہ آمادہ ہونے کے لئے یہ ایک تربیت گاہ ہے۔ اس دنیا کی زندگی آخری ہدف اور مقصد نہیں بلکہ یہ حقیقی زندگی کے لئے تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے جہان کی زندگی کو سازگار بنانے کے لئے اس جہان کی زندگی رحمِ مادر میں بچے کی زندگی کی طرح ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد کبھی بھی یہ زندگی نہیں رہا بلکہ یہ ایک زندگی کے لئے دورِ تکامل ہے۔ جب تک انسان جنین سے صحیح و سالم اور ہر قسم کے عیب سے پاک متولد نہ ہو بعد والی زندگی میں خوش بخت اور سعادت مند نہیں ہو سکتا۔

قیامت کا عقیدہ رکھنا انسان کی زندگی پر گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو شہامت و شجاعت بخشتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر انسان اس جہان کی زندگی میں افتخار کی بلندیوں تک پہنچتا ہے جو اسے خداوندِ عالم کی مقدس راہ میں "شہادت" سے حاصل ہوتا ہے اور یہ شہادت ایک صاحبِ ایمان انسان کے لئے محبوب ترین چیز ہے کیونکہ یہ دراصل ایک ابدی و جاودانی زندگی کی ابتداء ہے



قیامت پر ایمان انسان کو گناہ سے روکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے گناہ خدا اور آخرت پر ایمان سے نسبت معکوس رکھتے ہیں۔ یہ ایمان جتنا قوی ہوگا گناہ اتنے کم ہوں گے۔ سورہ ص آیہ ۲۶ میں حضرت داؤد سے خطاب الٰہی ہے:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں خدائی راستے سے گمراہ کردیں گی وہ لوگ جو راہِ خدا سے گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ انہوں نے روزِ قیامت کو فراموش کردیا ہے۔

گویا روزِ جزا کو بھول جانا قسم قسم کی سرکشی ظلم و ستم اور گناہوں کا پیش خیمہ ہے اور یہی چیزیں عذاب شدید کا سرچشمہ ہیں۔

زیرِ نظر آیات میں سے آخری ان لوگوں کے نتیجے اور انجام کار کی خبر دیتی ہے جن کی صفات گذشتہ پانچ آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں (اولئك على هدى من ربهم) اور یہی کامیاب ہیں (واولئك هم المفلحون)۔

حقیقت میں ان کی ہدایت اور کامیابی کی ضمانت خدا کی طرف سے ہے۔ "من ربهم" کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن کہتا ہے "على هدى من ربهم" یہ ایسے ہے گویا ہدایت خداوندی ایک رہوار ہے جس پر وہ سوار ہیں اور اس سواری کی مدد سے وہ کامیابی اور سعادت کی طرف رواں دواں ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ لفظ "علی" عموماً تسلط، علو اور غلبہ کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔

"هدى" (بصورت نکرہ) ضمناً اس ہدایت کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی طرف سے ان کے شاملِ حال ہے یعنی وہ بہت عظیم ہدایت پر فائز ہیں۔

هم المفلحون کی تعبیر علم معانی و بیان کے اصول کے پیشِ نظر دلیل حصر ہے یعنی کامیابی کا راستہ صرف انہی لوگوں کا راستہ ہے کیونکہ یہ لوگ پانچ مخصوص صفات اپنا کر ہدایتِ الٰہی سے سرفراز ہوئے ہیں۔[1]

چند اہم نکات

(۱) **ایمان و عمل کی راہ میں تسلسل:** گذشتہ آیات میں تمام جگہوں پر فعل مضارع سے استفادہ کیا گیا ہے جو عموماً استمرار و تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ يؤمنون بالغيب، يقيمون الصلوٰة، ينفقون، وبالاٰخرة هم يوقنون یہ اس امر کی

---

[1] صاحب تفسیر المنار معتقد ہیں کہ اولئك دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلا وہ جس میں ایمان بالغیب، قیام نماز اور انفاق کی صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرا وہ جو آسمانی وحی اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے کیونکہ یہ پانچ صفات ایک گروہ سے مخصوص ہیں اور ایک دوسرے سے متصل ہیں اور اس کے دو حصے کرنا درست نہیں۔



نشاندہی کرتا ہے کہ پرہیزگار اور سچے مومن وہ ہیں جو اپنے پروگرام میں ثبات و استمرار رکھتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز اُن کی رُوح و فکر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ان سے اُن کے انسان ساز پروگراموں میں خلل پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ابتداء ہی سے حق طلبی کی رُوح رکھتے ہیں جو اس کا باعث بنتی ہے کہ وہ دعوتِ قرآن کے پیچھے جائیں اور پھر دعوتِ قرآن اُن میں یہ پانچ صفات پیدا کر دیتی ہے۔

(۲) حقیقت تقویٰ کیا ہے: تقویٰ کا مادہ ہے "وقایۃ" جس کے معنی ہیں نگہداری یا خودداری[1]۔ دوسرے لفظوں میں نظم و ضبط کی ایک ایسی اندرونی طاقت کا نام تقویٰ ہے جو سرکشی و شہوت کے مقابلے میں انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ قوت ایک ایسے مضبوط ہینڈل کا کام دیتی ہے جو وجودِ انسانی کی مشینری کو الٹ جانے کی جگہوں پر محفوظ رکھتا ہے اور خطرناک تیزیوں سے روکتی ہے۔

اسی لئے امیر المؤمنین علیؑ تقویٰ کو خطراتِ گناہ کے مقابلے میں ایک مضبوط قلعے کا عنوان دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

اعلموا عباد اللہ ان التقوی دار حصن عزیز

اے اللہ کے بندو! جان لو کہ تقویٰ ایسا مضبوط قلعہ ہے جسے تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔[2]

اسلامی احادیث اور علماء اسلام کے کلمات میں حالتِ تقویٰ کے لئے بہت سی تشبیہات بیان ہوئی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

الا و ان التقوی مطایا ذلل حمل علیها اهلها و اعطوا ازمتها فاوردتهم الجنة

تقویٰ ایسے راہوار کی مانند ہے جس پر اس کا مالک سوار ہو اور اس کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اسے بہشت کے اندر پہنچا دے۔[3]

بعض نے تقویٰ کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی ہے جو کانٹوں بھری زمین سے گذر رہا ہو اور اس کوشش میں ہو کہ اپنا دامن بھی سنبھالے رکھے اور قدم بھی احتیاط سے اٹھائے تاکہ کوئی کانٹا اس کے دامن سے نہ الجھ جائے اور نہ ہی کوئی خار اُس کے پاؤں میں چبھے۔

عبداللہ معتز نے اس کیفیت کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها   وکبیرها فهو التقی

---

[1] راغب نے "مفردات" میں لکھا ہے کہ "وقایہ" کے معنی ہیں "چیزوں کو ان امور سے محفوظ کرنا جو انہیں نقصان یا تکلیف پہنچائیں" اور تقویٰ کے معنی ہیں "خطرات سے بچا کر رُوح کو ایک حفاظتی پردے میں رکھنا"۔ تقویٰ کے معنی کبھی خوف بھی کئے جاتے ہیں حالانکہ خوف تو تقویٰ کا سبب ہے۔ عرفِ شریعت میں تقویٰ کا مطلب ہے اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھنا اور کمالِ تقویٰ یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۰

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶



۲- واضع کماش فوق ار من الشوک یحذر ما یری

۳- لا تحقرون صغیرۃ ان الجبال من الحصی

۱- سب چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے کہ حقیقت تقویٰ یہی ہے۔

۲- اس شخص کی طرح ہو جا جو خار دار زمین پر انتہائی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہے۔

۳- چھوٹے گناہوں کو چھوٹا نہ سمجھ کہ پہاڑ سنگریزوں ہی سے بنتا ہے۔[1]

ضمناً اس تشبیہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ تقویٰ یہ نہیں کہ انسان گوشہ نشین ہو جائے اور لوگوں سے میل جول ترک کرے بلکہ معاشرے میں رہتے ہوئے اگرچہ وہ غلیظ معاشرہ ہی کیوں نہ ہو اپنی حفاظت کرے۔

اسلام میں کسی کی شخصیت کے لیے معیار فضیلت و افتخار یہی تقویٰ ہے اور اسلام کا شعار زندہ ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

یعنی یقیناً خدا کے ہاں تم میں سے زیادہ صاحب عزت و تکریم وہی ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ (حجرات - ۱۳)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ان تقوی اللہ مفتاح سداد و ذخیرۃ معاد و عتق من کل ملکۃ و نجاۃ من کل ھلکۃ

تقویٰ اور خوف خدا ہر بند دروازے کی کلید ہے، قیامت کے لیے ذخیرہ ہے، شیطان کی بندگی سے آزادی کا سبب ہے اور ہر ہلاکت سے باعث نجات ہے۔[2]

ضمناً متوجہ رہیے گا کہ تقویٰ کی کئی ایک شاخیں اور شعبے ہیں مثلاً تقویٰ مالی، تقویٰ اقتصادی، تقویٰ جنسی، تقویٰ اجتماعی اور تقویٰ سیاسی وغیرہ۔

۶- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

۷- خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد اول، صفحہ ۹۲

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳۰



ترجمہ

۶۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں (عذاب خدا سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۷۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ایک بڑا عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

تفسیر

دوسرا گروہ سرکش کفار کا ہے

یہ گروہ ان پرہیزگار انسانوں کے بالکل برعکس ہے جن کی صفات گذشتہ دو آیات میں پوری وضاحت سے بیان ہوئی ہیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی میں ہے کہ جو کافر ہیں (اور ساتھ اپنے کفر و بے ایمانی پر مُصر ہیں) ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ انہیں عذاب الٰہی سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کیونکہ وہ تو ایمان لانے کے نہیں (ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون)۔

پہلا گروہ حواس و ادراک کے ساتھ پوری طرح تیار تھا کہ وہ حق کو پہچانے اور پھر اسے قبول کر کے اس کی پیروی کرے۔ لیکن اس گروہ کے افراد اپنی گمراہی میں اتنے کٹر ہیں کہ حق جتنا بھی ان کے سامنے واضح ہو جائے وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں وہ قرآن جو متقین کے لئے ہادی اور راہنما ہے ان کے لئے بالکل بے اثر ہے۔ کچھ کہیں نہ کہیں، ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کوئی بشارت دیں یا نہ دیں ان پر کسی چیز کا کچھ اثر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق کی پیروی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے روحانی طور پر آمادہ ہی نہیں۔

دوسری آیت میں اس تعصب و ڈھٹائی کی دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ یہ کفر و عناد میں اس طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ حسِ شناخت کھو بیٹھے ہیں "خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔" (ختم اللّٰہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ) اسی بنا پر ان کا انجام یہ ہے کہ اُن کے لئے بہت بڑا عذاب ہے (ولھم عذاب عظیم)۔

اس لحاظ سے وہ آنکھ پرہیزگار جس سے آیات خدا کو دیکھتے تھے، وہ کان پرہیزگار جس سے حق کی باتیں سنتے تھے اور وہ دل پرہیزگار جس سے حقائق کا ادراک کرتے تھے کفار کے لئے بے کار ہیں۔ عقل، آنکھ اور کان اُن کے پاس ہیں لیکن سمجھنے، دیکھنے اور



سننے کی قوت ان میں نہیں رہی کیونکہ انکے بُرے اعمال اُن کا عناد اور ہٹ دھرمی انکی شناخت کی قوت کے سامنے پردہ بن گئے ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ جب تک انسان اس مرحلے تک نہ پہنچے، کتنا ہی گمراہ کیوں نہ ہو قابل ہدایت ہوتا ہے لیکن جب وہ اعمال بد کی وجہ سے حس تشخیص ہی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کے لئے راہ نجات نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس پہچان کی قوت ہی نہیں لہٰذا یقینی طور پر عذاب عظیم اُس کے انتظار میں ہے۔

چند اہم نکات

(۱) تشخیص کی قدرت کا چھن جانا دلیل جبر نہیں: پہلا سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت کے مطابق اگر خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تو پھر وہ مجبور ہیں کہ کفر پر باقی رہ جائیں تو کیا یہ جبر نہیں؟ قرآن میں اس آیت کی طرح اور بھی ایسی ہی آیات موجود ہیں۔ ان حالات میں انہیں سزا دینے کے کیا معنی ہیں؟

اس سوال کا جواب خود قرآن نے دیا ہے اور وہ یہ کہ حق کے مقابلے میں ان لوگوں کا اصرار اور ہٹ دھرمی، ان کی طرف سے ظلم و ستم اور کفر کا استمرار و دوام ان کی حس شناخت پر پردہ پڑ جانے کا باعث بنتا ہے۔ سورہ نساء، آیت ۱۵۵ میں ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ

خداوند عالم نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

سورہ مومن، آیت ۳۵ میں ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

اس طرح خدا ہر متکبر اور ستمگر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے

اسی طرح سورہ جاثیہ، آیت ۲۳ میں ہے:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہوائے نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے لہٰذا وہ گمراہ ہو گیا ہے اور خدا نے اُس کے گوش و دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کی حس تشخیص کا سلب ہو جانا اور آلات تمیز و معرفت کا بے کار ہو جانا ان آیات میں چند ایک علل کا معلول شمار ہوا ہے۔ کفر، تکبر، ستم، پیروی ہوا و ہوس سرکشی، تعصب اور حق کے مقابلے میں اصرار۔ حقیقت میں یہ حالت انسان کے اعمال کا عکس العمل اور بازگشت ہے کوئی اور چیز نہیں۔

اصولاً یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر انسان ایک غلط کام کو مسلسل کرتا رہے تو آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ پہلے ایک حالت ہے پھر وہ ایک عادت بن جاتی ہے گویا وہ رُوح انسانی کا جزو ہو جاتی ہے اور کبھی معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے



کہ انسان کا پلٹ آنا ممکن نہیں رہتا لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کیا تھا لہٰذا عواقب و انجام کا بھی خود ذمہ دار ہے۔ اور اس میں جبر کی کوئی بات نہیں بالکل اس شخص کی طرح جو خود اپنی آنکھ پھوڑے اور کان ضائع کر دے کہ دیکھ سکے نہ سن سکے۔

اب اگر آپ دیکھیں کہ ان افعال کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اس قسم کے افعال میں ایسی خاصیت رکھی ہے (یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے)۔

قوانینِ آفرینش سے اسی مفہوم کی پورے طور پر عکاسی ہوتی ہے۔ جو شخص صحیح اور سچے تقویٰ اور پاکیزگی کو اپنا پیشہ بنا لے خداوند عالم اس کی حسِ تمیز کو زیادہ قوی کر دیتا ہے اور اسے خاص ادراکِ نظر اور روشن فکری عطا کرتا ہے۔ جیسے سورۂ انفال آیہ ۲۹ میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ کو اپنا پیشہ قرار دو تو خداوندِ عالم تمہیں فرقان (یعنی وسیلۂ ادراک حق و باطل) عطا کرے گا۔

اس حقیقت کو ہم نے روزمرہ کی زندگی میں بھی آزمایا ہے۔ بعض ایسے اشخاص ہیں جو غلط کام شروع کرتے ہیں اور ابتداء میں خود معترف بھی ہوتے ہیں کہ سو فیصد غلط کاری اور برائی کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اسی بنا پر وہ اس کام سے دکھی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو جاتے ہیں تو وہ دکھ ان سے دور ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ نہ صرف انہیں اس کام سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں حتیٰ کہ اسے انسانی یا دینی ذمہ داری سمجھنے لگتے ہیں۔

حجاج ابن یوسف جو دنیا کا سب سے بڑا سفاک اور ظالم انسان تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ہولناک مظالم اور سفاکیوں کی توجیہہ میں کہتا تھا:

"یہ لوگ گناہگار ہیں لہٰذا مجھ جیسا شخص ان پر مسلط رہنا چاہیے تاکہ ان پر ظلم کرے کیونکہ یہ اس کے مستحق ہیں۔"

گویا وہ جس قدر قتل، خونریزی اور ظلم کرتا تھا اس کے لئے اپنے آپ کو خدا کی طرف سے مامور سمجھتا تھا۔

کہتے ہیں چنگیز خاں کے ایک سپاہی نے ایران کے ایک سرحدی شہر میں تقریر کی اور کہنے لگا:

"کیا تمہارا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ خدا گنہ گاروں پر عذاب نازل کرتا ہے۔ ہم وہی عذاب الٰہی ہیں لہٰذا کسی قسم کے مقابلے کی کوشش نہ کرنا۔"

(۲) ایسے لوگ قابل ہدایت نہیں تو انبیاء کا تقاضا کیوں: یہ دوسرا سوال ہے جو زیرِ نظر آیات کے سلسلے میں سامنے آتا ہے۔ اگر ہم ایک نکتے کی طرف توجہ دیں تو جواب واضح ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ سزا اور عذاب الٰہی ہمیشہ انسان کے اعمال و کردار سے مربوط ہے۔ صرف اس بنا پر کسی شخص کو سزا نہیں دی جا سکتی کہ وہ دلی طور پر برا شخص ہے بلکہ ضروری ہے کہ پہلے اسے حق کی دعوت دی جائے۔ اگر اس نے پیروی نہ کی اور اپنے اندرونی خباثت کو اپنے اعمال و کردار سے ظاہر کیا تو اس وقت وہ سزا و عذاب کا مستحق ہے ورنہ وہ ظلم سے پہلے قصاص کا مصداق قرار پائے گا۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم اتمام حجت کا نام دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جزا اور



عمل کا بدلہ یقیناً انجام عمل کے بعد ہونا چاہیے صرف ارادہ یا روحانی وفکری آمادگی اس کے لئے کافی نہیں۔ علاوہ ازیں انبیاء صرف ان کی ہدایت کے لئے نہیں آتے رہے۔ ایسے لوگ اقلیت میں ہیں زیادہ تعداد تو ان گمراہ لوگوں کی ہے جو صحیح تعلیم و تربیت کے تحت قابل ہدایت ہیں۔

(۴) دلوں پر مہر لگانا: زیر بحث اور دیگر بہت سی آیات قرآن مجید میں بعض اشخاص سے حسِ تمیز اور ادراکِ واقعی کے چھن جانے کو "ختم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض اوقات "طبع" یا "رین" قرار دیا گیا ہے۔ یہ معنی یہاں سے لئے گئے کہ لوگوں میں رسم تھی کہ وہ جب کچھ چیزیں تھیلیوں یا مخصوص برتنوں میں رکھتے یا کسی اہم خط کو کسی لفافے میں رکھتے تو اس بناء پر کہ کوئی اسے کھولے نہیں اور اسے ہاتھ نہ لگائے اسے باندھ دیتے اور گرہ لگا دیتے پھر گرہ کے اوپر مہر لگاتے تھے۔ آج بھی یہی معمول ہے۔ جائدادوں کی رجسٹریوں کو اسی بناء پر خاص قسم کی رسی سے باندھتے ہیں۔ اس کے اوپر لاک (خاص قسم کی دھات) ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اوپر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ اگر اس کے مضمون میں کوئی کمی بیشی کی جائے تو معلوم ہو جائے۔

تاریخ میں بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ سربراہان حکومت درہم و دینار کے توڑوں پر اپنی مہر لگا دیتے تھے اور خاص خاص اشخاص کی طرف بھیجتے تھے۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ان میں کسی قسم کا تصرف نہ ہونے پائے اور یونہی اس خاص شخص تک پہنچ جائے کیونکہ اس میں تصرف مہر توڑے بغیر ممکن نہ تھا۔ آج کل بھی ڈاک کے تھیلوں پر مہر کا طریقہ رائج ہے۔

عربی زبان میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے لفظ "ختم" استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ تعبیر صرف ان اشخاص کے لئے ہے جو بے ایمان اور ہٹ دھرم ہیں جو کثرت گناہ کے باعث عوامل ہدایت کا اثر قبول نہیں کرتے اور اہل حق کے مقابلے میں ان کے دلوں میں بغض و عناد اتنا راسخ ہوتا ہے کہ گویا اس تھیلے کی طرح ان پر مہر لگ چکی ہے اور اب ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں ہو سکتا۔

"طبع" بھی لغت میں اسی معنی کے لئے آیا ہے اور طابع و خاتم ہر دو کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگاتے ہیں۔

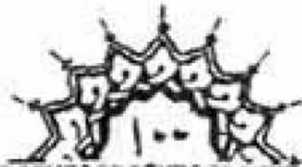
باقی رہا "رین" یعنی زنگ، غبار یا سخت قسم کی مٹی جو قیمتی چیزوں سے چپک جائے۔ یہ تعبیر بھی قرآن میں ان اشخاص کے لئے آئی ہے جو کثرتِ گناہ کی وجہ سے اس عالم کو پہنچ چکے ہیں کہ ان کے دل نفوذ حق کے قابل نہیں رہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

ایسا ہرگز نہیں بلکہ جرائم پیشہ ہونے اور مسلسل برے اعمال کرتے رہنے کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں۔ (مطففین۔ ۱۴)

یہاں یہ بات اہم ہے کہ انسان ہمیشہ متوجہ رہے اگر خدانخواستہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو بہت جلد اسے توبہ کے پانی اور نیک عمل سے دھو ڈالنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دل پر زنگ کی شکل اختیار کر جائے اور اس پر مہر لگا دے۔

امام باقرؑ سے ایک روایت میں ہے:



ما من عبد مومن الا و فی قلبه نکتة بیضاء فاذا اذنب ذنباً خرج فی تلک النکتة سودا فان تاب ذهب ذلک السواد فان تمادی فی الذنوب زاد ذلک السواد حتی یغطی البیاض فاذا غطی البیاض لم یرجع صاحبه الی خیر ابداً و هو قول الله عزوجل:
کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ○

کوئی بندۂ مومن ایسا نہیں جس کے دل میں ایک وسیع سفید اور چمکدار نقطہ نہ ہو۔ جب اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس نقطۂ سفید کے درمیان ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر توبہ کرلے تو وہ سیاہی برطرف ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل گناہ کرتا رہے تو سیاہی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ تمام سفیدی پر محیط ہو جاتی ہے اور جب سفیدی بالکل ختم ہو جائے تو پھر ایسے دل والا کبھی بھی خیر و برکت کی طرف نہیں پلٹ سکتا اور اس ارشاد الٰہی کا یہی مفہوم ہے جب فرماتا ہے کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون [1]

(۴) قرآن میں قلب سے کیا مراد ہے : قرآن مجید میں ادراکِ حقائق کی نسبت دل کی طرف کیوں دی گئی ہے جب کہ یہ بات واضح ہے کہ دل ادراکات کا مرکز نہیں وہ تو بدن میں گردش خون کا ایک آلہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ قلب قرآن میں کئی معانی کے لئے ہے جن میں سے بعض یہ ہیں :

(۱) ادراک و عقل — جیسا کہ سورہ ق، آیہ ۳۷ میں ہے :
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ
ان مطالب میں تذکر و یاد دہانی ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل و ادراک کی قوت رکھتے ہیں۔

(۲) روح و جان — جیسا کہ سورہ احزاب، آیہ ۱۰ میں ہے :
وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ
جب آنکھیں دھنس گئیں اور مارے دہشت کے روح و جان لبوں تک آ پہنچی۔

(۳) مرکز عواطف و مہربانی — سورہ انفال، آیہ ۱۲ میں ہے :
سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ
بہت جلد کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔

ایک اور جگہ سورہ آل عمران، آیہ ۱۵۹ میں ہے :
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ ص
یہ رحمت الٰہی ہے کہ آپ لوگوں کے لئے نرم خو ہیں اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو آپ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۲۰، صفحہ ۲۰۹



اس کی توضیح یہ ہے کہ انسانی وجود میں دو قوی مرکز ہیں جو یہ ہیں :

(۱) مرکز ادراک — جو مغز اور کارخانۂ اعصاب ہے اسی لئے جب کوئی فکری کام درپیش ہو تو ہم احساس کرتے ہیں اور اپنے مغز کو اس کے تجزیہ و تحلیل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اگرچہ مغز اور سلسلۂ اعصاب حقیقت میں روح کے لئے وسیلہ اور آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(ب) مرکز عواطف — جس سے مراد وہی چلغوزہ نما دل ہے جو سینے کے بائیں حصے میں ہے اور مسائل عواطف (مہربانی و رحم) پہلے پہل اسی مرکز پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پہلی چنگاری دل سے شروع ہوتی ہے۔

ہم وجدانی طور پر جب کسی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کا بوجھ اسی دل پر محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی سرور انگیز اور مسرت آرا امر کا سامنا کرتے ہیں تو اسی مرکز میں فرحت و انبساط کا احساس کرتے ہیں (یہ بات غور طلب ہے)۔

یہ صحیح ہے کہ سب ادراکات و عواطف کا اصلی مرکز انسان کی روح رواں ہے لیکن ان کا مظاہرہ اور جسمی عکس العمل مختلف ہوتا رہتا ہے۔ ادراک و فہم کا عکس العمل پہلی دفعہ کارخانۂ مغز میں ظاہر ہوتا ہے لیکن مسائل عواطف مثلاً محبت، عداوت، خوف، اطمینان خوشی اور غمی کا عکس العمل انسان کے دل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان امور کے پیدا ہوتے ہی واضح طور پر ان کا اثر ہم اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر قرآن میں مسائل عواطف کو اسی دل کی طرف اور مسائل عقلی کو قلب یعنی عقل یا مغز کی طرف نسبت دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے جو بیان کی گئی ہے اور یہ کوئی بے قاعدہ بات نہیں ہے۔

علاوہ ازیں قلب یعنی عضو خاص (دل) انسانی زندگی اور اس کی بقا میں نہایت اہم کردار کا حامل ہے کیونکہ اس کا ایک لحظے کا توقف بھی تباہی اور نابودی کا سبب ہے۔ اس بنا پر کیا مضائقہ ہے کہ فکری، عاطفی تحریکوں اور فعالیتوں کی نسبت اس کی طرف دی جائے۔

(۵) قلب و بصر صیغہ جمع اور سمع مفرد میں کیوں : زیر مطالعہ آیت میں اور بہت سی آیات قرآنی کی طرح قلب و بصیر صورت جمع (قلوب و ابصار) آئے ہیں جب کہ سمع قرآن میں ہر جگہ مفرد کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو اس فرق میں کوئی نکتہ ہونا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ لفظ سمع قرآن مجید میں ہر جگہ مفرد آیا ہے اور کہیں بھی جمع (اسماع) نہیں آیا لیکن قلب و بصر کبھی جمع کی صورت میں جیسا کہ زیر نظر آیت میں اور کبھی بصورت مفرد جیسے سورۂ جاثیہ آیہ ۲۳ اور سورہ اعراف آیہ ۴۳ میں آیا ہے :

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (جاثیہ ۲۳)

عالم بزرگوار مرحوم شیخ طوسی تفسیر تبیان میں ایک مشہور ادیب کے حوالے سے رقمطراز ہیں :

ممکن ہے اسمع کے مفرد آنے کی ان دو میں سے ایک وجہ ہو :

(۱) سمع کبھی تو اسم جمع کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ اسم جمع میں جمع کے معنی ہوتے ہیں لہٰذا صیغہ جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) سمع میں یہ گنجائش ہے کہ وہ مصدری معنی رکھتا ہو اور ہم جانتے ہیں کہ مصدر کم یا زیادہ ہو دو پر دلالت



کرتا ہے لہٰذا جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ ایک وجہ ذوق وعلم کے اعتبار سے بھی بیان کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ادراکات قلبی اور مشاہدات چشم ان امور کی نسبت زیادہ ہیں جو سماعت میں آتے ہیں اس اختلاف کی بناء پر قلوب وابصار جمع کی شکل میں آیا ہے لیکن سمع مفرد کی صورت میں۔ ماڈرن فزکس کے مطابق امواج صوتی جو قابل سماعت ہیں نسبتاً تعداد میں محدود ہیں اور وہ چند ہزار سے زیادہ نہیں جبکہ امواج نور ورنگ جو قابل رویت ہیں کئی بلین سے زیادہ ہیں (یہ بات غور طلب ہے)۔

۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

۹۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

۱۰۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

۱۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝

۱۲۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

۱۳۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۴۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝

۱۵۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

۱۶۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ
وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم خدا اور روز قیامت پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں۔



۹۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا اور مومنین کو دھوکا دیں مگر وہ اس طرح اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔
۱۰۔ ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور خدا کی طرف سے اس بیماری کو بڑھا دیا جاتا ہے اور ان کی کذب بیانیوں کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
۱۱۔ جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔
۱۲۔ آگاہ رہو یہ سب مفسدین ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔
۱۳۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ جان لو کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔
۱۴۔ اور جب ایماندار لوگوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لا چکے ہیں لیکن جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں (ان سے تو) ہم تمسخر کرتے ہیں۔
۱۵۔ خداوند عالم ان سے استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ سرگرداں رہیں۔
۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی ہے حالانکہ یہ تجارت ان کے لئے نفع مند نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

تیسرا گروہ ــــ منافقین

زیر نظر آیات منافقین کے سلسلے میں مکمل اور بہت پُرمغز تشریح کی حامل ہیں۔ ان میں ان کی روحانی شخصیات اور اعمال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی کچھ وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اسلام کو ایک ایسے گروہ کا سامنا کرنا پڑا جو ایمان لانے کے لئے جذبۂ خلوص رکھتے تھے نہ صریح مخالفت کی جرأت کرتے تھے۔ قرآن اس گروہ کو "منافقین" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فارسی میں ہم دورو یا دوچہرہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقی مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ شمار ہوتے تھے۔ چونکہ ان کا ظاہر اسلامی تھا لہٰذا ان کی شناخت مشکل تھی لیکن قرآن ان کی باریک اور زندہ علامات بیان کرتا ہے تاکہ ان کی باطنی کیفیت کو مشخص کر دے۔ اس سلسلے میں قرآن ہر زمانے اور قرن کے مسلمانوں کو ایک نمونہ دے رہا ہے۔

پہلے تو نفاق کی تفسیر بیان کی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور قیامت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ ان میں ایمان نہیں ہے۔ (ومن الناس من یقول اٰمنا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر وما ھو بمؤمنین)

وہ اپنے اس عمل کو ایک قسم کی چالاکی اور عمدہ تکنیک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے اس عمل سے خدا اور مومنین کو دھوکہ دیں (یخٰدعون اللّٰہ والذین اٰمنوا)۔

حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں (وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون)۔



وہ صحیح راستے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر عمر کا ایک حصہ بے راہ روی میں گذار دیتے ہیں، اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو برباد کر دیتے ہیں اور ناکامی و بدنامی اور عذاب الٰہی کے علاوہ انہیں کچھ نہیں ملتا۔

اس کے بعد اگلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفاق درحقیقت ایک قسم کی بیماری ہے کیونکہ صحیح سالم انسان کا صرف ایک چہرہ ہوتا ہے۔ اس کے جسم و روح میں ہم آہنگی ہوتی ہے کیونکہ ظاہر و باطن، جسم و روح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اگر کوئی مومن ہے تو اس کا پورا وجود ایمان کی صدا بلند کرتا ہے اور اگر ایمان سے منحرف ہے تب بھی اس کا ظاہر و باطن انحراف کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ جسم و روح میں صوتی ایک دردِ نو اور اضافی بیماری ہے۔ یہ ایک طرح کا تضاد، ناہم آہنگی اور ایک دوسرے سے دُوری ہے جو وجودِ انسانی پر حکمران ہے۔

قرآن کہتا ہے ان کے دلوں میں ایک خاص بیماری ہے (فی قلوبھم مرض)۔

نظام آفرینش میں جو شخص کسی راستے پر چلتا ہے اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کیے رکھتا ہے تو وہ یقیناً آگے بڑھتا رہتا ہے یا بہ الفاظ دیگر ایک ہی میسر راستے پر چلنے والے انسان کے اعمال و افکار کا حجم اس میں زیادہ رنگ بھرتا ہے اور اسے زیادہ راسخ کرتا ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے، خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے (فزادھم اللّٰہ مرضاً)۔

چونکہ منافقین کا اصل سرمایہ جھوٹ ہے لہٰذا ان کی زندگی میں جو تناقضات رونما ہوتے ہیں وہ ان کی توجیہہ کرتے رہتے ہیں۔ آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے، ان کی ان دروغ گوئیوں کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون)۔

اس کے بعد ان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے پہلی اصلاح طلبی کا دعویٰ کرنا ہے حالانکہ حقیقی فسادی وہی ہیں "جب ان سے کہا جائے کہ روئے زمین پر فساد نہ کرو تو وہ اپنے تئیں مصلح بتاتے ہیں (واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون) اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا تو زندگی میں اصلاح کے علاوہ کبھی کوئی مقصد رہا ہے نہ اب ہے۔

اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے، جان لو کہ یہ سب مفسد ہیں اور ان کا پروگرام فساد کے سوا کچھ نہیں، لیکن وہ خود بھی شعور سے تہی دامن ہیں۔ (الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون)۔

ان کے اصرار نفاق میں پختگی اور اس باعثِ ننگ و عار کام کی عادت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ گمان کرنے لگے ہیں کہ یہی پروگرام تربیت و اصلاح کے لئے مفید ہے جیسے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگر گناہ ایک حد سے بڑھ جائے تو پھر انسان سے حسِ تشخیص چھن جاتی ہے بلکہ اس کی تشخیص برعکس ہو جاتی ہے اور ناپاکی و آلودگی اس کی طبیعت ثانوی بن جاتی ہے۔

ایسے لوگوں کی دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عاقل و ہوشیار اور مومنین کو بیوقوف، سادہ لوح اور جلد دھوکا کھانے والے سمجھتے ہیں۔ جیسے قرآن کہتا ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ ایمان لے آؤ جس طرح باقی لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں (واذا قیل لھم اٰمنوا کما اٰمن الناس قالوا انؤمن کما اٰمن السفھاء)

اس طرح وہ ان پاک دل، حق طلب اور حقیقت افراد کو حماقت و بیوقوفی سے متہم کرتے ہیں جو دعوتِ پیغمبر اور ان کی تعلیمات میں آثارِ حقانیت کا مشاہدہ کر کے سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۔ اپنی شیطنت، دورُخی اور نفاق کو ہوش و عقل اور درایت



کی دلیل سمجھتے ہیں گویا ان کی منطق میں عقل نے بے عقلی کی جگہ لے لی ہے اسی لئے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: جان لو کہ واقعی بیوقوف یہی لوگ ہیں لیکن وہ جانتے نہیں (الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون)۔

کیا یہ بیوقوفی نہیں کہ انسان اپنی زندگی کے مقصد کا تعین نہ کر سکے اور ہر گروہ میں اس گروہ کا رنگ اختیار کر کے داخل ہو اور یکسانیت و شخصی وحدت کی بجائے دوگانگی یا کئی ایک بہروپ قبول کر کے اپنی استعداد اور قوت کو شیطنت، سازش اور تخریب کاری کی راہ میں صرف کرے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو عقلمند سمجھے۔

اُن کی تیسری نشانی یہ ہے کہ ہر روز کسی نئے رنگ میں نکلتے ہیں اور ہر گروہ کے ساتھ ہم صدا ہوتے ہیں جس طرح قرآن کہتا ہے: جب وہ اہل ایمان سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں (واذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا) ہم تم میں سے ہیں ایک ہی مکتب کے پیروکار ہیں اور دل و جان سے اسلام قبول کر چکے ہیں اور تمہیں غیر نہیں سمجھتے۔

لیکن جب اپنے شیطان صفت دوستوں کی خلوت گاہ میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں (واذا خلوا الیٰ شیطینھم قالوا انا معکم) اور یہ جو ہم مومنین سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں یہ تو تمسخر و استہزا ہے (انما نحن مستھزءون) ان کے افکار و اعمال پر دل میں تو ہم ہنستے ہیں یہ سب ان سے مذاق ہے ورنہ ہمارے دوست، ہمارے محرم راز اور ہمارا سب کچھ تو آپ لوگ ہیں۔

اس کے بعد قرآن ایک سخت اور دو ٹوک لب و لہجے کے ساتھ کہتا ہے: خدا ان سے تمسخر کرتا ہے (اللہ یستھزئ بھم) اور خدا انہیں ان کے طغیان و سرکشی میں رکھے گا تاکہ وہ کاملاً سرگرداں رہیں (ویمدھم فی طغیانھم یعمھون)۔[1]

موردِ بحث آیات میں سے آخری ان کی آخری سرنوشت ہے جو بہت غم انگیز اور تاریک ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس تجارت خانہ عالم میں ہدایت کے لے گمراہی کو خرید لیا ہے (اولٰئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدٰی) اسی وجہ سے ان کی تجارت نفع مند نہیں بلکہ سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں (فما ربحت تجارتھم) اور کبھی بھی انہوں نے ہدایت کا چہرہ نہیں دیکھا (وما کانوا مھتدین)۔

چند اہم نکات

(۱) نفاق کی پیدائش اور اس کی جڑیں: جب کسی علاقے میں کوئی انقلاب آتا ہے خصوصاً اسلام جیسا انقلاب جس کی بنیاد حق و عدالت پر ہے تو مسلماً غارت گروں، ظالموں اور خود سروں کے منافع کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو وہ پہلے پہل تمسخر سے پھر مسلح قوت، اقتصادی دباؤ اور مسلسل اجتماعی پراپیگنڈہ سے کام لیتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ انقلاب کو درہم برہم کر دیں۔

جب انقلاب کی کامیابی کا پرچم علاقے کی قوتوں کو سربلند نظر آتا ہے تو مخالفین کا ایک گروہ اپنی تکنیک اور روش ظاہری کو بدل دیتا ہے اور ظاہراً انقلاب کے سامنے جھک جاتا ہے لیکن وہ زیر زمین مخالفت کا پروگرام تشکیل دیتا ہے۔

---

[1] "یعمھون" مادہ "عمہ" سے ہے (بر وزن "ہمہ") جو تردد یا کسی کام میں متحیر ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کوردلی، تاریکی بصیرت کے معنی میں بھی مستعمل ہے جس کا اثر سرگردانی ہے۔ مفردات راغب، تفسیر منار اور قاموس اللغۃ کی طرف رجوع کیا جائے۔



یہ لوگ جو دو مختلف چیزوں کی وجہ سے منافق کہلاتے ہیں انقلاب کے خطرناک ترین دشمن ہیں (منافق کا مادہ "نفق" ہے بر وزن "شفق" ہے جس کے معنی زیرِ زمین نقب اور سرنگ کے ہیں جس سے چھپنے یا بھاگنے کا کام لیا جاتا ہے) ان کا موقف پورے طور پر مشخص نہیں ہوتا لہٰذا انقلابی انہیں پہچان نہیں پاتے کہ خود سے انہیں دور کر دیں وہ لوگ پاک باز اور سچے لوگوں میں گھس جاتے ہیں یہاں تک کہ کبھی کبھی اہم ترین پوسٹ پر جا پہنچتے ہیں۔

جب تک پیغمبرِ اسلامؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی اور مسلمانوں کی حکومت تشکیل نہیں پائی تھی ایسا گروہ سرگرمِ عمل نہیں ہوا لیکن نبی اکرمؐ جب مدینہ میں آگئے تو حکومتِ اسلامی کی بنیاد رکھی گئی اور جنگ بدر کی کامیابی کے بعد یہ معاملہ زیادہ واضح ہو گیا یعنی رسمی طور پر ایک چھوٹی سی حکومت جو قابلِ رشد تھی، قائم ہو گئی۔

یہ وہ موقع تھا کہ مدینہ کے گدی نشینوں خصوصاً یہودیوں کے (جو اس زمانے میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے) بہت سے منافع خطرے میں پڑ گئے۔

اس زمانے میں یہودیوں کا زیادہ احترام اس وجہ سے تھا کہ وہ اہلِ کتاب اور نسبتاً پڑھے لکھے لوگ تھے اور وہ اقتصادی طور پر بھی آگے تھے حالانکہ یہی لوگ ظہورِ پیغمبرؐ سے پہلے اس قسم کے امور کی خوش خبری دیتے تھے۔ مدینہ میں کچھ اور لوگ بھی تھے جن کے سر میں لوگوں کی سرداری کا سودا سمایا ہوا تھا۔ لیکن رسولِ خداؐ کی ہجرت سے ان کے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

ظالم سرداروں، سرکشوں اور ان غارت گروں کے حمایتیوں نے دیکھا کہ عوام تیزی سے نبی اکرمؐ پر ایمان لا رہے ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب بھی ایک عرصے تک مقابلہ کرتے رہے لیکن آخرکار انہیں بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ظاہراً مسلمان ہو جائیں۔ کیونکہ علمِ مخالفت بلند کرنے میں جنگی مشکلات اور اقتصادی صدمات کے علاوہ ان کی نابودی کا خطرہ تھا خصوصاً عرب کی پوری قوت بھی آپؐ کے ساتھ تھی اور ان لوگوں کے قبیلے بھی ان سے جدا ہو چکے تھے۔

اس بناء پر انہوں نے تیسرا راستہ انتخاب کیا اور وہ یہ کہ ظاہراً مسلمان ہو جائیں اور مخفی طور پر اسلام کو برباد کرنے کا منصوبہ بنائیں۔

خلاصہ یہ کہ کسی معاشرے میں نفاق کے ظہور کی ان دو وجوہ میں سے ایک ہوتی ہے:

(۱) کسی انقلاب کی کامیابی اور معاشرے پر اس کا تسلط

(۲) نفسیاتی کمزوری اور سخت حوادث کے مقابلے میں جرأت و ہمت کا فقدان

(۲) ہر معاشرے میں منافقین کی پہچان ضروری ہے: اس میں شک و شبہ نہیں کہ نفاق اور منافق زمانہ پیغمبرؐ سے مخصوص نہ تھے بلکہ ہر معاشرے میں اس گروہ کا وجود ہوتا ہے البتہ ضروری ہے کہ قرآن کے دیے ہوئے معیار کی بنیاد پر ان کی پہچان کی جائے تاکہ وہ کوئی نقصان یا خطرہ پیدا نہ کر سکیں۔ زیرِ مطالعہ آیات کے علاوہ سورۂ منافقون اور روایاتِ اسلامی میں انکی مختلف نشانیاں بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) زیادہ شور شرابہ اور بڑے بڑے دعوے ــــ باتیں بہت، عمل کم اور قول و فعل میں تضاد ہونا۔

(۲) ہر جگہ کے رنگ کو اپنا لینا اور ہر گروہ کے ساتھ ان کے ذوق کے مطابق گفتگو کرنا۔ مومنین سے "آمنا" کہنا اور مخالفین سے



" انا معکم "۔

(iii) عوام سے اپنے آپ کو الگ رکھنا، خفیہ انجمنیں قائم کرنا اور پوشیدہ منصوبے بنانا۔

(iv) دھوکا دہی، مکر و فریب، جھوٹ، تملق، چاپلوسی، پیمان شکنی اور خیانت کی راہ چلنا۔

(v) اپنے تئیں بڑا سمجھدار گردانا اور دوسروں کو ناسمجھ، بیوقوف اور نادان قرار دینا۔

خلاصہ یہ کہ دو رخی اور اندرونی و بیرونی تضاد منافقین کی واضح صفت ہے۔ ان کا انفرادی و اجتماعی چال چلن ایسا ہوتا ہے جس سے انہیں واضح طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم کی یہ تعبیر کتنی عمدہ ہے کہ " ان کے دل بیمار ہیں" (فی قلوبھم مرض)۔ کون سی بیماری ظاہر و باطن کے تضاد سے بدتر ہے اور کون سی بیماری اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور سخت حوادث کے مقابلے سے فرار سے بڑھ کر ہے۔

جیسے دل کی بیماری جتنی بھی پوشیدہ ہو اسے کاملاً مخفی نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس کی علامات انسان کے چہرے اور تمام اعضاء بدن سے آشکار ہوتی ہیں۔ نفاق کی بیماری بھی اسی طرح ہے جو مختلف مظاہر کے ساتھ قابلِ شناخت ہے اور اندرونی نفاق کی بیماری کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔

تفسیر نمونہ سورۂ نساء آیت ۱۴۱ تا ۱۴۳ میں بھی صفاتِ منافقین کے بارے میں بحث کی گئی ہے نیز سورہ توبہ آیت ۴۹ تا ۵۰ کے ذیل میں بھی اس سلسلے میں کافی بحث ہے اور سورہ توبہ آیت ۶۱ تا ۶۸ کے ذیل میں بھی ایسی ابحاث موجود ہیں۔

(۳) معنیٔ نفاق کی وسعت: اگرچہ نفاق اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے ان بے ایمان لوگوں کے لئے ہے جو ظاہراً مسلمانوں کی صف میں داخل ہوں لیکن باطنی طور پر کفر کے دلدادہ ہوں لیکن نفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے ظاہر و باطن اور گفتار و کردار کے تضاد پر محیط ہے چاہے یہ چیز مومن افراد میں پائی جائے جنہیں ہم "دو رگہ ہائے نفاق" (یعنی - ایسے انسان یا حیوان جن کے ماں باپ مختلف نسل سے ہوں) کہتے ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے:

ثلاث من کن فیہ کان منافقاً و ان صام وصلی و زعم انہ مسلم من اذا ائتمن خان و اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف۔

تین صفات ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں وہ منافق ہے چاہے وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے (اور وہ صفات یہ ہیں) جب امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، بات کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے [1]۔

مسلّم ہے کہ ایسے اشخاص اس خاص معنی کے لحاظ سے منافق نہیں تاہم نفاق کی جڑیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً ریاکاری کے بارے میں امام صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

الریاء شجرة لا تثمر الا الشرك الخفی و اصلها النفاق

یعنی — ریاکاری و دکھاوا ایسا (تلخ) درخت ہے جس کا پھل شرکِ خفی کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کی

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۶۰۵



اصل اور جڑ نفاق ہے۔[1]

یہاں ہم آپ کی توجہ امیرالمؤمنین علیؑ کے ایک ارشاد کی طرف دلاتے ہیں جو منافقین کے متعلق ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

اے خدا کے بندو! تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں اور منافقین سے ڈراتا ہوں کیونکہ وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، خود خطاکار ہیں اور دوسروں کو خطاؤں میں ڈالتے ہیں، مختلف رنگ اختیار کرتے ہیں، مختلف چہروں اور زبانوں سے خودنمائی کرتے ہیں، ہر طریقے سے تمہیں پھانسنے اور برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کمین گاہ میں تمہارے شکار کے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن کا ظاہر اچھا اور باطن خراب ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے خفیہ چال چلتے ہیں۔ ان کی گفتگو ظاہراً تو شفا بخش ہے لیکن ان کا کردار ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ لوگوں کی خوش حالی اور آسائش پر حسد کرتے ہیں اور اگر کسی پر مصیبت آن پڑے تو خوش ہوتے ہیں۔ امید رکھنے والوں کو مایوس کر دیتے ہیں۔ ہر راستے میں ان کا کوئی نہ کوئی مقتول ہے۔ ہر دل میں ان کی راہ ہے اور ہر مصیبت پر آنسو بہاتے ہیں۔ مدح و ثنا ایک دوسرے کو بطور قرض دیتے ہیں اور جزا و عوض کے منتظر رہتے ہیں اگر کوئی چیز لینی ہو تو اصرار کرتے ہیں اور اگر کسی کو ملامت کریں تو اس کی پردہ دری کرتے ہیں۔[2]

(۴) منافقین کی حوصلہ شکنیاں: نہ صرف اسلام بلکہ ہر انقلابی اور ارتقاپسند آئین و دین کے لئے منافقین خطرناک ترین گروہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس جاتے ہیں اور حوصلہ شکنی کے لئے ہر موقع کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ کبھی سچے مومنین کا اس پر بھی تمسخر اڑاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مختصر سرمایہ راہِ خدا میں خرچ کیا ہے جیسے قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ اِلَّا جُهۡدَهُمۡ فَیَسۡخَرُوۡنَ مِنۡهُمۡ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ ۫ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ

وہ مخلصین مومنین کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ انہوں نے (اپنے مختصر سرمایہ کو بے ریا راہِ خدا میں) خرچ کیا۔ خدا ان سے استہزاء کرتا ہے اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ (توبہ۔ ۷۹)

کبھی وہ اپنی خفیہ میٹنگوں میں فیصلہ کرتے کہ رسولِ خدا کے اصحاب سے مالی امداد کلی طور پر منقطع کر دیں اور آپؐ سے الگ ہو جائیں جیسے سورہ منافقون میں ہے۔

هُمُ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰی مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنۡفَضُّوۡا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لٰکِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَفۡقَهُوۡنَ ○

وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ جو لوگ ہیں ان سے مالی امداد منقطع کر دو تاکہ وہ آپؐ کے گرد و پیش سے

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱، مادہ ورق

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۴



منتشر ہو جائیں۔ جان لو کہ آسمان و زمین کے خزانے خدا کے لئے ہیں لیکن منافق نہیں جانتے۔ (منافقون۔۷)
کبھی یہ فیصلہ کرتے تھے کہ جنگ سے مدینہ واپس پہنچنے پر متحد ہو کر مناسب موقع پر مومنین کو مدینہ سے نکال دیں گے اور کہتے تھے:

لَئِن رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ

اگر ہم مدینہ کی طرف پلٹ گئے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے۔ (منافقون۔۸)
کبھی مختلف بہانے بنا کر (مثلاً فصل کے محصولات کی جمع آوری کا بہانہ) جہاد کے پروگرام میں شریک نہ ہوتے تھے اور سخت مشکلات کے وقت نبی اکرم کو تنہا چھوڑ دیتے تھے اور ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے مبادا اس طرح انہیں رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

ان کی معاندانہ حوصلہ شکنیوں کی وجہ سے قرآن مجید نے اُن پر سخت وار کئے ہیں اور قرآن مجید کی ایک سورت (منافقون) ان کے طور طریقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، توبہ، حشر اور بعض دوسری سورتوں میں بھی انہیں ملامت کی گئی ہے اور اسی سورہ بقرہ کی تیرہ آیات انہی کی صفات اور انجام بد سے متعلق ہیں۔

(۵) **وجدان کو دھوکا دینا:** مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی مشکل منافقین سے رابطے کے سلسلے میں تھی کیونکہ ایک طرف تو وہ مامور تھے کہ جو شخص اظہار اسلام کرے کشادہ روئی سے استقبال کیا جائے اور ان کے عقائد کے سلسلے میں جستجو اور تفتیش نہ کی جائے اور دوسری طرف منافقین کے منصوبوں کی نگرانی کا کام تھا۔ منافق اپنے تئیں جب حق کا ساتھی اور ایک فرد مسلمان کی حیثیت سے متعارف کرواتا تو اس کی بات قبول کرنا پڑتی جب کہ باطنی طور پر وہ اسلام کے لئے سد راہ ہوتا اور اس کے خلاف سوگند کھائے ہوئے دشمنوں میں سے ہوتا۔ یہ گروہ اس راہ کو اپنا کر اس زعم میں تھا کہ خدا اور مومنین کو ہمیشہ دھوکا دے سکے گا۔ حالانکہ یہ لوگ لاشعوری طور پر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

یخدعون اللہ والذین اٰمنوا کی تعبیر دقیق معنی دیتی ہے (مخادعہ کے معنی ہیں دونوں طرف سے دھوکہ دینا) یہ لوگ ایک طرف تو کور باطنی کی وجہ سے اعتقاد رکھتے تھے کہ نبی اکرم دھوکہ باز ہیں اور انہوں نے حکومت کے لئے دین و نبوت کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور سادہ لوح لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں لہٰذا ان کے مقابلے میں دھوکا ہی کرنا چاہیئے۔ اس بنا پر ان منافقین کا کام ایک طرف تو دھوکا فریب تھا دوسری طرف نبی اکرم کے بارے میں اس قسم کا غلط اعتقاد رکھتے تھے لیکن جملہ "وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون" ان کے دونوں ارادوں کو خاک میں ملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ جملہ ایک طرف تو یہ ثابت کرتا ہے کہ دھوکا و فریب صرف انہی کی طرف سے ہے۔ دوسری طرف کہتا ہے کہ اس فریب کی بازگشت بھی انہی کی طرف ہے لیکن وہ سمجھتے نہیں ان کا اصلی سرمایہ جو حصول سعادت کے لئے خدا نے ان کے وجود میں پیدا کیا ہے وہ اسے دھوکا و فریب کی راہ میں برباد کر رہے ہیں اور ہر خیر و نیکی سے تہی دامن اور گناہوں کا بھاری بوجھ اٹھائے دنیا سے جا رہے ہیں۔

کوئی شخص بھی خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ظاہر و باطن سے باخبر ہے اس بنا پر یخدعون اللہ سے تعبیر کرنا اس لحاظ سے ہے کہ رسول خدا اور مومنین کو دھوکا دینا خدا کو دھوکا دینے کی طرح ہے (دوسرے مواقع پر بھی قرآن میں ہے کہ خدا نے



عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ اور مومنین کی تنظیم کیلئے خود کو ان کی صف میں بیان کرتا ہے) یا پھر یہ لوگ صفاتِ خدا کو نہ پہچاننے کی وجہ سے اپنی کوتاہ و ناقص نکر سے واقعاً یہ سمجھتے تھے کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے پوشیدہ ہو ایسی نظیر قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

بہر حال زیر نظر آیت وجدان کو دھوکا دینے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گمراہ اور گناہ سے آلودہ انسان برے اور غلط اعمال کے مقابلے میں وجدان کی سزا و سرزنش سے بچنے کے لئے اسے دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے تئیں مطمئن کر لیتا ہے کہ نہ صرف اس کا عمل برا اور قبیح نہیں بلکہ باعث اصلاح ہے اور فساد کے مقابلے میں ہے (انما نحن مصلحون)۔ یہ اس لئے کہ وجدان کو دھوکا دے کر اطمینان سے غلط کام کو جاری رکھ سکے۔

امریکہ کے ایک صدر کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب اس سے سوال کیا گیا کہ اس نے جاپان کے دو بڑے شہروں (ہیروشیما اور ناگاساکی) کو ایٹم بم سے تباہ کرنے کا حکم کیوں دیا تھا جب کہ اس سے دو لاکھ افراد بچے، بوڑھے اور جوان ہلاک یا ناقص الاعضاء ہو گئے تو اس نے جواب دیا تھا کہ اگر ہم یہ کام نہ کرتے تو جنگ طویل ہو جاتی اور پھر زیادہ افراد کو قتل کرنا پڑتا۔

گویا ہمارے زمانے کے منافق بھی اپنے وجدان یا لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ایسی باتیں اور ایسے بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ جنگ جاری رکھنے یا شہر کو ایٹم بم سے اڑانے کے علاوہ تیسری واضح راہ بھی تھی وہ یہ کہ توسیع پسندی سے ہاتھ اٹھا لیں اور قوموں کو ان کے ملکوں کے سرمائے کے ساتھ آزاد رہنے دیں۔

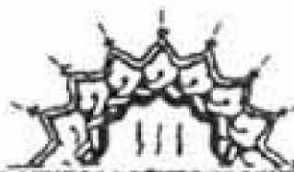
نفاق حقیقت میں وجدان کو فریب دینے کا وسیلہ ہے۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ انسان اس اندرونی واعظ، ہمیشہ بیدار و پہریدار اور خدا کے باطنی نمائندے کا گلا گھونٹ دے یا اس کے چہرے پر اس طرح پردہ ڈال دے کہ اس کی آواز کان تک نہ پہنچے۔

(۶) نقصان دہ تجارت: اس دنیا میں انسان کی کارگزاریوں کو قرآن مجید میں بارہا ایک قسم کی تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے اور حقیقت میں ہم سب اس جہان میں تاجر ہیں اور خدا نے ہمیں عقل، فطرت، احساسات، مختلف جسمانی قوی، نعمات دنیا طبیعت اور سب سے آخر میں انبیاء کی رہبری کا عظیم سرمایہ عطا فرما کر تجارت کی منڈی میں بھیجا ہے۔ ایک گروہ نفع اٹھاتا ہے اور کامیاب و سعادت مند ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا گروہ نہ صرف یہ کہ نفع حاصل نہیں کرتا بلکہ اصل سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے اور مکمل دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ پہلے گروہ کا کامل نمونہ مجاہدین راہ خدا ہیں جیسا کہ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ

اے ایمان والو! کیا تمہیں ایسی تجارت کی راہنمائی نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے (اور سعادت ابدی کا ذریعہ ہو) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس کی راہ میں مال و جان سے جہاد کرو۔

(صف ۱۰، ۱۱)



دوسرے گروہ کا واضح نمونہ منافقین ہیں۔ منافقین جو مخرب اور مفسد کام اصلاح و عقل کے لباس میں انجام دیتے تھے۔ قرآن گذشتہ آیات میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا ہے اور یہ تجارت اُن کے لئے نفع بخش ہے نہ ہی باعثِ ہدایت۔ وہ لوگ ایسی پوزیشن میں تھے کہ بہترین راہ انتخاب کرتے۔ وہ وحی کے خوشگوار اور میٹھے چشمے کے کنارے موجود تھے اور ایسے ماحول میں رہتے تھے جو صدق و صفا اور ایمان سے لبریز تھا۔

بجائے اس کے کہ وہ اس خاص موقع سے بڑا فائدہ اٹھاتے جو طویل صدیوں میں ایک چھوٹے سے گروہ کو نصیب ہوا، انہوں نے ایسی ہدایت کھو کر گمراہی خرید لی جو اُن کی فطرت میں تھی اور وہ ہدایت جو وحی کے ماحول میں موجزن تھی۔ ان تمام سہولتوں کو وہ اس گمان میں ہاتھ سے دے بیٹھے کہ اس سے وہ مسلمانوں کو شکست دے سکیں گے اور خود اُن کے گندے دماغوں میں پرورش پلنے والے بُرے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں گے جبکہ اس معاملے اور غلط انتخاب میں انہیں دو بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا:

(i) ایک یہ کہ ان کا مادی اور معنوی دونوں قسم کا سرمایہ تباہ ہو گیا اور اس سے انہیں کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا۔

(ii) دوسرا یہ کہ وہ اپنے غلط مطمعِ نظر کو پا بھی نہ سکے کیونکہ اسلام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور صفحۂ ہستی پر محیط ہو گیا اور یہ منافقین بھی رسوا ہو گئے۔

۱۷۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ
بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ○

۱۸۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ○

۱۹۔ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ
فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ○

۲۰۔ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَا
أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ ع ۲

ترجمہ

۱۷۔ وہ (منافقین) اس شخص کی مثل ہیں جس نے آگ روشن کی ہو (تاکہ تاریک بیابان میں اسے راستہ مل جائے) مگر جب آگ سے سب اطراف روشن ہو گئیں تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج کر) اسے خاموش کر دیا اور ایسی وحشت ناک تاریکی مسلط کی جس میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔



۱۸۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں لہٰذا خطا کاری کے راستے سے پلٹیں گے نہیں۔

۱۹۔ یا پھر ان کی مثال ایسی ہے کہ بارش شب تاریک میں گھن گرج، چمک اور بجلیوں کے ساتھ رہگذاروں کے سروں پر برس رہی ہو اور وہ موت کے خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تاکہ بجلی کی آواز سے بچیں اور یہ سب کافر خدا کے احاطۂ قدرت میں ہیں۔

۲۰۔ قریب ہے کہ بجلی کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو چندھیا دے۔ جب بھی بجلی چمکتی ہے اور (صفحۂ بیابان کو) ان کے لئے روشن کر دیتی ہے تو وہ (چند گام) چل پڑتے ہیں اور جب وہ خاموش ہو جاتی ہے تو رک جاتے ہیں اور اگر خدا چاہے تو اُن کے کان اور آنکھیں تلف کر دے (کیونکہ) یقیناً ہر چیز خدا کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔

تفسیر

منافقین کے حالات واضح کرنے کیلئے دو مثالیں:

منافقین کی صفات و خصوصیات بیان کرنے کے بعد قرآن مجید ان کی کیفیت کی تصویر کشی کے لئے زیر نظر آیات میں دو واضح مثالیں اور تشبیہیں بیان کرتا ہے:

(۱) پہلی مثال میں ہے کہ وہ اس شخص کی مانند ہیں جس نے (سخت تاریک رات میں) آگ روشن کی ہو تاکہ اس کی روشنی میں سیدھے اور ٹیڑھے راستے کی پہچان کر سکے اور منزل مقصود تک پہنچ جائے (مثلھم کمثل الذی استوقد نارا) مگر جب آگ کے شعلوں نے گرد و پیش کو روشن کر دیا تو خداوند عالم نے اسے بجھا دیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا اس عالم میں کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے (فلما اضاءت ما حولہ ذھب اللہ بنورھم و ترکھم فی ظلمات لا یبصرون) وہ سمجھتے تھے کہ اس تھوڑی سی آگ اور اس کی روشنی سے تاریکیوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہ سکیں گے مگر اچانک آندھی اٹھی یا سخت بارش برسی یا ایندھن ختم ہو گیا اور آگ سردی اور خاموشی میں بدل گئی یوں وہ دوبارہ وحشت ناک تاریکی میں سرگرداں ہو گئے اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں اور چونکہ ادراکِ حقائق کا کوئی وسیلہ ان کے پاس نہیں رہا لہٰذا وہ اپنے راستے سے پلٹیں گے نہیں (صم، بکم عمی فھم لا یرجعون) یہ کس قدر باریک اور واضح مثال ہے۔ انسانی زندگی میں ٹیڑھے راستے تو بہت ہیں لیکن خط مستقیم جو منزل مقصود تک پہنچتا ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں، لیکن ٹیڑھے خط تو بہت ہیں علاوہ ازیں اس راستے میں تاریکیوں کے پردے، وحشتناک طوفان اور قسم قسم کے حوادث ہیں لہٰذا ایک ایسے روشن چراغ کی ضرورت ہے جو ان حوادث سے محفوظ رہ سکے وہ تاریکی کے پردوں کو چاک کر سکے اور طوفانوں کا مقابلہ کر سکے اور ایسا چراغ سوائے چراغ عقل و ایمان اور خورشیدِ وحی کے کوئی اور نہیں۔

مختصر شعلہ جو انسان وقتی طور پر روشن کرتا ہے وہ اس طویل مسافت میں جس میں طوفان ہی طوفان ہیں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

منافقین نفاق کی راہ انتخاب کرکے یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر حال میں اپنی حیثیت و وجاہت کی حفاظت کر سکیں گے اور ہر احتمالی خطرے سے محفوظ رہ سکیں گے اور دونوں طرف سے منافع سمیٹ لیں گے اور جو گروہ بھی غالب ہوگا ہمیں اپنے میں سے سمجھے گا اگر



مومن کامیاب ہوئے تو مومنین کی صف میں اور اگر کافر غالب رہے تو ان کے ساتھ۔

وہ اپنے آپ کو چالاک اور ہوشیار سمجھتے تھے اور اس کمزور و ناپائیدار شعلے کی روشنی میں اپنی روحیات پر ہمیشہ کے لئے چلنا چاہتے تھے تاکہ خوشحالی تک جا پہنچیں لیکن قرآن نے انہیں بے نقاب کر دیا اور ان کے جھوٹ کو آشکار کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝

جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ آپ اسی کے بھیجے ہوئے ہیں مگر خدا جانتا ہے کہ منافق اپنے اظہارات میں جھوٹے ہیں۔ (منافقون۔ ۱)

یہاں تک کہ قرآن کفار کو بھی واضح کرتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے ساتھ بھی نہیں ہیں وہ جو بھی وعدے کرتے ہیں اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ۝

منافق اہل کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تمہیں مدینے سے باہر نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں کسی کی بات پر کان نہیں دھریں گے اور اگر تمہارے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں اگر انہیں باہر کیا گیا تو یہ ان کے ساتھ باہر نہیں جائیں گے اور اگر ان (کافروں) سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے یہ تو (محاذ جنگ سے) بھاگ جائیں گے اور ثابت قدم نہیں رہیں گے۔ (حشر۔ ۱۱، ۱۲)

قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن نے جملہ "استوقد ناراً" سے استفادہ کیا ہے یعنی وہ نور تک پہنچنے کے لئے نار کا سہارا لیں گے وہ آگ کہ جس میں دھواں، خاکستر اور سوزش ہے جب کہ مومنین خالص نور اور ایمان کے روشن و پُر فروغ چراغ سے بہرہ ور ہیں۔ منافقین اگرچہ نور ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا باطن نار سے پُر ہے اور اگر نور ہو بھی تو کمزور اور تھوڑی مدت کا ہے یہ مختصر نور وجدان و فطرتِ توحیدی کی روشنی کی طرف اشارہ ہے یا ان کے ابتدائی ایمان کی طرف جو بعد میں کورانہ تقلید، غلط تعصب، دشمنی اور عداوت کے نتیجے میں تاریک پردوں کی اوٹ میں چھپ گیا قرآن کی نظروں میں یہ سیاہ پردے ظلمت نہیں بلکہ ظلمات ہیں۔

یہی چیزیں ہیں جو بالآخر ان سے دیکھنے والی آنکھ، سننے والا کان اور بولنے والی زبان چھین لیتی ہیں کیونکہ (جیسا پہلے بھی



کہا جا چکا ہے) غلط راستے پر چلتے رہنا رفتہ رفتہ قوت تشخیص اور ادراک انسانی کو کمزور کر دیتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اُسے حقائق اُلٹ نظر آتے ہیں اس کی نگاہ میں نیک بد ہو جاتا ہے۔ فرشتہ اسے جن نظر آنے لگتا ہے۔ بہر حال یہ تشبیہ درحقیقت نفاق کے سلسلے میں ایک واقعیت کو واضح کرتی ہے اور وہ یہ کہ نفاق و دورخی طویل مدت کے لئے موثر نہیں ہو سکتی۔ منافق تھوڑی مدت تک اسلام کی خوبیوں اور مومنین کی معنویت وحفاظت سے سرفراز رہیں اور کفار سے پوشیدہ دوستی سے بھی بہرہ مند ہوں لیکن یہ ایک شعلۂ ضعیف کی طرح ہے جو بیابانِ تاریک اور ظلماتی طوفانوں کی زد میں ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ ان کا حقیقی چہرہ آشکار ہو جاتا ہے اور کسب مقام و محبوبیت کی بجائے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں دور پھینک دیتے ہیں اور ان کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو سرگرداں ہو جس نے بیابان میں راستہ کھو دیا ہو اور چراغ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیہ ھو الذی جعل الشمس ضیاءً و القمر نورًا (وہ خدا ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بخشا ہے) کی تفسیر میں امام باقرؑ سے اس طرح منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> اضاءت الارض بنور محمد کما تضیئ الشمس فضرب اللہ مثل محمد الشمس ومثل الوصی القمر۔
>
> خداوند عالم نے روئے زمین کو محمدؐ کے وجود سے روشنی بخشی جس طرح آفتاب سے۔ لہٰذا محمدؐ کو آفتاب سے اور اُن کے وصی (علیؑ) کو چاند سے تشبیہ دی ہے۔[1]

یعنی نور ایمان وحی عالمگیر ہے جب کہ نفاق کا کوئی پرتو ہو بھی تو وہ اپنے گرد کے ایک چھوٹے سے دائرے میں اور وہ بھی بہت تھوڑی مدت کے لئے روشنی دیتا ہے (ماحولہٗ)۔

(۲) دوسری مثال میں قرآن ان کی زندگی کو ایک دوسری شکل میں پیش کرتا ہے:

تاریک وسیاہ اور پُر خوف و خطر رات ہے جس میں شدید بارش ہو رہی ہے۔ اُفق کے کناروں سے پُر نور بجلی چمکتی ہے۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اتنی وحشت ناک اور مہیب ہے کہ کانوں کے پردے چاک کئے دیتی ہے۔ وہ انسان جس کی کوئی پناہ گاہ نہیں وسیع و تاریک اور خطرناک دشت و بیابان کے وسط میں حیران و سرگرداں کھڑا ہے۔ موسلا دھار بارش نے اُس کی پشت کو تر کر دیا ہے نہ کوئی جائے امان ہے اور نہ تاریکی چھٹتی ہے کہ قدم اُٹھائے۔

مختصر سی عبارت میں قرآن ایسے مسافر کی نقشہ کشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ منافقین کی حالت یا ایسی ہے جیسے تاریک رات میں سخت بارش گرج چمک اور بجلیوں کے ساتھ رہگذاروں کے سروں پر برس رہی ہو (او کصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق) اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لیتے ہیں تاکہ وحشت ناک بجلیوں کی آواز نہ سنیں (یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت)۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اول، صہ ۳۶



اور آخر میں فرماتا ہے: خداوند عالم کی قدرت کافروں پر محیط ہے وہ جہاں جائیں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں (واللہ محیط بالکافرین)۔

پے در پے بجلیاں صفحۂ آسمان پر کوندتی ہیں۔ بجلیوں کی روشنی آنکھوں کو یوں خیرہ کئے دیتی ہے کہ قریب ہے کہ آنکھوں کو اچک لے (یکاد البرق یخطف ابصارھم)

جب بجلی چمکتی ہے اور صفحۂ بیابان روشن ہو جاتا ہے تو مسافر چند قدم چل لیتے ہیں لیکن فوراً تاریکی ان پر مسلط ہو جاتی اور وہ اپنی جگہ پر رک جاتے ہیں (کلما اضاء لھم مشو فیہ و اذا اظلم علیھم قاموا) وہ ہر لحظہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس وسطِ بیابان میں کوئی پہاڑ دکھائی دیتا ہے نہ درخت نظر پڑتا ہے جو رعد اور برق و صاعقہ کے خطرے کو روک سکے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ بجلی ان پر گرے اور وہ فوراً خاکستر ہو جائیں۔

ہم جانتے ہیں کہ صواعق (آسمانی بجلیاں) زمین سے ابھری ہوئی چیز پر حملہ کرتی ہیں لیکن وسطِ بیابان میں سوائے ان اشخاص کے کوئی اُبھری ہوئی چیز بھی نہیں کہ بجلی اس طرف متوجہ ہو لہٰذا خطرہ یقینی اور حتمی ہے یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کوہستانی علاقو کی نسبت حجاز کے بیاباتوں میں آسمانی بجلی کے انسانوں پر گرنے کا خطرہ نسبتاً کئی گنا زیادہ ہے اس مثال کی اہمیت اس علاقے کے لوگوں کے لئے زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں مضطرب و پریشان اور حیران و سرگرداں اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ بیابان و ریگستان میں نہ راہ سجھائی دیتی ہے نہ کوئی راہنما نظر آتا ہے۔ جس کی راہنمائی میں قدم آگے بڑھا سکیں۔ یہ خطرہ بھی کہ بادلوں کی گرج ان کے کانوں کے پردے پھاڑ دے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی بصارت چھین لے جائے اور ہاں خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھ ختم کر دے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم و ابصارھم ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر)۔

منافق بعینہٖ ان مسافروں کی طرح ہیں۔ مومنین کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اور وہ سخت سیلاب اور موسلا دھار بارش کی طرح ہر طرف سے آگے بڑھ رہے ہیں انکے درمیان یہ منافق موجود ہیں افسوس کہ انہوں کے قابل اطمینان پناہ گاہ 'ایمان' سے پناہ نہیں لی تاکہ عذاب الٰہی کی فنا کر دینے والی بجلیوں سے نجات پا سکیں۔

مسلمانوں کا مسلح جہاد دشمنوں کے مقابلے میں رعد و صاعقہ کی سخت آواز کی طرح ان کے سر پر آ پڑتا ہے کبھی کبھی راہِ حق پیدا کرنے کے مواقع انہیں نصیب ہوتے کہ کچھ افکار بیدار ہوں مگر افسوس کہ یہ بیداری آسمانی بجلی کی طرح دیر پا نہ رہتی چند ہی قدم چلتے تو بجھ جاتی اور غفلت کی تاریکی پھر توقف و سرگردانی کی جگہ لے لیتی۔

اسلام کی تیز پیش رفت آسمانی بجلی کی طرح ان کی آنکھوں کو خیرہ کر چکی تھی اور آیاتِ قرآنی ان کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھا دیتی تھیں اور بجلیوں کی طرح انہیں اپنا ہدف بناتی تھیں۔ انہیں ہر وقت احتمال ہوتا کہ کہیں کوئی آیت نازل ہو کر ان کے کسی اور راز سے پردہ نہ اٹھا دے اور وہ زیادہ رسوا نہ ہو جائیں۔

جیسا کہ قرآن سورہ توبہ، آیت ۶۴ میں فرماتا ہے:



يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ○

منافق اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادہ کوئی سورہ ان کے بر خلاف نازل ہو اور جو کچھ وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں وہ فاش ہو جائے۔ کہیے جتنا چاہتے ہو استہزار کر لو جس سے ڈرتے ہو خدا اسے ظاہر کر کے رہیگا۔

منافق اس سے بھی ترساں تھے کہ ان کے اسرار ظاہر ہو جانے کے بعد کہیں خدا کی طرف سے ان اندرونی خائن دشمنوں کے خلاف فرمان جنگ جاری نہ ہو جائے اور مسلمان جو اس وقت قوی اور طاقت ور ہو چکے ہیں ان پر حملہ نہ کر دیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ○ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ○

اگر منافقین اور وہ جن کے دل بیمار ہیں اور جو جھوٹی خبریں اڑا کر خوف، دہشت اور مایوسی پیدا کرتے ہیں اپنے برے کردار سے باز نہ آئے تو ہم ضرور ان کے خلاف تمہیں قیام کا حکم دیں گے تاکہ وہ تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں اور وہ جہاں مل جائیں انہیں قابل نفرت افراد کی طرح گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔

(احزاب - ۶۰، ۶۱)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ منافق مدینہ میں انتہائی وحشت و سرگردانی میں مبتلا تھے۔ سخت لہجہ اور دو ٹوک آیات پے در پے رعد و برقِ آسمانی کی طرح ان کے خلاف نازل ہوتی تھیں اور انہیں ہر وقت احتمال رہتا تھا کہ ان کی سرکوبی یا کم از کم انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم صادر نہ ہو جائے۔ اگرچہ ان آیات کی شانِ نزول زمانہ پیغمبرؐ کے منافقین سے متعلق ہے لیکن چونکہ منافقین ہر عہد کے سچے اور حقیقی انقلابوں کے مقابلے میں موجود رہتے ہیں اس لئے ہر عصر و قرن کے منافقین کے لئے یہ آیات وسعت رکھتی ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے ایک ایک کر کے یہ تمام نشانیاں سرِ مو فرق کے بغیر اپنے زمانے کے منافقین میں دیکھ رہے ہیں۔ ان کی سرگردانی ان کا اضطراب غرضیکہ ان کی بیچارگی، بدبختی اور رسوائی بالکل اس مسافر کی طرح نظر آتی ہے جس کی قرآن نے نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔

دونوں مثالوں کا فرق: زیر نظر آیات میں پہلی اور دوسری مثال ایک دوسرے سے کیا فرق رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ پہلی آیت (مثلهم كمثل الذی ...) ان منافقین کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ابتداء میں سچے مومنین کی صف میں داخل ہوئے اور حقیقتاً ایمان لائے تھے لیکن یہ ایمان مستقر اور مستحکم نہ تھا لہٰذا وہ نفاق کی طرف جھک گئے۔

باقی رہی دوسری مثال (اوكصيب من السماء ...) تو وہ ان منافقین کی حالت بیان کرتی ہے جو ابتداء ہی سے منافقین کی صف میں تھے اور ایک لحظہ کے لئے بھی ایمان نہیں لائے۔

(۲) دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی مثال افراد کی حالت کو واضح کرتی ہے اور دوسری مثال معاشرے کی کیفیت بیان کرتی ہے لہذا پہلی مثال میں ہے "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِيْ" (ان لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے) اور دوسری مثال میں ہے



"اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ" یا ان کی مثال ایسی ہے کہ موسلا دھار بارش جو آسمان سے برستی ہے اور اس میں تاریکیاں، رعد اور برق ہے جو وحشت ناک ہے اور خوف و خطر سے بھرپور ہے کہ جس میں منافق زندگی گزارتے ہیں۔

۲۱- يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

۲۲- الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱- اے لوگو! اپنے پروردگار کی پرستش و عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ اور اللہ کے لئے شریک قرار نہ دو اور تم جانتے بھی ہو۔

۲۲- وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان (فضائے زمین) کو تمہارے سروں پر چھت کی طرح قائم کیا، آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے میوہ جات کی پرورش کی تاکہ وہ تمہاری روزی بن جائیں جیسا کہ تم جانتے ہو (ان شرکاء اور بتوں میں سے نہ کسی نے تمہیں پیدا کیا اور نہ تمہیں روزی دی لہٰذا بس اسی خدا کی عبادت کرو)۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں خداوند تعالیٰ نے تین گروہوں (پرہیزگار، کفار و منافقین) کی تفصیل بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ پرہیزگار ہدایت الٰہی سے نوازے گئے ہیں اور قرآن ان کا راہنما ہے جب کہ کفار کے دلوں پر جہل و نادانی کی مہر لگا دی ہے اور ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے اور ان سے حق تمیز چھین لی ہے اور منافق ایسے بیمار دل ہیں کہ ان کے برے عمل کے نتیجے میں ان کی بیماری بڑھا دی ہے۔

زیر بحث آیات میں تقابل کے بعد سعادت و نجات کی راہ جو پہلے گروہ کے لئے ہے واضح طور پر مشخص کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے تاکہ پرہیزگار بن جاؤ (يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝)۔

چند اہم نکات

(۱) یا ایھا الناس کا خطاب: اس کا مطلب ہے "اے لوگو" اس خطاب کی قرآن میں تقریباً بیس مرتبہ تکرار



زندگی کے سب وسائل زمین کی دورانی حرکت کے نتیجے میں فضا میں جا پڑیں اور سرگرداں پھرتے رہیں۔

زمین بچھونا ہے : زمین کو بستر استراحت سے تعبیر کیا گیا ہے یہ کس قدر خوبصورت تعبیر ہے۔ بستر میں نہ صرف اطمینان، آسودگی خاطر اور استراحت کا مفہوم پنہاں ہے بلکہ گرم و نرم ہونا اور حدِ اعتدال میں رہنے کے معنی بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عالم تشیع کے چوتھے پیشوا امام سجاد علی ابن الحسینؑ نے اپنے ایک بہترین بیان میں اس آیت کی تفسیر میں اس حقیقت کی تشریح فرمائی ہے:-

جعلها ملائمة لطباعكم موافقة لاجسامكم و لم يجعلها شديد الحمی والحرارة فتحرقكم ولا شديدة البرد فتجمدكم ولا شديدة طيب الريح فتصدع هاماتكم ولا شديدة النتن فتعطبكم ولا شديدة اللين كالماء فتغرقكم ولا شديدة الصلابة فتمتنع عليكم فی دوركم و ابنيتكم وقبور موتاكم فلذا اجعل الارض فراشا لكم۔

خدا نے زمین کو تمہاری طبیعت اور مزاج کے مطابق بنایا اور تمہارے جسم کی موافقت کے لئے اسے گرم اور جلانے والی نہیں بنایا کہ اس کی حرارت سے تم جل جاؤ اور اسے زیادہ ٹھنڈا بھی پیدا نہیں کیا کہ کہیں تم منجمد ہو جاؤ۔ اسے اس قدر معطر اور خوشبودار پیدا نہیں کیا کہ اس کی تیز خوشبو تمہارے دماغ کو تکلیف پہنچائے اور اسے بدبودار بھی پیدا نہیں کیا کہ کہیں تمہاری ہلاکت کا ہی سبب بن جائے۔ اسے پانی کی طرح نہیں بنایا کہ تم اس میں غرق ہو جاؤ۔ اور اسے اتنا سخت بھی نہیں بنایا تاکہ تم اس میں گھر اور مکانات بنا سکو اور مُردوں کو (جن کا سطح زمین پر رہ جانا گوناگوں پریشانیوں کا باعث ہوتا) اس میں دفن کر سکو۔ ہاں خدا ہی نے زمین کو تمہارے لئے ایسا بستر استراحت قرار دیا ہے۔[1]

پھر نعمتِ آسمان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: آسمان کو تمہارے سروں پر چھت جیسا بنایا ہے (والسماء بناء)

لفظ "بناء" لفظ "علیکم" کی طرف توجہ کریں تو یہ بیان کرتا ہے کہ آسمان تمہارے سر کے اوپر بالکل چھت کی طرح بنا ہوا ہے۔ یہی معنی زیادہ صراحت کے ساتھ قرآن میں ایک اور جگہ بھی ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا ہے۔ (انبیاء۔ ۳۲)

شاید یہ تعبیر بعض ایسے افراد کے لئے عجیب و غریب ہو جو آسمان و زمین کی عمارت کی کیفیت کو آج کے علم ہیئت کی نظر سے جانتے ہیں یعنی یہ چھت کیونکر ہے اور کہاں ہے۔ بطلیموس کی فرضی ہیئت جس کے مطابق افلاک ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح ہیں کیا یہ تعبیر اس مفہوم کو تو ہمارے دلوں میں بٹھانا نہیں چاہتی؟

مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کرنے سے مطلب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے:

---

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۴۱



لفظ "سما" قرآن میں مختلف معانی کے لئے آیا ہے جس میں مشترک قدر وہ چیز ہے جو مندرجہ بالا جہت میں ہے ان میں سے ایک معنی جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ وہی فضائے زمین ہے یعنی ہوائے متراکم کا چھلکا اور چمڑا جس نے ہر طرف سے کرۂ زمین کو چھپایا ہوا ہے اور علماء و دانشوروں کے نظریے کے مطابق اس کی ضخامت کئی سو کلو میٹر ہے۔

اب اگر ہم اس ہوا کے قشر ضخیم کے اساسی اور حیاتی نقش کے بارے میں جس نے زمین کو ہر طرف سے گھیرا اور احاطہ کیا ہوا ہے غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ چھت انسانوں کی حفاظت کے لئے کس قدر محکم اور مؤثر ہے۔ یہ مخصوص ہوائی جلد جو بلوریں چھت کی طرح ہمارے گرد احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سورج کی حیات بخش شعاعوں کے پہنچنے سے مانع بھی نہیں اور محکم و مضبوط بھی ہے بلکہ کئی میٹر ضخیم فولادی تہوں سے زیادہ مضبوط ہے۔

اگر یہ چھت نہ ہوتی تو زمین ہمیشہ پراگندہ آسمانی پتھروں کی بارش کی زد میں رہتی اور عملی طور پر لوگوں سے راحت و اطمینان چھن جاتا لیکن یہ سخت جلد جو کئی سو کلو میٹر ہے[1] تمام آسمانی پتھروں کو زمین کی سطح تک پہنچنے سے پہلے جلا کر نابود کر دیتی ہے اور بہت کم مقدار میں ایسے پتھر ہیں جو اس جلد کو عبور کر کے خطرے کی گھنٹی کے عنوان سے گوشہ و کنار میں آگرتے ہیں لیکن یہ قلیل تعداد اہل زمین کے اطمینان میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتی۔

منجملہ شواہد کے جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آسمان کے ایک معنی فضائے زمین ہے وہ حدیث ہے جو ہمارے بزرگ پیشوا امام صادقؑ سے آسمان کے رنگ کے بارے میں منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اے مفضل! آسمان کے رنگ میں غور و فکر کرو کہ خدا نے اسے آبی رنگ پیدا کیا ہے جو انسانی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ موافق ہے یہاں تک کہ اسے دیکھنا بینائی کو تقویت پہنچاتا ہے[2]

آج اس چیز کو ہم سب جانتے ہیں کہ آسمان کا آبی رنگ دراصل اس متراکم ہوا کا رنگ ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس بنا پر اس حدیث میں آسمان سے مراد یہی فضائے زمینی ہے۔

سورہ نحل کی آیہ ۷۹ میں ہے:

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ

آیا وہ ان پرندوں کو نہیں دیکھتے جو وسط آسمان میں تسخیر شدہ ہیں۔

آسمان کے دوسرے معانی کے سلسلے میں اس سورت کی آیت ۲۹ میں آپ مزید صراحت سے مطالعہ کریں گے۔

اس کے بعد بارش کی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "اور آسمان سے پانی نازل کیا (و انزل من السماء ما)

---

[1] بہت سی کتب میں اس ہوائی جلد کی ضخامت ایک سو کلو میٹر لکھی ہوئی ہے لیکن بظاہر ان کا مقصود وہ جگہ ہے جہاں ہوا کے سالمے (MOLE-CULES) نسبتاً زیادہ نزدیک ہیں لیکن موجودہ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ چند سو کلو میٹر کی ضخامت میں ہوا کے سالمے پراگندہ حالت میں موجود ہیں۔

[2] توحید مفضل۔



کیسا پانی — جو حیات بخش، تمام آبادیوں کا سبب اور تمام مادی نعمتوں کا جامع ہے۔ جملہ "انزلنا من السماء" دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ سماء سے مراد یہاں وہی — فضائے آسمانی — ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بارش بادلوں سے برستی ہے اور بادل فضائے زمین میں موجود بخارات سے پیدا ہوتے ہیں۔

امام سجاد علیؑ ابن الحسینؑ اس آیہ کے ذیل میں بارش کے آسمان سے نازل ہونے کے بارے میں ایک جاذب نظر بیان میں ارشاد فرماتے ہیں:

"خداوند عالم بارش کو آسمان سے نازل کرتا ہے تاکہ وہ پہاڑوں کی تمام چوٹیوں، ٹیلوں اور گڑھوں غرض تمام بلند و ہموار جگہوں تک پہنچ جائے (اور سب بغیر استثناء کے سیراب ہوں) اور یہ نرم اور پے در پے اور کبھی سخت دانوں کی شکل میں اور کبھی قطرات کی صورت میں برستی ہے تاکہ پوری طرح زمین کے اندر چلی جائے اور زمین اس سے سیراب ہو۔ اسے سیلاب کی صورت میں نہیں بھیجا کہ مبادا زمینوں، درختوں، کھیتوں اور تمہارے پھلوں کو بہا لیجائے اور انہیں ویران کردے۔"[1]

اس کے بعد قرآن بارش کی برکت سے پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھلوں اور ان روزیوں کی طرف جو انسانوں کا نصیب ہیں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "خداوند عالم نے بارش کے سبب میوہ جات کو تمہاری روزی کے عنوان سے زمین سے نکالا (فاخرج به من الثمرات رزقا لكم)۔

یہ خدائی پروگرام ایک طرف خدا کی وسیع اور پھیلی ہوئی رحمت کو جو اس کے بندوں پر ہے مشخص کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی قدرت کو بیان کرتا ہے۔ اس نے کس طرح بے رنگ پانی سے ہزاروں رنگوں کے میوے جو انسانی غذا کے لئے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں اور اسی طرح دوسرے جاندار پیدا کیے جو اس کے وجود کے زندہ ترین دلائل میں سے ہیں لہٰذا بلا فاصلہ مزید کہتا ہے "جب ایسا ہی ہے تو پھر خدا کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تمہیں معلوم ہے (فلا تجعلوا لله اندادا و انتم تعلمون)۔ (تم سب جانتے ہو کہ ان بتوں اور خود ساختہ شرکاء نے تمہیں پیدا نہیں کیا اور نہ یہ روزی دیتے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی کم ترین نعمت بھی ان کی طرف سے نہیں پس کس طرح انہیں خدا کا شبیہ و نظیر قرار دیتے ہو۔

"انداد" جمع ہے "ند" (بروزن "ضد") کی۔ اس کے معنی ہیں شریک و شبیہ۔ ظاہر ہے کہ یہ شباہت و شرکت بت پرستوں کے گمان میں تھی نہ یہ کہ اس کی کوئی حقیقت و واقعیت ہے یا زیادہ دقیق تعبیر کی بناء پر جیسے راغب نے مفردات میں کہا ہے "ند" و "ندید" وہ چیز ہے جو گوہر ذات میں کسی دوسری چیز کی شریک اور شبیہ ہو اسی بناء پر ایک خاص قسم کی شباہت کے لئے یہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول، ص٣٩ کے مطابق حدیث کی عبارت اس طرح ہے:

ينزله من اعلى ليبلغ قلل جبالكم و تلالكم و هضابكم و اوهادكم ثم فرقه رذاذا و وابلا و هطلا لتنشفه ارضكم ولم يجعل ذلك المطر نازلا عليكم قطعة واحدة فيفسد ارضيكم و اشجاركم و زروعكم و ثماركم



لفظ بولا جاتا ہے یعنی گو ہر ذات میں ایک جیسا ہونا۔

بت پرستی مختلف شکلوں میں

یہاں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے کہ خدا کا شریک قرار دینا یہی نہیں کہ پتھر اور لکڑی کے بت بنا لئے جائیں یا اس سے بڑھ کر انسان کو مثلاً مسیح کو تین میں سے ایک خدا سمجھا جائے بلکہ اس کے وسیع ترمعنی ہیں جو زیادہ مخفی اور پنہاں صورتوں پر بھی مشتمل ہیں کلیہ وقاعدہ یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کو بھی خدا کے ساتھ ساتھ مؤثر سمجھا جائے — وہ ایک قسم کا شرک ہے۔

اس موقع پر ابن عباس کی ایک عجیب تفسیر ہے وہ کہتے ہیں:

الانداد هو الشرك الخفی من دبیب النمل علی صفاة سوداء فی ظلمة اللیل وهو ان یقول والله حیاتك یا فلان وحیاتی .... ویقول لو لا کلیه هذا لاتانا اللصوص البارحة .... وقول الرجل لصاحبه ماشاء الله وشئت هذا کله به شرك یعنی — انداد وہی شرک ہے جو کبھی تاریک رات میں سیاہ پتھر پر ایک چیونٹی کی حرکت سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔ انسان کا یہ کہنا کہ خدا کی قسم اور تیری جان کی قسم یا خدا کی قسم اور مجھے میری جان کی قسم (یعنی خدا اور دوست کی جان یا خدا اور اپنی جان کو ایک ہی لائن میں قرار دینا) یا یوں کہنا کہ اگر یہ کتیا کل رات نہ ہوتی تو چور آگئے تھے (لہٰذا چوروں سے نجات دلانے والی یہ کتیا ہے) یا پھر اپنے دوست سے کہے کہ جو کچھ خدا چاہے اور تم پسند کرو — ان سب میں شرک کی بو ہے۔[1]

ایک حدیث میں ہے:

ایک شخص نے نبی اکرمؐ کے سامنے یہ جملہ کہا:

"ماشاء اللہ وشئت" (جو کچھ خدا اور آپ چاہتے ہیں)

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اجعلتنی للہ ندًا" (کیا تونے مجھے اللہ کا شریک ورديف قرار دیا)۔

عام لوگ روزانہ ایسی بہت سی باتیں کرتے رہتے ہیں مثلاً "پہلے خدا پھر تم" باور کیجئے کہ ایک کامل مؤحد انسان کے لئے یہ تعبیرات بھی مناسب نہیں ہیں۔

سورہ یوسف کی آیت ۱۰۶ — وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ٥ کی تفسیر کے ذیل میں امام صادق سے ایک روایت ہے، آپؑ نے (شرکِ خفی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا:

جیسے ایک انسان دوسرے سے کہتا ہے اگر تو نہ ہوتا تو میں نابود ہو جاتا یا میری زندگی تباہ

---

[1] فی ظلال سید قطب، جلد اول، صفحہ ۵۳۔



ہو جاتی"۔[1]

اس کی مزید وضاحت اسی تفسیر میں سورہ یوسف، آیہ ۱۰۷ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

۲۳- وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

۲۴- فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ
الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ○

ترجمہ

۲۳- اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (پیغمبر) پر نازل کی ہے کوئی شک و شبہ ہے تو (کم از کم) ایک سورہ اس کی مثل لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر اپنے گواہوں کو بھی اس کام کی دعوت دو، اگر تم سچے ہو۔

۲۴- اگر یہ کام تم نے نہ کیا اور کبھی کر بھی نہ سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسانوں کے بدن اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

تفسیر

قرآن ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے

گذشتہ آیات کا موضوع سخن کفر و نفاق ہے۔ کفر و نفاق کبھی نبوت اور اعجاز پیغمبر کے عدم ادراک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا زیر بحث آیات میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ انگشت قرآن پر رکھ دی گئی ہے جو ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔ یہ اس لئے کہ رسول اسلام کی رسالت کے بارے میں ہر قسم کا شک و شبہ دور ہو سکے۔

قرآن کہتا ہے: "اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کوئی شک و شبہ ہے تو ایک سورت

---

[1] سفینۃ البحار، جلد اول، ص ۴۹۷



ہی اس جیسی لے آؤ" (ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ) مقابلے کی دعوت اور چیلنج کو قطعی ہونا چاہیئے اور دشمن کو پوری طرح تحریک پیدا کرنی چاہیئے۔ اور اصطلاحاً غیرت دلانی چاہیئے تاکہ وہ پوری طاقت استعمال کر سکے۔

اس طرح جب عجز و ناتوانی ثابت ہو جائے گی تو وہ مسلّم طور پر جان لے گا کہ جس چیز کے وہ مدمقابل ہے وہ کارِ بشر نہیں بلکہ خدائی کام ہے لہٰذا بعد والی آیت میں مختلف تعبیروں سے اسے بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "اگر تم اس کام کو انجام نہ دے سکے اور ہرگز نہ دے سکو گے لہٰذا اس آگ سے ڈرو کہ جس کا ایندھن بے ایمان آدمیوں کے بدن اور پتھر ہیں (فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ) یعنی آگ ابھی سے کافروں کے لئے تیار ہے اور اس میں تاخیر نہ ہوگی (اعدت للکافرین)۔

"وقود" کے معنی ہیں وہ چیز جسے آگ پکڑ لے یعنی وہ مادہ جو جلنے کے قابل ہے جیسے لکڑیاں۔ اس سے مراد وہ چیز نہیں جس سے آگ نکلے مثلاً ماچس یا وہ خاص پتھر جن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔

مفسرین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ "حجارۃ" سے وہ بت مراد ہیں جنہیں پتھر سے بنایا گیا تھا اور سورۂ انبیاء کی آیت ۹۸ کو اس کا شاہد قرار دیتا ہے:

اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ ط

تم اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں۔

ایک اور گروہ کہتا ہے کہ "حجارۃ" سے مراد گندھک کے پتھر ہیں جن کی حرارت دوسرے پتھروں سے زیادہ ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس تعبیر کا مقصد جہنم کی شدتِ حرارت کی طرف توجہ کرنا ہے یعنی اس میں ایسی حرارت و تپش ہوگی جو پتھروں اور انسانوں کو بھی شعلہ ور کر دے گی۔

گذشتہ آیات کے پیشِ نظر جو بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جہنم کی آگ خود انسانوں اور پتھروں کے اندر سے نکلے گی اور یہ حقیقت آج ثابت ہو چکی ہے کہ جسموں کے اندر ایک عظیم آگ چھپی ہوئی ہے (دوسرے لفظوں میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو آگ میں تبدیل ہو سکتی ہیں)۔ یہ مفہوم سمجھنا مشکل نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس جلانے والی آگ کو اس دنیا کی عمومی آگ

لے بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ضمیر "مثلہ" رسول اکرمؐ کے بارے میں ہے جنہیں قبل کے جملے میں "عبدنا" سے یاد کیا گیا یعنی اگر اس وحی آسمانی کے حقیقی ہونے میں تمہیں شک ہے تو کوئی شخص محمدؐ جیسا پیش کرو جس نے بالکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور نہ خط و کتابت سیکھی ہو جو ایسا کلام پیش کر سکے۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ یوں آیا ہے:

فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖٓ (طور۔ ۳۴)

ایک اور مقام پر ہے:

فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ (یونس۔ ۳۸)

• اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "مثلہ" قرآن کے لئے ہے پیغمبر کے لئے نہیں۔

کی طرح سمجھا جائے۔

سورۂ ہمزہ آیہ ۶،۷ میں ہے:

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ ۝

خدا کی جلانے والی آگ جس کا سرچشمہ دل میں اور جو اندر سے باہر کی طرف سرایت کرتی ہے (اس جہان کی آگ کے برعکس جو باہر سے اندر تک پہنچتی ہے)۔

چند اہم نکات

(۱) انبیاء کے لئے معجزے کی ضرورت: ہم جانتے ہیں کہ نبوت و رسالت ایک عظیم ترین منصب ہے جو پاک لوگوں کے ایک گروہ کو عطا ہوا ہے کیونکہ دوسرے منصب و مقام جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں لیکن نبوت وہ منصب ہے جو معاشرے کی روح اور دل پر حکومت کرتا ہے۔ جھوٹے مدعی اور بہت سے بڑے افراد اس کی رفعت و سربلندی کے ہی پیش نظر اس منصب کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس سے غلط مفاد اٹھاتے ہیں۔

لوگ یا تو ہر مدعی کے دعویٰ کو قبول کرلیں یا سب کی دعوت کو رد کردیں۔ سب کو قبول کرلیں تو واضح ہے کہ کس قدر ہرج و مرج لازم آئے گا اور دین خدا کی کیا صورت بنے گی اور اگر کسی کو بھی قبول نہ کریں تو اس کا نتیجہ بھی گمراہی اور پسماندگی ہے اس بناء پر جس دلیل کی رو سے انبیاء کا وجود ضروری ہے اسی دلیل کی روشنی میں سچے انبیاء کے پاس ایسی نشانی ہونی چاہیئے جو جھوٹے دعویداروں سے انہیں ممتاز قرار دے اور وہ ان کی حقانیت کی سند ہو۔

اس اصل کی بناء پر ضروری ہے کہ نبی معجزہ لے کر آئے جو اس کی رسالت کی صداقت کا شاہد ہوسکے اور جیسا کہ لفظ معجزہ سے واضح ہے نبی خارق العادۃ اعمال (وہ کام جو عموماً نہ ہوئے ہوں) انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو جن کی انجام دہی سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔

نبی جو صاحب معجزہ ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو مقابلہ بمثل کی دعوت دے (یعنی کہے کہ ایسا کام تم بھی کر دکھاؤ) اور وہ اپنی گفتار کی سچائی کی علامت و نشانی کو اپنا معجزہ قرار دے تاکہ اگر دوسرے بھی ویسا کام کرسکتے ہیں تو بجا لائیں اس کام کو اصطلاح میں تحدی (چیلنج) کہتے ہیں۔

قرآن رسول اسلامؐ کا دائمی معجزہ

جو معجزات اور خارق عادات پیغمبر اسلامؐ سے صادر ہوئے قرآن ان میں سے آپؐ کی حقانیت کی بلند ترین اور زندہ سند ہے۔ قرآن افکار بشر سے بلند تر کتاب ہے کوئی اب تک ایسی کتاب نہیں لاسکا۔ یہ ایک عظیم آسمانی معجزہ ہے۔

قرآن پیغمبر اسلامؐ کی حقانیت کی زندہ سند ہے اور آپؐ کے معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی علت یہ ہے:

قرآن ایک بولنے والا ابدی، عالمگیر اور روحانی معجزہ ہے۔

گذشتہ انبیاء کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے معجزات کے ساتھ ہوں اور ان کے اعجاز کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کو مقابلہ



بشل کی دعوت دیں۔ درحقیقت ان کے معجزات کی اپنی کوئی زبان نہ تھی بلکہ انبیاء کی گفتار ان کی تکمیل کرتی تھی۔ یہی بات قرآن کے علاوہ پیغمبر اسلام کے دیگر معجزات پر بھی صادق آتی ہے۔

لیکن قرآن ایک بولنے والا معجزہ ہے وہ تعارف کرانے والے کا محتاج نہیں۔ وہ خود اپنی طرف دعوت دیتا ہے اور مخالفین کو مقابلے کے لئے پکارتا ہے۔ انہیں مغلوب کرتا ہے اور خود میدان مقابلہ سے کامیابی کے ساتھ نکلتا ہے لہٰذا وفات نبیؐ کو کئی صدیاں بیت گئیں مگر قرآن آپؐ کے زمانۂ حیات کی طرح آج بھی اپنا دعویٰ پیش کر رہا ہے۔ قرآن خود دین بھی ہے اور معجزہ بھی۔ قانون بھی ہے اور سندِ قانون بھی۔ قرآن زمان و مکان کی سرحد سے مافوق ہے۔

گذشتہ انبیاء کے معجزات بلکہ قرآن کے علاوہ آنحضرتؐ کے دیگر معجزات بھی معین و مشخص زمان و مکان اور مخصوص افراد کے سامنے ظہور پذیر ہوتے تھے۔ مثلاً حضرت مریمؑ کے نومولود بچے کی گفتگو، مردوں کو زندہ کرنا اور حضرت مسیحؑ کے ایسے دوسرے معجزات مخصوص زمان و مکان اور معین اشخاص کے لئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو امور زمان و مکان کے رنگ سے ہم آہنگ ہوں گے وہ اس زمان و مکان سے جتنا دور ہوں گے ان کے رنگ روپ میں کمی واقع ہوگی اور یہ چیز امور زمانی کے خواص میں سے ہے۔

لیکن قرآن کسی خاص زمان و مکان سے وابستہ نہیں۔ یہ جس طرح اور جس حالت میں چودہ سو سال قبل حجاز کے تاریک ماحول میں جلوہ گر تھا اسی طرح آج بھی ہم پر ضو فشاں ہے بلکہ گذشت زمانہ اور علم و دانش کی پیش رفت کی وجہ سے ہم میں اس کی استعداد بڑھ گئی ہے کہ دورِ حاضر کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ یہ واضح ہے کہ جس پر اپنے زمان و مکان کا رنگ نہ ہو وہ بعد تک اور سارے جہان تک رسائی حاصل کر سکے گا اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک عالمی دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالمی و ابدی سند حقانیت رکھتا ہو۔

قرآن روحانی کیوں ہے؟

گذشتہ انبیاء سے جو خارق عادت امور ان کی گفتار کے پیچھے گواہ کے طور پر دیکھنے میں آتے تھے وہ عموماً جسمانی پہلو رکھتے تھے۔ ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا، نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں باتیں کرنا وغیرہ سب جسمانی پہلو رکھتے تھے اور انسان کی آنکھ اور کان کو مسخر کرتے تھے لیکن قرآنی الفاظ جو انہی عام حروف و کلمات سے مرکب ہیں انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، انسان کی روح انہیں عجیب و غریب سمجھتے ہوئے ان کے لئے احساسات تحسین سے معمور ہو جاتی ہے اور افکار و عقول ان کی تعظیم پر مجبور نظر آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو صرف انسانی اذہان، افکار اور ارواح سے سروکار رکھتا ہے۔ جسمانی معجزات پر ایسے معجزے کی برتری کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

کیا قرآن نے مقابلے کے لئے چیلنج کیا ہے؟

قرآن نے چند ایک سورتوں میں اپنی مثل لانے کے لئے چیلنج کیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) سورۂ اسراء آیہ ۸۸ (یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی) میں ہے:



قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ٥

کہیے کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں تاکہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے اگرچہ خوب ہم فکر و ہم کار بھی ہو جائیں۔

(ii) سورہ ہود (یہ بھی مکہ میں نازل ہوئی) کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں یوں ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات خدا پر افتراء ہیں کہہ دے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو ایسی دس سورتیں گھڑ کے لے آؤ اور بدون خدا جسے مدد کی دعوت دے سکتے ہو دے لو —— اور اگر انہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو جان لو کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں۔

(iii) سورہ یونس (جو مکہ میں نازل ہوئی) کی آیت ۳۸ میں اس طرح ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥

کیا وہ کہتے ہیں کہ خدا پر افتراء باندھا گیا ہے آپ کہیے کہ اس جیسی ایک سورت لا دکھاؤ اور خدا کے علاوہ ہر کسی کو مدد کے لئے طلب کر لو اگر تم سچے ہو۔

(iv) چوتھی مثال یہی زیر بحث آیت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

جیسا کہ واضح ہے کہ قرآن صراحت اور بے نظیر قاطعیت اور یقین کے ساتھ مقابلے کی دعوت دے رہا ہے ایسی صراحت و قاطعیت جو حقانیت کی زندہ نشانی ہے۔

قرآن نے بہت قاطع اور صریح بیان کے ساتھ تمام جہانوں اور تمام ان انسانوں کو مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے جو قرآن کے مبداء جہان آفرینش کے ساتھ ربط میں شک رکھتے ہیں۔ صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ مقابلے کا شوق دلایا ہے اور اس کے لئے تحریک پیدا کی ہے اور ان آیات میں ایسے الفاظ صرف کئے ہیں جو ان کی غیرت کو ابھارتے ہیں۔ مثلاً:

"اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

اگر تم سچے ہو۔

"فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ"

ایسی دس سورتیں گھڑ لاؤ۔

"قل فاتوا بسورة مثلہ .... ان کنتم صٰدقین"

اگر سچے ہو تو ایسی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔



"وادعوا من استطعتم من دون اللہ"

بدون خدا جسے چاہو دعوت دو۔

"قل لئن اجتمعت الانس والجن"

اگر تم جن و انس بھی اکٹھا کر لو۔

"لا یاتون بمثلہ"

اس کی مثل نہیں لا سکتے۔

"فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ"

اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہ گار) لوگوں کے بدن اور پتھر ہیں۔

"فان لم تفعلوا ولن تفعلوا"

اگر اس کی مثل نہ لائے اور نہ ہی تم لا سکتے ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف ادبی یا مذہبی مقابلہ نہ تھا بلکہ ایک سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مقابلہ تھا تمام چیزیں یہاں تک کہ خود ان کے وجود کی بقا کا انحصار بھی اس مقابلے میں کامیابی پر تھا بہ الفاظ دیگر ایک مکمل مقابلہ تھا جو ان کی زندگی اور موت کی راہ اور سرنوشت کو روشن کر دیتا۔ اگر کامیاب ہو جاتے تو سب کچھ ان کے پاس ہوتا اور اگر مغلوب ہو جاتے تو اپنی بھی ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے اس سب کے باوجود تحریک و تشویق کا یہ عالم ہے۔

اس کے باوصف اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیے اور اس کا مثل نہ لا سکے تو قرآن کا معجزہ ہونا زیادہ واضح اور روشن تر ہو جاتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ آیات کسی خاص زمانے یا جگہ سے مخصوص نہیں بلکہ تمام جہانوں اور تمام علمی مراکز کو مقابلے کی دعوت دے رہی ہیں اور کسی قسم کا استثناء نہیں ہے اور یہ چیلنج آج بھی برقرار ہے۔

یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن کی مثل نہ لائی جا سکی ؟ — تاریخ اسلام پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی ممالک کے اندر رسول اکرمؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد یہاں تک کہ خود مکہ اور مدینہ میں کٹر اور متعصب عیسائی اور یہودی بستے تھے جو مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے ہر موقع کو غنیمت جانتے تھے۔ خود مسلمانوں میں بھی ایک "مسلمان نما" گروہ موجود تھا قرآن نے ان کا نام منافق رکھا ہے ان کے ذمے مسلمانوں کے جاسوس کا رول ادا کرنا تھا جیسے ابو عامر راہب اور مدینہ میں اس کے منافق ساتھی جن کے **بادشاہ** روم سے مخصوص روابط کا تاریخ میں تذکرہ موجود ہے۔ مدینہ میں مسجد ضرار انہی لوگوں نے بنائی تھی جہاں سے وہ عجیب سازش وجود پذیر ہوئی جس کا قرآن نے سورہ توبہ میں ذکر کیا ہے یہ طے شدہ بات ہے کہ منافقین کا یہ گروہ اور وہ متعصب اور کٹر دشمن گہری نظر سے مسلمانوں کے حالات کی تاک میں رہتے تھے اور ہر وہ چیز جو مسلمانوں کے نقصان کا باعث ہوتی اسے خوش آمدید کہتے تھے۔

اگر ان لوگوں کو اس قسم کی کتاب مل جاتی تو مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اس کی ہر ممکن نشر و اشاعت کرتے یا



کم از کم اسکی حفاظت و نگہداشت کی کوشش کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ افراد جن کے متعلق نہایت کم احتمال بھی ہے کہ وہ قرآن کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ تاریخ نے ان کے نام ریکارڈ کئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

عبداللہ بن مقفع: اس نے اسی مقصد کے لئے کتاب "الدرة الیتیمة" تصنیف کی۔ کتاب ابھی موجود ہے اور کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے اس کتاب میں اس بات کا چھوٹے سے چھوٹا اشارہ بھی نہیں کہ یہ قرآن کے مقابلے میں لکھی گئی ہے اس کے باوجود ہم نہیں جانتے کہ اس کی طرف یہ نسبت کیوں دی گئی ہے۔

متنبی احمد بن حسین کوفی: یہ شاعر تھا۔ اس کا نام بھی اس زمرے میں آتا ہے کہ اس نے دعویٰ نبوت کیا تھا جب کہ بہت سے قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ گھریلو ناکامیوں اور جاہ طلبی کی خواہش کے پیش نظر اس نے بلند پروازی کا یہ پروگرام بنایا تھا۔

ابو العلای معری: اس کا نام بھی اس امر میں داخل ہے اگرچہ اسلام کے بارے میں اس سے منسوب سخت باتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن وہ قرآن کے مقابلے کا ارادہ کبھی بھی نہ رکھتا تھا بلکہ اس نے قرآن کی عظمت کے متعلق بہت عمدہ جملے کہے ہیں جن میں بعض کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

مسیلمہ کذاب: یہ یمامہ کا رہنے والا تھا اور یقیناً ان اشخاص میں سے ہے جو قرآن کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور بقول اس کے کچھ آیات لایا جن میں تفریح طبع کا پہلو زیادہ ہے حرج نہیں کہ ان میں سے چند جملے ہم یہاں نقل کر دیں:

(۱) سورہ الذاریات کے مقابلے میں اس نے یہ جملے پیش کئے:

والمبذرات بذرًا والحاصدات حصدًا والذاریات قمحًا والطاحنات طحنًا والعاجنات عجنًا والخابزات خبزًا والثاردات ثردًا واللاقمات لقمًا اهالة وسمنًا [1]

یعنی — قسم ہے کسانوں کی — قسم ہے بیج ڈالنے والوں کی اور قسم ہے گھاس کو گندم سے جدا کرنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گھاس سے الگ کرنے والوں کی۔ قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی اور قسم ہے روٹی پکانے والوں کی اور قسم ہے ترید بنانے والوں کی اور قسم ہے ان کی جو چرب و نرم لقمہ اٹھاتے ہیں۔

(۲) یا ضفدع بنت ضفدع نقی ما تنقین نصفك فی الماء و نصفك فی الطین لا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین [2]

یعنی — اے مینڈک! مینڈک کی بیٹی! جتنا چاہتی ہے آواز نکال تیرا آدھا حصہ پانی میں ہے اور آدھا کیچڑ میں۔ پانی کو گندلا کرتی ہے اور نہ کسی کو پینے سے روکتی ہے۔

---

[1] اعجاز القرآن رافعی

[2] قرآن و آخرین پیامبر



یہاں ضروری ہے کہ چند جملے بڑے لوگوں کے ـــــ یہاں تک کہ جو قرآن کا مقابلہ کرنے میں متہم ہیں نقل کئے جائیں تاکہ عظمتِ قرآن ظاہر ہو:

ابو العلای معری : یہ قرآن کا مقابلہ کرنے میں متہم ہے، کہتا ہے:

"یہ بات تمام لوگوں میں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم موردِ اتفاق ہے کہ وہ کتاب جو محمد (ص) لے کر آیا ہے اس نے اپنے مقابلے میں عقلوں کو مغلوب کر دیا ہے اور آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لا سکا۔ اس کا طرز اسلوب عربوں کے معمول کے اسلوبوں خطابہ، رجز، شعر اور کاہنوں کے سجع کسی سے بھی مشابہت نہیں رکھتا۔ اس کتاب میں اس قدر امتیاز اور کشش ہے کہ اگر اس کی ایک آیت کسی دوسرے کے کلمات میں موجود ہو تو شبِ تاریک میں چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن ہوگی۔"

ولید بن مغیرہ مخزومی : یہ ایسا شخص ہے جو حسنِ تدبیر کے باعث عربوں میں شہرت رکھتا تھا اور زمانۂ جاہلیت میں حل مشکلات کے لئے اس کے فکر و تدبر سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اسے "ریحانۂ قریش" (قریش کا گلدستہ) کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں جب اس نے نبی کریمؐ سے سورہ غافر کی چند ابتدائی آیات سنیں تو بنی مخزوم کی ایک محفل میں آیا اور کہنے لگا:

"خدا کی قسم میں نے محمد (ص) سے ایسی گفتگو سنی ہے جو کلامِ انسان سے شباہت رکھتی ہے نہ جنوں کی گفتگو ہے"۔

اس نے مزید کہا:

وان له لحلاوة، وان عليه لطلاوة، وان اعلاه لمثمر وان اسفله لمغدق، وانه يعلو ولا يعلى عليه۔

اس کی گفتگو میں خاص مٹھاس اور حسن ہے۔ اس کا اوپر کا حصہ (بار آور درختوں کی شاخوں کی طرح) پھلدار ہے اور نیچے کا حصہ (پرانے درختوں کی جڑوں کی طرح) مضبوط بنیاد پر استوار ہے۔ یہ ایسی گفتگو ہے جو ہر ایک پر غالب ہے اور کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔[1]

کارلائل : یہ انگلستان کا مشہور مورخ اور محقق ہے جو قرآن کے بارے میں کہتا ہے:

"اگر اس مقدس کتاب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ برجستہ حقائق اور وجود کے اسرار و خصائص نے اس کے جوہر دار مضامین میں ایسے پرورش پائی ہے جس سے قرآن کی عظمت و حقیقت وضاحت سے نمایاں ہوتی ہے یہ خود ایک ایسی خوبی ہے جو صرف قرآن سے مخصوص ہے اور کسی دوسری علمی، سیاسی اور اقتصادی کتاب میں نہیں دیکھی جاسکتی۔ یقیناً بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ ذہنِ انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے لیکن ان کا قرآن سے کبھی موازنہ نہیں کیا جاسکتا اس بنا پر کہنا چاہیئے کہ قرآن کی ابتدائی خوبیاں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، سورہ مدثر



اور بنیادی دستاویزات جن کا تعلق حقیقت، پاکیزہ احساسات، برجستہ عنوانات اور اس کے اہم مسائل و مضامین سے ہے ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ وہ فضائل جو تکمیل انسانیت اور سعادت بشری کا باعث ہیں اس میں ان کی انتہا ہے اور قرآن وضاحت سے ان فضائل کی نشاندہی کرتا ہے۔"[1]

جان ڈیون پورٹ: یہ کتاب "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن" کا مصنف ہے۔ قرآن کے بارے میں لکھتا ہے:

"قرآن نقائص سے اس قدر مبرا و منزہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی تصحیح اور اصلاح کا بھی محتاج نہیں۔ ممکن ہے کہ انسان اسے اول سے آخر تک پڑھتا جائے اور معمولی سی ملالت و افسردگی بھی محسوس نہ کرے۔"

اس کے بعد مزید لکھتا ہے:

"سب اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ قرآن سب سے زیادہ فصیح و بلیغ زبان اور عرب کے سب سے زیادہ نجیب اور ادیب قبیلے قریش کے لب و لہجے میں نازل ہوا اور یہ روشن ترین صورتوں اور محکم ترین تشبیہات سے معمور ہے۔"[2]

گوئٹے: یہ آلمانی شاعر اور عالم ہے۔ کہتا ہے:

"قرآن ایسی کتاب ہے کہ ابتداء میں قاری اس کی وزنی عبارت کی وجہ سے روگردانی کرنے لگتا ہے لیکن اس کے بعد اس کی کشش کا فریفتہ ہو جاتا ہے اور پھر بے اختیار اس کی متعدد خوبیوں کا عاشق ہو جاتا ہے۔"

یہی گوئٹے ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"سالہا سال تک خدا سے ناآشنا پوپ ہمیں قرآن اور اس کے لانے والے محمدؐ کی عظمت سے دور رکھے رہے مگر علم و دانش کی شاہراہ پر جتنا ہم نے قدم آگے بڑھایا جہالت و تعصب کے ناروا پردے ہٹتے گئے اور بہت جلد اس کتاب نے جس کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس نے دنیا کے علم و دانش پر گہرا اثر کیا ہے اور آخر کار یہ کتاب دنیا بھر کے لوگوں کے افکار کا محور قرار پائے گی۔"

مزید لکھتا ہے:

"ہم ابتداء میں قرآن سے روگردان تھے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کتاب نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ہمیں حیران کر دیا یہاں تک کہ اس کے اصول اور عظیم علمی قوانین کے سامنے ہم نے سر تسلیم خم کر دیا۔"[3]

---

[1] "سازمانہائے تمدن امپراطوری اسلام"

[2] مقدمہ کتاب "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن" (یہ اصل کتاب کے فارسی ترجمے کا حوالہ ہے۔ مترجم)

[3] "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن"



ول ڈیوران: یہ ایک مشہور مؤرخ ہے، لکھتا ہے:

"قرآن نے مسلمانوں میں اس طرح کی عزت نفس، عدالت اور تقویٰ پیدا کیا ہے جس کی نظیر و مثال دنیا کے دوسرے ممالک میں نہیں ملتی۔"

ژول لابوم: یہ ایک فرانسیسی مفکر ہے۔ اپنی کتاب "تفصیل الآیات" میں کہتا ہے:

"دنیا نے علم و دانش مسلمانوں سے لی ہے اور مسلمانوں نے یہ علوم اس قرآن سے لئے ہیں جو علم و دانش کا دریا ہے اور اس سے عالم بشریت کے لئے کئی نہریں جاری ہوئی ہیں۔"

دینورٹ: یہ ایک اور مستشرق ہے، لکھتا ہے:

ضروری ہے کہ ہم اعتراف کرلیں کہ علوم طبیعی و فلکی اور فلسفہ و ریاضیات جو یورپ میں رواج پذیر ہیں زیادہ تعلیمات قرآن کی برکت سے ہیں۔ اور ہم مسلمانوں کے مقروض ہیں بلکہ اس لحاظ سے یورپ ایک اسلامی شہر ہے۔"[1]

ڈاکٹر مسز لورا واکسیا گلیری: یہ ناپل یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں۔ "پیش رفت سریع اسلام" میں لکھتی ہیں:

"اسلام کی کتاب آسمانی اعجاز کا ایک نمونہ ہے ..... قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کے اسلوب اور طرز کا نمونہ گذشتہ ادبیات میں نہیں پایا جاتا اور یہ طرز روح انسانی میں جو تاثیر پیدا کرتی ہے وہ اس کے امتیازات اور بلندیوں سے پیدا ہوتی ہے کس طرح ممکن ہے کہ یہ اعجاز آمیز کتاب محمدؐ کی خود ساختہ ہو جب کہ وہ ایک ایسا عرب تھا جس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہمیں اس کتاب میں علوم کے خزینے اور ذخیرے نظر آتے ہیں جو نہایت ہوش مند اشخاص، بزرگ ترین فلاسفہ اور قوی ترین سیاست دان اور قانون دان لوگوں کی استعداد اور ظرفیت سے بلند ہیں اسی بناء پر قرآن کسی تعلیم یافتہ مفکر و عالم کا کلام نہیں ہوسکتا۔"[2]

۲۵- وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ
قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝

---

[1] قرآن برفراز اعصار بحوالہ المعجزۃ الخالدۃ۔

[2] پیش رفت سریع اسلام۔ (یہ بھی اصل کتاب کے فارسی ترجمے کا حوالہ ہے۔ مترجم)



ترجمہ

ایمان لانے والوں اور نیک عمل بجالانے والوں کو خوشخبری دیجئے کہ اُن کے لئے بہشت کے باغات ہیں جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب انہیں ان میں سے پھل دیا جائے گا تو کہیں گے یہ وہی ہے جو پہلے بھی ہمیں دیا گیا تھا (لیکن یہ اس سے کس قدر بہتر ہے) اور جو پھل ان کو پیش کئے جائیں گے (خوبی و زیبائی میں) یکساں ہیں اور ان کے لئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

بہشت کی نعمات کی خصوصیات

چونکہ گذشتہ بحث کی آخری آیت میں کفار اور منکرین قرآن کو دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے لہٰذا زیر نظر آیت میں مومنین کی سرنوشت کا تذکرہ ہے تاکہ قرآن کے روش اور طریقے کے مطابق دونوں کے مدمقابل ہونے سے حقیقت زیادہ روشن ہوتی رہے۔

پہلے کہتا ہے کہ ان افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اعمال صالح انجام دیے ہیں بشارت دے دو کہ ان کے لئے بہشت کے باغ ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (و بشر الذین امنوا وعملوا الصالحات ان لھم جنات تجری من تحتھا الانھار)۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ باغات جہاں ہمیشہ پانی نہیں ہوتا بلکہ باہر سے پانی لا کر انہیں سیراب کیا جاتا ہے ان میں زیادہ طراوت نہیں ہوتی۔ تروتازگی تو اس باغ میں ہوتی ہے جس کے لئے پانی کا اپنا انتظام ہو اور وہ پانی اس سے کبھی منقطع نہ ہوتا ہو، ایسے باغ کو خشک سالی اور پانی کی کمی کا خطرہ نہیں ہوتا اور بہشت کے باغات اسی طرح کے ہیں۔

اس کے بعد ان باغوں کے گوناگوں پھلوں کے بارے میں کہتا ہے ہر زمانے میں ان باغوں کے پھل انہیں دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا ہے (کلما رزقوا منھا من ثمرۃ رزقا قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل)۔

مفسرین نے اس جملے کی کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ نعمات ان اعمال کی جزا ہیں جنہیں ہم پہلے دنیا میں انجام دے چکے ہیں اور یہ موضوع پہلے سے فراہم شدہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس وقت جنت کے پھل دوبارہ ان کے لئے لائے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی میوے ہیں جو ہم پہلے کھا چکے ہیں لیکن جب اسے کھائیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کا ذائقہ نیا اور لذت تازہ ہے۔ مثلاً سیب اور انگور جو اس دنیا میں کھاتے ہیں ہر دفعہ وہی پہلے والا ذائقہ محسوس کرتے ہیں لیکن جنت کے میوے جس قدر بھی ظاہراً ایک قسم کے ہوں ہر دفعہ ایک نیا ذائقہ دیں گے اور یہ اس جہاں کی خصوصیات میں سے ہے گویا وہاں تکرار نہیں ہے۔

کچھ اور حضرات کے نزدیک اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ جب جنت کے میووں کو دیکھیں گے تو انہیں دنیا کے میووں سے



مشابہ پائیں گے تاکہ نامانوسی کا احساس نہ ہو لیکن جب کھائیں گے تو ان میں تازگی اور بہترین ذائقہ محسوس کریں گے۔

بعید نہیں کہ آیت میں ان تمام مفاہیم و تفاسیر کی طرف اشارہ ہو کیونکہ قرآن کے الفاظ بعض اوقات کئی معانی کے حامل ہوتے ہیں[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ ان کے لئے ایسے پھل پیش کئے جائیں گے جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں گے (واتوا بہ متشابھا) یعنی وہ سب خوبی و زیبائی میں ایک جیسے ہوں گے وہ ایسے اعلیٰ درجے کے ہوں گے کہ انہیں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے گی۔ یہ اس دنیا کے میووں سے برعکس بات ہوگی جہاں بعض کچے ہوتے ہیں اور بعض زیادہ پک جاتے ہیں۔ بعض کم رنگ اور کم خوشبو ہوتے ہیں اور بعض خوش رنگ، خوشبودار اور معطر ہوتے ہیں۔ لیکن جنت کے باغات کے میوے ایک سے ایک بڑھ کر خوشبودار، ایک سے ایک بڑھ کر میٹھا اور ایک سے ایک بڑھ کر جاذب نظر اور زیبا ہوگا۔

اور آخر میں جنت کی جس نعمت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پاک و پاکیزہ بیویاں ہیں۔ فرمایا: ان کے لئے جنت میں مطہر و پاک بیویاں ہیں (ولھم فیھا ازواج مطھرۃ) یہ ان تمام آلائشوں سے پاک ہوں گی جو اس جہان میں ممکن ہے ان میں ہوں۔ گویا روح و دل پر نگاہ کریں تو پاک اور جسم و بدن پر نظر ڈالیں تو پاک۔

دنیا کی نعمات میں جو مشکلات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے اس وقت اس کے زوال کی فکر بھی لاحق رہتی ہے اور اس کا دل پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر یہ نعمتیں کبھی بھی اطمینان بخش نہیں رہتیں لیکن جنت کی نعمتیں چونکہ ابدی و جاودانی ہیں ان کے لئے فنا و زوال نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ہر جہت سے کامل اور اطمینان بخش ہیں اسی لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا: مومنین ہمیشہ ہمیشہ ان باغاتِ بہشت میں رہیں گے۔ (وھم فیھا خلدون)۔

چند اہم نکات

(۱) **ایمان و عمل:** قرآن کی بہت سی آیات میں ایمان و عمل صالح ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اس بات کی نشاندہی ہے کہ ان میں جدائی نہیں ہوسکتی اور حقیقتاً ایسا ہی ہے کیونکہ ایمان و عمل صالح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اگر ایمان روح کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یقیناً اس کی شعاع انسان کے اعمال کو بھی روشن کرے گی اور اس کے عمل کو عملِ صالح بنا دے گی۔ جیسے کوئی چراغِ پُر نور کسی کمرے میں جلا دیں تو روشندانوں اور دریچوں سے باہر بھی اس کی کرنیں دکھائی دیتی ہیں۔

سورہ طلاق آیہ ۱۱ میں ہے:

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

---

[1] لفظ کے ایک سے زیادہ معانی میں استعمال کی بحث میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔



جو خدا پر ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے اُسے خدا باغات بہشت میں داخل کرے گا جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جہاں جانے والے ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

سورہ نور آیہ ۵۵ میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

جو افراد ایمان لے آئیں اور اعمال صالح انجام دیں خدا کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انہیں روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا۔

اصولی طور پر ایمان جڑ ہے اور عمل صالح اس کا پھل اور میٹھے پھل کا وجود جڑ کی سلامتی کی دلیل ہے اور جڑ کی سلامتی مفید پھل کی پرورش کا سبب ہے۔

ممکن ہے بے ایمان لوگ کبھی کبھی عمل صالح انجام دیں لیکن یہ مسلم ہے کہ اس میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہوگی۔ ایمان جو عمل صالح کا ضامن ہے ایسا ایمان ہے جس کی جڑیں وجود انسانی کی گہرائیوں میں پہنچی ہوئی ہوں اور اُن کی وجہ سے انسان میں احساس مسئولیت پیدا ہو۔

(۲) پاکیزہ بیویاں: یہ امر قابل غور ہے کہ جنت کی بیویوں کی اس آیت میں صرف ایک صفت "مطهرة" بیان کی گئی ہے۔ صفت مطہرہ (یعنی پاک و پاکیزہ) کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیوی کے لئے سب سے پہلی اور اہم ترین شرط پاکیزگی ہے باقی صفات سب اس کے ماتحت ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث اس حقیقت کو روشن کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

ایاکم وخضراء الدمن، قیل: یا رسول اللّٰہ وما خضراء الدمن، قال: المرأة الحسناء فی منبت السوء۔[1]

ان سبزیوں سے پرہیز کرو جو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر اُگیں۔ عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسولؐ! آپ کا مقصد اس سبزی سے کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: خوبصورت عورت جس نے گندے خاندان میں پرورش پائی ہو۔

(۳) جنت کی مادی و معنوی نعمات: اگرچہ بہت سی آیات قرآنی میں مادی نعمتوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ مثلاً باغات جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، قصور و محلات، پاکیزہ بیویاں، رنگ برنگے پھل اور میوے اور ہم مزاج دوست وغیرہ مگر ان کے ساتھ ساتھ اہم ترین معنوی نعمات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جن کی عظمت و رفعت کو ہمارے پیمانوں سے ناپنا ممکن نہیں۔ مثلاً سورہ توبہ آیہ ۷۲ میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۴، ص ۱۹۔



خداوند عالم نے ایماندار مردوں اور عورتوں سے باغاتِ جنت کا وعدہ کیا ہے جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے اور ان کے لئے ان دائمی بہشتوں میں پاکیزہ مکانات ہیں اور اسی طرح پروردگار کی خوشنودی بھی جو ان سب سے بالاتر ہے اور یہ ہے عظیم کامیابی۔

سورہ بینہ کی آیہ ۸ میں جنت کی مادی نعمتوں کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

خداوند عالم ان سے خوش ہے اور وہ بھی خدا سے خوش ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس مقام پر پہنچ جائے کہ اسے احساس ہو کہ خدا اُس سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہے تو وہ تمام لذات کو بھلا دیتا ہے صرف اسی سے دل لگا لیتا ہے اس کے علاوہ اپنی فکر میں کچھ نہیں لاتا اور یہ ایسی روحانی لذت ہے۔ کسی طرح بھی زبان و بیان سے ادا نہیں کی جا سکتی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ چونکہ قیامت و معاد کا روحانی پہلو بھی ہے اور جسمانی بھی لہٰذا جنت کی نعمات بھی دونوں پہلو رکھتی ہیں تاکہ انہیں جامعیت حاصل ہو اور ہر شخص اپنی استعداد اور شائستگی کے مطابق ان سے بہرور ہو۔

۲۶۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ

ترجمہ

۲۶۔ خداوند عالم مچھر یا اس سے بڑھ کر کوئی مثال دینے میں جھجکتا نہیں۔ (اس لئے کہ) جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف سے حقیقت ہے لیکن جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے (اس موضوع کو بہانہ بنا کر) کہتے ہیں کہ خدا کا مقصد اس مثال سے کیا تھا۔ خدا اس سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے لیکن گمراہ صرف فاسقوں کو کرتا ہے۔

تفسیر

کیا خدا بھی مثال دیتا ہے؟

مندرجہ بالا میں سے پہلی آیت کہتی ہے کہ خداوند عالم اس سے نہیں شرماتا کہ وہ اپنی موجودات میں سے جسے چاہے وہ ظاہراً چھوٹی سی ہیں جیسے مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی مثال دے (ان اللہ لا یستحیٖ ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا) کیونکہ مثال کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقصد کے مطابق ہو بہ الفاظ دیگر مثال حقیقت کی تصویر کشی کا ذریعہ ہے۔

بعض اوقات کہنے والا دعیان کی تحقیر اور ان کے کمزور پہلو کو بیان کر رہا ہو تو کسی کمزور چیز کو مثال کے لئے منتخب کرتا ہے۔ مثلاً سورہ حج آیہ ۷۳ میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں بلکہ اگر مکھی کوئی چیز ان سے چھین کر لے جائے تو وہ اس سے واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتے طلب کرنے والا اور جس سے طلب کی جا رہی ہے دونوں کمزور ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں مکھی یا اس جیسی کسی چیز کی مثال سے بہتر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جو ان کی کمزوری اور ناتوانی کی تصویر کشی کرے۔

سورۂ عنکبوت میں جب اس نے چاہا کہ بت پرستوں کے سہاروں کی کمزوری کی تصویر کشی کرے تو انہیں مکڑی سے تشبیہ دی جس نے اپنے لئے کمزور سے گھر کا انتخاب کیا ہے کیونکہ دنیا میں کمزور ترین گھر عنکبوت ہی کا ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ (عنکبوت، ۴۱)

یہ بات مسلم ہے کہ اگر ان مواقع پر ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثال کی بجائے عالم خلقت کی بڑی بڑی چیزوں مثلاً ستاروں اور وسیع آسمانوں کی مثال پیش کی جائے تو بہت ہی نامناسب ہوگا اور اصول فصاحت و بلاغت کے بالکل مطابق نہ ہوگا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں خداوند عالم فرماتا ہے کہ ہمیں انکار نہیں کہ ہم مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال دیں تاکہ حقائق عقلی کو حسی مثالوں کے لباس میں پیش کیا جا سکے اور پھر انہیں بندوں کے اختیار میں دے دیں۔

خلاصہ یہ کہ غرض تو مقصد پہنچانا ہے مثالیں ایسی قبا کی مانند ہونا چاہئیں جو قامتِ مطالب پر فٹ آ سکیں۔

"فما فوقھا" کا مقصود کیا ہے اس کی مفسرین نے دو قسم کی تفسیریں کی ہیں:



ایک گروہ کے مطابق اس سے مراد "چھوٹے ہوتے میں بڑھ کر" ہے کیونکہ مثال چھوٹے ہونے کا بیان کر رہی ہے لہٰذا اس سے بڑھ کر یا اس سے اوپر ہونا بھی اسی نظر سے ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ ایک روپے کے لئے کیوں اتنی زحمت اٹھا رہے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور وہ جواب دے کہ میں تو اس سے اوپر کے لئے بھی تکلیف اٹھاتا ہوں یہاں تک کہ ایک آنے کے لئے بھی۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد "اوپر سے بڑے ہونے کے لحاظ سے ہے" یعنی خداوند عالم چھوٹی چیزوں کی مثالیں بھی دیتا ہے اور بڑی کی بھی، مقتضائے حال کے مطابق۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات اُن کے پروردگار کی طرف سے حق ہے (فاما الذین اٰمنوا فیعلمون انه الحق من ربهم) وہ ایمان اور تقویٰ کی روشنی میں تعصب، عناد اور حق سے کینہ پروری سے دور ہیں اور وہ حق کے چہرے کو پورے طور پر دیکھ سکتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی مثالوں کی منطق کا ادراک کر سکتے ہیں۔

لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کا اس مثال سے کیا مقصد تھا جو تفرقہ و اختلاف کا سبب بن گئی ہے ایک گروہ کی اس کی وجہ سے ہدایت کی ہے اور دوسرے کو گمراہ کیا ہے (واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللّٰه بهذا مثلا یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا) ان کے نزدیک یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مثالیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں کیونکہ خدا کی طرف سے ہوتیں تو سب لوگ اسے قبول کر لیتے۔

مگر خدا انہیں ایک مختصر اور دوٹوک جواب دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے صرف فاسقوں اور گنہ گاروں کو جو حق کے دشمن ہیں گمراہ کرتا ہے (وما یضل به الا الفٰسقین)۔

اس بنا پر یہ ساری گفتگو خدا کی ہے اور نور و ہدایت ہے البتہ چشم بینا کی ضرورت ہے جو استفادہ کرے اب اگر یہ دلوں کے اندھے مخالفت اور ڈھٹائی پر اُتر آئے ہیں تو اس میں ان کا اپنا ہی نقصان اور خسارہ ہے ورنہ ان آیاتِ الٰہی میں کوئی نقص نہیں ہے[1]

چند اہم نکات

(۱) حقائق کے بیان کرنے میں مثال کی اہمیت: حقائق واضح کرنے اور مطالب کو دل نشین بنانے کے لئے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ یضل به کثیرا..... خدا کا کلام ہے نہ کہ کفار کا۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ان مثالوں کا کیا مقصد ہے ان کے جواب میں خدا فرماتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہدایت کرے اور بہت سوں کو گمراہ کرے فاسقین کے علاوہ کوئی گمراہ نہیں ہوتا (لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے)



مختلف مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور ان کی اثر آفرینی ناقابلِ انکار ہے۔

بعض اوقات ایک مثال کا تذکرہ راستے کو اتنا کم کر دیتا ہے کہ زیادہ فلسفیانہ استدلال کی زحمت و تکلیف سے کہنے اور سننے والے دونوں کو نجات مل جاتی ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پیچیدہ علمی مطالب کو عمومی سطح تک عام اور وسیع کرنے کے لئے مناسب مثالوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

ڈھٹائی پسند اور حیلہ ساز لوگوں کو خاموش کرنے کے لئے مثال کی تاثیر کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال معقول کو محسوس سے تشبیہ دینا مسائلِ عقلی کو سمجھانے کے لئے ایک مؤثر طریقہ ہے (البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مثال مناسب ہونی چاہیئے ورنہ گمراہ کن، اتنی ہی خطرناک اور مقصد سے دور کرنے والی ہوگی) اسی بناء پر قرآن میں ہمیں بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک بہت پُرکشش، بہت میٹھی اور بہت پُر تاثیر ہے کیونکہ تمام انسانوں، ہر سطح کے افراد اور فکر و معلومات کے لحاظ سے ہر درجہ کے لوگوں کے لئے یہ کتاب انتہائی فصیح و بلیغ ہے [1]

(۲) مچھر کی مثال کیوں : بہانہ سازوں نے اگرچہ مچھر اور مکھی کے چھوٹے پن کو آیاتِ قرآن سے استہزاء اور اعتراضات کا ذریعہ بنا لیا ہے لیکن اگر ان میں انصاف، ادراک اور شعور ہوتا اور اس چھوٹے سے جانور کی ساخت اور بناوٹ پر غور و فکر کرتے تو سمجھ لیتے کہ اس کے بنانے میں باریک بینی اور عمدگی کی ایک دنیا صرف ہوئی ہے کہ جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ امام صادقؑ اس چھوٹے سے حیوان کی خلقت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :

> خداوند عالم نے مچھر کی مثال دی ہے حالانکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے جسم میں وہ تمام آلات اور اعضاء و جوارح ہیں جو خشکی کے سب سے بڑے جانور کے جسم میں ہیں۔ یعنی ہاتھی اور اس کے علاوہ بھی اس کے دو عضو (سینگ اور پر) ہیں جو ہاتھی کے پاس نہیں ہیں۔ خداوند یہ چاہتا ہے کہ مومنین کو اس مثال سے خلقت و آفرینش کی خوبی و عمدگی بیان کرے۔ یہ بظاہر کمزور سا جانور جسے خدا نے ہاتھی کی طرح پیدا کیا ہے اس میں غور و فکر انسان کو پیدا کرنے والے کی عظمت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔
>
> خصوصاً اس کی سونڈ جو ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہے اندر سے خالی ہے اور وہ مخصوص قوت سے خون کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کی یہ تھوتنی دنیا کی عمدہ ترین سرنگ ہے اور اس کا اندرونی سوراخ بہت باریک ہے۔
>
> خدا نے مچھر کو قوتِ جذب و دفع اور ہاضمے کی قوت دی ہے۔ اسی طرح اسے مناسب طور پر ہاتھ، پاؤں اور کان دیئے ہیں، اسے پَر دیے ہیں تاکہ غذا کی تلاش کر سکے اور یہ پَر اس تیزی سے اوپر نیچے حرکت کرتے

---

[1] انسانی زندگی میں مثال کی تاثیر کس قدر ہے اس سلسلے میں سورہ رعد کی آیہ ۱۷ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے جسے تفسیر نمونہ کی جلد دہم میں ملاحظہ کیجئے۔



ہیں کہ آنکھ ان کی یہ حرکت دیکھ نہیں پاسکتی۔ یہ جانور اتنا حساس ہے کہ صرف کسی چیز کے اٹھنے سے خطرہ محسوس کرلیتا ہے اور بڑی تیزی سے اپنے آپ کو خطرے کی جگہ سے دور لے جاتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ انتہائی کمزور ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے جانور کو عاجز کر دیتا ہے۔

حضرت امیرالمؤمنین علیؑ کا اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب خطبہ نہج البلاغہ میں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

اگر دنیا جہاں کے سب زندہ موجودات جمع ہو جائیں اور باہم مل کے کوشش کریں کہ ایک مچھر بنالیں تو وہ ہرگز ایسا نہیں کرسکتے بلکہ اس جاندار کی خلقت کے اسرار پر ان کی عقلیں دنگ رہ جائیں گی۔ ان کے قویٰ عاجز آجائیں گے اور وہ تھک کر انجام کو پہنچ جائیں گے۔ تلاش بسیار کے بعد بالآخر شکست خوردہ ہو کر اعتراف کریں گے کہ وہ مچھر کی خلقت کے معاملے میں عاجز ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے نابود کرنے سے بھی عاجز ہیں۔[1]

(۳) خدا کی طرف سے ہدایت و گمراہی: گذشتہ آیت کا ظاہری مفہوم ممکن ہے یہ شک پیدا کرے کہ ہدایت اور گمراہی میں جبر کا پہلو ہے اور اس کا دارومدار خدا کی چاہت پر ہے جب کہ اس آیت کا آخری جملہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ہدایت و ضلالت کا سرچشمہ انسان کے اپنے اعمال ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کے اعمال و کردار کے ہمیشہ خاص نتائج و ثمرات ہوتے ہیں ان میں سے اگر عمل نیک ہو تو اس کا نتیجہ روشن ضمیری، توفیقِ الٰہی، خدا کی طرف سے ہدایت اور بہتر انجام کار ہے۔

سورہ انفال کی آیہ ۲۹ اس بات کی گواہ ہے۔ ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو! اگر پرہیزگاری کو اپنا لو تو خدا تمہیں تمیز حق و باطل اور روشن ضمیری عطا کرے گا۔

اور اگر انسان بُرے کاموں کے پیچھے لگا رہے تو اس کے دل کی تیرگی اور بڑھ جائے گی اور گناہ کی طرف اس کا رجحان زیادہ ہو گا بلکہ بعض اوقات انکارِ خدا کی سرحد تک پہنچ جائے گا۔

اس کی شاہد سورہ روم کی آیہ ۱۰ ہے جس میں فرمایا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ○

بُرے اعمال انجام دینے والے اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ اب آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔

ایک اور آیت میں ہے:

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ

جب وہ حق سے پھر گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ (صف. ۵)

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶



زیر بحث آیت بھی اسی مفہوم کی شاہد ہے جب وہ فرماتا ہے وما یضل بہ الا الفسقین یعنی خدا فاسقین ہی کو گمراہ کرتا ہے۔

اس بنا پر اچھے یا بُرے راستے کا انتخاب پہلے ہی سے خود ہمارے اختیار میں ہے اس حقیقت کو ہر شخص کا وجدان قبول کرتا ہے۔ انتخاب کے بعد اس کے قہری نتائج کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن کے مطابق ہدایت و ضلالت اچھے یا برے راستے کے جبری اختیار کا نام نہیں بلکہ قرآن کی متعدد آیات شہادت دیتی ہیں کہ ہدایت کے معنی ہیں سعادت کے وسائل فراہم ہونا اور ضلالت کا مطلب ہے مساعد حالات کا ختم ہو جانا، لیکن اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے اور یہ اسباب کا فراہم کرنا (جس کا نام ہمارے نزدیک توفیق ہے) یا اسباب ختم کر دینا (جسے ہم سلب توفیق کہتے ہیں) انسان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔

اس حقیقت کو ہم ایک سادہ سی مثال سے پیش کر سکتے ہیں۔ جب انسان کسی گرنے کی جگہ یا کسی خطرناک بڑی نہر سے گذرتا ہے تو وہ جتنا اپنے آپ کو نہر کے قریب تر کرتا ہے اس کے پاؤں کی جگہ زیادہ پھسلنے والی ہوتی ہے ایسے میں گرنے کا احتمال زیادہ اور نجات پانے کا کم ہو جاتا ہے اور انسان جتنا اپنے آپ کو اس سے دور رکھے گا اس کے پاؤں رکھنے کی جگہ زیادہ محکم اور اطمینان بخش ہوگی اور گرنے کا احتمال کم ہوگا، ان میں سے ایک کا نام ہدایت اور دوسری کا ضلالت ہے۔ اس گفتگو سے ان لوگوں کی بات کا جواب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے جو آیات ہدایت و ضلالت پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۴) **فاسقین:** فاسقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو عبودیت و بندگی کے دستور سے پاؤں باہر نکالیں کیونکہ اصل لغت میں فسق گٹھلی کے کھجور سے باہر نکلنے کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی کو وسعت دے کر ان لوگوں کے لئے یہ لفظ بولا گیا ہے جو خدا کی بندگی کی شاہراہ سے الگ ہو جائیں۔

۲۷۔ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○

ترجمہ

۲۷۔ (فاسق وہ ہیں) جو خدا سے محکم عہد و پیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں وہ تعلق جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

تفسیر

حقیقی زیاں کار

گذشتہ آیت کے آخر میں چونکہ فاسقین کے گمراہ ہونے سے متعلق گفتگو تھی لہذا اس آیت میں ان کی تین صفات بیان



کرکے انہیں مکمل طور پر مشخص کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں ان علامات وصفات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) فاسق وہ ہیں جو خدا سے محکم عہد و پیمان باندھ کر توڑ دیتے ہیں (الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ)۔
حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے خدا سے مختلف پیمان باندھ رکھے ہیں۔ توحید و خداشناسی کا پیمان اور شیطان اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے کا پیمان۔ فاسق ان تمام پیمانوں کو توڑ دیتا ہے وہ فرمانِ حق سے سرتابی کرتا ہے اور شیطان اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے۔

یہ پیمان کہاں اور کس طرح باندھا گیا تھا: یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پیمان تو دو طرفہ معاملہ ہے ہمیں بالکل یاد نہیں کہ ہم نے گذشتہ زمانے میں اس سلسلے میں اپنے پروردگار سے کوئی عہد و پیمان کیا ہو۔

ایک نکتے کی طرف متوجہ ہونے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ روح کی گہرائی اور سرشتِ انسان کے باطن میں ایک مخصوص شعور اور کچھ خاص قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں جنکی ہدایت کے ذریعے انسان سیدھی راہ اختیار کر سکتا ہے اور اسی ذریعے سے وہ خواہش نفس کی پیروی سے بچتے ہوئے رہبرانِ الٰہی کی دعوت کا مثبت جواب دے سکتا ہے اور خود کو اس دعوت سے ہم آہنگ کر سکتا ہے۔

قرآن اس مخصوص فطرت کو عہد خدا اور پیمانِ الٰہی قرار دیتا ہے حقیقت میں یہ ایک تکوینی پیمان ہے نہ کہ تشریعی و قانونی۔ قرآن کہتا ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

اے اولادِ آدم! کیا ہم نے تم سے یہ عہد و پیمان نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا جو تمہارا واضح دشمن ہے اور میری ہی عبادت کرنا جو سیدھا راستہ ہے۔ (یٰس۔ ۶۰، ۶۱)

واضح ہے کہ یہ اسی فطرتِ توحید و خداشناسی کی طرف اشارہ ہے اور انسان میں راہِ تکامل طے کرنے کا جو عشق ہے اس کی نشاندہی ہے۔

اس بات کے لئے دوسرا شاہد وہ جملہ ہے جو نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں موجود ہے:

وبعث فیھم رسلہ و واتر الیہ انبیائہ لیستأدوہ میثاق فطرتہ

خداوند عالم نے یکے بعد دیگرے لوگوں کی طرف اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ ان سے یہ خواہش کریں کہ وہ اپنے فطری پیمان پر عمل کریں۔

مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو ہر نعمت وافر دی ہے اور اس کے ساتھ عملی طور پر اس سے زبانِ آفرینش میں عہد و پیمان لیا ہے۔ اسے آنکھ دی ہے تاکہ اس سے حقائق کو دیکھ سکے کان دیا ہے تاکہ حق کی آواز سن سکے اور اسی طرح دیگر نعمات ہیں۔

جب انسان اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا نہ ہو یا خداداد قوتوں کا غلط استعمال کرے تو گویا اس نے عہد و پیمان خدا کو



توڑ دیا۔ فاسق تمام کے تمام یا ان میں سے بعض فطری پیمانوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔

(۲) اس کے بعد قرآن فاسقین کی دوسری علامت کی نشاندہی یوں فرماتا ہے: جو تعلق خدا نے قائم رکھنے کو کہا ہے وہ انہیں منقطع کر دیتے ہیں (ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل)۔

بہت سے مفسرین نے اگرچہ اس آیت کو قطع رحمی اور عزیز داری کے رشتے کو منقطع کرنے سے مخصوص سمجھا ہے لیکن مفہوم آیت پر گہرا غور نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے معنی زیادہ وسعت اور زیادہ عمومیت رکھتے ہیں جس کی بنا پر قطع رحم اس کا ایک مصداق ہے کیونکہ آیت کہتی ہے کہ فاسقین ان رشتوں اور تعلقات کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اب یہ پیوند اور ناتے، رشتہ داری کے ناتے، دوستی کے ناتے، معاشرے کے رشتے، خدائی رہبروں سے ربط و پیوند اور خدا سے رابطہ سب پر محیط ہیں لہٰذا آیت کو قطع رحمی اور رشتہ داری کے رابطوں کو روندنے کے معنی میں منحصر نہیں کرنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت سے مراد انبیاء و مومنین سے رابطہ منقطع کرنا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم انبیاء اور آسمانی کتابوں سے رابطہ قطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان سے رابطہ استوار رکھنے کا حکم دیا ہے واضح ہے کہ یہ تفسیریں بھی آیت کے مفہوم کا جز ہیں۔

بعض روایات میں "ما امر اللہ بہ ان یوصل" کی تفسیر امیر المؤمنینؑ اور ائمہ اہل بیتؑ سے مربوط کی گئی ہے۔[1]

(۳) فاسقین کی ایک اور علامت زمین میں فساد برپا کرنا ہے جس کی آخری مرحلے میں نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں (و یفسدون فی الارض)۔

یہ واضح ہے کہ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے، اس کی اطاعت سے رخ موڑ لیا ہے اور اپنے رشتے داروں سے رحم و شفقت کا برتاؤ نہیں کرتے وہ دوسروں سے کیسا معاملہ کریں گے۔ وہ اپنی مقصد براری، اپنی لذتوں اور ذاتی فائدوں کے ہی چکر میں رہیں گے۔ معاشرے کی حالت کچھ بھی ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ان کا ہدف تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی جائے۔ اس ہدف و غرض تک پہنچنے کے لئے وہ کسی بھی غلطی کی پرواہ نہیں کرتے۔ واضح ہے کہ اس طرز فکر و عمل سے معاشرے میں کیسے کیسے فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

زیر بحث آیت کے آخر میں ہے کہ یہی لوگ زیاں کار اور خسارہ اٹھانے والے ہیں (اولئک ھم الخاسرون)۔

واقعاً ایسا ہی ہے۔ اس سے بدتر کیا خسارہ ہوگا کہ وہ تمام مادی و روحانی سرمایہ جس سے انسان بڑے بڑے اعزاز اور سعادتیں حاصل کر سکتا ہے اُسے اپنی فنا و نابودی، بدبختی اور سیاہ کاری کی راہ میں خرچ کر دے اور جو لوگ مفہوم فسق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خدا کی اطاعت کے مرکز سے خارج ہو گئے ہیں ان کی قسمت میں اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اول، ص ۴۵ (مزید توضیح کے سلسلے میں نیز ان روایات کے لئے جو ان پیوندوں کے مفہوم کی وسعت سے متعلق ہیں اسی تفسیر (نمونہ) میں سورہ رعد کی آیہ ۲۱ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے)



چند اہم نکات

(ا) اسلام میں صلہ رحمی کی اہمیت: گذشتہ آیت اگرچہ تمام خدائی باتوں کے احترام کے متعلق گفتگو کرتی ہے لیکن بلاشک و تردد رشتہ داری کا ناتا اور تعلق اس کا واضح اور روشن مصداق ہے۔

اسلام صلہ رحمی، عزیزوں کی مدد وحمایت اور ان سے محبت کرنے کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور قطع رحمی اور رشتہ داروں اور عزیزوں سے رابطہ منقطع کرنے کو سختی سے منع کرتا ہے۔

صلہ رحمی کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

صلة الرحم تعمر الديار وتزيد فی الاعمار وان کان اهلها غير اخيار

رشتہ داروں سے صلہ رحمی شہروں کی آبادی کا باعث ہے اور زندگیاں اس سے بڑھتی ہیں اگرچہ صلہ رحمی کرنے والے لوگ اچھے نہ ہوں[1]

امام صادقؑ کے ارشادات میں سے ہے:

صل رحمك ولو بشربة من ماء وافضل ما يوصل به الرحم کف الاذی عنها۔

رشتہ داری کی گرہ اور ناتے کو مضبوط کرو چاہے پانی کے ایک گھونٹ سے ہو سکے اور ان کی خدمت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ (کم ازکم) تم سے انہیں کوئی تکلیف واذیت نہ پہنچے[2]

قطع رحمی کی قباحت اور گناہ اس قدر ہے کہ امام سجادؑ نے اپنے فرزند کو نصیحت کی کہ وہ پانچ گروہوں کی صحبت اور دوستی سے پرہیز کرے اور ان پانچ گروہوں میں سے ایک قطع رحمی کرنے والے ہیں:

.... وایاك ومصاحبة القاطع لرحمه فانی وجدته ملعونا فی کتاب الله

قطع رحمی کرنے والے کی معاشرت سے پرہیز کرو کیونکہ قرآن نے اسے ملعون اور خدا کی رحمت سے دور قرار دیا ہے[3]

سورہ محمد آیہ ۲۲، ۲۳ میں ارشاد ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ۔

پس اس کے سوا تم سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ اگر اقتدار تمہارے ہاتھ آجائے تو زمین میں فساد برپا کردو اور قطع رحمی کرو۔ ایسے ہی لوگ خدا کی لعنت کے سزاوار ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۵۱۳۔

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۵۱۳

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۵۱۶ (مادہ رحم)



خلاصہ یہ کہ قرآن میں قطع رحمی کرنے والوں اور رشتے داری کے پیوند کو توڑنے والوں کے لئے سخت احکامات ہیں اور احادیث اسلامی بھی ان کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مغضوب کون سا عمل ہے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: خدا سے شرک کرنا۔ پوچھا اس کے بعد کون سا عمل زیادہ باعث غضب الٰہی ہے تو فرمایا: قطع رحمی ہے[1]

اسلام نے جو رشتہ داری کی اس قدر حفاظت و نگہداری کی تاکید کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عظیم معاشرے کا استحکام، ترقی، تکامل اور اسے عظیم تر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کام چھوٹی اکائیوں سے شروع کیا جائے۔ یہ عظمت اقتصادی اور فوجی لحاظ سے درکار ہو یا روحانی و اخلاقی لحاظ سے۔ جب چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں پیش رفت اور استحکام پیدا ہوگا تو بڑا معاشرہ خود بخود اصلاح پذیر ہو جائے گا۔

اسلام نے مسلمانوں کی عظمت کے لئے اس روش سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نے اکائیوں کی اصلاح کا حکم دیا ہے اور عموماً لوگ ان کی مدد، اعانت اور انہیں عظمت بخشنے سے روگردانی نہیں کرتے کیونکہ وہ ایسے افراد کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے کی نصیحت کرتا ہے جن کا خون ان کے رگ و ریشے میں گردش کر رہا ہے اور جو ایک خاندان کے ارکان ہیں۔ واضح ہے کہ جب رشتہ داری کے چھوٹے گروپ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے تو بڑا گروپ بھی عظمت حاصل کرے گا اور ہر لحاظ سے قوی ہوگا، وہ حدیث جس میں ہے کہ صلہ رحمی شہروں کی آبادی کا باعث ہے غالباً اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۲) **جوڑنے کی بجائے توڑنا:** یہ بات قابل غور ہے کہ آیت کی تعبیر میں اس طرح ہے کہ خدا نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے فاسق اسے توڑتے ہیں۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قطع کرنا وصل سے پہلے ممکن ہے؟ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ وصل سے مقصد ان روابط کو جاری رکھنا ہے جو خداوند عالم نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان یا بندوں میں سے ایک دوسرے کے درمیان طبعی اور فطری طور پر قائم کئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خدا نے حکم دیا ہے کہ ان فطری اور طبعی رابطوں کی محافظت و پاسداری کی جائے لیکن گنہگار انہیں قطع کر دیتے ہیں (اس بات پر خصوصی غور کیجئے)۔

۲۸۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

۲۹۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ ع

۲

ترجمہ

۲۸۔ تم خدا سے کیونکر کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندگی دی پھر وہ تمہیں مارے گا اور دوبارہ تمہیں

[1] سفینۃ البحار (مادہ رحم)



زندہ کرے گا اس کے بعد اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے (اس بنا پر نہ تمہاری زندگی تمہاری طرف سے ہے اور نہ موت جو کچھ تمہارے پاس ہے سب خدا ہی کی طرف سے ہے)۔

۲۹۔ وہ خدا جس نے زمین کی تمام نعمتوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

زندگی ایک اسرار آمیز نعمت ہے

مندرجہ بالا دو آیات میں قرآن نے نعمات الٰہی کے ایک سلسلے اور تعجب انگیز خلقت کا ذکر کر کے انسان کو پروردگار اور اس کی عظمت کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور خدا شناسی کے سلسلے میں جو دلائل گذشتہ آیات (۲۱ و ۲۲) میں بیان کئے گئے ہیں ان کی تکمیل کر رہا ہے۔

قرآن یہاں وجود خدا کے اثبات کو ایسے نکتے سے شروع کر رہا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور وہ ہے زندگی کا پُر اسرار مسئلہ۔

پہلے کہتا ہے تم خدا کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندہ کیا اور تمہارے بدن پر زندگی کا لباس پہنایا (کیف تکفرون باللہ، وکنتم امواتا فاحیاکم)۔

قرآن ہم سب کو یاد دہانی کراتا ہے کہ —— اس سے پہلے تم پتھروں، مٹی اور بے جان موجودات کی طرح مردہ تھے اور نسیم زندگی کا تمہارے کوچے سے گزر نہ تھا لیکن اب تم نعمت حیات و ہستی کے مالک ہو تمہیں اعضاء، حواس اور ادراک کے کارخانے عطا کئے گئے ہیں۔ یہ وجود اور حیات تمہیں کس نے عطا کیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ خود تم نے اپنے آپ کو دیا ہے۔ واضح ہے کہ ہر منصف مزاج انسان بغیر کسی تردد کے اعتراف کرتا ہے کہ یہ نعمت خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ ایک مبداء عالم و قادر کی طرف سے اسے ملی ہے جو زندگی کے تمام رموز اور پیچیدہ قوانین سے واقف تھا، انہیں منظم کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ کیوں حیات و ہستی بخشنے والے خدا کا انکار کرتے ہیں۔

آج کے زمانے میں تمام علماء و محققین پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے پاس اس دنیا میں حیات و ہستی سے زیادہ پیچیدہ کوئی دوسرا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ تمام تر عجیب و غریب ترقی کے باوجود جو طبیعی علوم و فنون کے سلسلے میں انسان کو نصیب ہوئی ہے ابھی تک حیات کا معمہ حل نہیں ہو سکا۔ یہ مسئلہ اس قدر اسرار آمیز ہے کہ لاکھوں علماء کے افکار اور کوششیں اب تک اس مسئلے کے ادراک سے عاجز ہو چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انتھک کوششوں کے سلسلے میں آئندہ تدریجاً انسان رموز حیات سے آگاہ ہو سکے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی شخص اس معاملے کو جو بہت گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اسرار انگیز ہے اور بہت زیادہ علم و قدرت کا محتاج ہے بے شعور طبیعت کی طرف نسبت دے سکتا ہے وہ طبیعت جو خود حیات و زندگی سے عاری ہے۔



یہ وہ مقام ہے جہاں ہم کہتے ہیں کہ اس جہان طبیعت میں حیات و زندگی کا ظہور وجود خدا کے اثبات کی سب سے بڑی سند ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

قرآن اوپر والی آیت میں خصوصیت کے ساتھ اسی مسئلے کا سہارا لیتا ہے ہم سردست اسی مختصر اشارے سے گزر جاتے ہیں۔ قرآن اس نعمت کی یاد دہانی کے بعد ایک اور واضح دلیل پیش کرتا ہے اور وہ ہے مسئلہ موت، قرآن کہتا ہے: پھر خدا انہیں مار دے گا (ثم یمیتکم)۔

انسان دیکھتا ہے کہ اس کے اعزا و اقربا اور دوست و احباب یکے بعد دیگرے مرتے رہتے ہیں اور ان کا بے جان جسم مٹی کے نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ یہ مقام بھی غور و فکر کا ہے کہ آخر کس نے ان سے وجود کو چھین لیا ہے اگر ان کی زندگی اپنی طرف سے تھی تو ہمیشہ رہتی یہ جو لے لی گئی ہے اس کی دلیل ہے کہ کسی دوسرے نے انہیں دی تھی۔

زندگی پیدا کرنے والا وہی موت پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ سورہ ملک کی آیت ۲ میں ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

خدا وہ ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں حسن عمل کے میدان میں آزمائے۔

قرآن نے وجود خدا پر ان دو واضح دلیلوں کو پیش کیا ہے۔ دوسرے مسائل کے لئے روح انسانی کو آمادہ کیا ہے اور اس بحث سے مسئلہ معاد اور موت کے بعد زندگی کو بیان کیا ہے پھر کہتا ہے وہ اس کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا (ثم یحییکم)۔ البتہ موت کے بعد یہ زندگی کسی طرح تعجب خیز نہیں کیونکہ پہلے بھی انسان اسی طرح تھا پہلی دلیل (یعنی بے جان کو زندگی عطا کرنا) کی طرف متوجہ ہونے کے بعد دوسری مرتبہ اجزائے بدن کے منتشر ہونے کے بعد زندگی ملنے کے مسئلے کو قبول کرنا مشکل نہیں بلکہ پہلی دفعہ کی نسبت آسان ہے اگرچہ جس ذات کی قدرت لامتناہی ہو اس کے لئے تسہیل و مشکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں انسانوں کی دوبارہ کی زندگی میں شک اور تردد تھا حالانکہ پہلی زندگی جو بے جان موجودات سے صورت پذیر ہوئی ہے اسے جانتے تھے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن آغاز سے اختتام تک فرجیات کو انسان کے سامنے کھولتا ہے اور ایک مختصر سے بیان میں زندگی کی ابتداء و انتہا اور مسئلہ معاد و قیامت کی اس کے سامنے تصویر کشی کرتا ہے۔

اس آیت کے آخر میں کہتا ہے: پھر اس کی طرف تمہاری بازگشت ہوگی (ثم الیہ ترجعون) خدا کی طرف رجوع کرنے کے معنی وہی خدا کی نعمتوں کی طرف رجوع کرنا ہیں یعنی قیامت اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے والے دن خدا کی نعمتوں کی طرف رجوع کرو گے۔ اس کی شاہد سورہ انعام کی آیت ۳۶ ہے جہاں فرماتا ہے:

وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ؐ

خدا مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا اور اسی کی طرف ان کی بازگشت ہوگی۔

ممکن ہے خدا کی طرف رجوع کرنے سے مقصود کوئی ایسی حقیقت ہو جو اس سے زیادہ دقیق و باریک ہو اور وہ یہ کہ تمام موجودات نے اپنا سفر نقطۂ عدم جو نقطۂ صفر ہے سے شروع کیا ہے اور تمام موجودات سیر تکامل میں ہیں اور لامتناہی کی طرف



بڑھ رہے ہیں جو ذاتِ پروردگار ہے لہٰذا مرنے سے سیر تکامل کا سلسلہ معطل نہیں ہوتا اور دوسری مرتبہ قیامت میں زندگی کی زیادہ بلند سطح کی طرف یہ سیر تکامل جاری وساری رہے گی۔

نعمت حیات اور مسئلہ مبدا ر و معاد کے ذکر کے بعد خدا ایک اور وسیع نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: خدا وہ ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لئے پیدا کیا ہے (ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً)۔ اس تربیت سے انسان کی وجودی قدر و قیمت اور زمین کے تمام موجودات پر ان کی سرداری کو مشخص کیا گیا ہے۔ اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان کو بہت بڑے، قیمتی اور عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ تمام چیزوں کو تو اس کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب اسے کس لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس صحن عالم میں عالی ترین وجود ہے اور صحن عالم میں سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

صرف یہی آیت نہیں جس میں انسان کے بلند ترین مقام کو بیان کیا گیا ہے بلکہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات ملتی ہیں جو انسان کا تعارف تمام تر موجودات کا مقصودِ اصلی کی حیثیت سے کراتی ہیں جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو تمہارے لئے مسخر قرار دیا ہے۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل بیان ہوئی ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ[1]..... وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ[2] وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ[3]..... وَسَخَّرَ الْبَحْرَ[4]..... وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ[5]

کشتیوں کو تمہارے لئے مسخر کیا.... اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا.... دن اور رات کو تمہارے لئے مسخر کیا.... اور سمندروں کو مسخر کیا.... اور آفتاب و ماہتاب کو بھی تمہارا فرماں بردار اور خدمت گزار قرار دیا۔[6]

دوبارہ توحید کے دلائل کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا ہے: پھر خداوند عالم آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (ثم استویٰ الی السماء فسوٰاھن سبع سمٰوٰت وھو بکل شیء علیم)۔

لفظ "استویٰ" مادہ "استواء" سے لیا گیا ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں احاطۂ کامل، تسلط اور خلقت و تدبیر پر مکمل قدرت۔ لفظ "ثم" جملہ "ثم استویٰ الی السماء" میں ضروری نہیں کہ تاخیر زمانی کے معنی میں ہو بلکہ ہو سکتا ہے اس کے معنی تاخیر بیان اور حقائق کو ایک دوسرے کے بعد لاتا ہو۔

---

[1] ابراہیم، آیہ ۳۲

[2] و [3] ابراہیم، آیہ ۳۳

[4] نحل، آیہ ۱۴

اس سلسلے میں زیادہ تر بحث اسی تفسیر میں سورہ رعد آیہ ۲ اور سورہ ابراہیم آیات ۳۲ اور ۳۳ میں کی گئی ہے۔



چند اہم نکات

(۱) تناسخ اور ارواح کا پلٹ آنا

اُوپر والی آیت ان آیات میں سے ہے جو عقیدۂ تناسخ کی صریحاً نفی کرتی ہیں کیونکہ تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کا خیال ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوسری دفعہ اسی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے البتہ ہوتا یہ ہے کہ اس کی رُوح دوسرے جسم (اور دوسرے نطفے) میں حلول کرکے نئے سرے سے اسی دنیا میں زندگی کا آغاز کرتی ہے اور ممکن ہے اسی سلسلے کا بار بار تکرار ہو۔ اس جہان میں اس مکرر زندگی کو تناسخ یا عودِ ارواح کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت صراحت سے بیان کرتی ہے کہ موت کے بعد ایک سے زیادہ زندگی نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ یہ حیات وہی معاد و قیامت کی حیات ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آیت کہتی ہے کہ مجموعی طور پر تمہاری دو زندگیاں اور دو اموات تھیں اور ہیں۔ پہلے مُردہ تھے (بے جان عالم موجودات میں تھے) خداوند عالم نے تمہیں زندہ کیا پھر وہ مارے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ اگر تناسخ صحیح ہوتا تو انسان کی حیات اور موت کی تعداد دو دو سے زیادہ ہوتی۔

یہی مضمون قرآن کی اور متعدد آیات میں بھی نظر آتا ہے جن کی طرف اپنی اپنی جگہ اشارہ ہوگا۔[1]

اس بناء پر تناسخ کا عقیدہ جسے عودِ ارواح بھی کہا جاتا ہے قرآن کی نظر میں باطل اور بے اساس ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس روشن عقلی دلیلیں بھی موجود ہیں جو اس عقیدے کی نفی کرتی ہیں جن سے یہ ایک قسم کا دقیانوسی اور قانون تکامل کی رجعتِ قہقری کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے متعلق اس کی اپنی جگہ گفتگو کی گئی ہے۔[2]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ شاید بعض لوگ مندرجہ بالا آیت کو برزخ کی زندگی کی طرف اشارہ قرار دیں حالانکہ آیت اس پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی صرف اتنا کہتی ہے کہ تم پہلے بے جان جسم تھے خداوند عالم نے تمہیں پیدا کیا دوبارہ وہ تمہیں مارے گا جو اشارہ ہے اس دنیا کی زندگی کے اختتام کی طرف) پھر تمہیں زندہ کرے گا (یہ حیات آخرت کی طرف اشارہ ہے) اور اسی کی طرف تم اپنی سیر تکامل جاری رکھو گے۔

(۲) سات آسمان

لفظ "سما" لغت میں "اوپر" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ ایک جامع مفہوم ہے جس کے مختلف مصادیق ہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں گوناگوں موقعوں پر صرف ہوا ہے۔

(۱) کبھی زمین کے پڑوس میں "اوپر" والی جہت پر بولا جاتا ہے جیسے کہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا

---

[1] موضوعِ رجعت کی وجہ سے اس مسئلے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ رجعت اول تو ایک مخصوص طبقہ کے لئے ہے اس میں عمومیت نہیں ہے جب کہ زیرِ نظر آیت ایک حکم کلی بیان کر رہی ہے پھر تناسخ میں اجسام اور ان کے اجزاء الگ الگ ہوتے ہیں جب کہ رجعت میں ایسا نہیں ہے۔

[2] کتاب "عودِ ارواح و ارتباط ارواح" کی طرف رجوع فرمائیں۔



فِی السَّمَآءِ ۙ

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خداوند عالم نے پاک گفتگو کو کس طرح ایک ایسے پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑ مضبوط و ثابت ہے اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ (ابراہیم ۔ ۲۴)

(ii) کبھی لفظ "سماء" سطح زمین سے بہت دور (بادلوں کی جگہ) کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا

ہم آسمان سے برکتوں والا پانی نازل کرتے ہیں۔ (ق ۔ ۹)

(iii) کبھی اطراف زمین کی ہوائے متراکم کی جلد کو آسمان کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ

ہم نے آسمان کو محکم و مضبوط چھت قرار دیا ہے۔ (انبیاء ۔ ۳۲)

یہ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ زمین کی فضا جو چھت کی طرح ہمارے سروں پر برقرار ہے وہ اتنی مضبوط ہے کہ کرہ ارض کو آسمانی پتھروں کے گرنے سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ پتھر جو مسلسل شب و روز کشش زمین کے مرکز میں آتے ہیں اور اس کی طرف کھچے آتے ہیں اگر ہوائے متراکم کی یہ جلد نہ ہو تو ہم ہمیشہ ان خطرناک پتھروں کی زد میں رہیں لیکن اس جلد کا وجود اس بات کا سبب بنتا ہے کہ یہ پتھر فضائے زمین ہی میں جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

(iv) اور کبھی اوپر کے کروں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جب کہ وہ دھواں اور بخارات تھے (اور پہلی گیس سے کرات کو پیدا کیا)۔ (فصلت ۔ ۱۱) (حم سجدہ)

اب اصل بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ سات آسمانوں سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین اور علماء اسلام کے گوناگوں بیانات اور مختلف تفاسیر ہیں۔

(۱) بعض سات آسمانوں سے وہی سبع سیارات (سات سیارے یعنی عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل، چاند اور سورج) مراد لیتے ہیں۔ علمائے ہیئت قدیم کے نزدیک چاند اور سورج بھی سیارات میں داخل تھے[1]

(ب) بعض کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد زمین کے گرد ہوائے متراکم کے طبقات ہیں اور وہ مختلف تہیں جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔

---

[1] بعض علماء نے نظام شمسی کے دس کرات (نو سیارے تو مشہور ہیں ایک اور سیارہ بھی ہے جو مریخ اور مشتری کے درمیان تھا لیکن وہ منتشر ہو گیا اس کا کچھ حصہ اسی طرح اسی مدار میں محو گردش ہے) کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک گروہ وہ ہے جو مدار زمین میں گردش کر رہے ہیں (جن میں عطارد و زہرہ شامل ہیں) اور ایک گروہ مدار زمین سے باہر اور اس کے اوپر کی طرف ہے۔ شاید اسی تفسیر سے یہی باہر کے سات سیارے مراد ہیں۔



(ج) بعض کہتے ہیں یہاں سات کا عدد تعدادی عدد (عدد مخصوص) کے معنی میں نہیں بلکہ عدد تکثیری ہے جس کے معنی ہیں زیادہ اور تعداد فراواں کلام عرب اور خود قرآن میں کئی جگہ اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً سورہ لقمان آیت ۲۷ میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ

اگر زمین کے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں اور سات سمندر مزید مل جائیں تو بھی کلماتِ خدا کو لکھا نہیں جا سکتا۔

بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں سات سے مراد عدد مخصوص سات نہیں بلکہ اگر ہزارہا سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو اس سے خدا کے لامتناہی علم کو نہیں لکھا جا سکتا۔ اس بنار پر کہا جا سکتا ہے کہ سات آسمانوں سے متعدد آسمان اور عالم بالا کے بہت سے کرات مراد ہیں اور اس سے کوئی عدد مخصوص مراد نہیں۔

(د) جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ "سمٰوٰتِ سبع" سے مراد سات آسمان ہی ہے جو اس کے حقیقی معنی ہیں۔ مختلف آیاتِ قرآن میں اس عبارت کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ سات کا عدد یہاں کثرت کے معنی میں نہیں بلکہ اسی خاص عدد کی طرف اشارہ ہے البتہ آیاتِ قرآن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام کرات، ثوابت اور سیارات جو ہم دیکھ رہے ہیں پہلے آسمان کا جزء ہیں اور چھ عالم اس کے علاوہ موجود ہیں جو ہماری نگاہ اور آج کے علمی آلات کی دسترس سے باہر ہیں اور مجموعی طور پر سات آسمانوں سے سات عالم تشکیل پذیر ہیں۔

قرآن اس گفتگو کا شاہد ہے:

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ

ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے سجایا۔ (فصلت۔ ۱۲)

دوسری جگہ پر یوں ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨ الْكَوَاكِبِ ۙ

یقیناً ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی۔ (الصّٰفّٰت۔ ۶)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ جسے ستاروں کی دنیا کہتے ہیں سب آسمان اول ہے اس کے علاوہ چھ آسمان اور موجود ہیں جن کی جزئیات کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ چھ اور آسمان ہیں جو ہمارے لئے مجہول ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ علوم ان سے پردہ اٹھائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ناقص علوم جتنے آگے بڑھتے ہیں خلقت کے نئے عجائبات تک دسترس حاصل کرتے ہیں مثلاً علم ہیئت ابھی وہاں تک پہنچا ہے جہاں سے آگے ٹیلی سکوپ (TELESCOPE) دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

بڑی بڑی رصد گاہوں کے انکشافات ایک ارب نوری سال کے فاصلے تک پہنچ چکے ہیں اور سائنس دان معترف ہیں کہ یہ تو آغازِ عالم ہے اختتام نہیں لہٰذا اس میں کیا مانع ہے کہ آئندہ علم ہیئت کی ترقی سے مزید آسمان، کہکشائیں اور دوسرے



عوالم کا انکشاف ہو جائے۔ بہتر ہے کہ یہ گفتگو دنیا کی ایک بہت بڑی رصدگاہ کی زبان ہی سے سنی جائے۔

(۳) **عظمتِ کائنات:** پالومار کی رصدگاہ نے جہانِ بالا کی اس طرح توصیف کی ہے:

"جب تک پالومار کی رصدگاہ کی دُوربین نہیں بنی تھی دنیا کی وسعت جو ہمیں نظر آتی تھی پانچ سو نوری سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب اس دُوربین نے ہماری دنیا کی وسعت ایک ارب نوری سال تک پہنچا دی ہے اس کے نتیجے میں کئی ملین نئی کہکشاؤں کا انکشاف ہوا ہے (جن میں) سے بعض ہم سے ایک ارب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں لیکن ایک ارب نوری سال کے فاصلے کے بعد ایک عظیم مہیب اور تاریک فضا نظر آتی ہے جس کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی یعنی روشنی وہاں سے عبور نہیں کر سکتی کہ رصدگاہ کی دُوربین کے صفحہ عکاسی کو متاثر کرے لیکن بلاشک اس مہیب و تاریک فضا میں کئی سو ملین کہکشائیں موجود ہیں لیکن ہماری دنیا ان کہکشاؤں کی کشش سے محفوظ ہے۔

یہ عظیم دنیا جو نظر آرہی ہے جس میں کئی سو ملین کہکشائیں موجود ہیں ایک عظیم تر جہان کا چھوٹا سا ذرّہ بے مقدار ہے اور ابھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس دوسری دنیا کے اوپر بھی کوئی اور دنیا ہے۔"[1]

اس گفتگو سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیائے علم آسمانوں کے بارے میں اپنی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اپنے انکشافات کو آغازِ جہاں سمجھتی ہے نہ کہ اس کا اختتام بلکہ ایک بہت ہی عظیم جہان کے مقابلے میں اسے ایک چھوٹا سا ذرہ خیال کرتی ہے۔

۳۰۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ
فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ
نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۳۱۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ۝

---

[1] مجلہ "فضا" شمارہ ۵۶ فروردین ۱۳۵۱ ہجری شمسی



۳۳۔ قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا
تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۰۔ جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک جانشین اور حاکم مقرر کرنے لگا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگارا) کیا ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا (کیونکہ آدم سے پہلے زمین کے دوسرے موجودات جو عالم وجود میں آچکے ہیں ان کی طبیعت اور مزاج جہان مادہ کے حکم کا پابند ہے لہٰذا وہ فساد اور خونریزی کے گناہ ہی میں مبتلا تھے لیکن خلقت انسان کا مقصد اگر عبادت ہے تو ہم تیری تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں (اس پر پروردگار عالم نے فرمایا: میں حقائق کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

۳۱۔ پھر علم اسماء (علم اسرار خلقت اور موجودات کے نام رکھنے کا علم) سب کا سب آدم کو سکھایا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔

۳۲۔ فرشتوں نے کہا تو پاک و منزہ ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو حکیم و دانا ہے۔

۳۳۔ فرمایا: اے آدم! انہیں ان موجودات کے ناموں (اور اسرار) سے آگاہ کر دے۔ جب اس نے انہیں آگاہ کر دیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو انہیں بھی جانتا ہوں۔

تفسیر

زمین میں خدا کا نمائندہ —— انسان

گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا نے زمین کی تمام نعمتیں انسان کے لئے پیدا کی ہیں اور ان آیات میں رسمی طور پر انسان کی رہبری اور خلافت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کی اس روحانی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ان تمام احسانات کے لائق تھا۔

ان آیات میں آدم (پہلے انسان) کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات کے اس سلسلے میں جو آیہ ۳۰ سے شروع ہو کر ۳۹ تک پہنچتا ہے تین بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(۱) پروردگار عالم کا فرشتوں کو زمین میں انسان کی خلافت و سرپرستی کے بارے میں خبر دینا اور وہ گفتگو جو فرشتوں نے اس سلسلے میں خدا سے کی۔



(۲) پہلے انسان کے لئے فرشتوں کو خضوع و تعظیم کا حکم جس کا ذکر مختلف مناسبات سے قرآن کی مختلف آیات میں کیا گیا ہے۔

(۳) بہشت میں آدم کی کیفیت اور رہنے کی تشریح، وہ حوادث جو جنت سے ان کے نکلنے کا سبب بنے، آدم کا توبہ کرنا اور پھر آدم اور اولادِ آدم کا زمین میں آکر آباد ہونا۔

زیر بحث آیات ان میں سے پہلی منزل کی بات کرتی ہیں۔ خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا موجود خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو، اس کی صفات صفاتِ خداوندی کا پرتو ہوں اور اس کا مرتبہ و مقام فرشتوں سے بالاتر ہو۔ خدا کی خواہش اور ارادہ یہ تھا کہ ساری زمین اور اس کی نعمتیں، تمام قوتیں، سب خزانے، تمام کانیں اور سارے وسائل بھی اس کے سپرد کر دیے جائیں۔ ضروری ہے کہ ایسا شخص عقل و شعور، ادراک کے وافر حصے اور خصوصی استعداد کا حامل ہو جس کی بنا پر موجودات ارضی کی رہبری اور پیشوائی کا منصب سنبھال سکے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت کہتی ہے: یاد کریں اُس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر جانشین مقرر کرنے والا ہوں (واذ قال ربک للملٰئکة انی جاعل فی الارض خلیفة)۔

"خلیفہ" کے معنی ہیں جانشین۔ لیکن یہاں اس سے کس کا جانشین مراد ہے اور کس چیز میں جانشین ہے۔ مفسرین نے اس کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں انسان یا اور موجودات کا جانشین جو زمین میں پہلے زندگی گزارتے تھے۔

بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ انسان کی دوسری نسلیں ایک دوسرے کا جانشین ہوں گی۔

لیکن انصاف یہ ہے جسے بہت سے محققین نے بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد خلافتِ الٰہی اور زمین میں خدا کی نمائندگی ہے کیونکہ اس کے بعد فرشتوں کا سوال اور ان کا کہنا کہ ممکن ہے نسل آدم مبدار فساد و خونریزی ہو جب کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے کیونکہ زمین میں خدا کی نمائندگی ان کاموں کے ساتھ سازگار نہیں۔

اسی طرح آدم کو "اسما" کی تعلیم دینا جس کی تفصیل بعد کی آیات کے ذیل میں آئے گی اس دعوے پر ایک اور واضح قرینہ ہے اور آدم کے سامنے سجدہ بھی اسی مقصد کا شاہد ہے۔

بہرحال خدا چاہتا تھا کہ ایسے وجود کو پیدا کرے جو عالمِ وجود کا گلدستہ ہو اور خلافتِ الٰہی کے مقام کی اہلیت رکھتا ہو اور زمین میں اللہ کا نمائندہ ہو۔

ان آیات کی تفسیر میں ایک حدیث جو امام صادقؑ سے مروی ہے وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فرشتے مقام آدم پہچاننے کے بعد سمجھ گئے کہ آدم اور ان کی اولاد زیادہ حقدار ہیں کہ وہ زمین میں خلفاءِ الٰہی ہوں اور مخلوق پر اس کی حجت ہوں[1]۔

زیر بحث آیت مزید بیان کرتی ہے کہ فرشتوں نے حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ اعتراض کی غرض سے عرض کیا: کیا زمین

---

[1] معانی الاخبار بحوالہ المیزان، جلد ۱، ص ۱۲۱۔ اس حدیث سے اگرچہ زیادہ تر انبیاء اور آئمہ کا مقام ظاہر ہوتا ہے لیکن معلوم ہے کہ یہ انہی میں منحصر نہیں وہ تو اس موضوع کے اتم داخل مصداق ہیں۔



میں اسے (جانشین) قرار دے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا (قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء)۔ جب کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، تیری تسبیح و حمد کرتے ہیں اور جس چیز کی تیری ذات لائق نہیں اُس سے تجھے پاک سمجھتے ہیں (ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک)۔

مگر یہاں خدا نے انہیں سربستہ و مجمل جواب دیا جس کی وضاحت بعد کے مراحل میں آشکار ہوئی۔ فرمایا: میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے (قال انی اعلم ما لا تعلمون)۔

جیسے کہ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے فرشتے سمجھ گئے تھے کہ یہ انسان سربراہی نہیں بلکہ فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کس طرح سمجھے تھے۔

بعض کہتے ہیں خدا نے انسان کے آئندہ حالات بطورِ اجمال انہیں بتائے تھے جب کہ بعض کا احتمال ہے کہ ملائکہ خود اس مطلب کو لفظ فی الارض (زمین میں) سے سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے انسان مٹی سے پیدا ہوگا اور مادہ اپنی محدودیت کی وجہ سے طبعاً مرکز نزاع و تزاحم ہے کیونکہ محدود مادی زمانہ انسانوں کی اس طبیعت کو سیر و سیراب نہیں کر سکتا جو زیادہ کی طلب رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر ساری دنیا ایک فرد کو دے دی جائے تو ممکن ہے وہ پھر بھی سیر نہ ہو اگر کافی احساس ذمہ داری نہ ہو تو یہ کیفیت فساد اور خونریزی کا سبب بنتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین معتقد ہیں کہ فرشتوں کی پیشین گوئی اس وجہ سے تھی کہ آدم روئے زمین کی پہلی مخلوق نہیں تھا بلکہ اس سے قبل بھی دیگر مخلوقات تھیں جنہوں نے نزاع، جھگڑا اور خونریزی کی تھی۔ ان سے پہلے کی مخلوق کی بری فائل نسل آدم کے بارے میں فرشتوں کی بدگمانی کا باعث بنی۔

یہ تین تفاسیر ایک دوسرے سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتیں یعنی ممکن ہے یہ تمام امور فرشتوں کی اس توجہ کا سبب بنے ہوں اور دراصل یہ ایک حقیقت بھی تھی جسے انہوں نے بیان کیا تھا یہی وجہ ہے کہ خدا نے جواب میں کہیں بھی اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ایسی مزید حقیقتیں انسان اور اس کے مقام کے بارے میں موجود ہیں جن سے فرشتے آگاہ نہیں تھے۔

فرشتے سمجھتے تھے اگر مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو ہم اس کے مصداقِ کامل ہیں ہمیشہ عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں لہٰذا سب سے زیادہ ہم خلافت کے لائق ہیں لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے وجود میں شہوت و غضب اور قسم قسم کی خواہشات موجود نہیں جب کہ انسان کو میلانات و شہوات نے گھیر رکھا ہے اور شیطان ہر طرف سے اسے وسوسے ڈالتا رہتا ہے لہٰذا ان کی عبادت انسان کی عبادت سے بہت زیادہ تفاوت رکھتی ہے۔ کہاں اطاعت اور فرمانبرداری ایک طوفان زدہ کی اور کہاں عبادت ان ساحل نشینوں کی جو مطمئن، خالی ہاتھ اور سبک بار ہیں۔

انہیں کب معلوم تھا کہ اس آدم کی نسل سے محمدؐ، ابراہیم، نوح، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء اور ائمہ اہل بیتؑ جیسے امام اور ایسے صالح بندے اور جانباز شہید مرد اور عورتیں عرصۂ وجود میں قدم رکھیں گے جو پروانہ وار اپنے آپ کو راہِ خدا میں پیش کریں گے۔ ایسے افراد جن کے غور و فکر کی ایک گھڑی فرشتوں کی سالہا سال کی عبادت کے برابر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فرشتوں نے اپنی صفات کے بارے میں تین چیزوں کا سہارا لیا تسبیح، حمد اور تقدیس۔ اس میں



شک نہیں کہ تسبیح اور حمد کے معنی ہیں خدا کو ہر قسم کے نقص سے پاک اور ہر قسم کے کمال کا اہل سمجھنا لیکن یہ کہ تقدیس سے کیا مقصود ہے۔

بعض نے تقدیس کے معنی "پروردگار کو ہر قسم کے نقصان سے پاک شمار کرنا" بیان کئے ہیں جو کہ دراصل تسبیح کے معنی کی تاکید ہے۔

لیکن بعض معتقد ہیں کہ تقدیس مادہ "قدس" سے ہے جس کے معنی ہیں روئے زمین کو فاسد اور مفسد لوگوں سے پاک کرنا یا اپنے آپ کو ہر قسم کی بُری اور مذموم صفات سے پاک کرنا اور جسم و جان کو خدا کے لئے پاک کرنا۔ لفظ "لک" کو جملہ "نقدس لک" میں اس مقصود کے لئے شاہد قرار دیتے ہیں کیونکہ فرشتوں نے یہ نہیں کہا کہ "نقدسک" یعنی ہم تجھے پاک سمجھیں گے بلکہ انہوں نے کہا "نقدس لک" یعنی تیرے لئے معاشرے کو پاک کریں گے۔

درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر ہدف اور غرض، اطاعت اور بندگی ہے تو ہم فرمانبردار ہیں اور اگر عبادت ہے تو ہم ہر وقت اس میں مشغول ہیں اور اگر اپنے آپ کو پاک رکھنا یا صفحۂ ارضی کو پاک رکھنا ہے تو ہم ایسا کریں گے جب کہ یہ مادی انسان خود بھی فاسد ہے اور روئے زمین کو بھی فاسد کرے گا۔

حقائق کو تفصیل سے ان کے سامنے واضح کرنے کے لئے خداوند عالم نے ان کی آزمائش کے لئے اقدام کیا تاکہ وہ خود اعتراف کریں کہ ان کے اور اولادِ آدم کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

فرشتے امتحان کے سانچے میں

پروردگار کے لطف و کرم سے آدم حقائق عالم کے ادراک کی کافی استعداد رکھتے تھے خدا نے ان کی اس استعداد کو فعلیت کے درجے تک پہنچایا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق آدم کو تمام اسماء (عالم وجود کے حقائق و اسرار) کی تعلیم دی (وعلم آدم الاسماء کلھا)۔

مفسرین نے اگرچہ "علم اسماء" کی تفسیر میں قسم قسم کے بیانات دیے ہیں لیکن مسلم ہے کہ آدم کو کلمات و اسماء کی تعلیم بغیر معنی کے نہیں دی تھی کیونکہ یہ کوئی قابل فخر بات نہیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان اسماء کے معانی و مفاہیم اور جن چیزوں کے وہ نام تھے ان سب کی تعلیم ہو۔ البتہ جہانِ خلقت اور عالم ہستی کے مختلف موجودات کے اسماء و خواص سے مربوط علوم سے باخبر و آگاہ کیا جانا حضرت آدم کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادقؑ سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

الارضين والجبال والشعاب والاودية ثم نظر الى بساط تحته فقال وهذا البساط مما علمه۔

اسماء سے مراد زمینیں، پہاڑ، درے، وادیاں (غرض یہ کہ تمام موجودات) تھے۔ اس کے بعد امامؑ نے اس فرش کی طرف نگاہ کی جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور فرمایا یہاں تک کہ یہ فرش بھی ان امور میں



سے ہے کہ خدا نے جن کی آدم کو تعلیم دی ۔ [1]

اس سے ظاہر ہوا کہ علم اسماء علم لغت کے مشابہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق فلسفہ، اسرار اور کیفیات و خواص کا ساتھ تھا۔ خداوند عالم نے آدم کو اس علم کی تعلیم دی تا کہ وہ اپنی سیر تکامل میں اس جہان کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں ۔ اسی طرح چیزوں کے نام رکھنے کی استعداد بھی انہیں دی تا کہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکیں اور ضرورت کے وقت ان کا نام لے کر انہیں بلا سکیں یا منگوا سکیں اور یہ ضروری نہ ہو کہ اس کے لئے ویسی چیز دکھائی پڑے ۔ یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے ۔ اس موضوع کی اہمیت ہم اس وقت سمجھتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ انسان کے پاس اس وقت جو کچھ ہے کتاب اور لکھنے کی وجہ سے ہے اور گذرے ہوئے لوگوں کے سب علمی ذخائر ان کی تحریروں میں جمع ہیں اور یہ سب کچھ چیزوں کے نام رکھنے اور ان کے خواص کی وجہ سے ہے ورنہ کبھی بھی ممکن نہ تھا کہ ہم گذشتہ لوگوں کے علوم آنے والوں تک منتقل کر سکتے ۔

پھر خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا : اگر سچ کہتے ہو تو ان اشیاء اور موجودات کے نام بتاؤ جنہیں دیکھ رہے ہو اور ان کے اسرار و کیفیات کو بیان کرو (ثم عرضهم على الملائكة فقال انبئونى باسماء هؤلاء ان كنتم صدقين) لیکن فرشتے جو اتنا علم نہ رکھتے تھے اس امتحان میں رہ گئے لہٰذا جواب میں کہنے لگے خداوندا ! تو منزہ ہے ، تو نے ہمیں جو تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے (قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا) تو خود ہی علیم و حکیم ہے (انك انت العليم الحكيم) اگر ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا ہے تو یہ ہماری نا آگاہی کی بناء پر تھا ہم نے یہ مطلب نہیں پڑھا تھا اور آدم کی اس عجیب استعداد اور قدرت سے بے خبر تھے جو ہمارے مقابلے میں اس کا بہت بڑا امتیاز ہے ۔ بے شک وہ تیری خلافت و جانشینی کی اہلیت رکھتا ہے جہان ہستی کی سرزمین اس کے وجود کے بغیر ناقص تھی ۔

اب آدم کی باری آئی کہ وہ ملائکہ کے سامنے موجودات کا نام لیں اور ان کے اسرار بیان کریں ۔ خداوند عالم نے فرمایا : اے آدم ! فرشتوں کو ان موجودات کے ناموں اور کاموں سے آگاہ کرو (قال يادم انبئهم باسمائهم) جب آدم نے انہیں ان اسماء سے آگاہ کیا تو خداوند عالم نے فرمایا : کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب سے واقف ہوں اور تم جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو سب سے باخبر ہوں (فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انى اعلم غيب السموت والارض و اعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون)

اس مقام پر ملائکہ نے اس انسان کی وسیع معلومات اور فراواں حکمت و دانائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور ان پر واضح ہو گیا کہ صرف یہی زمین پر خلافت کی اہلیت رکھتا ہے ۔

جملہ " ماکنتم تکتمون " (جو کچھ تم اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو) اس بات کی نشاندہی ہے کہ فرشتوں نے جو کچھ ظاہر کیا تھا اس کے علاوہ کچھ دل میں بھی چھپائے ہوئے تھے ۔ بعض کہتے ہیں یہ ابلیس کے غرور و تکبر کی طرف اشارہ ہے جو ان دنوں ملائکہ کی صف میں رہتا تھا لہٰذا وہ بھی ساتھ ہی مخاطب تھا ۔ اس نے دل میں پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ آدم کے سامنے ہرگز نہیں

[1] مجمع البیان ، زیر نظر آیات کے ضمن میں ۔



سمجھے گا۔

یہ بھی احتمال ہے فرشتے درحقیقت اپنے آپ کو روئے زمین پر خلافت الٰہی کے لئے ہر کسی سے زیادہ اہل سمجھتے تھے اگرچہ اس مطلب کی طرف اشارہ تو کر چکے تھے لیکن صراحت سے بیان نہ کیا تھا۔

دو سوال اور ان کا جواب

دو سوال اس موقع پر باقی رہ جاتے ہیں پہلا یہ کہ خداوند عالم نے حضرت آدم کو کس طرح ان علوم کی تعلیم دی تھی اور دوسرا یہ کہ اگر ان علوم کی فرشتوں کو بھی تعلیم دے دیتا تو وہ بھی آدم والی فضیلت حاصل کر لیتے۔ یہ آدم کے لئے کون سا افتخار و اعزاز ہے جو فرشتوں کے لئے نہیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ یہاں تعلیم جنبۂ تکوینی رکھتی ہے یعنی خدا نے یہ آگاہی آدم کی طبیعت و سرشت میں قرار دی تھی اور تھوڑی سی مدت میں اسے بارآور کر دیا تھا۔

لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم تکوینی پر قرآن میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے۔ سورہ رحمٰن آیہ ۴ میں ہے:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

خداوند عالم نے انسان کو بیان کی تعلیم دی ہے

واضح ہے کہ یہ تعلیم خداوند عالم نے انسان کو مکتب آفرینش و خلقت میں دی ہے اور اس سے مراد وہی استعداد و خصوصیت فطری ہے جو انسانوں کے مزاج میں رکھ دی گئی ہے تاکہ وہ بات کر سکیں۔

دوسرے سوال کے جواب میں اس طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ ملائکہ کی خلقت ایک خاص قسم کی ہے جس میں یہ تمام علوم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے وہ ایک اور مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس مقصد کے لئے ان کی تخلیق نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس امتحان کے بعد ملائکہ حقیقت حال سمجھ گئے اور انہوں نے قبول کر لیا۔ پہلے شاید وہ سوچتے تھے کہ اس مقصد کی اہلیت بھی اُن میں ہے مگر خدا نے علم اسماء کے امتحان سے آدم اور ان کی استعداد کا فرق واضح کر دیا۔

یہاں ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اگر مقصود علم اسماء، علم اسرار خلقت اور تمام موجودات کے خواص جاننا تھا تو پھر ضمیر "ھم"، لفظ "اسمائھم" اور لفظ "ھؤلا" کیوں استعمال ہوئے جو عموماً افراد عاقل کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ ضمیر "ھم" اور لفظ "ھؤلا" صرف ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات عاقل اور غیر عاقل کے مجموعے پر یا یہاں تک کہ افراد غیر عاقل کے مجموعے کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جیسے حضرت یوسف ستاروں، سورج اور چاند کے بارے میں کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ○

میں نے خواب میں دیکھا یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ (یوسف - ۴)



۳۴- وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ۖ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ○

۳۵- وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ○

۳۶- فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ ○

ترجمہ

۳۴- اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کے لئے سجدہ و خضوع کرو تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کر کے (نافرمانی کی وجہ سے) کافروں میں سے ہو گیا۔

۳۵- اور ہم نے کہا اے آدمؑ! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں سکونت اختیار کرلو اور (اس کی نعمتوں میں سے) جو چاہو کھاؤ (لیکن) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ستمگاروں میں سے ہو جاؤ گے۔

۳۶- پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس (بہشت) میں وہ رہتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور (اس وقت) ہم نے ان سے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہو گے۔ زمین تمہاری ایک مدت معین کے لئے قرارگاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔

تفسیر

آدم جنت میں

گذشتہ بحثیں جو انسان کے مقام و عظمت کے بارے میں تھیں اُن کے ساتھ قرآن نے ایک اور فصل بیان کی ہے۔ پہلے کہتا ہے: یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدمؑ کے لئے سجدہ و خضوع کرو (واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم) ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے انکار کیا اور تکبر اختیار کیا (فسجدوا الا ابلیس ابیٰ واستکبر)۔ اُس نے تکبر کیا اور اسی تکبر و نافرمانی کی وجہ سے کافروں میں داخل ہو گیا (وکان من الکافرین)۔

پہلے پہل یوں لگتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا مرحلہ فرشتوں کے امتحان اور تعلیم اسماء کے بعد آیا لیکن قرآن کی دوسری آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع آفرینش انسان اور اس کی خلقت کی تکمیل کے ساتھ ہے اور ملائکہ کے امتحان سے پہلے درپیش ہوا۔



سورہ حجر آیہ ۲۹ میں ہے:

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ۝

جب خلقتِ آدم کو منظم کر لوں اور اپنی رُوح میں سے (ایک شائستہ رُوح جو میری مخلوق ہے) اس میں پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ کرو۔

یہی مفہوم سورہ ص آیہ ۷۲ میں بھی ہے۔[1]

اس موضوع کی شاہد یہ بات بھی ہے کہ اگر سجدہ کا حکم مقامِ آدم کے واضح ہونے کے بعد ہوتا تو ملائکہ کے لئے زیادہ افتخار کا باعث نہ ہوتا چونکہ اس وقت تو آدم کا افتخار سب پر واضح ہو چکا تھا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت انسانی شرافت اور اس کی عظمت مقام کی زندہ اور واضح گواہ ہے کہ اس کی تکمیل خلقت کے بعد تمام ملائکہ کو حکم ملتا ہے کہ اس عظیم مخلوق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ واقعاً وہ شخص جو مقامِ خلافتِ الٰہی اور زمین پر خدا کی نمائندگی کا منصب حاصل کرے، تمام تر تکامل و کمال پر فائز ہو اور بلند مرتبہ فرزندوں کی پرورش کا ذمہ دار ہو جن میں انبیاء اور خصوصاً پیامبر اسلام اور ان کے جانشین شامل ہوں، ایسا انسان ہر قسم کے احترام کے لائق ہے۔

ہم اس انسان کا کتنا احترام کرتے ہیں اور اس کے سامنے جھکتے ہیں جو علم کے چند فارمولے جانتا ہو۔ تو پھر وہ پہلا انسان جو جہانِ ہستی کی بھرپور معلومات رکھتا تھا اس کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے تھا۔

چند اہم نکات

(۱) ابلیس نے مخالفت کیوں کی: ہم جانتے ہیں کہ لفظ "شیطان" اسم جنس ہے جس میں پہلا شیطان اور دیگر تمام شیطان شامل ہیں لیکن ابلیس مخصوص نام ہے اور یہ اسی شیطان کی طرف اشارہ ہے جس نے حضرت آدم کو ورغلایا تھا وہ صریح آیاتِ قرآن کے مطابق ملائکہ کی نوع سے نہیں تھا صرف اُن کی صفوں میں رہتا تھا وہ گروہ جن میں سے تھا جو ایک مادی مخلوق ہے۔

سورہ کہف آیہ ۵۰ میں ہے:

فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ

ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے (اور) یہ گروہ جنّ میں سے تھا۔

اس مخالفت کا سبب کبر و غرور اور خاص تعصب تھا جو اس کی فکر پر مسلط تھا۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں لہٰذا اسے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا جانا چاہیئے بلکہ آدم کو سجدہ کرنا چاہیئے اور اسے مسجود ہونا چاہیئے۔ اس کی تفصیل سورہ اعراف کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں آئے گی۔[2]

شیطان کے کفر کی علت بھی یہی تھی کہ اس نے خداوند عالم کے حکیمانہ حکم کو ناروا سمجھا۔ نہ صرف یہ کہ عملی طور پر اس نے نافرمانی

---

[1] آلوسی نے روح المعانی میں اور رازی نے تفسیر کبیر میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[2] تفسیر نمونہ، سورہ اعراف کی آیہ ۱۲ کی تفسیر سے رجوع کیجئے۔



کی بلکہ اعتقاد کی نظر سے بھی معترض ہوا اور خود بینی و خود خواہی نے یوں ایک عمر کے ایمان و عبادت کے ماحصل کو برباد کر دیا اور اس کے خرمن ہستی میں آگ لگا دی۔ کبر و غرور کے آثار بد اس سے بھی زیادہ ہیں۔

کان من الکافرین کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پہلے ہی میر ملائکہ اور فرمان خدا کی اطاعت سے اپنا حساب الگ کر چکا تھا اور اس کے سر میں استکبار کی فکر پرورش پا رہی تھی اور شاید وہ خود سے کہتا تھا کہ اگر مجھے آدم کو سجدہ اور خضوع کرنے کا حکم دیا گیا تو میں قطعاً اطاعت نہیں کروں گا۔ ممکن ہے جملہ ماکنتم تکتمون (جو کچھ تم چھپاتے تھے) اسی طرف اشارہ ہو۔ تفسیر قمی میں جو حدیث امام حسن عسکریؑ سے روایت کی گئی ہے اس میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔[1]

(۲) سجدہ خدا کے لئے تھا یا آدم کے لئے: اس میں کوئی شک نہیں کہ سجدہ۔ جس کا معنی عبادت و پرستش ہے صرف خدا کے لئے ہے کیونکہ عالم میں خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور توحید عبادت کے معنی یہی ہیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں لہٰذا اس میں شک و شبہ نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے لئے سجدۂ عبادت نہیں کیا بلکہ یہ سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن اس عجیب و غریب مخلوق کی وجہ سے تھا یا سجدہ آدم کے لئے تھا لیکن وہ خضوع و تعظیم کا سجدہ تھا نہ کہ عبادت و پرستش کا۔

کتاب عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے اسی طرح روایت ہے:

کان سجودهم لله تعالیٰ عبودیة ولآدم اکرام وطاعة لکوننا فی صلبه۔

فرشتوں کا سجدہ ایک طرف سے خدا کی عبادت تھا اور دوسری طرف آدم کا اکرام و احترام۔ کیونکہ ہم صلب آدم میں موجود تھے۔[2]

بہر حال اس واقعہ اور فرشتوں کے امتحان کے بعد آدم اور اس کی بیوی کو حکم دیا گیا کہ وہ بہشت میں سکونت اختیار کریں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جو چاہو کھاؤ (وقلنا یا آدم اسکن انت و زوجك الجنة وکلا منها رغداً حیث شئتما)۔[3] لیکن اس مخصوص درخت کے نزدیک نہ جانا۔ ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (ولا تقربا هٰذه الشجرة فتکونا من الظالمین)۔

آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم زندگی گزارنے کے لئے اسی عام زمین پر پیدا ہوئے تھے لیکن ابتداء میں خداوند عالم نے انہیں بہشت میں سکونت دی جو اسی جہان کا ایک سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے مالا مال باغ تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں آدم نے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیکھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آدمؑ زمین میں زندگی گزارنے سے آشنائی نہ رکھتے تھے اور بغیر کسی تمہید کے زحمات و تکالیف اٹھانا ان کے لئے مشکل تھا اور زمین میں زندگی گزارنے کے لئے یہاں کے کردار و رفتار کی کیفیت سے آگاہی ضروری تھی لہٰذا مختصر مدت کے لئے بہشت کے اندر ضروری تعلیمات حاصل کرلیں کیونکہ زمین کی زندگی پر گرداموں، تکلیفوں

---

[1] تفسیر المیزان، ج ا ص ۱۲۴۔

[2] نور الثقلین، جلد ا ص ۵۸

[3] "رغد" بر وزن "صمد" ہے جس کے معنی ہیں فراواں، وسیع اور گوارا۔ حیث شئتما اشارہ ہے ہر جگہ اور ہر قسم کے میوے کی طرف۔



اور ذمہ داریوں سے معمور ہے جس کا انجام صحیح سعادت، تکامل اور بقائے نعمت کا سبب ہے اور ان سے روگردانی کرنا رنج و مصیبت کا باعث ہے اور یہ بھی جان لیں کہ اگرچہ انہیں آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ مطلق ولا محدود آزادی نہیں ہے کہ جو کچھ چاہیں انجام دیں بلکہ انہیں چاہیئے کہ زمین کی کچھ چیزوں سے چشم پوشی کریں۔ نیز یہ جان لینا بھی ضروری تھا کہ اگر خطا و لغزش دامن گیر ہو تو ایسا نہیں کہ سعادت و خوش بختی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے بلکہ انہیں پلٹ کر دوبارہ عہد و پیمان کرنا چاہیئے کہ وہ حکم خدا کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دیں گے تاکہ دوبارہ نعمات الٰہی سے مستفید ہو سکیں۔ یہ بھی تھا کہ وہ اس ماحول میں رہ کر کچھ پختہ ہو جائیں اور اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیں اور زمین میں زندگی گزارنے کی کیفیت سے آشنا ہو جائیں۔ یقیناً یہ سلسلہ تعلیمات ضروری تھا تاکہ وہ اسے یاد رکھیں اور اس تیاری کے ساتھ روئے زمین پر قدم رکھیں۔

یہ ایسے مطالب تھے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد آئندہ زندگی میں ان کی محتاج تھی لہٰذا باوجودیکہ آدمؑ کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا تھا ایک مدت تک بہشت میں قیام کرتے ہیں اور انہیں کئی ایک حکم دیے جاتے ہیں شاید یہ سب تمرین و تعلیم کے پہلو سے تھا۔

اس مقام پر آدمؑ نے اس فرمان الٰہی کو دیکھا جس میں آپ کو ایک درخت کے بارے میں منع کیا گیا تھا۔ ادھر شیطان نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آدمؑ اور اولاد آدمؑ کو گمراہ کرنے سے باز نہ آئے گا۔ وہ وسوسے پیدا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جیسا کہ باقی آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے اس نے آدمؑ کو اطمینان دلایا کہ اگر اس درخت سے کچھ کھا لیں تو وہ اور ان کی بیوی فرشتے بن جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے یہاں تک کہ اس نے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں [1]

بالآخر شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور جس بہشت میں وہ رہتے تھے ان سے باہر نکال دیا۔ قرآن کے الفاظ میں:

فازلهما الشیطٰن عنها فاخرجهما مما کانا فیه [2]

اس بہشت سے جو اطمینان و آسائش کا مرکز تھی اور رنج و غم سے دور تھی شیطان کے دھوکے میں آکر نکالے گئے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وقلنا اهبطوا بعضکم لبعض عدو

اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ زمین پر اتر آؤ جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے (آدم و حوا ایک طرف اور شیطان دوسری طرف)۔

مزید فرمایا گیا کہ تمہارے لئے ایک مدت معین تک زمین میں قرارگاہ ہے جہاں سے تم نفع اندوز ہو سکتے ہو (ولکم فی الارض

---

[1] سورہ اعراف آیہ ۲۰، ۲۱

[2] ضمیر "عنہا" کے مرجع میں دو احتمال ہیں۔ ۱۔ یہ جنت کے لئے ہو اس صورت میں "مما کانا فیہ" کا جملہ مقام و مرتبہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہو گا کہ شیطان نے ان کے دلوں کو جنت میں پھسلایا اور جس مقام کے وہ حامل تھے اس سے باہر نکالا۔ ۲۔ یہ مرجع "شجرہ" ہو یعنی شیطان نے اس درخت ممنوع کی وجہ سے انہیں پھسلایا اور جس بہشت میں وہ تھے اس سے باہر نکالا۔



مستقر و متاع الی حین)۔ یہ وہ مقام تھا کہ آدمؑ متوجہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور بہشت کے آرام وہ اور نعمتوں سے مالا مال ماحول سے شیطانی وسوسے کے سامنے سر جھکانے کے نتیجے میں باہر نکالے جا رہے ہیں اور اب زحمت و مشقت کے ماحول میں جا کر رہیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ آدمؑ نبی تھے اور گناہ سے معصوم تھے لیکن جیسا کہ ہم آئندہ چل کر بتائیں گے کہ کسی پیغمبر سے جب ترک اولیٰ سرزد ہو جاتا ہے تو خداوند عالم اس سے اس طرح سخت گیری کرتا ہے جیسے کسی عام انسان سے گناہ سرزد ہو۔

چند اہم نکات

(۱) آدمؑ کس جنت میں تھے: اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے کہ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جو نیک اور پاک لوگوں کی وعدہ گاہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ وہ بہشت نہ تھی بلکہ زمین کے سرسبز علاقوں میں نعمات سے مالا مال ایک روح پرور مقام تھا۔

اوّل تو وہ بہشت جس کا وعدہ قیامت کے ساتھ ہے وہ ہمیشگی اور جاودانی نعمت ہے جس کے دوام کی نشاندہی بہت سی آیات میں کی گئی ہے اور اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔

دوم یہ کہ غلیظ اور بے ایمان ابلیس کے لئے اس بہشت میں جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔ وہاں نہ وسوسۂ شیطانی ہے اور نہ خدا کی نافرمانی۔

سوم یہ کہ اہل بیتؑ سے منقول روایات میں یہ موضوع صراحت سے نقل ہوا ہے۔

ایک راوی کہتا ہے: میں نے امام صادقؑ سے آدمؑ کی بہشت کے متعلق سوال کیا۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا:

جنة من جنات الدنيا يطلع فيها الشمس والقمر ولو كان من جنان الآخرة ماخرج منها ابدًا

دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا جس پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی پڑتی تھی اگر آخرت کی جنتوں میں سے ہوتی تو کبھی بھی اس سے باہر نہ نکالے جاتے [۱]

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ کے ہبوط و نزول سے مراد نزولِ مقام ہے نہ کہ نزولِ مکان یعنی اپنے اس بلند مقام اور سرسبز جنت سے نیچے آئے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جنت کسی آسمانی کرہ میں تھی اگرچہ وہ ابدی جنت نہ تھی۔ بعض اسلامی روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ یہ جنت آسمان میں تھی لیکن ممکن ہے لفظ "سماء" (آسمان) ان روایات میں مقامِ بلند کی طرف اشارہ ہو۔

تاہم بے شمار شواہد نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جنت آخرت والی جنت نہ تھی کیونکہ وہ تو انسان کی سیر تکامل کی آخری منزل ہے

---

[۱] نور الثقلین جلد ۱، ص ۶۲ بحوالہ کتاب کافی۔



اور یہ اُس کے سفر کی ابتدا تھی اور اس کے اعمال اور پروگرام کی ابتدا تھی اور وہ جنت اس کے اعمال اور پروگرام کا نتیجہ ہے۔

(۲) آدم کا گناہ کیا تھا: واضح ہے کہ آدم اس مقام کے علاوہ جو خدا نے گذشتہ آیات میں ان کے لئے بیان کیا ہے معرفت و تقویٰ کے لحاظ سے بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ وہ زمین میں خدا کے نمائندے تھے، وہ فرشتوں کے معلم تھے وہ عظیم ملائکہ الٰہی کے مسجود تھے اور یہ مسلم ہے کہ آدم ان امتیازات و خصوصیات کے ہوتے ہوئے گناہ نہیں کر سکتے تھے علاوہ ازیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ پیغمبر تھے اور ہر پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم سے جو کچھ سرزد ہوا وہ کیا تھا۔ یہاں تین تفاسیر موجود ہیں۔

(i) آدم سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترکِ اولیٰ تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان کی حیثیت اور نسبت سے وہ گناہ تھا لیکن گناہِ مطلق نہ تھا۔ گناہِ مطلق وہ گناہ ہے جو کسی سے سرزد ہو اور اس کے لئے سزا ہے (مثلاً شرک، کفر، ظلم اور تجاوز وغیرہ) اور نسبت کے اعتبار سے گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات بعض مباح اعمال بلکہ مستحب بھی بڑے لوگوں کے مقام کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ ان اعمال سے گریز کریں اور اہم کام بجا لائیں ورنہ کہا جائے گا کہ انہوں نے ترکِ اولیٰ کیا ہے۔ مثلاً ہم جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کچھ حصہ حضورِ قلب سے ہوتا ہے کچھ بغیر اس کے۔ یہ امر ہمارے مقام کے لئے تو مناسب ہے لیکن حضرت رسولِ اسلامؐ اور حضرت علیؑ کے شایانِ شان نہیں ان کی ساری نماز خدا کے حضور میں ہونی چاہیئے اور اگر اس کے علاوہ کچھ ہو تو کسی فعلِ حرام کا ارتکاب تو نہیں تاہم ترکِ اولیٰ ہے۔

(ii) خدا کی نہی یہاں "نہی ارشادی" ہے۔ جیسے ڈاکٹر کہتا ہے فلاں غذا نہ کھاؤ۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔ خدا نے بھی آدمؑ سے فرمایا کہ اگر درختِ ممنوعہ سے کچھ کھا لیا تو بہشت سے باہر جانا پڑے گا اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا پڑے گا لہٰذا آدم نے حکم خدا کی مخالفت نہیں کی بلکہ "نہی ارشادی" کی مخالفت کی ہے۔

(iii) جنت بنیادی طور پر جائے تکلیف نہ تھی بلکہ وہ آدم کے زمین کی طرف آنے کے لئے ایک آزمائش اور تیاری کا زمانہ تھا اور یہ نہی صرف آزمائش کا پہلو رکھتی تھی۔[1]

(۳) تورات سے معارف قرآن کا مقابلہ: مندرجہ بالا آیات کے مطابق وجود آدم میں سب سے بڑا افتخار اور نقطۂ قوت جس کی وجہ سے وہ مخلوق میں منتخب ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسجودِ ملائکہ ہے وہی "علم الاسماء" سے آگاہی اور حقائق اسرارِ خلقت و جہانِ ہستی سے واقفیت ہے۔ واضح ہے کہ آدمؑ انہی علوم کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور اولادِ آدمؑ اگر کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ان علوم سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے۔ اولادِ آدم میں سے ہر ایک کا کمال و تکامل اسرارِ خلقت کی آگاہی سے سیدھی نسبت رکھتا ہے۔ قرآن پوری صراحت سے آدم کے مقام کی عظمت ان چیزوں میں سمجھتا ہے لیکن توریت میں آدم کے بہشت سے باہر نکالے جانے کا جو راز اور بہت بڑا گناہ بیان کیا گیا ہے وہ ان کی علم و دانش کی طرف توجہ اور نیک و بد جاننے کی خواہش ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لئے جلد ۹ سورہ اعراف ۱۹ تا ۲۲ اور جلد ۱۳ آیات ۱۲۱ اور اس کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں۔



توراۃ فصل دوم سفر تکوین میں ہے:

"پس خداوند خدا نے آدم کو خاکِ زمین سے صورت دی اور تسلیم حیات اس کے دماغ میں پھونکی اور آدم زندہ جان ہو گیا اور خداوند خدا نے ہر خوشنما درخت اور جو کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا نیز شجرِ حیات کو وسطِ باغ میں لگایا اور نیک و بد جاننے کے درخت کو..... اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ باغ کے تمام درختوں سے تمہیں کھانے کا اختیار ہے لیکن نیک و بد جاننے کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اسے کھائے گا موت کا مستحق ہو جائے گا۔"

فصل سوم میں یوں آیا ہے:

"اور خداوند کی آواز کو سنا جو دن کو نسیم کے وقت باغ میں خراماں چلتا تھا اور آدم اور اس کی بیوی اپنے آپ کو خداوند کے حضور سے باغ کے درختوں کے درمیان چھپاتے تھے۔"

"اور خداوند خدا نے آدم کو آواز دی۔ اُسے کہا کہ تو کہاں ہے۔"

"اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تیری آواز سنی اور میں ڈر گیا کیونکہ میں برہنہ ہوں اس وجہ سے چھپا بیٹھا ہوں۔"

"خدا نے اس سے کہا: تجھے کس نے کہا کہ تو برہنہ ہے کیا جس درخت سے تمہیں نہ کھانے کے لئے کہا تھا تم نے کچھ کھایا۔"

"آدم نے کہا جو عورت تو نے مجھے میرے ساتھ رہنے کے لئے دی ہے اُس نے اس درخت سے مجھے دیا ہے جسے میں نے کھا لیا ہے۔"

"اور خداوند خدا نے کہا آدم تو "نیک و بد جاننے" کی وجہ سے چونکہ ہم میں سے ایک ہو گیا ہے لہٰذا اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ دراز کرے اور "درخت حیات" سے بھی کچھ لے لے اور کھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ رہے۔"

"پس اس سبب سے خداوند خدا نے اسے باغ عدن سے نکال دیا تاکہ اس زمین میں جو اس سے لے لی گئی تھی زراعت کرے۔"

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا یہ تکلیف دہ افسانہ جو آج توراۃ میں ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے موجود ہے اس کے مطابق آدم کے بہشت سے نکلنے اور ان کے عظیم گناہ کی اصلی علت و سبب علم و دانش کی طرف ان کی توجہ اور نیک و بد سے آگاہی کے لئے اُن کی تمنا ہے۔ چنانچہ اگر آدم "شجرۂ نیک و بد" کی طرف ہاتھ نہ پھیلاتے تو ابد تک جہالت میں باقی رہ جاتے یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہ جانتے کہ برہنہ ہونا قبیح اور ناپسندیدہ فعل ہے اور ہمیشہ کے لئے بہشت میں باقی رہ جاتے۔

اس لحاظ سے تو آدم کو اپنے کام پر پشیمان نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ایسی جنت کو ہاتھ سے دینا جہاں رہنے کی شرط نیک و بد سے عدم آگاہی ہو، اس کے مقابلے میں علم و دانش حاصل کرنا نفع مند تجارت ہے۔ اس تجارت کے بعد آدم کیوں حیران و پریشان ہوں۔



اس بنا پر تورات کا یہ افسانہ ٹھیک قرآن کے مد مقابل قرار پاتا ہے جس کے نزدیک انسان کا مقام عظمت اور اس کی خلقت کا راز علم الاسماء سے آگاہی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ افسانے میں خداوندعالم اور مخلوقات کے بارے میں عجیب وغریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً:

(i) خدا کی طرف جھوٹ کی نسبت — جیسے فصل دوم کا جملہ ۱۷:

"خداوند خدا نے کہا کہ اس درخت سے مت کھانا ورنہ مر جاؤ گے"

حالانکہ انہوں نے مرنا نہیں تھا بلکہ دانا و عقل مند ہونا تھا۔

(ii) خداوند عالم کی طرف بخل کی نسبت — جیسے فصل سوم کا جملہ ۲۲ جس کے مطابق خدا نہیں چاہتا تھا کہ آدم وحوا علم وحیات کے درخت سے کھائیں اور دانا وعقل مند ہو جائیں نیز ابدی زندگی حاصل کریں۔

(iii) خداوند عالم کے لئے شریک کے وجود کا امکان — جیسے یہ جملہ:

"آدم شجر نیک وبد سے کھانے کے بعد ہم (خداؤں) میں سے ایک کی طرح ہو گیا ہے"

(iv) خدا کی طرف حسد کی نسبت — جیسے اس جملے سے ظاہر ہے:

"خداوند نے اس علم ودانش کی وجہ سے جو آدم میں پیدا ہو گئی تھی اس پر رشک وحسد کیا"

(v) خداوند عالم کی طرف جسم کی نسبت — جیسے فصل سوم میں ہے:

"خداوند صبح کے وقت بہشت کی سڑکوں پر خراماں خراماں چل رہا تھا"

(vi) خداوند عالم کی ان حوادث سے بے خبری جو اس کے قریب واقع ہوتے ہیں — جیسے جملہ ۹ میں ہے:

"آواز دی اے آدم! کہاں ہو۔ انہوں نے درختوں کے درمیان اپنے آپ کو خداوند کی آنکھ سے چھپا رکھا تھا"[1]

یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ جھوٹے افسانے پہلے تورات میں نہ تھے بعد میں ملا دیئے گئے)

(۴) قرآن میں شیطان سے کیا مراد ہے: لفظ "شیطان" مادہ "شطن" سے ہے اور "شاطن" کے معنی ہیں "خبیث و پست" اور شیطان وجود سرکش ومتمرد کو کہا جاتا ہے چاہے وہ انسان ہو یا جن یا کوئی اور حرکت کرنے والی چیز۔ روح شریر اور حق سے دور کو بھی شیطان کہتے ہیں جو حقیقت میں ایک قدر مشترک رکھتے ہیں۔ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ شیطان اسم عام (اسم جنس) ہے جب کہ ابلیس اسم خاص (علم) ہے۔

دوسرے لفظوں میں شیطان ہر موذی، گمراہ، باغی اور سرکش کو کہتے ہیں وہ انسان ہو یا غیر انسان لیکن ابلیس اس شیطان کا نام ہے جس نے آدم کو ورغلایا تھا اور اس وقت بھی وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اولادِ آدم کے شکار کے لئے کمین گاہ میں ہے۔

قرآن میں اس لفظ کے استعمال کے مواقع سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان موذی ومضر چیز کو کہتے ہیں۔ جو راہِ راست سے ہٹ چکا ہو، جو دوسروں کو آزار پہنچانے کے درپے ہو۔ اختلاف وتفرقہ پیدا کرنا جس کی کوشش ہو اور جو اختلاف وفساد کو

---

[1] کتاب "قرآن و آخرین پیامبر" صفحہ ۱۳۰ تا صفحہ ۱۳۲



ہوا دیتا ہو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ

شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی، بغض اور کینہ پیدا کرے۔ (مائدہ۔ ۹۱)

اگر ہم دیکھیں گے کہ لفظ "یریدہ" فعل مضارع کا صیغہ ہے اور استمرار و تسلسل پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کا ہمیشہ کا ارادہ ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں لفظ شیطان کسی خاص موجود کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ مفسد اور شریر انسانوں تک کو شیطان کہا گیا ہے۔ جیسے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ

اسی طرح ہر نبی کے لئے ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن قرار دیا ہے۔ (انعام۔ ۱۱۲)

یہ جو ابلیس کو بھی شیطان کہا گیا ہے وہ اس کی شرارت اور فساد کے باعث ہے۔

اس کے علاوہ بعض اوقات لفظ شیطان جراثیم کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

لا تشربوا الماء من ثلمة الاناء ولا من عروته فان الشیطان یقعد علی العروة والثلمة۔

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصے اور دستے کی جگہ سے پانی نہ پیو کیونکہ دستے کی جگہ اور ٹوٹے ہوئے حصے پر شیطان بیٹھا ہوتا ہے[1]

نیز امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ولا یشرب من اذن الکوز ولا من کسره ان کان فیه فانه مشرب الشیاطین۔

دستے اور کوزے کے ٹوٹے ہوئے مقام سے پانی نہ پیو کیونکہ یہ شیطانوں کے پینے کی جگہ ہے۔[2]

رسولِ اسلامؐ کا ارشاد ہے:

مونچھوں کے بال بڑے نہ رکھو کیونکہ شیطان اسے اپنی زندگی کے لئے جائے امن سمجھتا ہے اور اس میں چھپ کر بیٹھتا ہے۔[3]

اس سے ظاہر ہوا کہ شیطان کے ایک معنی نقصان دہ اور مضر جراثیم بھی ہے لیکن واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ لفظ شیطان تمام مقامات پر اس معنی میں ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ شیطان کے مختلف معانی ہیں۔ ان روشن و واضح مصادیق میں سے ایک ابلیس کا اس کا لشکر اور اس کے اعوان و مددگار بھی ہیں اور اس کا دوسرا مصداق مفسد، حق سے منحرف کرنے والے انسان ہیں اور بعض اوقات اذیت دینے والے جراثیم کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (اس میں خوب غور کیجئے گا)۔

(۵) خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا ہے: بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ شیطان جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہے آخر

---

[1] و [2] و [3] کافی جلد ۶، کتاب الاطعمه والاشربه باب الاولی۔



اسے کیوں پیدا کیا گیا اور اس کے وجود کا فلسفہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

اوّل تو خدا نے شیطان کو شیطان نہیں پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ سالہا سال تک وہ ملائکہ کا ہم نشین رہا اور پاک فطرت پر رہا لیکن پھر اس نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا اور بغاوت و سرکشی کی بنیاد رکھی لہٰذا وہ ابتدا میں پاک پاکیزہ پیدا کیا گیا اس کی کجروی اس کی اپنی خواہش پر ہوئی۔

دوم یہ کہ نظام خلقت کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبانِ ایمان اور وہ لوگ جو راہ حق پر گامزن رہنا چاہتے ہیں اُن کے لئے نہ صرف یہ کہ شیطان کا وجود مضر اور نقصان دہ نہیں بلکہ اُن کی پیش رفت اور تکامل کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ترقی اور کمال ہمیشہ متضاد چیزوں کے درمیان ہی صورت پذیر ہوتے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک انسان طاقت ور دشمن کے مقابلے میں کھڑا نہ ہو کبھی بھی اپنی قوت و استعداد اور مہارت کو پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے کام میں لا سکتا ہے۔ یہی طاقت ور دشمن کا وجود انسان کے زیادہ تحرک اور جنبش کا سبب بنتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے ترقی اور کمال نصیب ہوتا ہے۔

معاصرین میں سے ایک بہت بڑا فلسفی "ٹوائن بی" کہتا ہے:

> "دنیا میں کوئی روشن تمدن اس وقت تک پیدا نہیں ہوا جب تک کوئی ملت کسی خارجی طاقت کے حملے کا شکار نہیں ہوئی۔ اس حملے اور یلغار کے مقابلے میں وہ اپنی مہارت و استعداد کو بروئے کار لائی اور پھر کسی درخشاں تمدن کی داغ بیل پڑی۔"

۳۷۔ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

۳۸۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۳۷۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے اور (ان کے ذریعے) توبہ کی اور خداوند عالم نے اس کی توبہ قبول کر لی، خداوند عالم تواب اور رحیم ہے۔

۳۸۔ ہم نے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) اتر جاؤ۔ جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی اس وقت

جو لوگ اس کی پیروی کریں گے اُن کے لئے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۳۹۔ اور جو لوگ کافر ہو جائیں اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہ اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

تفسیر

خدا کی طرف آدمؑ کی بازگشت

وسوسۂ ابلیس اور آدمؑ کے جنت سے نکلنے کے حکم جیسے واقعات کے بعد آدم متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اس اطمینان بخش اور نعمتوں سے مالا مال جنت سے شیطانی فریب کی وجہ سے نکلنا پڑا اور اب زحمت و مشقت سے بھری ہوئی زمین میں رہیں گے۔ اس وقت آدم اپنی غلطی کی تلافی کی فکر میں پڑے اور مکمل جان و دل سے پروردگار کی طرف متوجہ ہوئے ایسی توجہ جو ندامت و حسرت کا ایک پہاڑ ساتھ لئے ہوئے تھی۔ اس وقت خدا کا لطف و کرم بھی اُن کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا آیات میں کہتا ہے، آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے جو بہت مؤثر اور انقلاب خیز ان کے ساتھ توبہ کی اور خدا نے بھی ان کی توبہ قبول کر لی (فتلقی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ) کیونکہ وہ تواب و رحیم ہے۔

"توبہ" کے اصلی معنی ہیں "بازگشت" اور قرآن کی زبان میں گناہ سے واپسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اُس صورت میں ہے جب توبہ کا لفظ کسی شخص گنہ گار کے لئے استعمال کیا جائے لیکن کبھی کبھی یہ لفظ اللہ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے وہاں اس کا مفہوم ہے رحمت کی طرف بازگشت۔ یعنی وہ رحمت جو ارتکابِ گناہ کی وجہ سے بندے سے سلب کر لی گئی تھی۔ اب اطاعت و بندگی کے راستے کی طرف اس کی واپسی کی وجہ سے اُسے لوٹا دی جاتی ہے اسی لئے خدا کے لئے تواب (بہت زیادہ رحمت کی طرف لوٹنے والا) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر توبہ خدا اور بندے کے درمیان ایک لفظ مشترک ہے۔ جب یہ صفت بندوں کے لئے ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ ہر گناہ کرنے والا در اصل اپنے پروردگار سے بھاگتا ہے اور پھر جب وہ توبہ کرتا ہے تو اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ گناہ کے وقت خدا بھی اُن سے منہ پھیر لیتا ہے اور جب یہ صفت خدا کے لئے استعمال ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے لطف، رحمت اور محبت کی نظر اُن کی طرف لوٹا دیتا ہے۔[1]

یہ صحیح ہے کہ حضرت آدمؑ نے حقیقت میں کوئی فعل حرام انجام نہیں دیا تھا لیکن یہی ترکِ اولیٰ اُن کے لئے نافرمانی شمار ہوتا ہے۔ وہ حضرت فوراً اپنی کیفیت و حالت کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹے۔

"کلمات" سے کیا مراد ہے۔ اس کے بارے میں اس بحث کے اختتام پر گفتگو کریں گے۔

بہرحال جو کچھ نہیں ہونا چاہیئے تھا یا ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا اور باوجودیکہ آدم کی توبہ قبول ہو گئی لیکن اس کا اثرِ وضعی

---

[1] یہی وجہ ہے کہ لفظ توبہ جب بندے کی طرف منسوب ہو تو لفظ "الی" آتا ہے اور خدا کی طرف منسوب ہو تو "علی" آتا ہے۔ پہلی صورت میں "تاب الیہ" اور دوسری طرف "تاب علیہ" کہا جاتا ہے (تفسیر کبیر اور تفسیر صافی زیر نظر آیت کے ذیل میں)۔



یعنی زمین کی طرف اترنا یہ متغیر نہ ہوا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں: ہم نے ان سے کہا کہ تم سب (آدم و حوا) زمین کی طرف اتر جاؤ۔ جب تمہیں ہماری طرف سے ہدایت پہنچے اس وقت جو لوگ اس کی پیروی کریں گے ان کے لئے خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے (وقلنا اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون)۔

لیکن جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں رہیں گے (والذين كفروا وكذبوا بآياتنا اولئك اصحاب النار هم فيها خالدون)۔

چند اہم نکات

(۱) خدا نے جو کلمات آدمؑ پر القا کئے وہ کیا تھے: توبہ کے لئے جو کلمات خدا نے آدم کو تعلیم فرمائے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مشہور ہے کہ وہ جملے یہ تھے جو سورہ اعراف آیہ ۲۳ میں ہیں:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ٥

ان دونوں نے کہا خدایا! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم زیاں کاروں اور خسارے میں رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

بعض کہتے ہیں کہ کلمات سے مراد یہ دعا و زاری تھی:

اللهم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك رب انى ظلمت نفسى فاغفر لى انك خير الغافرين

اللهم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك رب انى ظلمت نفسى فارحمنى انك خير الراحمين

اللهم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك رب انى ظلمت نفسى فتب علی انك انت التواب الرحيم۔

پروردگارا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک و منزہ ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، مجھے بخش دے کہ تو بہترین بخشنے والا ہے۔

خدایا! تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو پاک و منزہ ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، تو مجھ پر رحم فرما کہ تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

بارالہا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک و منزہ ہے میں تیری حمد کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اپنی رحمت کو میرے شامل حال قرار دے اور میری توبہ قبول کر لے کہ تو تواب و رحیم ہے۔

امام محمد باقرؑ سے منقول ایک روایت میں بھی یہ موضوع اسی طرح وارد ہوا ہے[1]

---

[1] مجمع البیان، آیات زیر بحث کے ذیل میں۔



اسی قسم کی تعبیرات قرآن کی دوسری آیات میں حضرت یونسؑ و موسیٰؑ کے بارے میں بھی ہیں:

حضرت یونسؑ خدا سے بخشش کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سُبْحٰنَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

خدایا! تو پاک ہے، میں ان میں سے ہوں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ (انبیاء - ۸۷)

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں ہے:

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهٗ ط

انہوں (حضرت موسیٰؑ) نے عرض کیا: پروردگارا! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے اور خدا نے انہیں بخش دیا۔ (القصص - ۱۶)

کئی ایک روایات جو طرق اہل بیت سے منقول ہیں میں ہے کہ کلمات سے مراد خدا کی بہترین مخلوق کے ناموں کی تعلیم تھی یعنی محمدؐ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام اور آدمؑ نے ان کلمات کے وسیلے سے درگاہِ الٰہی سے بخشش چاہی اور خدا نے انہیں بخش دیا۔

یہ تین قسم کی تفاسیر ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت آدمؑ کو ان سب کلمات کی تعلیم دی گئی ہو تاکہ ان کلمات کی حقیقت اور باطنی گہرائی پر غور کرنے سے آدمؑ میں مکمل طور پر انقلاب روحانی پیدا ہو اور خدا انہیں اپنے لطف و ہدایت سے نوازے۔

(۲) لفظ "اِهْبِطُوا" کا تکرار کیوں: زیر بحث اور ان سے پہلی آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ توبہ سے پہلے اور بعد بھی حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ حوا کو خطاب ہوا کہ زمین کی طرف اتر جاؤ۔ یہ تکرار آیا تاکید کے لئے ہے یا کسی اور مقصد کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ دوسری مرتبہ یہ لفظ اس واقعیت و حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کہیں آدمؑ یہ گمان نہ کریں کہ ان کی توبہ قبول ہو جانے کے بعد زمین کی طرف اترنے کا حکم بھی واپس لے لیا گیا ہے بلکہ انہیں اس رستے کی طرف ہر حال میں جانا ہے یا اس لحاظ سے کہ دراصل وہ پیدا ہی اس مقصد کے لئے ہوئے تھے یا پھر اس نظر سے کہ یہ اترنا اس عمل کا اثر وضعی ہے اور یہ توبہ سے نہیں بدلا۔

(۳) "اھبطوا" میں کون مخاطب ہیں: "اھبطو" صیغۂ جمع کے ساتھ آیا ہے جب کہ آدمؑ و حوا جو اس گفتگو کے اصلی مخاطب ہیں وہ دو سے زیادہ نہیں تھے لہٰذا ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیئے تھا لیکن اس بناء پر جمع کا صیغہ آیا کہ آدمؑ و حوا کے زمین پر اترنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی اولاد اور نسل کو بھی زمین میں رہنا تھا لہٰذا جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔

۴۰ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝



ترجمہ

۴۰۔ اے اولاد اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں انہیں یاد رکھو اور میرے ساتھ جو عہد و پیمان تم نے باندھا ہے۔ اسے پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کروں (اور ذمہ داری کی انجام دہی نیز عہد و پیمان کی پابندی میں) صرف مجھ سے ڈرا کرو۔

تفسیر

خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا

زمین پر خلافتِ آدمؑ کی داستان، ملائکہ کی طرف سے اُن کی تعظیم کا واقعہ، آدمؑ کا عہد و پیمان الٰہی کو بھول جانے کا ذکر اور پھر ان کی توبہ کا تذکرہ یہ سب کچھ ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں۔

اس واقعے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس دنیا میں ہمیشہ دو مختلف طاقتیں، حق و باطل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں جس شخص نے شیطان کی پیروی کی اس نے باطل کی راہ کو انتخاب کیا جس کا انجام ہے جنت و سعادت سے دوری اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا اور اس کے بعد پشیمانی ہے۔ اس کے برخلاف جو فرمان خداوندی کی راہ پر چلتا رہا اور اس نے شیاطین اور باطل پرستوں کے وسوسوں کی پرواہ نہ کی وہ پاک و پاکیزہ اور رنج و غم سے آسودہ زندگی بسر کرے گا۔

بنی اسرائیل نے فرعونیوں کے چنگل سے نجات پائی، زمین میں خلیفہ ہوئے پھر پیمان الٰہی کو بھول گئے اور دوبارہ رنج و بدبختی میں پھنس گئے چونکہ یہ واقعہ حضرت آدمؑ کے واقعے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے بلکہ اسی اصل کی ایک فرع شمار ہوتا ہے لہٰذا خداوند عالم زیر بحث اور اس کے بعد دسویں آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور ان کی سرنوشت بیان کرتا ہے تاکہ وہ تربیتی درس جو سرنوشت آدمؑ سے شروع ہوا تھا ان مباحث میں مکمل ہو جائے۔

بنی اسرائیل کی طرف اس طرح روئے سخن ہے: اے بنی اسرائیل! ہماری ان نعمتوں کو یاد کرو جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں اور مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو تاکہ میں بھی تم سے کئے ہوئے عہد سے وفا کروں اور صرف مجھ سے ڈرو (یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم و اوفوا بعھدی اوف بعھدکم و ایای فارھبون)۔

درحقیقت یہ تین دستور اور احکام (خدا کی عظیم نعمتوں کو یاد کرنا، عہد پروردگار کو پورا کرنا اور اس کی نافرمانی سے ڈرنا) خدا کے تمام پروگراموں کی تشکیل کرتے ہیں۔

اس کی نعمتوں کو یاد کرنا، انسان کو اس کی معرفت کی دعوت دیتا ہے اور انسان میں شکر گزاری کا احساس ابھارتا ہے۔ اس کے بعد اس نکتے کی طرف توجہ کہ یہ نعمتیں بغیر کسی قید و شرط کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ خدا نے عہد و پیمان لیا ہے یہ انسان کو اس کی الٰہی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ انسان ذمہ داری کی راہ میں کسی شخص یا ہستی سے نہ ڈرے۔ یہ سبب بنتا ہے کہ انسان اس راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دے اور اپنی ذمہ داریوں اور عہد و پیمان کو پورا کرے کیونکہ



اس راستے کی اہم رکاوٹوں میں سے ایک بلاوجہ اِس سے اور اُس سے ڈرنا ہے خصوصاً بنی اسرائیل جو سالہا سال تک فرعونوں کے زیر تسلط رہے تھے، خوف ان کے بدن کا جزو بن چکا تھا۔

چند اہم نکات

(۱) یہودی مدینہ میں: یہ بات قابل غور ہے کہ بعض مورخین قرآن کی تصریح یہ ہے کہ سورہ بقرہ وہ پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کا اہم حصہ یہودیوں کے بارے میں ہے کیونکہ اہل کتاب کے پیروکاروں کی زیادہ مشہور جماعت وہاں پر یہودیوں ہی کی تھی، وہ ظہور پیغمبرؐ سے پہلے اپنی مذہبی کتب کی روشنی میں اس قسم کے ظہور کے منتظر تھے اور دوسروں کو بھی اس کی بشارت دیتے تھے۔ اقتصادی حالت بھی اُن کی بہت اچھی تھی خلاصہ یہ کہ مدینہ میں ان کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو اسلام ان کے غیر شرعی منافع کے راستوں کو بند کرتا تھا اور ان کے غلط رویوں اور خود سری کو روکتا تھا۔ ان میں سے اکثر نے نہ صرف یہ کہ اسلام کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ چودہ سو سال گذرنے کے باوجود اسلام سے ان کا یہ مقابلہ ابھی تک جاری ہے۔

مندرجہ بالا اور اس کے بعد کی آیات نازل ہوئیں اور سخت ترین سرزنشوں کے تیر یہودیوں پر چلائے گئے اور ان کی تاریخ کے حساس حصوں کو اس باریکی کے ساتھ ذکر کیا گیا کہ جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا اُن میں سے جو بھی تھوڑی سی حق جوئی کی روح رکھتا تھا وہ بیدار ہو کر اسلام کی طرف آگیا علاوہ ازیں مسلمانوں کے لئے بھی ایک تربیتی درس تھا۔

انشاء اللہ آنے والی آیات میں آپ بنی اسرائیل کے نشیب و فراز پڑھیں گے جس میں اُن کا فرعون کے چنگل سے نجات پانا، دریا کا شق ہونا، فرعون اور فرعونیوں کا غرق ہونا، کوہ طور حضرت موسیٰؑ کی وعدہ گاہ، حضرت موسیٰؑ کی غیبت کے دنوں میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی، خونی توبہ کا حکم، خدا کی مخصوص نعمتوں کا ان پر نزول اور اس قسم کے دیگر واقعات جن میں سے ہر ایک واقعہ اپنے اندر ایک یا کئی عبرت ناک درس لئے ہوئے ہے۔

(۲) یہودیوں سے خدا کے بارہ معاہدے: جس طرح آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے وہ معاہدے یہ تھے: ایک اکیلے خدا کی عبادت کرنا، ماں باپ، عزیز و اقارب، یتیموں اور مدد طلب کرنے والوں سے نیکی کرنا، لوگوں سے اچھا سلوک کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا اور اذیت و آزار اور خون ریزی سے دور رہنا۔

اس بات کی شاہد اسی سورت کی آیت ۸۳ اور ۸۴ ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ....
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاۗءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○

دراصل یہ دو آیات دس معاہدوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو خدا نے یہودیوں سے کیے تھے اور سورہ مائدہ کی



آیت ۱۲ جو یہ ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ ..... وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ۔

اس میں سے دوسرے عہد و پیمان جن میں انبیاء پر ایمان لانا اور انہیں تقویت پہنچانا شامل ہیں ظاہر ہوتے ہیں۔
اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کی بڑی بڑی نعمتیں کچھ معاہدوں کی بنیاد پر حاصل کی تھیں اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر ان معاہدوں کے وفادار رہو گے تو تمہیں جنت کے باغوں میں بھی جگہ دی جائے گی جس کی نہریں اس کے قصروں اور درختوں کے نیچے جاری ہوں گی:

لادخلنکم جنات تجری من تحتها الانھر

بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے آخر کار یہ عہد و پیمان پاؤں تلے روند ڈالے اور اب اس زمانے میں بھی اپنی پیمان شکنی جاری رکھے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ منتشر و پراگندہ ہیں اور دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور جب تک ان کی یہ پیمان شکنیاں جاری رہیں گی، ان کی یہ کیفیت بھی جاری رہے گی۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دوسروں کی پناہ میں نشو و نما پا رہے ہیں تو یہ ہرگز ان کی کامیابی کی دلیل نہیں اور ہم اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں کہ جس دن اسلام کے غیور بیٹے نسلی اور قومی رجحانات و میلانات سے دور ہو کر صرف قرآن کے سائے میں اٹھ کھڑے ہوں گے وہ اس شور اور ہنگامے کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔

(۴) خدا بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا: خدا کی نعمتیں کبھی قید اور شرط کے بغیر نہیں ہوتیں اور ہر نعمت کے پہلو میں ایک ذمہ داری اور شرط پنہاں ہے۔ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اوف بعھدکم سے مراد یہ ہے کہ میں اپنے عہد کو پورا کروں گا اور تمہیں جنت میں لے جاؤں گا۔[۱]

اس حدیث کے ایک حصے میں ولایت علیؑ پر ایمان لانا بھی اس عہد کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ بنی اسرائیل کے عہد و پیمان کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ انبیاء خدا کی رسالت پر ایمان لائیں گے اور ان کو تقویت پہنچائیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے جانشینوں کو بھی ماننا اسی مسئلۂ رہبری و ولایت کا ضمیمہ ہے جو ہر زمانے میں اس کی مناسبت سے تحقق پذیر ہوتا رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں اس منصب پر فائز خود حضرت موسیٰؑ تھے۔ اور نبی اکرمؐ کے زمانے میں خود آنحضرتؐ ہی تھے اور بعد والے زمانے میں حضرت علیؑ۔

ضمنی طور پر جملہ ایای فارھبون (صرف میری سزا سے ڈرو) اس امر کی تاکید ہے کہ خدا سے ایفائے عہد اور اطاعتِ احکام کی راہ میں کسی چیز اور کسی شخص سے خوف و وحشت نہیں ہونی چاہیے۔ لفظ ایای جو فارھبون سے مقدم ہے سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے۔

(۵) حضرت یعقوبؑ کی اولاد کو بنی اسرائیل کیوں کہتے ہیں: حضرت یعقوبؑ جو حضرت یوسفؑ کے والد تھے ان کا ایک

---

[۱] نور الثقلین، ج ۱، ص ۷۲



نام "اسرائیل" بھی ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنا یہ نام کیوں رکھا تھا۔ اس سلسلے میں غیر مسلم مؤرخین نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو خرافات کا پلندہ ہیں۔ جیسے قاموس "کتاب مقدس" میں لکھا ہے:

"اسرائیل کا معنیٰ وہ شخص ہے جو خدا پر غالب اور کامیاب ہوگیا ہو"

وہ مزید لکھتا ہے:

"یہ لفظ یعقوب بن اسحاق کا لقب ہے جنہیں خدا کے فرشتوں سے کشتی لڑتے وقت یہ لقب ملا تھا"

اسی کتاب میں لفظ یعقوب کے نیچے لکھا ہے:

"جب انہوں نے اپنے اثبات و استقامت ایمان کو ظاہر کیا تو خداوند نے اس کا نام بدل کر اسرائیل رکھ دیا اور وعدہ کیا کہ وہ عوام کے گروہوں کے باپ ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ وہ انتہائی کمال کے ساتھ اس دنیا سے گئے اور دنیا کے کسی بادشاہ کی طرح دفن ہوئے اور اسم یعقوب و اسرائیل ان کی پوری قوم کے لئے بولا جاتا ہے"

لفظ "اسرائیل" کے ذیل میں لکھتا ہے:

"اس نام کے بہت سے موارد ہیں چنانچہ کبھی اس سے مراد نسل اسرائیل و نسل یعقوب بھی ہوتی ہے"[1]

علماء اسلام اس سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں مثلاً مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

"اسرائیل وہی فرزند اسحاق بن ابراہیم ہیں"

وہ لکھتے ہیں:

"اسر" کے معنی "عبد" اور "ئیل" کے معنی "اللہ" ہیں لہٰذا "اسرائیل" کے معنی "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ ہیں"

واضح ہے کہ اسرائیل کی فرشتوں سے کشتی لڑنے کی داستان جیسے کہ تحریف شدہ تورات میں اب بھی موجود ہے ایک خود ساختہ اور بچگانہ کہانی ہے جو ایک آسمانی کتاب کی شان سے بعید ہے اور یہی داستان موجودہ تورات کے تحریف شدہ ہونے کی دلیل و مدرک ہے۔

۴۱۔ وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ ○

۴۲۔ وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○

۴۳۔ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ○

---

[1] قاموس کتاب مقدس ص۵۳ و ص۹۵۵



ترجمہ

۴۱۔ اور جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ تمہاری کتابوں میں ہے اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو (تھوڑی سی آمدنی کے لئے ان نشانیوں کو نہ چھپاؤ جو قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق تمہاری کتابوں میں موجود ہیں) اور دلوگوں سے ڈرنے کی بجائے) صرف مجھ سے (میرے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے) ڈرو۔

۴۲۔ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ چھپاؤ۔

۴۳۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (یعنی نماز جماعت کے ساتھ پڑھو)۔

شانِ نزول

زیر نظر آیات میں سے شروع کی آیتوں کے بارے میں بعض بزرگ مفسرین نے امام محمد باقرؑ سے یوں نقل کیا ہے:

"حیّ بن اخطب، کعب بن اشرف اور یہودیوں کی ایک جماعت کے لئے یہودیوں کی طرف سے ہر سال ایک زرق برق دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ خوف زدہ تھے کہ کہیں رسولِ اسلامؐ کے قیام کی وجہ سے یہ چھوٹا سا فائدہ جاتا نہ رہے اس وجہ سے (اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر) انہوں نے تورات کی ان آیات میں تحریف کر دی جو اوصافِ پیغمبرؐ کے بارے میں تھیں یہ وہی "ثمن قلیل" اور کم قیمت ہے جس کی طرف قرآن نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے"[1]

تفسیر

یہودیوں کی دولت پرستی

خدا نے یہودیوں سے جو پیمان لئے تھے ان میں انبیاء الٰہی پر ایمان لانا اور ان کے فرامین کی اطاعت کرنا بھی شامل تھا۔ زیر نظر تین آیات میں ان احکام و قوانین کے نو حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو یہودیوں کو دیے گئے تھے۔

پہلا یہ کہ ان آیات پر ایمان لاؤ جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی ہیں جب کہ یہ آیات ان اوصاف سے ہم آہنگ ہیں جو تمہاری تورات میں موجود ہیں (وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم)۔

قرآن اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے یعنی وہی بشارتیں جو تورات اور گذشتہ انبیاء نے اپنے پیروکاروں کو دی ہیں اور بتایا ہے کہ ان اوصاف کا نبی ظہور کرے گا اور اس کی آسمانی کتاب ان خصوصیات کی حامل ہوگی۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اس پیغمبرؐ کی صفات اور قرآن پاک کی خصوصیات ان بشارتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں جو تمہاری کتب میں

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیات کے سلسلے میں



موجود ہیں۔ اس ہر قسم کی مطابقت کے بعد اب تم کیوں اس پر ایمان نہیں لاتے۔

پھر کہا گیا ہے کہ تم آسمانی کتاب کا انکار کرنے والوں میں پہل نہ کرو (ولاتکونوا اول کافر بہ)۔

اگر مشرک اور عرب کے بت پرست کافر ہو جائیں تو زیادہ تعجب کی بات نہیں تعجب تو تمہارے کفر و انکار پر ہے اور مخالفت میں پہل کے لحاظ سے تم پیش پیش بھی ہو جب کہ تم ان کی زیادہ اطلاعات رکھنے ہو اور اہل کتاب بھی ہو۔ اس قسم کے پیغمبر کے بارے میں تمہاری آسمانی کتب میں سب بشارتیں دی جا چکی ہیں۔ اسی بناء پر تو تم اُن کے ظہور سے پہلے ان کے بارے میں منادی کیا کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے ظہور کے بعد تم ان پر ایمان لانے والوں میں پہل کرتے تم نے کفر میں پہل کی ہے۔ بہت سے یہودی اصولی طور پر کیچڑ قسم کے تھے اور اگر ان میں یہ ضدی پن نہ ہوتا تو بظاہر انہیں دوسروں کی نسبت پہلے ایمان لانا چاہیئے تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ تم میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو اور ایک سالانہ دعوت سے اس کا تقابل نہ کرو (ولا تشتروا بآیتی ثمنا قلیلا)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کی آیات کو کسی قیمت پر بھی نہیں بیچنا چاہیئے چاہے کم ہو یا زیادہ لیکن یہ جملہ حقیقت میں ان یہودیوں کی کم ظرفی کی نشاندہی کرتا ہے جنہوں نے چھوٹے چھوٹے منافع کے لئے ہر چیز کو بھلا دیا اور وہ لوگ جو پیغمبر اسلام کے قیام اور ان کی آسمانی کتاب کے بارے میں بشارت دیا کرتے تھے جب اپنے منافع کو خطرے میں دیکھا تو سب بشارتوں کا انکار کرنے لگے اور آیات تورات میں تحریف کر دی کیونکہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ اگر لوگوں کو حقیقت حال کا علم ہو گیا تو ان کی سرداری کا محل زمین بوس ہو جائے گا۔

اصولاً یہ پوری دنیا بھی اگر کسی کو ایک آیت الٰہی کے انکار کے بدلے دے دی جائے تو واقعاً یہ قیمت بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی تو بہر حال نابود ہونے والی ہے اور دار آخرت ابدی اور دائمی ہے لہٰذا ایک انسان کس طرح ان آیات الٰہی کو حقیر فوائد پر قربان کر دے۔

چوتھا حکم ہے کہ صرف مجھ سے ڈرو (وایای فاتقون)۔

اس بات سے نہ ڈرو کہ تمہاری روزی منقطع ہو جائے گی اور اس سے بھی نہ ڈرو کہ یہودیوں کی متعصب جماعت تم سرداروں کے خلاف قیام کرے گی بلکہ صرف مجھ سے یعنی میرے حکم کی مخالفت سے ڈرو۔

پانچواں حکم ہے کہ حق کو باطل سے مخلوط نہ کرو تاکہ کہیں لوگ اشتباہ میں جا پڑیں (ولا تلبسوا الحق بالباطل)۔

چھٹے فرمان میں حق کو چھپانے سے منع کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ جب کہ تم اسے جانتے اور اس سے آگاہ ہو (وتکتموا الحق وانتم تعلمون)۔

جس طرح حق کو چھپانا جرم اور گناہ ہے اسی طرح حق کو باطل سے ملانا اور انہیں ایک دوسرے سے مخلوط کرنا بھی حرام اور گناہ ہے کیونکہ نتیجے کے اعتبار سے دونوں عمل برابر ہیں۔ حق بات کرو چاہے تمہارے لئے نقصان دہ ہو اور باطل کو حق سے نہ ملاؤ چاہے تمہارے جلد ضائع ہو جانے والے منافع خطرے میں پڑ جائیں۔



آخر میں ساتویں، آٹھویں اور نویں حکم کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خصوصاً اجتماعی عبادت کو فراموش نہ کرتے ہوئے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین)۔

آخری حکم اگرچہ باجماعت نماز کے بارے میں ہے لیکن نماز کے تمام افعال میں سے صرف رکوع کو بیان کرتے ہوئے کہنا کہ رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ، شاید اس بنا پر کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع بالکل نہیں ہے یہ صرف مسلمانوں کی نماز ہے جس کے بنیادی ارکان میں رکوع شامل ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ نماز پڑھو بلکہ فرمایا: اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) یعنی فقط یہ نہ ہو کہ تم نماز پڑھتے رہو بلکہ ایسا کرو کہ آئین نماز معاشرے میں قائم ہو جائے اور لوگ عشق و وارفتگی کے ساتھ اس کی طرف جائیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "اقیموا" اس طرف اشارہ ہے کہ تمہاری نماز صرف اذکار و اوراد ہی نہ ہو بلکہ اسے پورے طور پر قائم کرو جس میں سے سب سے اہم قلبی توجہ، دل کا بارگاہِ خدا میں حاضر ہونا اور نماز کا انسان کی روح اور جان پر اثر انداز ہونا ہے[1]

درحقیقت ان آخری تین احکام کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ پہلا فرد کا خالق سے رشتہ بیان کرتا ہے، (یعنی نماز) دوسرا مخلوق کا مخلوق سے ناتا قائم کرتا ہے (یعنی زکوٰۃ) اور تیسرا سب لوگوں کا خدا سے تعلق ظاہر کرتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) کیا قرآن تورات اور انجیل کے مندرجات کی تصدیق کرتا ہے؟ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ بات نظر سے گزرتی ہے کہ قرآن گذشتہ کتب کے مندرجات کی تصدیق کرتا ہے محلِ بحث آیات میں ہے "مصدقا لما معکم" اور سورہ کی آیات ۸۹ اور ۱۰۱ میں ہے:

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ

نیز سورہ مائدہ کی آیت ۴۸ میں ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ

ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی یہ کتاب اپنے سے پہلے والی آسمانی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔

ان آیات کو علماء یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت تورات اور انجیل کے عدم تحریف کی سند قرار دیتی ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے زمانے کی تورات اور انجیل میں اور موجودہ تورات اور انجیل میں مسلماً کوئی فرق نہیں اگر تورات اور انجیل میں تحریف ہوئی ہوتی تو یہ زمانہ پیغمبر سے پہلے کی بات ہوتی لیکن قرآن نے چونکہ اس تورات اور انجیل کے صحیح ہونے کی تصدیق

---

[1] المنار، ج ۲، ص ۲۹۳ و مفرداتِ راغب، مادہ "قوم"



کی ہے جو آنحضرتؐ کے زمانے میں موجود تھی لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ان کتب کو غیر محرف آسمانی کتب کی حیثیت سے رسمی طور پر قبول کرلیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی مختلف آیات گواہی دیتی ہیں کہ انہی تحریف شدہ کتابوں میں جو اس وقت یہود و نصاریٰ کے پاس تھیں پیغمبر اسلامؐ اور ان کے دین کے متعلق نشانیاں موجود تھیں۔ یہ مسلم ہے کہ ان آسمانی کتب میں تحریف کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ کتب پوری کی پوری باطل اور خلافِ واقع ہیں بلکہ یقینی طور پر ان سب میں حقیقی تورات اور انجیل کا کچھ حصہ موجود تھا اور موجود ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں انہی یا دیگر مذہبی کتب میں نشانیاں موجود تھیں جو یہود و نصاریٰ کے پاس تھیں (آج بھی ان میں کچھ ایسے اشارات موجود ہیں)۔ اس لحاظ سے پیغمبر کا قیام، آپ کی دعوت اور آپ کی آسمانی کتاب عملی طور ان تمام نشانیوں کی تصدیق کرتے تھے کیونکہ ان کے مطابق تھے۔

لہٰذا قرآن کی تورات اور انجیل کی تصدیق کرنا ان معنی میں ہے کہ نبی اکرمؐ کی نشانیاں، آپؐ کی دعوت اور آپؐ کا قیام جو قرآن میں موجود ہے ان نشانیوں کے مطابق ہے جو تورات اور انجیل میں ہیں۔

تصدیق مطابقت کے معنی میں قرآن مجید کے دیگر مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے۔

مثلاً سورہ الصّٰفّٰت، آیہ ۱۰۵ میں ابراہیمؑ سے فرمایا گیا ہے:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ

آپ نے اپنے خواب کی تصدیق کردی

یعنی آپ کا عمل اس خواب کے مطابق ہے جو آپ نے دیکھا تھا۔

سورہ اعراف، آیہ ۱۵۷ میں ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ....

یہاں یہ حقیقت صراحت سے بیان ہوئی ہے یعنی "جو اوصاف وہ دیکھ رہے ہیں وہ اس کے مطابق ہیں جو انہوں نے تورات اور انجیل میں پائے ہیں...."

دوسری آیات میں یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کی نشانیاں ان گذشتہ کتب میں دیکھی گئی ہیں اور زیر بحث آیت جس کی تفسیر ہم پڑھ چکے ہیں یہ بھی اس حقیقت کی شاہد ہے اور وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ تھوڑی سی چیز کی خاطر یہاں تک کہ ایک دعوت کے لئے انہوں نے صفات پیغمبر کے بارے میں تحریف کردی۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن اور رسول اسلامؐ نے عملی طور پر اپنی حقانیت کی ان نشانیوں کی تصدیق کی جو گذشتہ کتب میں موجود تھیں اور اس کے لئے کوئی معمولی سی دلیل بھی موجود نہیں کہ ان آیات نے تورات اور انجیل کے تمام مندرجات کی تصدیق کردی ہے جب کہ اس کے برخلاف قرآن مجید کی کئی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے تورات اور انجیل میں تحریف کردی تھی اور یہ خود ہماری گذشتہ گفتگو کا ایک زندہ شاہد ہے۔



فخر الاسلام جو کتاب انیس الاعلام کے مؤلف ہیں علمائے نصاریٰ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علماء ہی میں مکمل کی تھی اور ان کے ہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب و غریب واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد و تقویٰ میں ممتاز تھا۔ کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اسی سے رجوع کرتے تھے۔ ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص ہی لگاؤ تھا۔ اُس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں صرف ایک صندوق خانے کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی..... اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جاکر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا۔ جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث و مباحثے میں معروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ "فارقلیطا" اور یونانی زبان کے لفظ "پیرکلتوس" کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے۔ ہر کسی کی الگ رائے تھی۔ واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں سے کس قول کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ فلاں مفسر کے قول کا جس نے اس کا معنیٰ "ممتاز" بیان کیا ہے میں نے پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ ان تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو راسخون فی العلم کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتائیے۔ وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا۔ لیکن اس نام کے معنی معلوم ہو جانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔ میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی "احمد" اور "محمد" ہیں۔ اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے آؤ۔ میں کتابیں اس کے پاس لے آیا۔ یہ دونوں کتابیں رسول اسلام کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔ دونوں کتب میں لفظ "فارقلیطا" کا ترجمہ "احمد" اور "محمد" کیا گیا تھا۔ اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرت کے ظہور سے پہلے علمائے نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد و محمد ہیں۔ لیکن ظہور محمدؐ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ



کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہوگیا ہے اس جملے کا اس نے تین مرتبہ تکرار کیا۔
پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم ..... کون سا ہے۔ اس نے کہا: منحصر
ہے محمدؐ کی پیروی و اتباع میں۔ میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں۔ اس نے کہا ہاں
خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی) پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت
اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کرلو ..... میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ
کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمدؐ کا پیروکار ہوں اور علماء نصاریٰ
کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست کش
نہیں ہوسکتے ورنہ کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔[1]

آپ دیکھیں گے کہ علماء اہل کتاب نے پیامبر اسلام کے ظہور کے بعد اپنے شخصی منافع کی خاطر آنحضرتؐ کے نام اور نشانیوں کی اور توجیہات کردی ہیں۔

۴۴۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۴۵۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ ○

۴۶۔ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ ع

۵ ع ۵

ترجمہ

۴۴۔ کیا تم لوگوں کو نیکی کی (اور اس پیغمبر پر جس کی صفات واضح طور پر تورات میں آئی ہیں ایمان لانے کی) دعوت دیتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ (آسمانی) کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

۴۵۔ صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو (استقامت اور اندرونی خواہشات پر کنٹرول کرکے پروردگار کی طرف توجہ سے قوت حاصل کرو) اور خشوع کرنے والوں کے علاوہ دوسروں پر یہ کام گراں ہے۔

۴۶۔ وہ جو ایمان رکھتے ہیں کہ خدا سے ملاقات کریں گے اور اسی کی جانب لوٹ جائیں گے۔

تفسیر

دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت

اگرچہ مندرجہ بالا آیات، اسی طرح گذشتہ اور آئندہ آیات میں روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے لیکن مسلماً اس کا مفہوم

---

[1] اقتباس و اختصار از ہدایت دوم مقدمہ انیس الاعلام۔



وسعت کے اعتبار سے دوسروں کے بھی شامل حال ہے۔

مشہور مفسر، صاحب مجمع البیان، طبرسی کے بقول یہود کے علماء و فضلاء حضرت محمدؐ کی بعثت سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے کی دعوت اور آپؐ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن خود انہی نے آنحضرتؐ کے ظہور کے وقت ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

یہی عظیم مفسر نقل کرتے ہیں کہ علماء یہود اپنے ان وابستگان کو جو اسلام لا چکے تھے نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنے ایمان پر باقی اور ثابت قدم رہنا لیکن خود ایمان نہ لاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں ان کے اس طرز عمل کی مذمت کی گئی ہے کہا گیا ہے: کیا تم لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو (اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم)۔

باوجودیکہ آسمانی کتاب (تورات) کا مطالعہ کرتے ہو لیکن کیا کچھ بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ہو (وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون)۔

اسی طرح قرآن انہیں سرزنش کرتا ہے دوسروں کو ایمان کی وصیت کیوں کرتے ہو جب خود ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ پیغمبر کی نشانیاں اور خصوصیت تورات میں پڑھ چکے ہو۔

علماء، مبلغین اور راہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے لئے خاص طور پر یہ بنیادی بات ہے کہ وہ باقی لوگوں کی نسبت زیادہ تر اپنے عمل سے تبلیغ کریں جیسے کہ حضرت امام صادقؑ سے ایک مشہور روایت ہے:

کونوا دعاۃ الناس باعمالکم ولا تکونوا دعاۃ بالسنتکم

لوگوں کو عمل سے دعوت دو نہ کہ زبان سے۔[1]

عملی دعوت کی گہری تاثیر کا سرچشمہ یہ ہے کہ اگر سننے والے کو معلوم ہو جائے کہ کہنے والا دل سے بات کر رہا ہے اور خود اپنے قول پر سو فی صد ایمان رکھتا ہے تو وہ اپنے دل کے کانوں سے اس کی بات سنے گا پھر اس کی باتیں بدن سے گزر کر نفس پر اثر کریں گی۔ کہنے والا اپنی بات پر ایمان رکھتا ہے، اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ خود اس پر دوسروں سے پہلے عمل کرتا ہے جیسے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ایھا الناس انی واللہ ما احثکم علی طاعۃ الا واسبقکم الیھا ولا انھاکم عن معصیۃ الا وانتھا قبلکم عنھا۔

اے لوگو! خدا کی قسم میں تمہیں کسی اطاعت کا شوق نہیں دلاتا جب تک پہلے خود اسے انجام نہ دے لوں اور کسی غلط کام سے تمہیں منع نہیں کرتا مگر یہ کہ پہلے خود اس سے رکتا ہوں۔[2]

امام صادقؑ سے ایک روایت میں ہے:

---

[1] سفینہ، مادہ "عمل"۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۰



من اشد الناس عذابا یوم القیامۃ من وصف عدلا وعمل بغیرہ

وہ لوگ جن پر قیامت کے دن سخت عذاب ہوگا ان میں سے ایک وہ ہوگا جو حق اور عدل کی بات کرتا ہے لیکن خود اس کے خلاف عمل کرتا ہے [1]

یہودی علماء اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر پیامبر اسلامؐ کی رسالت کا اعتراف کرلیں گے تو اُن کی مادی امداد منقطع ہو جائے گی اور یہودی عوام ان کی پرواہ نہیں کریں گے لہٰذا تورات میں پیغمبر اسلامؐ کی جو صفات آئی تھیں انہوں نے اُن میں ردو بدل کر دیا۔

اس مقصد کے لئے کہ وہ اپنے دلی میلان کی طرف قدم بڑھائیں اور سربراہی و سرداری کو دماغ سے نکال دیں قرآن کہتا ہے:
صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو یعنی استقامت اور اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کے ذریعے کامیابی حاصل کرو (واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ)۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ کام خاشعین کے علاوہ دوسروں پر گراں ہے (وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین)۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں خاشعین کا یوں تعارف کراتا ہے (الذین یظنون انھم ملٰقوا ربھم و انھم الیہ راجعون) [2] "یظنون" جس کا مادہ "ظن" ہے کبھی "گمان" اور کبھی "یقین" کے معنی میں آتا ہے۔ اس مقام پر یقیناً ایمان اور قطعی یقین کے معنی میں ہے کیونکہ لقاء اللہ اور اس خدا کی طرف بازگشت پر ایمان رکھنا انسان کے دل میں خشوع، خدا ترسی اور ذمہ داری کا احساس زندہ کر دیتا ہے اور یہ ایک ایسے معاد پر ایمان رکھنے کا نتیجہ ہے جو تربیت اور نشوونما کا باعث ہے جو ہر جگہ انسان کے سامنے اس بڑی عدالت کے دربار کی تصویر کشی کرتا ہے اور یہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور حق و عدالت کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں "ظن" گمان کے معنی میں ہو اور درحقیقت ایک قسم کا مبالغہ اور تاکید ہو کہ اگر بالفرض انسان اس عدالت عظمیٰ پر ایمان نہیں رکھتا اور صرف اُس کے ہونے کا گمان رکھتا ہے تو بھی اس کے لئے کافی ہے کہ ہر قسم کی غلط کاری سے پرہیز کرے۔ درحقیقت یہ علماء یہود کو ایک قسم کی سرزنش ہے کہ اگر تمہارا ایمان صرف ظن و گمان کے درجے تک بھی ہو پھر بھی تمہیں ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس قسم کی تحریف سے دست کش ہو جانا چاہیئے۔

چند اہم نکات

(۱) لقاء اللہ سے کیا مراد ہے: لقاء اللہ کی تعبیر قرآن میں متعدد بار آئی ہے اور ہر بار اس سے مراد صحن قیامت کی حاضری ہے یہ تو واضح ہے کہ خدا سے ملاقات اس طرح سے حسی تو نہیں جیسے افرادِ بشر ایک دوسرے سے ملتے ہیں کیونکہ خدا

---

[1] تفسیر نورالثقلین، ج ۱، ص ۵۰۔

[2] راغب نے مفردات میں کہا ہے، "ظن" نام ہے اس اعتقاد کا جو دلیل اور قرینے سے حاصل ہو یہ اعتقاد کبھی قوی ہوتا ہے اور درجہ یقین تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کمزور ہوتا ہے جو گمان کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔



جسم ہے نہ رنگ و مکان رکھتا ہے کہ ظاہری آنکھ سے اسے دیکھا جا سکے بلکہ مقصود میدانِ قیامت میں آثار قدرت، جزاو سزا، نجات اور عذابِ الٰہی کا مشاہدہ ہے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے یا اس کا معنیٰ ایک قسم کا شہودِ باطنی و قلبی ہے کیونکہ انسان بعض اوقات ایسے مقام و مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ خدا کو دل کی آنکھ سے اپنے سامنے دیکھتا ہے اس طرح کہ کوئی شک اور تردد باقی نہیں رہتا[۱]

پاکیزگی، تقویٰ، عبادت اور تہذیبِ نفس کے نتیجے میں یہ حالت اس دنیا میں بھی بعض لوگوں کے لئے ممکن ہے جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہے کہ ذعلب یمانی نے جو حضرت علیؑ کے دوستوں میں سے ایک دانشمند تھے آپؑ سے پوچھا:

هل رئیت ربك

کیا آپ نے اپنے خدا کو دیکھا ہے۔

امام نے فرمایا:

افأعبد مالا اریٰ

کیا میں اس کی عبادت کروں گا جسے میں نے دیکھا ہی نہیں۔

اس نے وضاحت چاہی تو امامؑ نے مزید فرمایا:

لاتدرکه العیون بمشاهدة العیان ولکن تدرکه القلوب بحقائق الایمان۔

ظاہری آنکھیں تو اسے دیکھ نہیں سکتیں البتہ دل نورِ ایمان کے وسیلے سے اس کا ادراک کر سکتے ہیں[۲]

باطنی شہود کی طاقت قیامت کے دن سب کو میسر ہوگی کیونکہ خدا کی عظمت و قدرت کے آثار اور نشانیاں اس وقت اس قدر عیاں ہوں گی کہ دل کا اندھا بھی اس پر قطعی ایمان لے آئے گا۔

(۲) مشکلات میں کامیابی کا راستہ: ترقی کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے دو بنیادی ارکان کی ضرورت ہے ایک طاقتور اور مضبوط اندرونی قلعہ اور دوسرا بیرونی محکم سہارا، مندرجہ بالا آیات میں ان دونوں اساسی ارکان کو صبر اور صلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صبر، استقامت اور بردباری کے ساتھ مشکلات کے محاذ پر ڈٹ جانے کا نام ہے اور نماز خدا سے رابطے اور تعلق کا وسیلہ ہے جو ایک محکم اور مضبوط سہارا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اگرچہ صبر سے روزہ مراد لیا ہے لیکن مسلّم ہے کہ صبر روزے ہی میں منحصر نہیں بلکہ یہاں روزے کا ذکر

---

[۱] المنار، جلد ۱، صفحہ ۳۰۲ - المیزان جلد ۱، صفحہ ۱۵۲ - روح المعانی، جلد ۱، صفحہ ۲۲۸

دوسری آیات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے مثلاً

فمن کان یرجوا لقاء ربه فلیعمل عملاً صالحًا۔ (کہف - ۱۱۰)

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۹



ایک واضح اور روشن مصداق کی حیثیت سے ہے کیونکہ یہ وہ عبادت ہے جس کے نتیجے میں انسان کے اندر قوی ارادہ اور پختہ ایمان پیدا ہوتا ہے اور ہوسرانیوں پر اس کی عقل کی حاکمیت مسلم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس آیت کے ذیل میں نقل کرتے ہیں کہ رسول اسلامؐ جب کسی ایسی مشکل سے دوچار ہوتے جو آپؐ کو بے آرام کرے تو آپؐ نماز سے مدد لیتے۔

امام صادقؑ سے ایک روایت میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب دنیا کے غموں میں سے کسی کا سامنا کرو تو وضو کرو اور مسجد میں جاکر نماز پڑھو اور پھر دعا کرو کیونکہ خدا نے خود ہی حکم دیا ہے: واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ[1]

نماز کی طرف توجہ اور پروردگار سے راز و نیاز انسان میں نئی قوت پیدا کر دیتا ہے۔

کتاب کافی میں امام صادقؑ سے روایت ہے:

کان علی اذا ھالہ امر فزع قام الی الصلوٰۃ ثم تلا ھذہ الآیہ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔

جب حضرت علیؑ کو کوئی سخت مشکل درپیش ہوتی تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرماتے: واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔

واقعاً نماز انسان کو قدرتِ لایزال سے مربوط کر دیتی ہے جس کے ہاں تمام مشکلات سہل و آسان ہیں اور یہی احساس باعث بنتا ہے کہ انسان حوادث کے مقابلے میں طاقتور اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

۴۷۔ يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

۴۸۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۷۔ اے بنی اسرائیل! جن نعمتوں سے میں نے تمہیں نوازا ہے انہیں یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت بخشی ہے۔

۴۸۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص دوسرے کی جگہ جواب دہ نہ ہوگا، نہ سفارش قبول کی جائے گی، نہ ہی تاوان و بدلہ قبول ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جاسکے گی۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



تفسیر

یہودیوں کے باطل خیالات

ان آیات میں خدا نے دوبارہ رُوئے سخن بنی اسرائیل کی طرف کیا ہے۔ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے: اے بنی اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں ان کے بارے میں سوچو (یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم)

ان نعمتوں کا دامن بڑا وسیع ہے۔ ہدایت و ایمان سے لے کر فرعونیوں کے چنگل سے رہائی اور عظمت و استقلال کے دوبارہ حصول تک سب نعمتیں اس میں شامل ہیں۔

پھر یہ نعمت بھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل کی جو دراصل مختلف نعمتوں کا مرکب ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: میں نے تمہیں جہانوں پر فضیلت عطا کی (وانی فضلتکم علی العٰلمین)۔

شاید بعض لوگوں کا احتمال ہو کہ "فضلتکم علی العٰلمین" کا مقصود یہ ہے کہ انہیں تمام جہانوں اور تمام ادوار میں برتری اور فضیلت دی گئی ہے لیکن قرآن کی دیگر آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ان کی سرزمین اور اُن کے زمانے کے لوگوں پر فضیلت و برتری مراد ہے کیونکہ قرآن میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے پیدا کیے گئے ہو۔ (آل عمران - ۱۱۰)

اس آیت کے مطابق پیامبر اسلامؐ کی امت بہترین اور افضل ترین ہے۔ ایک اور جگہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا

بنی اسرائیل جو کمزور سمجھے جاتے تھے انہیں ہم نے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا (اعراف - ۱۳۷)۔

واضح ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل پوری دنیا کے وارث نہ تھے لہٰذا مقصود یہ ہے کہ اپنے علاقے میں مشرق و مغرب کے وارث ہوئے لہٰذا عالمین پر ان کی فضیلت بھی اسی علاقے کے افراد کی مناسبت سے ہے۔

اگلی آیت میں قرآن نے یہودیوں کے باطل خیالات پر خط بطلان کھینچا ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد چونکہ پیغمبر تھے لہٰذا وہ ہماری شفاعت کریں گے یا یہ گمان کرتے تھے کہ گناہوں کا معاوضہ ادا کریں گے جیسے اس دنیا کا طریق کار ہے۔ قرآن کہتا ہے اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص دوسرے کی جگہ جزا نہیں پائے گا (واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا) اور نہ ہی اذن پروردگار کے بغیر، کوئی سفارش و شفاعت قبول ہوگی (ولا یقبل منها شفاعة) نہ ہی تاوان و بدل قبول ہوگا (ولا یؤخذ منها عدل) اور نہ ہی کوئی شخص ان کی مدد کے لئے کھڑا ہوگا (ولا هم ینصرون)۔

خلاصہ یہ کہ اس عدالت کا قاضی و حاکم وہ ہوگا جو پاک عمل کے سوا کچھ قبول نہیں کرے گا۔ جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۸۸ اور ۸۹ میں ہے۔



يَوۡمَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ۙ‏ اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍؕ‏

وہ دن جب نہ مال کام آئے گا نہ اولاد ہاں مگر وہ لوگ جو قلبِ سلیم لے کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوں گے۔

درحقیقت زیر بحث آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس دنیا میں اس طرح معمول ہے کہ مجرم سزا سے نجات پانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی ایک شخص دوسرے کا جرمانہ اپنے ذمے لے لیتا ہے اور اسے ادا کر دیتا ہے کبھی سفارش کو وسیلہ بنایا جاتا ہے اور ایسے اشخاص کو تیار کیا جاتا ہے جو اس کے گناہ کے سلسلے میں سفارش کریں اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو مجرم کوشش کرتا ہے کہ تاوان ادا کر کے اپنے آپ کو سزا سے بچا لے کچھ بھی نہ ہو سکے تو دوستوں کی مدد سے دفاع کے لئے تیار ہو جاتا ہے تاکہ سزا کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

دنیا میں سزا سے بچنے کے لئے یہ مختلف طریقے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ عالم قیامت میں سزاؤں کے اصول دنیا سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی وہاں کارآمد نہیں ہوگی۔

راہ نجات صرف یہ ہے کہ انسان ایمان و تقویٰ کے سائے میں پناہ لے اور پھر لطفِ پروردگار ہے۔

بت پرستوں اور اہل کتاب میں سے کجرو لوگوں کے عقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خرافاتی عقائد ان کے درمیان کم نہیں تھے۔ مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف نقل کرتے ہیں:

مصر کے بعض علاقوں کے فضول لوگ میت کو غسل دینے والے کو کچھ رقم دیتے تھے اور اسے بہشت میں نقل و انتقال کی اجرت کہتے تھے[1]

یہودیوں کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے کفارہ کے لئے قربانی کرتے تھے اور اگر قربانی میسر نہ ہوتی تو کبوتروں کے ایک جوڑے کی قربانی کر دیتے تھے[2]

گذشتہ قوموں (احتمالاً ماقبل تاریخ کی) کے حالات میں ہے کہ وہ زیور، آلات اور میت کا اسلحہ اس کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں ان سے فائدہ اٹھا سکے[3]

قرآن اور مسئلہ شفاعت

اس میں شک نہیں کہ خدائی سزائیں اس جہان میں ہوں یا قیامت میں، ان میں انتقام کا پہلو نہیں ہے۔ وہ سب درحقیقت قوانین کے اجراء اور اطاعت کی ضمانت ہیں اور نتیجے کے طور پر تمام پہلوؤں میں ترقی اور تکامل ہے۔ لہٰذا جو چیز اس ضامن اجراء کو کمزور کرے اس سے احتراز و اجتناب ضروری ہے تاکہ لوگوں میں گناہ کی جرأت پیدا نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف واپس لوٹنے اور اصلاح کرنے کے راستے، گناہگاروں کے لئے کلی طور پر بند نہیں ہونے چاہئیں۔ شفاعت صحیح معنی کے لحاظ سے تعمیر اور اصلاح کے لئے ہے اور گناہگاروں اور ناپاکیوں سے آلودہ افراد کی واپسی کا وسیلہ ہے لیکن غلط مفہوم کے اعتبار سے گناہ کا شوق پیدا

---

[1] و [2] المنار، ج ۱، ص ۳۰۶۔

[3] المیزان، ج ۱، ص ۱۵۶



کرنے اور جرأت دلانے کا سبب بنتی ہے۔

جو لوگ شفاعت کے مختلف پہلوؤں اور اس کے صحیح مفاہیم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھ سکے وہ بعض اوقات مسئلہ شفاعت کے سرے سے منکر ہو گئے ہیں اور شفاعت کو سلاطین اور ظالم حکام کے سامنے ایک دوسرے کی سفارش اور پارٹی بازی کے برابر سمجھتے ہیں اور بعض اوقات وہابیوں کی طرح مندرجہ بالا آیت کے الفاظ "لا یقبل منہا شفاعۃ" سے مراد یہ لیتے ہیں کہ قیامت میں کسی کی سفارش قابل قبول نہ ہوگی۔ دوسری آیات کی طرف توجہ کیے بغیر اسے دستاویز قرار دے کر شفاعت کا مکمل انکار کر دیتے ہیں۔

مخالفین شفاعت کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) شفاعت کا عقیدہ کوشش اور جستجو کی روح کو کمزور کر دیتا ہے۔

(۲) شفاعت کا عقیدہ پسماندہ اور طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔

(۳) شفاعت کا عقیدہ ایک قسم کا شرک ہے اور چند اشخاص کی پرستش کے مترادف ہے۔

(۴) شفاعت کا عقیدہ گناہ کا شوق دلاتا ہے اور ذمہ داریوں سے غفلت کا سبب بنتا ہے۔

(۵) شفاعت کے عقیدے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے احکام بدل جائیں اور خدا کا ارادہ و فرمان متغیر ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ ہم بتائیں گے کہ یہ اعتراضات اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ شفاعت کے قرآنی مفہوم کو عوام میں رائج بگڑی سفارشوں کی طرح سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ منفی اور مثبت جہات کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مفہوم شفاعت، فلسفۂ شفاعت، عالم تکوین میں شفاعت، قرآن و حدیث میں شفاعت اور شفاعت اور توحید و شرک کے متعلق بحث کی جائے تاکہ ہر قسم کا ابہام جو مندرجہ بالا اور دیگر آیات میں اس سلسلے میں دکھائی دیتا ہے دور ہو سکے۔

(۱) شفاعت کا حقیقی مفہوم: لفظ شفاعت "شفع" سے ہے جس کے معنی ہیں جفت اور "ضم الشئی الی مثلہ" ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز سے ملحق کرنا۔ اس کے مقابل ہے "وتر" جس کے معنی تاک اور تنہا ہیں کسی برتر و قوی فرد کے ضعیف فرد کے ساتھ مدد کی خاطر مل جانے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ عرف اور شرع میں دو مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

الف۔ عرف عام میں شفاعت کا مفہوم یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا اپنے مقام، شخصیت اور اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ماتحت لوگوں کی سزا کے بارے میں صاحب قدرت شخص کا نظریہ بدل دے اسی طرح اپنے اثر و رسوخ سے کام لینا جب کہ اس کا لحاظ رکھا جاتا ہو یا جب لوگ اس سے خوف زدہ ہوں یا پھر کسی پر نوازشات کے ذریعے سے اثر ڈالنا یا کبھی مجرم کے گناہ اور استحقاق سزا سے متعلق فکری بنیادوں کو بدل دینا وغیرہ خلاصہ یہ کہ اس شفاعت سے مجرم یا ملزم کی روح یا فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سب اثرات اور تبدیلیوں کا تعلق اس شخص سے ہوتا ہے جس کے پاس شفاعت و سفارش کی جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔



مذہبی نقطہ نظر سے ایسی شفاعت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ خدا کو تو اشتباہ نہیں ہوتا کہ اُس کے نظریے کو بدلا جا سکے نہ ہی وہ انسان جیسے میلانات رکھتا ہے کہ انہیں اُبھارا جا سکے نہ کسی کے اثر و رسوخ سے وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی سزا اور عذاب عدالت کے علاوہ کسی محور پر گردش کرتی ہے۔

ب۔ شفاعت کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو مذہبی منابع اور مصادر میں موجود ہے جس کا مقصد اس شخص میں تبدیلی پیدا کرنا ہے جس کی سفارش کی جا رہی ہے۔ یعنی جس شخص کی شفاعت ہو رہی ہے اس نے ایسے اسباب فراہم کئے ہیں کہ وہ اس ناپسندیدہ کیفیت سے باہر نکل آیا ہے جس کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق تھا اور شفیع سے ربط کی وجہ سے اپنے آپ کو پسندیدہ کیفیت میں ڈھال چکا ہے جس کی وجہ سے وہ اس لائق اور مستحق ہو گیا ہے کہ اسے بخش دیا جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ ایسی شفاعت پر ایمان رکھنا ایک بلند مکتبِ تربیت ہے گناہگار اور آلودہ افراد کی اصلاح، بیداری اور آگاہی کا وسیلہ ہے۔

ہم دیکھیں گے کہ تمام اعتراضات، نکتہ چینیاں اور حملے شفاعت کی پہلی تفسیر پر ہوتے ہیں دوسری پر نہیں جو کہ ایک منطقی، معقول اور تربیت کرنے والا مفہوم ہے۔

شفاعت کی دو شکلوں کی یہ اجمالی تفسیر تھی جن میں سے ایک گناہ پر پردہ ڈالنا اور دوسری انسان کی اصلاح و تربیت کرنا ہے۔

(ii) **عالم تکوین میں شفاعت:** جو کچھ ہم نے صحیح اور منطقی شفاعت کے بارے میں کہا ہے اس کا مشاہدہ عالم تشریع کے علاوہ تکوین و خلقت کی دنیا میں بہت کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کی طاقت ور قوتیں ضعیف قوتوں سے مل جاتی ہیں اور انہیں اصلاحی اغراض کے راستوں پر آگے لے چلتی ہیں۔ سورج چمکتا ہے۔ بارش برستی ہے، بیج زمین کے دل میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی اندرونی استعداد کو بروئے کار لائے اور پہلی زندگی کی کونپلوں کو زمین سے باہر بھیجے، اس طرح کہ دانے کے چھلکے کا زندان چاک کیا جائے ظلمت کدۂ خاک سے سر باہر نکالا جائے اور آسمان کی طرف آگے بڑھا جائے جس سے اس نے قوت حاصل کی تھی۔

زندگی کی اٹھان میں یہ سب بہاریں درحقیقت، شفاعت تکوینی کی ایک قسم ہیں اگر اس قسم کی شفاعت کے مشاہدے سے ہم عالم تشریع میں بھی اس کے قائل ہو جائیں تو ہم نے راہِ مستقیم اختیار کی ہے جس کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے۔

(iii) **مدارک شفاعت:** اب ہم مسئلہ شفاعت کے اصلی مدارک اور اولین دلائل کا ذکر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں مسئلہ شفاعت کے بارے میں اس عنوان سے تقریباً تیس مقامات پر گفتگو ہوئی ہے البتہ اس عنوان کے بغیر بھی اس کی بحثیں اور اس طرف اشارات موجود ہیں۔

وہ آیات جو قرآن میں اس مسئلے کے بارے میں ہیں چند شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

۱۔ وہ آیات جو بطور مطلق شفاعت کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً

اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ



اور

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

ان آیات میں مجرمین کے لئے ایمان وعمل صالح کے بغیر راہِ نجات کی نفی کی گئی ہے وہ چاہے مادی عوض سے ہو یا تعلق کی بنیاد پر سابقہ دوستی کی وجہ سے ہو یا مسئلہ شفاعت کے حوالے سے بلکہ بعض مجرمین کے بارے میں تو ہے کہ:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ؕ

شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ (مدثر - ۴۸)

ب۔ وہ آیات جو شفیع کو صرف خدا میں منحصر قرار دیتی ہیں۔ مثلاً

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ

اُس (خدا) کے سوا تمہارا کوئی ولی اور شفیع نہیں ہے۔ (سجدہ - ۴)

اور

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ

کہئے کہ تمام شفاعتیں اللہ کے لئے مخصوص ہیں۔ (زمر - ۴۴)

ج۔ وہ آیات جو شفاعت کو اذن وفرمانِ خدا کے ساتھ مشروط قرار دیتی ہیں۔ مثلاً

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

کون ہے جو خدا کے حضور اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔ (بقرہ - ۲۵۵)

اور

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ

اس کی بارگاہ میں کسی کو شفاعت سے فائدہ نہیں پہنچے گا مگر اسے جس کے لئے اجازت دی جائے گی۔
(سبا - ۲۳)

د۔ وہ آیات ہیں جن میں اس شخص کے لئے شرائط بیان کی گئی ہیں جس کی شفاعت کی جانا ہے۔ بعض اوقات رضا وخوشنودی خدا کو شرط قرار دیا گیا ہے:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ۔ (انبیاء - ۲۸)

اس آیت کے مطابق شفاعت کرنے والے صرف ان کی شفاعت کر سکتے ہیں جو مقام ارتضٰی کے حامل ہوں۔ یعنی درگاہِ خداوندی میں قبولیت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہوں۔

کبھی خدا کے ہاں عہد وپیمان کو شرط قرار دیا گیا ہے (یعنی توحید پر ایمان اور انبیاء کو صحیح طور پر پہچاننا)، مثلاً

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۘ (مریم - ۸۷)

بعض اوقات شفاعت کے حصول کی صلاحیت کو بعض مجرمین سے سلب کر لینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً ذیل کی



آیت میں ظالمین سے شفاعت سلب کئے جانے کا اعلان ہے :

مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ؕ (مومن ۱۸)

اس لحاظ سے عہد و پیمانِ الٰہی کا حامل ہونا یعنی ایمان اور مقام خوشنودی خدا تک پہنچنا، اس کے نزدیک قابل قبول ہونا اور گناہوں مثلاً ظلم و ستم سے بچنا یہ شفاعت کی حتمی شرائط ہیں۔

(۱۷) **شرائط شفاعت:** خلاصہ یہ ہے کہ آیاتِ شفاعت وضاحت سے نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام کی نظر میں مسئلہ شفاعت کوئی بے ضابطہ اور بلا شرط موضوع نہیں ہے بلکہ اس کی قیود و شرائط ہیں ایک طرف یہ اس جرم کے لحاظ سے ہیں جس کے بارے میں شفاعت ہوتی ہے اور دوسری طرف اس شخص کے بارے میں ہیں جس کی شفاعت کی جاتی ہے۔ تیسری طرف اس شخص کے بارے میں شرائط ہیں جس نے شفاعت کرنی ہے یہ سب چیزیں مل کر شفاعت کے اصلی رُخ اور اس کے فلسفے کو واضح کرتی ہیں۔ مثلاً ظلم و ستم جیسے گناہ شفاعت کے دائرے سے بالکل خارج کر دیے گئے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ظالموں کے لئے کوئی شفیع مطاع نہیں ہے۔ اب اگر ظلم کی اس کے وسیع معنی کے لحاظ سے تفسیر کی جائے تو پھر شفاعت صرف ان مجرمین کے لئے منحصر ہوگی جو اپنے جرم پر نادم و پشیمان ہوں اور اس کے ازالے اور اصلاح کی راہ پر گامزن ہوں جیسا کہ بعد میں بعض احادیث کے حوالے سے بیان ہوگا۔ اس صورت میں شفاعت توبہ اور گناہ پر ندامت کے عمل میں ایک مددگار کا کردار ادا کرے گی (اور یہ جو بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ ندامت اور توبہ کے ہوتے ہوئے شفاعت کی ضرورت نہیں یہ ان کا اشتباہ ہے جس کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے)۔

ایک طرف سورہ انبیاء، آیہ ۲۸ کے مطابق صرف وہ لوگ شفاعت کے ذریعے بخشے جائیں گے جو مقام ارتضیٰ تک پہنچے ہوں گے اور دوسری طرف سورہ مریم آیہ ۸۷ کے مطابق جو عہد الٰہی کے حامل ہوں گے۔

یہ دو عناوین جیسا کہ ان کے لغوی مفہوم سے اجمالاً اور اس سے کی روایات سے تفصیلاً ظاہر ہوتا ہے یہ معنی رکھتے ہیں، کہ انسان کا خدا، حساب و میزان اور سزا و عذاب پر ایمان ہو، نیک اعمال کو اچھا اور بُرے اعمال کو بُرا جانتا ہو اور تمام کے درست یعنی منزل من اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہو اگر ایسا ایمان انسان کی فکر و نظر اور زندگی سے ظاہر ہوتا ہو جس کی نشانی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ان ظالمین اور سرکش لوگوں سے ممتاز کرے جو اسلام کی کسی مقدس اصل پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے پروگراموں پر تجدید نظر کرے تو پھر وہ شفاعت کا اہل ہوتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۶۴ میں شفاعت کے زیر سایہ گناہوں کی بخشش کے بارے میں یوں ارشاد ہے :

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ؕ

اور اگر وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بارگاہِ الٰہی میں توبہ و استغفار کرتے اور پھر ہمارا رسول بھی ان کے لئے عفو و درگزر کی سفارش کرتا تو وہ دیکھتے کہ اللہ توبہ قبول کرکے رحم فرمانے والا ہے۔



اس آیت میں خود مجرمین کی توبہ و استغفار کو پیغمبرؐ کی طرف سے مغفرت کی سفارش کا مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔

سورہ یوسف کی آیت ۹۷ اور ۹۸ میں ہے:

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۝ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

انہوں نے اپنے باپ کی خدمت میں عرض کی کہ اللہ کے حضور ہماری مغفرت کی دعا کریں اور ہم اپنے خطاکار ہونے کے معترف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں جلد ہی اپنے پروردگار سے تمہاری مغفرت طلب کروں گا بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ برادرانِ یوسف نے باپ سے سفارش کے تقاضے سے قبل گناہ پر ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا۔

سورہ مومن، آیہ ۷، فرشتوں کی شفاعت کے بارے میں ہے کہ ان کی استغفار اور شفاعت صرف باایمان، راہِ خدا کے پیرو کار اور حق کی اتباع کرنے والے لوگوں کے لئے ہے:

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝

اب پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ توبہ کرنے، سبیل الٰہی کی اتباع کرنے اور اس راہ پر قدم رکھنے کے باوجود شفاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب ہم حقیقتِ شفاعت کی بحث میں دیں گے۔

شفاعت کرنے والوں کے لئے بھی اس شرط کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حق کے گواہ ہونے چاہئیں:

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (زخرف - ۸۶)

اس لحاظ سے ضروری ہے کہ جن کی شفاعت ہونا ہے وہ شفاعت کرنے والے سے ربط اور تعلق برقرار رکھیں اور وہ ربط ہے قول و فعل سے حق کی طرف متوجہ ہونا جو خود اصلاً اور راہِ حق میں تمام صلاحیتیں صرف کرنے کے لئے ایک عامل ہے۔

(۷) احادیثِ اسلامی اور شفاعت: روایاتِ اسلامی میں شفاعت کے سلسلے میں بہت سے تعبیرات موجود ہیں جو مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی کے مفہوم کی تکمیل کرتی ہیں اور بعض اوقات بہت صریح ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ تفسیر برہان میں امام کاظمؑ کے واسطے سے حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرمؐ سے سنا:

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی

میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے ہے۔

ابن عمیر جو راوی حدیث ہے کہتا ہے:

میں نے امام کاظمؑ سے پوچھا کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کی شفاعت کیسے ممکن ہے حالانکہ خداوند عالم فرماتا ہے "ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ" مسلم ہے کہ جو شخص کبائر کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ



ارتضیٰ اور خوشنودیٔ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

جو با ایمان شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ طبعاً پشیمان ہوتا ہے اور نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ گناہ سے پشیمانی توبہ ہے اور جو شخص پشیمان نہ ہو وہ حقیقی مومن نہیں ہے اور اس کے لئے شفاعت بھی نہیں ہے اور ایک گناہ ایک ظلم ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: ظالموں کے لئے دوست اور شفاعت کرنے والے نہیں ہیں[1]

صدر حدیث کا مضمون یہ ہے کہ شفاعت کبائر کے مرتکب لوگوں کے لئے ہے لیکن حدیث کا ذیل یہ واضح کرتا ہے کہ شفاعت کے قبول ہونے کی اصلی شرط یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس میں ایسا ایمان ہو جو مجرم کو ندامت، خود سازی، ازالۂ گناہ اور اصلاح کے مرحلے تک پہنچا دے اور ظلم، طغیان اور قانون شکنی سے اپنے آپ کو نکال لے اور اس کے بغیر شفاعت ممکن ہی نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

ب۔ کتاب کافی میں امام صادقؑ سے اس خط میں جو آپ نے متعدد المآل کی صورت میں اپنے اصحاب کو لکھا تھا منقول ہے:

من سرہ ان ینفعہ شفاعۃ الشافعین عند اللّٰہ فلیطلب الی اللّٰہ ان یرضی عنہ[2]

اس روایت کا لب و لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اشتباہات کے ازالے کے لئے ہے جو شفاعت کے سلسلے میں حضرت صادقؑ کے بعض اصحاب کو خصوصاً اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو عموماً ہو گئے تھے۔ اس میں صراحت کے ساتھ گناہ کا شوق دلانے والی شفاعتوں کی نفی کی گئی ہے۔ روایت کے مطابق "جو شخص پسند کرتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو اسے چاہیئے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرے"

ج۔ ایک اور ہم معنی حدیث حضرت صادقؑ سے یوں مروی ہے:

اذا کان یوم القیامۃ بعث اللّٰہ العالم والعابد فاذا وقفا بین یدی اللّٰہ عزوجل قیل للعابد انطلق الی الجنۃ وقیل للعالم قف تشفع للناس بحسن تادیبک لھم۔

قیامت کے دن خدا تعالیٰ عالم اور عابد کو قبر سے اٹھائے گا۔ عابد سے کہے گا اکیلے بہشت میں چلے جاؤ لیکن عالم سے کہے گا جن لوگوں کی اچھی تربیت کی ہے ان کی شفاعت کرو[3]

اس حدیث میں عالم نے جو ادب و اخلاق کی تعلیم دی ہے اور اس کے شاگرد جنہوں نے اس سے سبق حاصل کیا ہے کی

---

[1] تفسیر برہان، ج ۳، ص ۵۳
[2] نقل از بحار، ج ۳، ص ۳۰۴ (قدیم اشاعت)
[3] بحار، ج ۳، ص ۳۰۵ بحوالہ اختصاص مفید



شفاعت کے درمیان ایک ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ اس سے اس بحث کے تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

علاوہ ازیں شفاعت کا عالم سے مخصوص ہونا اور عابد سے اس کی نفی اس بات کی نشاندہی ہے کہ منطق اسلام کی رُو سے شفاعت کسی عہد و پیمان اور پارٹی بازی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکتبِ تربیت ہے اور اس جہان میں تربیت کی تصویر کشی ہے۔

(۷) شفاعت کی معنوی تاثیر: اس مقام پر شفاعت سے متعلق جو روایات ہم نے بیان کی ہیں وہ اس سلسلے کی روایات کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے جنہیں ہم نے اپنی بحث کی مناسبت سے انتخاب کیا ہے ورنہ شفاعت سے متعلق روایات تو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

نووی شافعی[1] شارح صحیح مسلم میں قاضی عیاض جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ شفاعت متواترات میں سے ہے[2]

یہاں تک کہ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) اور محمد بن عبد الوہاب (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے پیرو جو اس سلسلے میں سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور بہت متعصب ہیں ان روایات کے تواتر کے معترف ہیں۔

کتاب "فتح المجید" شیخ عبد الرحمٰن بن حسن کی تالیف ہے وہابیوں کی ایک مشہور کتاب ہے اور اب بھی حجاز کے بہت سے دینی مدارس میں درسی کتب کی حیثیت سے موجود ہے، اس میں ابن قیم سے اس طرح منقول ہے:

> شفاعتِ مجرمین کے بارے میں نبی اکرمؐ سے احادیث متواتر ہیں۔ آپ کے اصحاب اور اہل سنت کا عموماً اس پر اجماع ہے اور وہ اس کے منکر کو بدعتی سمجھتے ہیں اس پر تنقید کرتے ہیں اور اسے گمراہ شمار کرتے ہیں[3]

اس سے قبل کہ اب ہم شفاعت کے اجتماعی اور روحانی اثرات پر بحث کریں اور چار رس اعتراضات کو فلسفۂ شفاعت کی روشنی میں حل کریں خدا پرستوں اور معتقدین شفاعت کی منطق کی نظر سے اس کے معنوی آثار دیکھتے ہیں کیونکہ یہ نظر اس مسئلے کے اجتماعی اور معنوی عکس العمل کے سلسلے میں آئندہ آنے والی بحث کو زیادہ واضح کر دیتی ہے[4]

عقائد اسلامی کے علماء کے درمیان شفاعت کی تاثیرِ معنوی کے سلسلے میں بحث کچھ یوں ہے:

ایک گروہ "وعیدیہ" کے نام سے مشہور ہے (جن کا عقیدہ ہے کہ گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد ہمیشہ جہنم میں رہیں گے)۔

ان کا اعتقاد ہے کہ گناہ کے آثار کو کم کرتے میں شفاعت اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کی تاثیر پیش رفت، تکاملِ معنوی اور جزا و ثواب کی زیادتی ہے۔

---

[1] ان کا نام یحییٰ بن شرف ہے۔ سات سو ہجری کے علماء میں سے ہیں چونکہ نویٰ شہر جو دمشق کے پاس ہے میں پیدا ہوئے اس لئے نووی مشہور ہوئے۔

[2] بحار، ج ۳، ص ۳۰۵

[3] فتح المجید ص ۲۱۱

[4] توجہ رہے کہ یہاں پر ہم خاص طور پر علماء عقائد کی منطق سے بحث کر رہے ہیں۔



تفضیلیہ (جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والے لوگ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے) معتقد ہیں کہ شفاعت گناہگاروں کے لئے ہے اور اس کے نتیجے میں سزا اور عذاب ختم ہو جاتا ہے۔

نہایت مشہور محقق نصیرالدین طوسی کتاب تجرید الاعتقادات میں دونوں کو برحق سمجھتے ہیں اور وہ دونوں آثار کے معتقد ہیں۔ علامہ حلی بھی محقق طوسی کی عبارت کی شرح میں کتاب کشف المراد میں اس عقیدے کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے شواہد پیش کرتے ہیں۔

شفاعت کے معنی اصل لغت کے اعتبار سے بیان کئے گئے ہیں اور اسی طرح شفاعت تکوینی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب کسی تردید و شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ محقق طوسی کا عقیدہ حقیقت و واقعیت سے نزدیک ہے۔

کیونکہ ایک طرف ـــــ امام صادقؑ سے منقول مشہور روایت ہے:

مامن احد من الاولین والاخرین الا هو محتاج الی شفاعة محمد یوم القیامة۔[1]

اولین و آخرین میں کوئی بھی نہیں جو آنحضرتؐ کی شفاعت کا محتاج نہ ہو۔

اس حدیث کی رُو سے تو وہ اشخاص بھی جو گناہ سے توبہ کر چکے ہیں اور ان کا جرم بخشا گیا ہے، شفاعت کے محتاج ہیں اور یہ ایسی صورت میں ممکن ہے جب شفاعت کی تاثیر ہر دو پہلوؤں کے لئے ہو اور مقام و مرتبے کی بلندی کے لئے بھی کارآمد ہو۔ لہٰذا اگر بعض روایات میں ہے کہ نیک لوگوں کو شفاعت کی ضرورت نہیں تو اس سے مقصود ویسی شفاعت کی نفی ہے جو مجرمین اور گناہ گاروں کے لئے ہے۔

دوسری طرف ـــــ ہم کہہ چکے ہیں کہ شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ قوی تر موجود ضعیف تر موجود کی مدد کے لئے اس سے مربوط و منضم ہو جائے۔ ممکن ہے یہ مدد نقاط قوت کی زیادتی یا نقاط ضعف کی کمی کے لئے ہو۔

جیسا کہ شفاعت تکوینی اور وہ موجودات جو سیر تکامل و پرورش میں ہیں ان میں یہ دو جنبے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض اوقات پست تر موجودات کو قوی تر موجودات کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ عوامل تخریب کو دور کریں۔ (جیسے گھاس کو آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کی آفات و بلیات دور کرے) اور کبھی ان کی ضرورت قوت کی زیادتی اور پیش رفت کے لئے ہوتی ہے (جیسے گھاس کو رشد و نمو کے لئے بھی سورج کی روشنی درکار ہوتی ہے) اسی طرح درس پڑھنے والا شاگرد اپنے اشتباہات کی اصلاح کے لئے بھی استاد کی احتیاج رکھتا ہے اور اپنی معلومات بڑھانے کے لئے بھی۔ لہٰذا مختلف دلائل کے پیش نظر شفاعت دونوں قسم کے آثار رکھتی ہے اور صرف گناہ و جرم کے آثار کم کرنے میں منحصر نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے والوں کو شفاعت کی ضرورت کیوں ہے جب کہ مسلم مذہبی عقائد کے مطابق گناہ سے ندامت اور توبہ تنہا گناہ کی بخشش کا موجب ہے۔

اس موضوع کی دو دلیلیں ہیں:

---

[1] بحار اور دیگر کتب۔



۱۔ توبہ کرنے والے بھی معنوی مقامات کی بلندی، پرورش، تکامل اور ارتقاء کے لئے شفاعت کے محتاج ہیں۔

۲۔ بہت سے علماء کو ایک بہت بڑا اشتباہ تاثیر توبہ کے مسئلے میں پیش آتا ہے جو ایسے اشکالات کا سبب بنتا ہے وہ یہ کہ ان کا تصور یہ ہے کہ توبہ، ندامت اور گناہ سے پشیمانی، انسان کو گناہ سے قبل والی حالت کی طرف پلٹا دیتی ہے حالانکہ ہم اپنے مقام پر کہہ چکے ہیں کہ کئے ہوئے گناہ پر ندامت اور آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا عزم صمیم، توبہ کا صرف پہلا مرحلہ ہے اور وہ بالکل اس دوا کی طرح ہے جو بیماری ختم کر دیتی ہے۔ واضح ہے کہ بخار دور ہو جانے اور بیماری کے جڑ سے ختم ہو جانے سے اگرچہ بیمار اچھا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ایک عام آدمی کی حالت میں ہرگز نہیں آتا بلکہ اسے اپنے جسم کو پھر سے توانا بنانے کے لئے ایک مدت تک کوشش درکار ہے۔ پھر کہیں وہ بیماری سے پہلے والی حالت پر پہنچ پائے گا۔

بہ الفاظ دیگر توبہ کے کئی مرحلے ہیں گناہ پر نادم ہونا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا یہ تو صرف پہلا مرحلہ ہے۔ اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ توبہ کرنے والا ہر لحاظ سے گناہ سے پہلے کی روحانی حالت میں لوٹ آئے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور ان سے ربط و تعلق اثر بخش ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے زندہ شاہد استغفار سے متعلق وہی آیات ہیں جن کی ہم پہلے ہی نشاندہی کر چکے ہیں کہ مجرم کی توبہ کے علاوہ پیامبر کی استغفار بھی قبولیت توبہ کی شرط قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح برادران یوسفؑ کی توبہ کے ضمن میں حضرت یعقوبؑ کا ان کے لئے استغفار کرنا۔ سب سے واضح تو ملائکہ کا ان لوگوں کے لئے استغفار کرنا ہے جو صالح اور مصلح ہیں اور توبہ کرنے میں جن کے متعلق آیات پیش کی جا چکی ہیں۔

(۷) **فلسفۂ شفاعت:** مدارک شفاعت اور شفاعت کے سلسلے کی بحث سے ہم پر اس کا مفہوم واضح ہو چکا ہے۔ اب اس کے اجتماعی اور نفسیاتی فلسفوں کا سمجھنا مشکل نہیں رہا۔

شفاعت کی حقیقت کی طرف مکمل توجہ سے اس کے معتقدین پر مندرجہ ذیل اثرات کے مرتب ہونے کا امکان ہے۔

۱۔ **مایوسی کی روح سے مقابلہ:** جو لوگ سخت جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں وہ ایک طرف تو وجدانی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسری طرف درگاہ خدا سے بخشش سے مایوس ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ گناہوں کی زندگی سے واپسی کا راستہ نہیں پاتے لہٰذا عملی طور پر کسی تجدید نظر کے لئے تیار نہیں ہوتے اور مستقبل کے افق کی تیرگی کو دیکھ کر وہ طغیان و سرکشی میں زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ اس طرح اسی عملی زندگی کے عنوان سے مقررات الٰہی کے بے سود ہونے کے قائل ہو جاتے ہیں بالکل اس بیمار کی طرح جو تندرستی سے مایوس ہو کر ہر چیز کی بندشوں سے بے پرواہ ہو جائے چونکہ اب وہ اسے بے دلیل اور بے اثر سمجھتا ہے۔

بعض اوقات وجدانی درد و تکلیف جو ایسے جرائم سے پیدا ہوتی ہے نفسیاتی خلل یا معاشرے سے دوری کی تحریک کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ اسی معاشرے نے اسے اس طرح آلودہ کیا ہے۔ اس طرح گناہ گار ایک خطرناک عنصر میں تبدیل ہو کر معاشرے کے لئے دکھ اور تکلیف کا مرکز بن جاتا ہے۔

ایسے عالم میں شفاعت پر ایمان اس کے سامنے روشنی کا ایک دریچہ کھول دیتا ہے اور بخشے جانے کی امید دلا کر اسے اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ تجدید نظر اور گذشتہ کردار کے ازالے اور اصلاح کے لئے اسے شوق دلاتا ہے اس طرح معاشرے سے



قطع تعلق کی تحریک پیدا نہیں ہوتی اور نفسیاتی اطمینان اسے ایک سالم اور صالح عنصر میں تبدیل ہونے کا امکان مہیا کرتا ہے۔

اس بناء پر اگر ہم یہ کہیں کہ صحیح معنی والی شفاعت کی طرف توجہ ایک اصلاح کنندہ عامل ہے اور برائی سے رکنے کا سبب ہے اور ایک مجرم و گناہگار فرد کو صالح بنا دیتا ہے تو یہ فضول بات نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عمر قید کے قیدیوں کے لئے بھی سفارش اور بخشش کا دریچہ دنیا کے مختلف قوانین میں کھلا ہے تاکہ کہیں یاس و ناامیدی انہیں قید خانوں میں کسی خطرناک اقدام کی طرف نہ لے جائے یا نفسیاتی خلل میں مبتلا نہ کرے۔

۲۔ **شفاعت کی شرائط تعمیری اور اصلاح کنندہ ہیں:** اس طرف متوجہ رہتے ہوئے کہ شفاعت اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے کئی پہلوؤں سے متعدد قیود و شرائط کی حامل ہے، جو لوگ اس اصل و بنیاد کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ مجبور ہیں کہ ان شرائط پر عملدرآمد کریں اور ظلم جیسے گناہوں سے جن کی وجہ شفاعت کی امید ختم ہو جاتی ہے پرہیز کریں اور اپنے پروگرام کو تبدیل کرکے اور جا بجا تر بنا کر شروع کریں۔ ایسے لوگ مقام ارتضیٰ تک رسائی اور عہد الٰہی کی پاسداری کے لئے (جس کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے) اپنے گناہوں سے باقاعدہ توبہ کرتے ہیں یا کم از کم توبہ کی منزل پر قیام کرتے ہوئے غلط کاری اور قوانین الٰہی کی بندشوں کو توڑنے سے باز رہتے ہیں یا کم از کم ایسے افعال میں کمی کر دیتے ہیں اور اپنے اندر خدا اور بڑی عدالت پر ایمان کو زندہ رکھتے ہیں اور اس کے قوانین اور مقررات کا احترام کرتے ہیں۔

ایسے افراد اپنے اور شفاعت کرنے والے کے درمیان اپنے رشتے اور تعلق کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک قسم کا رابطہ چاہے کمزور ہی کیوں نہ ہو اپنے اور ان کے درمیان برقرار رکھتے ہیں یعنی جس طرح شفاعت تکوینی میں تاثیر کامل کے لئے آمادگی، ربط اور تسلیم ضروری ہیں شفاعت تشریعی میں نتیجے تک پہنچنے کیلئے بھی اس قسم کی آمادگی اور تیاری ضروری ہے (غور کیجئے گا)۔

اس طرح کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ شفاعت اپنے صحیح مفہوم کے اعتبار سے مجرمین کے حالات کی تبدیلی اور اصلاح کے لئے نقش مؤثر ہے۔

(iii v) **اعتراضات کے جوابات:** جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عرف عام کی شفاعت اور منطق اسلام کی شفاعت میں بہت فرق ہے ایک کی بنیاد اس کی فکر کو تبدیل کرنا ہے جس کے پاس شفاعت ہوتی ہے اور دوسری کی بنیاد اس شخص میں گوناگوں تبدیلیاں پیدا کرتا ہیں جس کی شفاعت ہو رہی ہے۔

واضح ہے کہ پہلے معنی والی شفاعت تمام تر اعتراضات کا موجب ہے۔ اسی سے سعی و طلب کی روح مضمحل ہوتی ہے اور یہی گناہ کی طرف رغبت کا باعث بنتی ہے اور پسماندہ اور طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کی انعکاسی کرتی ہے نیز ایک قسم کے شرک یا انحراف کا سبب قرار پاتی ہے کیونکہ اگر ہمارا اعتقاد ہو کہ خدا کے علم میں تغیر آسکتا ہے اور جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس کی کسی ایسی بات کو خدا کے سامنے واضح کیا جا سکتا ہے جسے وہ نہیں جانتا اور اس کے علاوہ کوئی اور ایسا مبداء ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے وسیلے سے خدا کے غضب کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے یا اس کی محبت کو اس کے ذریعے اپنی طرف جذب کیا جا سکتا ہے یا پھر یہ اعتقاد رکھیں کہ خدا کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے بعض بندوں کے مقام و اہمیت کا محتاج ہو اور اس احتیاج کی



وجہ سے کسی مجرم کے بارے میں اُن کی شفاعت قبول کرے یا پھر ہمارا اعتقاد ہو کہ ممکن ہے وہ وسائط کے اثر و رسوخ سے ڈر جائے اور ان کی شفاعت قبول کرے تو یہ تمام امور ہمیں اصل توحید اور صفات خدا سے دور کر دیتے ہیں اور شرک و بت پرستی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔ یہ سب عرف عام والی شفاعت کی خصوصیات ہیں جو دراصل اس کے غلط معانی ہیں۔

مگر صحیح شفاعت کہ جس میں وہ شرائط، کوائف اور خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس میں ان عیوب میں سے کسی کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے وہ شفاعت گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی بلکہ ترکِ گناہ کا وسیلہ ہے۔ وہ سستی اور کاہلی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ روح امید پیدا کر کے انسانی قویٰ کو گذشتہ غلطیوں اور خطاؤں کی تلافی کے لئے مجتمع کر دیتی ہے۔ وہ گذشتہ کردار سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھنے دیتی بلکہ مجرموں، گناہگاروں اور زیادتی کرنے والوں کی اصلاح کا ایک مؤثر تربیتی وسیلہ ہے۔ و صرف یہ کہ ایسی شفاعت شرک نہیں ہے بلکہ عین توحید ہے اور خدا کی طرف اور اس کی صفات کی طرف توجہ کا باعث ہے کیونکہ یہ دراصل اُس کے اذن اور فرمان سے مدد طلب کرنا ہے (پھر بھی غور کیجئے گا)۔

شفاعت اور مسئلہ توحید

مسئلہ شفاعت کی غلط تفسیروں کی وجہ سے دو گروہ اس کی مخالفت میں نمایاں ہوئے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے متضاد رُخ پر ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو مادیین جیسی فکر رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک مسئلہ شفاعت پردہ پوشی کا حامل ہے اور طلب و سعی کو ختم کر دیتا ہے۔ ان کا جواب تفصیل سے گزر چکا ہے۔

دوسرا گروہ افراط کے شکار کوتاہ نظر مذہبی لوگوں کا ہے (جیسے وہابی حضرات) اور ان کے کچھ اور ہم فکر لوگ بھی ہیں۔ یہ لوگ شفاعت کے اعتقاد کو ایک قسم کا شرک اور آئینِ توحید سے انحراف سمجھتے ہیں۔ باوجودیکہ اس اشکال کو پیش کرنا موضوع بحث سے خارج ہے (اور اس سے مذہبی اشتعال کا اندیشہ ہو سکتا ہے) تاہم اس بحث کی تکمیل کے لئے ہم یہاں اس کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں۔

پہلے اس موضوع کی طرف توجہ ضروری ہے کہ وہابی حضرات جنہوں نے آخری دو صدیوں میں محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان کی رہبری میں سرزمین حجاز کو اپنے افکار کے زیر تسلط کر لیا ہے وہ اپنے تند و تیز عقائد میں جو زیادہ تر توحید کے سلسلے میں ہیں نہ صرف یہ کہ شیعوں کے مخالف ہیں بلکہ اکثر اہل تسنن مسلمانوں کے بھی سخت مخالف ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب نے اپنے نظریات ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم دمشقی متوفی ۷۲۸ھ، جو اس سے تقریباً چار سو سال قبل ہو گزرا ہے) سے لئے ہیں۔ وہ حقیقت میں ابن تیمیہ کے افکار و عقائد کا اجرا کرنے والا تھا۔

محمد بن عبدالوہاب ۱۱۶۰ سے اپنے سن وفات ۱۲۰۶ تک وہاں کے حاکموں کا ساتھ دیتے ہوئے حجاز کے بدوؤں اور بیابانوں میں گھومنے والی اقوام میں سخت تعصب کی آگ بھڑکاتا رہا۔ توحید کے دفاع اور شرک کے مقابلے کے نام پر اپنے مخالفین کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا اور اس طرح کاروبارِ حکومت اور سیاسی قیادت پر الٹے سیدھے طریقے سے تسلط جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں حجاز اور حجاز سے باہر بہت سے مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔



محمد بن عبدالوہاب کے مریدوں کی کشمکش علاقۂ حجاز تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ۱۲۱۶ھ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے انتقال کے دس سال بعد اس کے مرید اور پیروکار حجاز کے بیابانوں کے راستے نکلے اور بے خبری میں اچانک کربلا پر حملہ کر دیا۔ عیدِ غدیر کی مناسبت سے شہر میں چھٹی تھی اور کربلا کے اکثر لوگ عید غدیر کے سلسلے میں نجف اشرف گئے ہوئے تھے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شہر کی دیوار توڑ دی اور شہر میں لوٹ مار مچادی۔ حرم امام حسینؑ اور دوسرے مقدس اسلامی مقامات کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان مقامات سے تمام ہیرے جواہرات، منقش پردے، نفیس برتن اور زینت کی دوسری چیزیں (لشکر یزید کی اتباع میں) لوٹ کر لے گئے، پچاس مسلمان ضریح کے قریب، پانچ سو صحن میں اور کثیر تعداد میں شہر کے دیگر مقامات پر شہید کر دیے جب کہ بعض لوگ اس موقع پر شہدائے کربلا کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ بیان کرتے ہیں بہت سے گھروں میں غارت گری کی گئی۔ یہاں تک کہ بوڑھے بچے اور عورتیں بھی اس ظلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔

۱۳۴۴ میں فقہائے مدینہ جو کاروبارِ حکومت میں دخل رکھتے تھے فتویٰ دیا کہ حجاز میں تمام بزرگان دین کی قبریں مسمار کر دی جائیں اور آٹھ شوال کو (متوکل عباسی کی پیروی میں) یہ حکم نافذ کر دیا گیا۔ قبرِ رسولؐ تو تمام مسلمانوں کی ناراضگی کے خوف سے محفوظ رہ گئی۔

خلاصہ یہ کہ اس مذہب کے پیروکار خود محمد بن عبدالوہاب کی طرح سخت مزاج، رحمدلی سے عاری، خودسر، لکیر کے فقیر اور متعصب ہیں۔ عقل و منطق کی بجائے شدت و سختی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ وہ تمام اسلام چند ایک مسائل کے لئے مقابلہ اور جنگ کرنا ہی سمجھتے ہیں، مثلاً شفاعت، زیارت اور توسل۔ عملی طور پر اسلام کے اہم اجتماعی اور معاشرتی مسائل خصوصاً جن کا تعلق عدالتِ اجتماعی اور سامراجی آثار کو ختم کرنے اور مادہ پرستی اور مذاہبِ الحادی کے عقل و منطق کیساتھ مقابلے سے لوگوں کو دور رکھے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری دائرہ کار میں ان مسائل کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی اور دورِ حاضر کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ایک وحشت ناک جہالت اور لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بہرحال یہ لوگ مسئلہ شفاعت کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ رسول اسلام سے شفاعت طلب کرے۔ مثلاً وہ کہے یا محمد اشفع لی عند اللہ (اے محمدؐ! اللہ کے ہاں میری شفاعت کیجئے) کیونکہ خدا کہتا ہے "و ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً" (جن۔۱۸)

رسالہ کشف الشبہات، تالیف محمد بن عبدالوہاب میں یوں ہے:

اگر کوئی کہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا نے پیغمبر کو مقامِ شفاعت بخشا ہے اور آپ خدا کے اذن و فرمان سے شفاعت کر سکتے ہیں تو کیا حرج ہے کہ جو کچھ خدا نے انہیں بخشا ہے ہم اس کا تقاضا کریں۔

تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ درست ہے کہ خدا نے انہیں مقامِ شفاعت عطا کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے نہی کی ہے کہ ہم ان سے شفاعت طلب کریں۔ خدا نے کہا ہے "فلا تدعوا مع اللہ احداً" (اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو)۔



علاوہ ازیں مقام شفاعت نبی کریم سے مخصوص نہیں ہے فرشتے اور دوستانِ خدا بھی اس مقام کے حامل ہیں تو کیا ہم ان سے بھی شفاعت طلب کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی اس طرح کہے تو اس نے خدا کے صالح بندوں کی پرستش وعبادت کی ہے [1]

یہی صاحب رسالہ "اربع قواعد" میں گفتگو کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے [2]

شرک سے نجات صرف چار قواعد جاننے سے ممکن ہے:

(i) وہ کفار جن سے نبی اکرم برسرپیکار تھے یہ اقرار کرتے تھے کہ خدا ہی خالق ورازق اور وہی جہان ہستی کی تدبیر کرنے والا ہے۔ "قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ..... وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ" یعنی ان سے پوچھو کہ آسمان وزمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے اور کون تدبیر امر کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں اللہ۔ (یونس۔ ۳۱)

لیکن یہ اقرار انہیں ہرگز مسلمانوں کے زمرے میں داخل نہ کر سکا۔

(ii) وہ کہتے تھے بتوں کی طرف ہماری توجہ اور ان کی عبادت صرف قرب خدا اور شفاعت کے لئے ہے "و یقولون هولاء شفعاؤنا عند الله" یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔

(iii) پیغمبرؐ نے ان تمام لوگوں کی، جو غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں نفی کر دی اور ان کے خلاف حکم دیا چاہے وہ فرشتوں، انبیاء اور صالحین کی عبادت کرتے تھے یا درختوں، پتھروں، سورج اور چاند کی۔ آپؐ ان کے درمیان کسی قسم کے فرق کے قائل نہ تھے۔

(iv) ہمارے زمانے کے مشرکین زمانۂ جاہلیت کے مشرکوں سے بدتر ہیں کیونکہ وہ اطمینان وراحت کے وقت بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن تنگی وسختی میں وہ صرف خدا کو پکارتے تھے جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ

(لہٰذا جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالصتاً خدا ہی کو پکارتے ہیں ....) (عنکبوت۔ ۶۵)

لیکن ہمارے زمانے کے مشرکین راحت واطمینان اور تنگی وسختی دونوں میں غیر خدا سے متوسل ہوتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ باقی تمام مسلمانوں کو جو ان کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں مشرک قرار دیتے ہیں وہ سنی ہوں یا شیعہ۔ یہ لوگ اس قدر جبر اور جسارت کے عادی ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کا خون اور مال اپنے لئے مباح اور حلال سمجھتے ہیں انہیں قتل کرنا بغیر چون وچرا کے جائز سمجھتے ہیں جیسے پیدائش وہابیت سے اب تک انہوں نے بارہا اس کا عملی مظاہرہ کر دکھایا ہے۔

شیخ سلیمان بن لحان کتاب "الهدية السنية" میں کہتا ہے:

---

[1] البراہین الجلیہ ص۱ بحوالہ کشف الشبہات۔

[2] کشف الارتیاب، ص۱۶۳ بحوالہ اربع قواعد ص۲۴ تا ص۲۵



جو شخص فرشتوں، انبیاء یا مثلاً ابن عباس اور ابوطالب یا ان جیسے اشخاص کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دے کہ وہ خدا کی بارگاہ میں اس کی شفاعت کریں کیونکہ یہ لوگ مقرب بارگاہ خدا ہیں جیسے کہ (بعض مقربین) بادشاہوں کے پاس شفاعت کرتے ہیں تو ایسے لوگ کافر اور مشرک ہیں اور ان کا خون اور مال مباح ہے اگرچہ وہ یہ کہتے ہیں "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ" اگرچہ وہ نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔[1]

جو سختی، سرکشی اور ڈھٹائی اس گفتگو سے برس رہی ہے وہ کسی شخص پر مخفی نہیں۔

مسئلہ شفاعت کے بارے میں وہابیوں کی جو منطق ان کے مذہب کے بانی محمد بن عبدالوہاب کے اقوال کے حوالے سے پیش کی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ شفاعت کے طرفدار مسلمانوں کو مشرک قرار دیتے ہوئے دو چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔

۱۔ انبیاء اور صلحاء کی شفاعت پر یقین رکھنے والے مسلمانوں کا قیاس زمانۂ جاہلیت کے مشرکین پر کرتے ہیں۔

۲۔ قرآن نے غیر خدا کی عبادت و پرستش کی صریحاً نفی کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کا نام نہ لیں "فلا تدعوا مع اللہ احداً" (سورہ جن) اور یہ کہ تقاضائے شفاعت ایک قسم کی عبادت ہے۔

پہلی بات کے بارے میں کہنا چاہیے کہ اس قیاس میں وہ بہت بڑے اشتباہ کے مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ قرآن سے نیک اور صالح انبیاء و ملائکہ کے لئے مقام شفاعت ثابت ہے جیسا کہ گذشتہ بحثوں میں گذر چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسے اذن الٰہی پر موقوف قرار دیا ہے۔

یہ بات انتہائی غیر منطقی اور مضحکہ خیز ہے کہ ہم کہیں کہ خدا نے انہیں یہ مقام تو دیا ہے لیکن ہمیں منع کیا گیا ہے کہ اس حیثیت و مقام کو عمل میں لانے کا مطالبہ کریں چاہے وہ اذن خدا ہی سے کیوں نہ ہو۔

علاوہ ازیں قرآن میں برادران حضرت یوسفؑ کا باپ سے رجوع کرنا یا اسی طرح اصحاب پیغمبر کا رجوع اور آپؐ سے اپنے حق میں استغفار کا مطالبہ کرنا شمار کئے جا چکے ہیں۔

کیا پیغمبرؐ سے یہ تقاضا کرنا کہ "اشفع لنا عند اللہ" (اللہ کے حضور ہماری شفاعت کیجئے) شفاعت کے روشن و واضح مصادیق میں سے نہیں ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا تھا۔

یا ابانا استغفر لنا

(اے والد بزرگوار! ہمارے لئے مغفرت طلب کیجئے) (یوسف۔ ۹۷)

جس چیز کو قرآن صراحت سے جائز سمجھتا ہے یہ لوگ اسے کیونکر شرک شمار کرتے ہیں اور اس کے معتقد کو مشرک نیز اس کے خون اور مال کو مباح سمجھتے ہیں اگر یہ چیز شرک ہے تو حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کیوں منع نہیں کیا۔

---

[1] البراہین الجلیۃ صفحہ ۱۳ بحوالہ الہدایۃ السنیۃ صفحہ ۶۶



دوسری بات یہ ہے کہ بت پرستوں اور ان عدا پرستوں میں جو شفاعت باذن اللہ کا اعتقاد رکھتے ہیں کوئی شباہت موجود نہیں ہے کیونکہ بت پرست بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں شفیع قرار دیتے تھے جب کہ شفاعت کا عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں میں مسئلہ عبادت کا تعلق شفعاء سے بالکل نہیں بلکہ وہ فقط ان سے خدا کے دربار میں شفاعت کی درخواست کرتے ہیں۔ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے کہ شفاعت کی درخواست کا مسئلہ عبادت سے کوئی ربط نہیں۔

بت پرست خدائے یگانہ کی پرستش سے وحشت میں تھے اور کہتے تھے :

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

کیا اس نے کئی خداؤں کو ایک خدا قرار دیا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ (ص۔ ۵)

بت پرست عبادت کے لحاظ سے بتوں کو خدا کے برابر سمجھتے تھے :

تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

خدا کی قسم ہم واضح گمراہی میں تھے جب کہ تمہیں رب العالمین کے مساوی سمجھتے تھے (شعراء۔ ۹۷، ۹۸)

جیسے کہ تاریخ واضح گواہی دیتی ہے بت پرست اپنی خلقت اور تقدیر میں بتوں کے عمل دخل کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس عمل دخل کی مبدائیت کے قائل تھے جب کہ شفاعت کا اعتقاد رکھنے والے مسلمان یہ امور صرف خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور کسی موجود کے لئے بھی تاثیر میں استقلال کے قائل نہیں ہیں۔

اب مسلمانوں کو بت پرستوں جیسا قرار دینا بہت ہی ظالمانہ اور بعید از عقل و منطق کام ہے۔

باقی رہا دوسرا مطلب تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ "عبادت" کیا ہے۔ اگر عبادت کا مفہوم "ہر قسم کا خضوع و احترام کرنا" لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کسی قسم کا خشوع و احترام نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح اگر عبادت کی تفسیر "ہر قسم کی درخواست و تقاضا کرنا" کی جائے تو ہر شخص سے درخواست و سوال اور تقاضا کرنا شرک اور بت پرستی قرار پا جائے حالانکہ یہ بھی عقل اور دین کی واضح راہنمائی کے خلاف ہے۔

عبادت کی تفسیر "کسی کا تابع اور پیرو ہونا" بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اجتماعی معاملات اور امور میں لوگ اپنے سربراہ کی پیروی کرتے ہیں جو زندگی کی ابجد کا حصہ ہے۔ جیسے انبیاء اور بزرگ رہبروں کی پیروی کرنا کسی دیندار کی لازمی ذمہ داریوں میں شمار ہوتی ہے۔

لہٰذا عبادت کا مفہوم ان تمام امور سے الگ اور جدا ہے اور وہ آخری حد کا خضوع اور تواضع ہے جو مطلق تعلق اور وابستگی کے ساتھ بغیر کسی قید اور شرط کے تسلیم کے عنوان سے "عابد" کی طرف سے معبود کے سامنے انجام پذیر ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل "عبد" ہے اور اس کا مفہوم لفظ عبد (بندہ) کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ دراصل عبادت کرنے والا اپنی عبادت کے ساتھ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ معبود کے سامنے تسلیم محض کے لئے حاضر ہے اور اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سمجھتا ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جو عبادت سے عرف اور شرع میں مراد لیا گیا ہے۔ تو کیا شفعاء سے شفاعت کے سوال میں اس



مفہوم عبادت کا کوئی اثر موجود ہے ؟

باقی رہا دعا اور غیر خدا کو پکارنا، جس سے کئی ایک آیات میں روکا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی کو آواز دینے سے منع کیا گیا ہے اور کسی کو اس کے نام سے پکارنا "یا حسن"، "یا احمد" کہنا ممنوع ہے یا شرک ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کسی کو پکارنا اور اس سے اس کام کی انجام دہی کی درخواست کرنا جو اس کی قدرت و طاقت میں ہو گناہ اور شرک نہیں۔ کیونکہ تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرنا اجتماعی زندگی کا حصہ ہے۔ تمام انبیاء اور ائمہ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے (یہاں تک کہ خود وہابی بھی اسے ممنوع نہیں جانتے)۔

قابل اعتراض صورت ممکن ہے وہی ہو جس پر ابن تیمیہ نے رسالہ "زیارۃ القبور" میں اعتراض کیا ہے:

مطلوب العبد ان کان لا یقدر علیہ الا اللہ فسائلہ من المخلوق مشرک من جنس عباد الملائکۃ والتماثیل ومن اتخذ المسیح وامہ الٰھین مثل ان یقول لمخلوق حی او میت اغفر ذنبی او انصرنی علی عدوی او اشف مریضی ..... وان کان مما یقدر علیہ العبد فیجوز طلبہ منہ فی حال دون حال فان مسألۃ المخلوق قد تکون جائزۃ وقد تکون منہیا عنہا قال اللہ تعالٰی: فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب۔ واوصی النبی (ص) ابن عباس اذا سئلت فاسئل اللہ اذا استعنت فاستعن باللہ واوصی طائفۃ من اصحابہ ان لا یسئل الناس شیئاً وکان سوط احدھم یسقط من کفہ فلا یقول لاحد ناولنی ایاہ فھذا المنھی عنہا والجائزۃ طلب دعاء المومن لاخیہ[1]

بندے کی خواہش اگر ایسی ہے جس پر خدا کے علاوہ کوئی قدرت نہیں رکھتا تو ایسی حاجت کا مخلوق سے سوال کرنے والا مشرک ہے اور وہ ملائکہ، تماثیل، حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو خدا سمجھنے والوں میں سے ہے۔ مثلاً کسی زندہ یا مردہ مخلوق سے یہ کہنا کہ میرا گناہ بخش دو یا میرے دشمن کے خلاف میری مدد کرو.... اور اگر وہ حاجت ایسی ہے جس پر بندہ قدرت رکھتا ہے تو بعض اوقات اس سے طلب کرنا جائز ہوتا ہے اور بعض اوقات ناجائز کیونکہ مخلوق سے سوال کبھی جائز ہوتا ہے اور کبھی اس سے روکا گیا ہوتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: جب آپ فارغ ہو جائیں تو نصب کریں اور اپنے رب کی طرف ہی رغبت کریں۔ نبی اکرمؐ نے ابن عباس کو وصیت کی کہ جب تمہیں سوال کرنا ہو تو خدا سے سوال کرو یا جب اعانت طلب کرنی ہو تو خدا سے اعانت طلب کرو اور آپ نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو وصیت کی تھی کہ وہ لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہ کریں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کا کوڑا اس کے ہاتھ سے گر جاتا تو کسی سے نہ کہتا کہ مجھے اٹھا کر دے دو تو یہ منہی عنہ (وہ ہے جس سے روکا گیا) ہے اور جائز یہ ہے کہ ایک مومن اپنے مومن بھائی سے دعا

---

[1] کشف الارتیاب صفحہ ۲۴۹ بحوالہ زیارۃ القبور صفحہ ۱۵۲



کی خواہش کرے۔

اس بنا پر اگر واقعاً کوئی خدا کا کام غیر خدا سے چاہے اور اسے اس کی انجام دہی میں مستقل سمجھے تو وہ مشرک ہے لیکن اگر اس سے شفاعت چاہے جو اس بندے ہی کا کام ہے اور خدا نے اسے یہ حق دیا ہے تو اس میں کسی قسم کا کوئی شرک نہیں ہے بلکہ عین ایمان اور توحید ہے۔ آیت: فلاتدعوا مع اللہ احداً" میں لفظ "مع" بھی اس کی واضح گواہی دے رہا ہے کہ یہاں مقصود ہے کسی کو خدا کے ہم پلہ سمجھ کر مؤثر مستقل خیال کرنا۔

خلاصہ یہ کہ اس بحث پر اصرار و تاکید کا مقصد یہ ہے کہ مفہوم شفاعت میں تحریف اور اسے مسخ کرنا نہ صرف مذہب پر اعتراض کرنے والوں کو مذہب پر تنقید کا بہانہ فراہم کرتا ہے بلکہ دو عظیم مذہبی گروہوں میں تفرقہ اور اختلاف کا سبب بھی بنا ہوا ہے۔

۴۹۔ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ○

۴۹۔ ترجمہ

نیز یاد کرو اس وقت کو) جب تمہیں ہم نے فرعونیوں کے چنگل سے رہائی بخشی جو مسلسل تمہیں سخت ترین طریقے سے تکلیف و آزار پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کے سر کاٹ لیتے اور تمہاری عورتوں کو (کنیزی کے لئے) زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی۔

تفسیر

قرآن اس آیت میں ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے اللہ نے قوم بنی اسرائیل کو نوازا تھا وہ ہے ستمگاروں کے چنگل سے آزادی جو خدا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔

انہیں یاد دلاتا ہے: وہ زمانہ یاد کرو جب تمہیں ہم نے فرعونیوں سے آزادی دلائی تھی (واذ نجیناکم من اٰل فرعون) جو ہمیشہ شدید ترین طریقے سے تمہیں آزار دیتے تھے (یسومونکم سوء العذاب)۔

تمہارے بیٹوں کا گلا کاٹ دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو کنیزی اور خدمت کے لئے زندہ رہنے دیتے تھے (یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم)۔

اور یہ صورت حال تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی (وفی ذالکم بلاء من ربکم عظیم)۔

قرآن نے خصوصیت سے بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے ظلم کی تصویر کشی کرتے ہوئے "یسومونکم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یسومون فعل مضارع ہے اور مادہ "سوم" سے ہے جس کا اصلی مطلب کسی چیز کے پیچھے جانا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ فعل مضارع عموماً دوام اور استمرار کے معنی دیتا ہے۔ اس گوسفند اور اونٹ کو "سائمہ" کہتے ہیں جو ہمیشہ



جنگل میں چرتے ہیں اور مالک کے گھر سے کبھی گھاس نہیں کھاتے۔

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل مسلسل فرعونیوں کے شکنجے میں مبتلا تھے۔ وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے کہ ان کے بیگناہ بیٹوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ خود ہمیشہ ان کے ظلم میں گرفتار رہتے۔ وہ قبطیوں کے غلام، خدمت گار، خادم اور سازوسامان کا حصہ شمار ہوتے تھے۔

یہ بات اہم ہے کہ قرآن اس کارروائی کو بنی اسرائیل کے لئے ایک سخت اور عظیم آزمائش قرار دیا ہے (بلاء کا ایک معنی آزمائش و امتحان ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ ان نامناسب اور خلافِ فطرت امور کو برداشت کرنا ایک سخت آزمائش تھی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "بلاء" یہاں مجازات اور سزا کے معنی میں ہو کیونکہ بنی اسرائیل اس سے پہلے بہت قدرت و نعمت کے حامل تھے اور انہوں نے کفرانِ نعمت کیا لہٰذا خدا نے انہیں سزا دی۔

بعض مفسرین کی طرف سے ایک تیسرا احتمال بھی ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ "بلاء" نعمت کے معنی میں ہے یعنی فرعونیوں کے چنگل سے نجات تمہارے لئے ایک بہت بڑی نعمت تھی۔[۱]

بہر حال فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کی آزادی کا دن ایک اہم تاریخی دن تھا جس کا قرآن نے بارہا تذکرہ کیا ہے۔[۲] قرآن نے بیٹیوں کو زندہ رکھنے اور بیٹوں کے سر کاٹنے کو عذاب قرار دیا ہے اور اس ظلم سے آزادی کو اپنی نعمت شمار کیا ہے، گویا وہ انسانوں کو ابھار رہا ہے کہ وہ کوشش کریں کہ ہر قیمت پر اپنی مسلّم آزادی حاصل کریں اور اس کی حفاظت کریں جیسا کہ حضرت علیؑ اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الموت فی حیاتکم مقھورین والحیاۃ فی موتکم قاھرین[۳]

زندہ رہنا اور زیردست و مغلوب رہنا موت ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے موت انسان کی زندگی ہے۔

آج کی دنیا کا گذشتہ زمانے سے فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں فرعون ایک خاص استبداد کے ساتھ مخالف گروہ کے بیٹوں اور مردوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتا تھا۔

۱۔ "بلاء" کے اصلی معنی ہیں کہنگی اور قدامت۔ آزمانے کو بھی "بلاء" کہا گیا ہے۔ کیونکہ جس چیز کی کئی مرتبہ آزمائش کی جائے اس میں کہنگی آ جاتی ہے۔ غم و اندوہ کو بھی "بلاء" کہتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جسم و روح کو کہنہ و فرسودہ کر دیتا ہے۔ تکالیف اور مصائب کو بھی بلاء کہتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جسم و روح کو کہنہ و فرسودہ کر دیتا ہے۔ شرعی اور ذمہ داریوں کو بھی بلاء کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انسان کے جسم و جان پر سنگین اثرات پیدا کرتی ہیں۔ آزمائش بعض اوقات نعمت کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی مصیبت کے ساتھ لہٰذا لفظ "بلاء" بھی کبھی اس معنی میں اور کبھی اس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ مزید توضیح تفسیر نمونہ کی دسویں جلد میں مطالعہ کیجیے۔

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۱



لیکن آج کی دنیا میں دوسرے طریقوں سے افرادِ انسانی کی روحِ مردانگی کو قتل کر دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو گناہوں میں غرق لوگوں کی شہوات کی قید میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

آخر کیوں فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا؟

یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں بعض مفسرین اس جرم اور ظلم کا سبب ایک خواب کو قرار دیتے ہیں جو فرعون نے دیکھا تھا لیکن اس کا مفصل جواب آپ سورہ قصص کی آیت ۴ کے تحت پڑھیں گے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا سبب فقط ایک خواب نہ تھا جو فرعون نے دیکھا بلکہ بنی اسرائیل کے طاقت ور ہونے اور حکومت چھین لینے کی وحشت وخوف بھی اس کام کا مددگار عنصر تھا۔

۵۰۔ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

۵۰۔ ترجمہ

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے دریا شگافتہ کیا اور تمہیں تو نجات دے دی مگر فرعونیوں کو غرق کر دیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کا ایک اجمالی اشارہ موجود تھا اور محلِ بحث آیت دراصل اس کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ نجات انہیں کس طرح ملی تھی جو خود ایک نشانی ہے اور پروردگار کی بنی اسرائیل پر عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

فرمایا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو شق کیا (واذ فرقنا بکم البحر) تمہیں نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے (فانجینکم واغرقنا ال فرعون وانتم تنظرون)۔

فرعونیوں کی دریا میں غرقابی اور بنی اسرائیل کی ان کے چنگل سے نجات کا ماجرا قرآن کی متعدد سورتوں میں ہے منجملہ ان کے اعراف آیہ ۱۳۶، انفعال آیہ ۵۴، اسراء آیہ ۱۰۳، شعراء آیہ ۶۶، زخرف آیہ ۵۵ اور دخان آیہ ۱۷ سے بعد تک۔

ان سورتوں میں اس واقعے کی تقریباً تمام جزئیات کی تشریح کی گئی ہے لیکن مورد بحث آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی نظرِ رحمت ولطف کے لئے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے جو نیا نجات بخش آئین ہے صرف اشارہ کیا گیا ہے[1]

---

[1] مزید شرح تفسیر نمونہ کی جلد ۱۳، سورہ طٰہٰ آیت ۷۷ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔



جیسا کہ تفصیل کے ساتھ اس واقعے کو آپ ان سورتوں میں پڑھیں گے کہ حضرت موسیٰؑ ایک مدت سے تبلیغ کرنے، فرعون اور فرعونیوں کو دعوت دینے، قسم قسم کے معجزات دکھانے اور ان کے قبول نہ کرنے پر مامور ہوئے کہ آدھی رات کے وقت بنی اسرائیل کو لے کر کوچ کر جائیں مگر جب وہ عظیم دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو اچانک دیکھا کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل اضطراب و وحشت میں گھر گئے۔ ان کے سامنے دریا اور غرقابی تھی اور پشت پر فرعون کا طاقت ور لشکر جس کے مقابلے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ عصا دریا پر ماریں۔ دریا میں مختلف راستے پیدا ہو جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کی جمعیت دریا کی دوسری طرف پہنچ جاتی ہے۔ ادھر سے لشکر مخالف جوان کا مسلسل پیچھا کر رہا تھا سارے کا سارا دریا میں داخل ہو جاتا ہے دریا کا پانی مل جاتا ہے اور وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے ہیں لشکر فرعون کے مُردوں کے بدن پانی پر تیرنے لگتے ہیں اور بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ دشمن پانی میں غرق ہو گیا ہے۔

وہ حالتِ اضطراب و وحشت اور یہ نجات ہر دو غور طلب امور ہیں کہ انسان اس راحت و آرام کو جب اضطراب کے بعد دیکھے تو خدا کا شکر ادا کرے۔

قرآن چاہتا ہے کہ یہودیوں سے کہے کہ ہم نے جو تم پر اس قدر لطف و کرم کیا ہے اور تمہیں اس وحشت و اضطراب سے رہائی بخشی ہے تو کیوں تم رسولِ اسلام اور ہمارے دستور و احکام کی مخالفت کرتے ہو۔

اس آیت میں انسانوں کے لئے درس ہے کہ اگر وہ زندگی میں خدا پر بھروسہ کریں اور اس قوتِ لازوال پر اعتماد رکھیں اور صراطِ مستقیم میں کسی سعی و جستجو سے پیچھے نہ رہیں تو سخت ترین مواقع اور مشکلات میں خداوند عالم ان کا یار و مددگار ہوگا اور انہیں نجات دے گا۔

۵۱۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۵۲۔ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۵۳۔ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

۵۴۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○



ترجمہ

۵۱- اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا (اور وہ تم سے جدا ہو کر چالیس راتوں کے لئے وعدہ گاہ پر احکام لینے کے لئے آیا) پس تم نے بچھڑے کو (اپنے معبود کی حیثیت سے) منتخب کر لیا۔ حالانکہ اس کام سے تم (اپنے ہی اوپر) ظلم کر رہے تھے۔

۵۲- پھر ہم نے اس کام کے بعد تمہیں بخش دیا کہ شاید تم اس نعمت کا شکر ادا کرو۔

۵۳- نیز (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق و باطل کی تشخیص کا ذریعہ تھی کہ شاید تم ہدایت حاصل کرو۔

۵۴- اور (وہ وقت بھی) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم تم نے بچھڑے کا انتخاب کرکے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے نفسوں کو قتل کرو۔ تمہارے پروردگار کی بارگاہ میں یہ کام تمہارے لئے بہتر ہے پھر خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ تواب و رحیم ہے۔

تفسیر

ان چار آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک بھرپور واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہودیوں کو اسی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے یہ آیات یہودیوں کی طویل تاریخ میں ان کی بہت بڑی کجروی کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور وہ ہے اصل توحید سے شرک اور بچھڑا پرستی کے ٹیڑھے راستے کی طرف ان کا سفر۔

انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ تم تاریخ میں ایک مرتبہ فاسدین کے گمراہ کرنے کے باعث ایسی سخت سرنوشت سے دوچار ہوئے تھے، اب بیدار رہو اور خالص توحید کا راستہ اسلام اور قرآن کے ذریعے تمہارے سامنے کھولا گیا ہے اسے فراموش نہ کرو۔

یہ آیات حضرت موسیٰ کے کوہ طور کی طرف جانے کے واقعے کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو چالیس شب و روز میں انجام پذیر ہوا اور یہ آیات بتاتی ہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کیسے گاؤ پرستی میں پڑ گئے۔ نیز حضرت موسیٰ کی کتاب ہدایت کے ساتھ واپسی، بنی اسرائیل کی نئے رنگ کی توبہ کا مسئلہ اور خدا کی طرف سے اس کی قبولیت کو بیان کرتی ہیں۔

پہلے کہتا ہے یاد کرو اس زمانے کو جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتوں کا وعدہ کیا (واذ وٰعدنا موسٰی اربعین لیلۃ)۔

جب وہ تم سے جدا ہوئے اور تیس راتوں کی میعاد چالیس ہو گئی تو ان کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو اپنے معبود کی حیثیت سے منتخب کر لیا حالانکہ اس عمل سے تم اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے (ثم اتخذتم العجل من بعدہ و انتم ظالمون)

اس ماجرے کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ سے بعد تک اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۸۶ سے بعد تک آپ پڑھیں گے جس کا خلاصہ یہ ہے۔



اس کے بعد کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے چنگل سے نجات پا چکے اور فرعون اور اس کے پیروکار غرق ہوگئے تو حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ تورات کی تختیاں لینے تیس راتوں کے لئے کوہ طور پر جائیں لیکن بعد میں لوگوں کی آزمائش کے لئے دس راتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ سامری جو ایک مکار اور فریب کار آدمی تھا اس نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور بنی اسرائیل کے پاس جو سونا اور جواہرات فرعونیوں کی یادگار کے طور پر موجود تھے۔ ان سے ایک بچھڑا بنایا جس سے ایک خاص قسم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ بنی اسرائیل کو اس کی عبادت و پرستش کی دعوت دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک بڑی اکثریت اس سے مل گئی۔ حضرت ہارونؑ جو حضرت موسیٰؑ کے جانشین اور بھائی تھے ایک اقلیت کے ساتھ آئین توحید پر باقی رہے انہوں نے جس قدر کوشش کی کہ انہیں اس غلط راستے سے روکیں وہ نہ رک سکے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ہارونؑ کو ختم کرنے پر تیار ہوگئے۔

حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس آئے اور اس عجیب صورت حال کو دیکھا تو انہیں سخت تکلیف اور دکھ پہنچا۔ انہوں نے ان لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی چنانچہ وہ اپنے برے کام کی برائی کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کرنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا کی طرف سے ایک نئے رنگ کی توبہ ان کے سامنے پیش کی جس کی تفصیل بعد کی آیات میں آئے گی۔

اگلی آیت میں خدا کہتا ہے کہ اس بڑے گناہ کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو (ثم عفونا عنکم من بعد ذالک لعلکم تشکرون)۔

اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل کی پہچان کا وسیلہ عطا کیا تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے (واذ اٰتینا موسی الکتاب والفرقان لعلکم تھتدون)۔

ممکن ہے کتاب و فرقان دونوں سے مراد تورات ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب تورات کی طرف اشارہ ہو اور فرقان ان معجزات کی طرف اشارہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اختیار میں دیے تھے (کیونکہ فرقان کا اصلی معنیٰ ہے وہ چیز جو حق کو باطل سے انسان کے لئے ممتاز کرتی ہے)۔

اس کے بعد اس گناہ سے توبہ کے سلسلے میں کہتا ہے: اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم تم نے بچھڑے کو منتخب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے (واذ قال موسیٰ لقومہ یاقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل)۔

اب جو ایسا ہو گیا ہے تو توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹ آؤ (فتوبوا الی بارئکم) باری کے معنی ہیں خالق۔ دراصل اس کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا۔ خالق چونکہ مخلوقات کو مواد اصلی اور ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس سخت توبہ کا حکم وہی ذات دے رہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہاری توبہ اس طرح ہونی چاہیئے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو (فاقتلوا انفسکم) یہ کام تمہارے لئے تمہارے خالق کی بارگاہ میں بہتر ہے (ذالکم خیر لکم عند بارئکم) اس ماجرے کے بعد خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی جو تواب و رحیم ہے (فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم)۔

عظیم گناہ اور سخت سزا

اس میں شک نہیں کہ سامری کے بچھڑے کی پرستش و عبادت کوئی معمولی بات نہ تھی وہ قوم جو خدا کی یہ تمام آیات دیکھ



چکی تھی اور اپنے عظیم پیغمبر کے معجزات کا مشاہدہ کر چکی تھی ان سب کو بھول کر پیغمبر کی ایک مختصر سی غیبت میں اصل توحید اور آئین خداوندی کو پورے طور پر پاؤں تلے روندنے اور بت پرست ہو جائے۔ اب اگر یہ بات ان کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے جڑ سے نہ نکالی جاتی تو خطرناک حالت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور ہر موقعے کے بعد اور خصوصاً حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے بعد ممکن تھا ان کی دعوت کی تمام آیات ختم کر دی جاتیں اور اس عظیم قوم کی تقدیر مکمل طور پر خطرے سے دو چار ہو جاتی۔

لہٰذا یہاں شدتِ عمل سے کام لیا گیا اور صرف پشیمانی اور زبان سے اظہار توبہ پر ہرگز قناعت نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف سے ایسا سخت حکم صادر ہوا جس کی مثال تمام انبیاء کی طویل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہ یہ کہ توبہ اور توحید کی طرف بازگشت کے سلسلے میں گناہگاروں کے کثیر گروہ کے لئے اکٹھا قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فرمان بھی ایک خاص طریقے سے جاری ہونا چاہیے تھا اور وہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خود تلواریں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کو قتل کریں کہ ایک اس کا اپنا مارا جانا عذاب ہے اور دوسرا دوستوں اور شناساؤں کا قتل کرنا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا کہ ایک تاریک رات میں وہ تمام لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی غسل کریں۔ کفن پہن لیں اور صفیں باندھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائیں۔

ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ یہ توبہ کیوں اس سختی سے انجام پذیر ہوئی۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا ان کی توبہ کو بغیر اس خونریزی کے قبول کر لیتا۔

اس سوال کا جواب گذشتہ گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اصل توحید سے انحراف اور بت پرستی کی طرف جھکاؤ کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا کہ اتنی آسانی سے درگذر کر دیا جاتا اور وہ بھی ان واضح معجزات اور خدا کی بڑی بڑی نعمتوں کے مشاہدے کے بعد۔

درحقیقت ادیان آسمانی کے تمام اصولوں کو توحید اور یگانہ پرستی میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس اصل کا متزلزل ہونا دین کی تمام بنیادوں کے ناتقے کے برابر ہے اگر گاؤ پرستی کے مسئلے کو آسان سمجھ لیا جاتا تو شاید آنے والے لوگوں کے لئے سنت بن جاتا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے لئے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ضدی اور بہانہ ساز لوگ تھے، لہٰذا چاہیے تھا کہ ان کی ایسی گوشمالی کی جائے کہ اس کی چبھن تمام صدیوں اور زمانوں تک باقی رہ جائے اور اس کے بعد کوئی شخص بت پرستی کی فکر میں نہ پڑے اور شاید یہ جملہ " ذالکم خیر لکم عند بارئکم " یعنی یہ قتل و کشتار تمہارے خالق کے ہاں تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ اسی طرف اشارہ ہو۔

۵۵۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

۵۶۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۵۵۔ اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم خدا کو آشکار (اپنی آنکھوں سے) دیکھے بغیر تم پر ہرگز ایمان نہیں



لائیں گے۔ اسی حالت میں تمہیں بجلی نے آن لیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

۵۶۔ پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندگی بخشی کہ شاید خدا کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

تفسیر

یہ دو آیات خدا کی ایک اور بہت بڑی نعمت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ لوگ کس قدر ہٹ دھرم اور بہانہ ساز تھے اور کیسے خدا کے سخت عذاب نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا لیکن پھر خدا کا لطف و کرم ان کے شامل حال ہوا۔

فرماتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس وقت تک ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک خدا کو ظاہر بظاہر اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لیں (واذ قلتم یٰموسیٰ لن نؤمن لک حتی نری اللّٰہ جهرة)۔

ممکن ہے یہ خواہش ان کی جہالت کی وجہ سے ہو کیونکہ نادان لوگ اپنے محسوسات سے زیادہ کسی چیز کا شعور نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کو آنکھ سے دیکھیں یا پھر وہ ہٹ دھرمی اور بہانہ جوئی کی خاطر ایسا کرتے تھے جو اس قوم کی خصوصیت تھی اور اب بھی ہے۔

بہرحال انہوں نے صراحت سے حضرت موسیٰ سے کہا کہ جب تک خدا کو ظاہری آنکھ سے نہ دیکھ لیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں اس کے علاوہ چارہ کار نہ تھا کہ خدا کی ایک ایسی مخلوق انہیں دکھائی جاتی جسے دیکھنے کی تاب ان میں نہ ہو اور وہ جان لیں کہ ظاہری آنکھ تو اس سے بھی ناتواں ہے کہ وہ خدا کی تمام مخلوقات کو دیکھ سکے۔ چہ جائیکہ ذات پاک پروردگار کو دیکھے۔

چنانچہ چندھیا دینے والی چمک، رعب دار آواز اور زلزلے کے ساتھ بجلی آئی اور پہاڑ پر گری۔ اس نے سب کو اس طرح وحشت زدہ کر دیا کہ وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا جملے کے بعد کہتا ہے: پھر اس حالت میں صاعقہ نے تمہیں آ لیا کہ تم دیکھ رہے تھے (فاخذتکم الصاعقة وانتم تنظرون)۔

حضرت موسیٰ اس واقعے سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ بنی اسرائیل کے بہانہ جو لوگوں کے لئے تو ستر افراد کا ختم ہو جانا ایک بڑا بہانہ تھا جس کی بنیاد پر وہ حضرت موسیٰ کی زندگی کو تیرہ و تار کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے خدا سے ان لوگوں کے لئے دوبارہ زندگی کی درخواست کی جسے اس نے قبول کر لیا جیسا کہ قرآن کی بعد والی آیت میں کہتا ہے: پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں نئی زندگی بخشی کہ شاید تم خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو (ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون)۔

اجمالی طور پر ان دو آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سورہ اعراف آیہ ۱۵۵ اور سورہ نساء آیہ ۱۵۳ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔[1]

بہرحال یہ داستان نشاندہی کرتی ہے کہ خدا کے عظیم انبیاء جاہل و بے خبر لوگوں کو دعوت دینے کی راہ میں کن کن عظیم مشکلات

---

[1] زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۴ کی طرف رجوع فرمائیے۔



سے دو چار ہوتے تھے۔ کبھی تو وہ لوگ قسم قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور کبھی اس سے بھی آگے قدم رکھتے تھے اور اس ظاہری آنکھ سے خدا کو دیکھنے کی خواہش کرتے اور قطعاً کہتے کہ جب تک ہماری یہ تمنا انجام پذیر نہ ہو ہمارا ایمان لانا محال ہے اور جب خدا کی طرف سے کسی شدید رد عمل سے دوچار ہوتے پھر بھی ایک نئی مشکل درپیش ہوتی۔ اگر لطف خدا شامل حال نہ ہوتا تو ان بہانہ سازیوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔

ضمنی طور پر یہ آیت امکان رجعت اور اس دنیا میں دوبارہ زندگی گذارنے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ ایک مقام پر اس کا واقع ہونا دوسرے مواقع پر بھی اس کے ممکن اور واقع ہونے کے لئے دلیل ہے۔

بعض اہلسنت مفسرین جو یہ چاہتے ہیں کہ رجعت اور دوبارہ کی زندگی کو قبول نہ کیا جائے انہوں نے مندرجہ بالا آیت کی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ کے واقعہ "صاعقہ" میں مرجانے کے بعد خدا نے تمہیں بہت سی اولاد اور افزائش نسل دی ہے تاکہ تمہارا خاندان ختم نہ ہو۔[1]

لیکن یہ تو کہے بغیر بھی واضح ہے کہ یہ تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ خدا تو فرما رہا ہے:

وبعثناکم من بعد موتکم (تمہیں تمہاری موت کے بعد ہم نے اٹھایا)۔[2]

۵۷۔ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

ترجمہ

۵۷۔ اور ہم نے بادل کے ذریعے تم پر سایہ ڈالا اور من (درختوں کا مخصوص اور لذیذ شیرہ) و سلویٰ (کبوتر کی طرح کے مخصوص مرغ) کے ساتھ تمہاری تواضع کی۔ (اور ہم نے کہا) ان پاکیزہ نعمتوں سے جو ہم نے دی ہیں کھاؤ۔ انہوں نے ہم پر تو کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کیا ہے۔

تفسیر

جیسے سورہ مائدہ کی ۲۰ تا ۲۲ آیات سے ظاہر ہوتا ہے بنی اسرائیل جب فرعونیوں کے چنگل سے نجات پاچکے تو خداوند عالم نے

---

[1] تفسیر المنار ج ۱، ص ۳۲۲

[2] بعض مفسرین مثلاً آلوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے کہ موت سے یہاں مراد بے ہوشی ہے یعنی بنی اسرائیل صاعقہ عظیم دیکھنے سے بیہوش ہوگئے تھے۔ پھر لطف خدا سے ہوش میں آئے۔ بعض مفسرین نے توجیہ کرنے میں قدم کچھ آگے بڑھایا ہے اور موت کے معنی جہالت اور "بعث" کے معنی تعلیم کیے ہیں، لیکن یہ آیات اور ان کی مثل دیگر آیات جو سورہ اعراف میں ہیں ان پر غور و فکر کرنے سے واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی توجیہ بھی ایک حقیقت پسند مفسر کو زیب نہیں دیتی۔



انہیں حکم دیا کہ وہ فلسطین کی مقدس سرزمین کی طرف جائیں اور اس میں داخل ہو جائیں لیکن بنی اسرائیل اس فرمان کے مطابق نہ گئے اور کہنے لگے جب تک ستمگار (قوم عمالقہ) وہاں سے باہر نہ چلے جائیں ہم اس زمین میں داخل نہیں ہوں گے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ تو اور تیرا خدا ان سے جنگ کرنے جاؤ جب تم کامیاب ہو جاؤ گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

حضرت موسیٰؑ ان کی اس بات سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور انہوں نے درگاہِ الٰہی میں شکایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چالیس سال تک بیابان (صحرائے سینا) میں اسی طرح سرگرداں رہے۔

ان میں سے ایک گروہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا۔ انہوں نے بارگاہِ خدا کا رخ کیا۔ خدا نے دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ جن میں سے بعض کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم نے تمہارے سر پر بادل سے سایہ کیا (وظللنا علیکم الغمام) واضح ہے کہ وہ مسافر جو روزانہ صبح سے غروب تک سورج کی گرمی میں بیابان میں چلتا ہے وہ ایک لطیف سائے سے کیسی راحت پائے گا (وہ سایہ جو بادل کا ہو جس سے انسان کے لئے نہ تو فضا محدود ہوتی ہو اور نہ جو ہوا چلنے سے مانع ہو)۔ یہ صحیح ہے کہ بادل کے سایہ فگن ٹکڑوں کا احتمال ہمیشہ بیابان میں ہوتا ہے لیکن آیت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ایسا عام حالات کی طرح نہ تھا بلکہ وہ لطفِ خدا سے اکثر اس عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

دوسری طرف اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں چالیس سال کی طویل مدت سرگرداں رہنے والوں کے لئے غذا کی کافی و وافی ضرورت تھی۔ اس مشکل کو بھی خداوند عالم نے ان کے لئے حل کر دیا جیسا کہ اس آیت کے آخر میں کہتا ہے: ہم نے من و سلویٰ جو لذیذ اور طاقت بخش غذا ہے تم پر نازل کیا (وانزلنا علیکم المن والسلویٰ) ان پاکیزہ غذاؤں سے جو تمہیں روزی کے طور پر دی گئی ہیں کھاؤ (اور حکم خدا کی نافرمانی نہ کرو اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو) (کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم) لیکن وہ پھر بھی شکر گزاری کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے (تاہم) انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کیا ہے (وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون)۔

من و سلویٰ کی تفسیر مندرجہ ذیل نکات میں تفصیل سے بیان کی جائے گی۔

چند اہم نکات

(۱) آزاد ماحول کی زندگی: اس سے قطع نظر کہ بادل ان پر کیسے سایہ کرتا تھا اور من و سلویٰ کیا تھے، اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ایک بہت بڑی قوم کے لوگ جو سالہا سال سے کمزوری، ذلت اور زبوں حالی میں بغیر ارادہ و خواہش کے مجبوراً فرعونیوں کے محلات میں خدمت کرتے تھے یا ان کے کھیتوں اور باغوں میں زحمت و تکلیف اٹھاتے تھے طبعی بات ہے کہ وہ اس قابل نہ تھے کہ فوراً تمام گذشتہ اخلاق و عادات سے آزاد ہو کر انقلابی بنیاد پر ایک مستقل خدائی حکومت قائم کریں۔ بہر صورت اس قوم کے لئے ضروری تھا کہ گذشتہ رسومات کے خاتمے اور قابلِ افتخار زندگی گذارنے کی تیاری کے لئے برزخ کا ایک زمانہ گزارے چاہے یہ زمانہ چالیس سال یا اس سے کم و بیش ہو۔ اگر قرآن اس کا سزا کے طور پر تعارف کراتا ہے تو بھی یہ اصلاح کرنے والی



اور بیدار کرنے والی سزا ہے کیونکہ خدا کی طرف سے جتنی سزائیں ہیں ان میں انتقام کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

چاہیئے تھا کہ وہ سالہا سال اس بیابان جسے ان کی سرگردانی کی وجہ سے " تیہ " کہا جانے لگا تھا میں رہیں تاکہ ستمگر دل کے برفرعون کے تسلط سے دور رہیں اور ان کی نئی نسل توحیدی و انقلابی خصوصیات کے ساتھ پرورش پائے اور مقدس سرزمینوں پر حکومت کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

(۱۱) من و سلوٰی کیا ہے : مفسرین نے ان دو الفاظ کی تفسیر میں بہت سی باتیں کہی ہیں جن سب کے ذکر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کے لغوی معنی اور وہ تفسیر جو زیادہ فصیح نظر آتی ہے اور آیات کے قرآن سے زیادہ ہم آہنگ ہے بیان کریں۔

بعض کے بقول لغت میں "من" شبنم کی طرح کے ان چھوٹے چھوٹے قطرات کو کہتے ہیں جو درختوں پر گرتے ہیں اور میٹھا ذائقہ رکھتے ہیں[1] یا بعض دوسروں کے بقول یہ ایک قسم کا صمغ (درخت کا شیرہ) ہے جس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا ذائقہ میٹھا لیکن ترشی سے ملا ہوا تھا۔

"سلوٰی" کے اصل معنی تو ہیں اطمینان اور تسلی۔ بعض ارباب لغت اور بہت سے مفسرین نے اسے ایک قسم کا پرندہ (بٹیر یا تیتر) قرار دیا ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ سے منقول ایک روایت کے مطابق، آپؐ نے فرمایا :

" الکماۃ من المن "

کھمبی کی قسم کی ایک چیز تھی جو اس زمین میں اگتی تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ مَن سے مراد وہ تمام نعمتیں جو خدا نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں اور سلوٰی وہ تمام عطیات ہیں جو ان کی راحت و آرام اور اطمینان کا سبب تھے۔

تورات میں ہے کہ "من" دھنیے کے دانوں جیسی کوئی چیز ہے جو رات کو اس سرزمین پر آ گرتی تھی۔ بنی اسرائیل اسے اکٹھا کرکے پیس لیتے اور اس سے روٹی پکاتے تھے جس کا ذائقہ روغنی روٹی جیسا ہوتا تھا۔

ایک احتمال اور بھی ہے کہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے زمانے میں خدا کے لطف و کرم سے جو نفع بخش بارشیں برستی تھیں اُن کے نتیجے میں درختوں سے کوئی خاص قسم کا صمغ اور شیرہ نکلتا تھا اور بنی اسرائیل اس سے مستفید ہوتے تھے۔

بعض دیگر حضرات کے نزدیک "من" ایک قسم کا طبیعی شہد ہے اور بنی اسرائیل اس بیابان میں طویل مدت تک چلتے پھرتے رہنے سے شہد کے مخزنوں تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ بیابان تیہ کے کناروں پر پہاڑ اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں کافی طبیعی شہد نظر آیا کرتا تھا۔

عہدین (توریت اور انجیل) پر لکھی گئی تفسیر سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے کہ مقدس سرزمین قسم قسم کے پھولوں

---

[1] مفردات راغب مادہ من



اور شگوفوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی لئے شہد کی مکھیوں کے جتھے ہمیشہ پتھروں کے سوراخوں، درختوں کی شاخوں اور لوگوں کے گھروں پر جا بیٹھے ہیں اس طرح سے بہت فقیر و مسکین لوگ بھی شہد کھا سکتے ہیں [1]

اب ہم سلویٰ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اسے شہد کے ہم معنی لیا ہے لیکن دوسرے تقریباً سب مفسرین نے اسے پرندے کی ایک قسم قرار دیا ہے یہ پرندہ اطراف اور مختلف علاقوں سے کثرت سے اس علاقے میں آتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے گوشت سے استفادہ کرتے تھے عہدین پر لکھی گئی تفسیر میں بھی اس نظریے کی تائید دکھائی دیتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> معلوم ہونا چاہیئے کہ بہت بڑی تعداد میں سلویٰ افریقہ سے چل کر شمال کو جاتے ہیں۔ جزیرۂ کاپری میں ایک فصل میں ۱۶ ہزار کی تعداد میں ان کا شکار کیا گیا۔ یہ پرندہ بحیرۂ قلزم کے راستے سے آتا ہے۔ خلیج عقبہ اور سویز کو عبور کرتا ہے۔ پھر جزیرہ سینا میں داخل ہوتا ہے اور راستے میں اس قدر تکان و تکلیف جھیلنے کی وجہ سے آسانی سے ہاتھ سے پکڑا جاسکتا ہے اور جب پرواز کرتا ہے تو زیادہ تر زمین کے قریب ہوتا ہے۔ اس حقیقے کے متعلق (تورات کے) سفر خروج اور سفر اعداد میں گفتگو ہوئی ہے۔ [2]

اس تحریر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ سلویٰ سے مراد وہی پرگوشت پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ اور اس کے ہم وزن ہوتا ہے اور یہ پرندہ اس سرزمین میں مشہور ہے۔ البتہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے دنوں میں ان پر خدا کا یہ خاص لطف و کرم تھا کہ یہ پرندہ وہاں کثرت سے ہوتا تھا تاکہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔

چند اہم نکات

(۱) "انزلنا" کیوں کہا گیا: توجہ رہے کہ انزلنا سے مراد ہمیشہ اوپر سے نازل کرنا نہیں ہوتا جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۶ میں ہے:

> اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ
>
> "چوپایوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لئے نازل کئے"

ہم جانتے ہیں کہ چوپائے آسمان سے نہیں اترے۔ اس بنا پر ایسے موقع پر یہ نزولِ مقامی کے معنی میں ہے یعنی وہ نعمت جو ایک برتر مقام سے پست مقام کو دی جائے اور چونکہ یہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں لہٰذا انہیں نزول سے تعبیر کیا گیا ہے اور یا پھر یہ مادہ انزال سے مہمان نوازی کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انزال و نُزُل (بروزن رُسل) پذیرائی کرنے کے لئے میں آتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ واقعہ آیہ ۹۳ میں زخمیوں کے دو گروہوں میں سے ایک کے بارے میں ہے:

---

[1] قاموس کتاب مقدس، ص ۶۱۲

[2] قاموس کتاب مقدس ص ۴۸۳



فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝

لہٰذا حمیم (دوزخ کا جلانے والا مشروب) اُن کی پذیرائی کے لئے پیش کیا جائے گا۔

نیز سورہ آل عمران آیہ ۱۹۸ میں اہل بہشت کے بارے میں ہے :

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

وہ ہمیشہ بہشت میں خدا کے مہمان ہوں گے۔

بنی اسرائیل چونکہ درحقیقت اس سرزمین میں خدا کے مہمان تھے لہٰذا من و سلویٰ کے لئے نزول کی تعبیر ہی ان کے بارے میں منطبق ہوتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں نزول اپنی اسی مشہور معنی میں ہو کیونکہ یہ نعمتیں خصوصاً (سلویٰ) پرندے اوپر ہی سے ان کی طرف آتے تھے۔

(ii) "غمام" کیا ہے : بعض غمام اور سحاب دونوں کو بادل کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں لیکن بعض کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غمام سفید رنگ کے بادلوں کو کہا جاتا ہے اور بعض اس کی تعریف میں کہتے ہیں کہ غمام وہ بادل ہے جو زیادہ سرد اور زیادہ نازک ہوتا ہے جب کہ سحاب بادلوں کے ایسے اکٹھ کو کہتے ہیں جو غمام کے مدمقابل ہے۔ غمام اصل میں مادہ غم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپانا۔ بادل کو غمام کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ صفحۂ آسمان کو چھپا دیتا ہے۔ اندوہ کو بھی غم کہنے کی یہی وجہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو اپنے پردے میں چھپا لیتا ہے۔[1]

بہرحال ممکن ہے یہ تعبیر اس لئے ہو کہ بنی اسرائیل بادل کے سائے سے مستفید ہو رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ بادلوں کی سفیدی کی وجہ سے روشنی بھی چھن چھن کر ان تک پہنچ رہی تھی۔

(iii) من و سلویٰ کی ایک اور تفسیر : بعض مفسرین نے من و سلویٰ کی معروف تفسیر کی بجائے ایک اور تفسیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "من" سے مراد ناشکرگزاروں پر احسانِ مطلق اور بے شمار خدائی نعمت ہے اور سلویٰ سے مراد دل کا وہ اطمینان ہے جو خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے چنگل سے نجات عطا کر کے مرحمت فرمایا تھا۔[2]

یہ تفسیر تقریباً تمام مفسرین، اسلامی روایات اور کتب عہدین کے خلاف ہونے کے علاوہ آیت کے متن سے بھی میل نہیں کھاتی کیونکہ قرآن من و سلویٰ کے ذکر کے فوراً بعد بلا فاصلہ کہتا ہے: "کلوا من طیبات ما رزقناکم" یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ من و سلویٰ کھانے والی چیزوں میں ہے یہ تعبیر نہ صرف اس آیت میں ہے بلکہ بعینہ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ میں بھی ہے۔

۵۸- وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

---

[1] روح المعانی، زیر نظر آیات کے ذیل میں و مفردات راغب مادہ "غم"

[2] پرتوی از قرآن، ج ۱، ص ۱۶۵



الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
۵۹۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۵۸۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے کہا: اس بستی (بیت المقدس) میں داخل ہو جاؤ اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ اور (معبد بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ اور کہو: خدایا! ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ تاکہ ہم تمہیں بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے۔

۵۹۔ ظالم لوگوں نے اس قول کو بدل دیا اور اس کی جگہ ایک اور (استہزاء آمیز) جملہ کہنے لگے لہٰذا ہم نے ستمگروں پر اس نافرمانی کے باعث آسمان سے عذاب بھیجا۔

تفسیر

اس مقام پر ہمارا سابقہ بنی اسرائیل کی زندگی کے ایک اور مرحلے سے پڑتا ہے جو سرزمین مقدس میں ان کے داخلے سے مربوط ہے۔

پہلی آیت کہتی ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ان سے کہا کہ اس بستی (سرزمین قدس) میں داخل ہو جاؤ (واذ قلنا ادخلوا ھٰذہ القریۃ)۔

لفظ قریہ اگرچہ روزمرہ میں بستی کے معنی میں ہے لیکن قرآن اور لغت عرب میں ہر اس محل و مقام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ جمع ہوں چاہے وہ بڑے شہر ہوں یا بستیاں یہاں مراد بیت المقدس اور قدس کی سرزمین ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ (فکلوا منھا حیث شئتم رغداً) اور (بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ گزر جاؤ (وادخلوا الباب سجداً) اور کہو: خدایا! ہمارے گناہوں کو بخش دے (وقولوا حطۃ)۔ تاکہ ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے (نغفر لکم خطٰیکم و سنزید المحسنین)۔

متوجہ رہنا چاہیئے کہ لفظ حطہ لغوی لحاظ سے جھاڑنے اور نیچے گرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس کا معنی یہ ہوگا کہ خدایا! ہم تجھ سے اپنے گناہوں کے گرنے کی خواہش کرتے ہیں۔

خدا نے انہیں حکم دیا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے یہ جملہ سچے دل سے زبان پر جاری کریں اور ان سے وعدہ کیا کہ اس حکم پر عملدرآمد کی صورت میں ان کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ شاید اسی مناسبت سے بیت المقدس کے



ایک دروازے کا نام باب الحطہ رکھا گیا ہے جیسا کہ ابوحیان اندلسی نے بیان کیا ہے :

باب سے مراد بیت المقدس کا ایک دروازہ ہے جو باب حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ [1]

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے کہ نیک لوگوں کے لئے مغفرت اور گناہوں کی بخشش کے ساتھ ساتھ ہم اجر میں مزید اضافہ کریں گے (وسنزید المحسنین)۔

بہرحال خداوند عالم نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ گناہوں سے توبہ کے لئے خدا کی بارگاہ میں خضوع کے طور پر یہ جملہ بھی سچے دل سے زبان پر جاری کریں جو توبہ اور تقاضائے عفو کی دلیل ہے اور ان سے وعدہ کیا کہ اس حکم پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ان کے گناہوں کو بخش دے گا بلکہ یہاں تک کہ ان کے پاک اور نیکوکار لوگوں کو گناہوں کی بخشش کے علاوہ دوسرا اجر بھی دیگا۔
لیکن جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کو جانتے ہیں، ان میں سے ایک گروہ نے یہ لفظ ادا کرنے کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کی بجائے استہزاء کے طور پر ایک نامناسب لفظ کہنے لگے لہٰذا قرآن کہتا ہے: رہے وہ لوگ جو ظالم و ستمگار تھے انہوں نے اس لفظ کو کسی اور لفظ سے بدل دیا۔ (فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم) ہم نے بھی ان ستمگروں پر ان کے فسق و گناہ کی وجہ سے آسمان سے عذاب اتارا (فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون)

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے لفظ "رجز" دراصل اضطراب، انحراف اور بدنظمی کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر خصوصاً اونٹ کے لئے اس وقت استعمال ہوتی ہے جب وہ اپنے پاؤں کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب نامنظم طور پر رکھے۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں :

"رجز" دراصل حجاز کی لغت میں عذاب کے معنی میں ہے۔

وہ نبی اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو طاعون کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمائی :

انه رجز عذب به بعض الامم من قبلکم

یہ ایک قسم کا عذاب ہے جو تم سے پہلے کی بعض امتوں پر نازل ہوا۔ [2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض روایات میں زیر بحث آیت میں لفظ رجز کو ایک قسم کا طاعون کیوں قرار دیا گیا ہے، جو تیزی سے بنی اسرائیل میں پھیلا اور اس نے ایک گروہ کو ختم کر دیا۔

ممکن ہے کہا جائے کہ طاعون کی بیماری ایسی چیز نہیں ہے جو آسمان سے نازل ہو۔ ہو سکتا ہے بنی اسرائیل کی طرف طاعون کے جراثیم ان کے گرد چلنے والی ہوا میں موجود غلیظ گرد و غبار میں شامل ہوں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ طاعون کے دردناک عوارض

---

[1] صاحب تفسیر الکاشف نے زیر نظر آیت کے ذیل میں ابوحیان کی یہ عبارت نقل کی ہے۔
[2] تفسیر نمونہ جلد ۶ میں بھی لفظ رجز کے معنی پر بحث کی گئی ہے۔



میں سے یہ بھی ہے کہ اس بیماری کے عالم میں لوگ گفتگو اور چلنے پھرنے میں بدنظمی اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں جو اس لفظ کے اصلی معنی کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مندرجہ بالا آیات میں "فانزلنا علیھم" کی بجائے "فانزلنا علی الذین ظلموا" (جنہوں نے ظلم کیا ہم نے ان پر عذاب نازل کیا) کہہ کر یہ واضح کرتا ہے کہ اس عذاب اور خدائی سزا نے صرف بنی اسرائیل کے ستمگاروں کو ہی اپنی گرفت میں لیا اور سب خشک و تر اس میں نہیں جکڑے گئے۔ اس کے علاوہ آخر آیت میں جملہ "بما کانوا یفسقون" آیا ہے تاکہ اس موضوع کی مزید تاکید ہو جائے کہ ان کا ظلم و فسق ہی ان پر سزا و عذاب کی علت اور سبب ہے۔

اس طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہ اس جملے کے مذکورہ حصے نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ان برے اعمال پر مصر تھے اور ہمیشہ کے لئے ان پر کاربند تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ جب عادت کی شکل اختیار کر لے اور حالت و کیفیت کے طور پر معاشرے میں مرتکز ہو جائے تو اس وقت عذاب الٰہی نازل ہونے کا احتمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔

۶۰۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

ترجمہ

۶۰۔ اور (وہ زمانہ کہ) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنے عصا کو مخصوص پتھر پر مارو اچانک اس سے بارہ چشمے ابلنے لگے (اس طرح کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے) سب لوگ اپنے اپنے مخصوص چشمے کو پہچانتے تھے، (اور ہم نے کہا) خدا کی روزی میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرو اور نہ ہی فساد پھیلاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں بنی اسرائیل پر کی گئی ایک اور نعمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے (اس خشک اور جلانے والے بیابان میں جس وقت بنی اسرائیل پانی کی وجہ سے سخت تنگی میں مبتلا تھے) پانی کی درخواست کی (و اذ استسقیٰ موسیٰ لقومہ) تو خدا نے اس درخواست کو قبول کیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنا عصا مخصوص پتھر پر مارو (فقلنا اضرب بعصاک الحجر) اس پر اچانک پانی ابلنے لگا اور پانی کے بارہ چشمے زور و شور سے جاری ہو گئے (فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا)۔

بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے عین مطابق جب یہ چشمے جاری ہوئے تو ایک چشمہ ایک قبیلے کی طرف جھک جاتا تھا جس پر بنی اسرائیل کے لوگوں اور قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے چشمے کو پہچان لیا (قد علم کل اناس مشربھم)۔

یہ پتھر کس قسم کا تھا، حضرت موسیٰ کس طرح اس پر عصا مارتے تھے اور پانی اس میں سے کیسے جاری ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں



بہت کچھ گفتگو کی گئی ہے قرآن جو کچھ اس بارے میں کہتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ موسیٰؑ نے اس پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک کوہستانی علاقے کے ایک حصے میں واقع تھا جو اس بیابان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ کی تعبیر "انبجست" اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابتداء میں اس پتھر سے تھوڑا تھوڑا پانی نکلا بعد میں زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ، ان کے جانور جو ان کے ساتھ تھے اور وہ کھیتی جو انہوں نے احتمالاً اس بیابان کے ایک حصے میں تیار کی تھی، سب اس سے سیراب ہو گئے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوہستانی علاقے میں پتھر کے ایک حصے سے پانی جاری ہوا البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ سب معجزے سے رونما ہوا۔

رہا ان کا قول جو کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک مخصوص قسم کا تھا جسے بنی اسرائیل اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے تھے۔ جہاں انہیں پانی کی ضرورت ہوتی اسے زمین پر رکھ دیتے اور حضرت موسیٰ اپنا عصا اس پر مارتے اور اس سے پانی جاری ہو جاتا تو قرآن کی آیات میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے اگرچہ بعض روایات میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔ تورات کی سترھویں فصل میں سفر خروج کے ذیل میں بھی یوں لکھا ہے:

> خدا نے موسیٰ سے کہا: قوم کے آگے آگے رہو اور اسرائیل کے بعض بزرگوں کو ساتھ لے لو اور وہ عصا جسے نہر پر مارا تھا ہاتھ میں لے کر روانہ ہو جاؤ۔ میں وہاں تمہارے سامنے کوہ حوریب پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور اسے پتھر پر مارو، اس سے پانی جاری ہو جائے گا۔ تاکہ قوم پی لے اور موسیٰؑ نے اسرائیل کے مشائخ اور بزرگوں کے سامنے ایسا ہی کیا۔[1]

بہرحال ایک طرف خداوند عالم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا اور دوسری طرف انہیں فراواں پانی عطا کیا اور ان سے فرمایا: خدا کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ پیو لیکن زمین میں خرابی اور فساد نہ کرو (کلوا واشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

گویا یہ آیت انہیں متوجہ کرتی ہے کہ کم از کم ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری کے طور پر ضدی پن، ستمگری، انبیاء کو ایذا رسانی اور بہانہ سازی ترک کر دو۔

چند اہم نکات

(۱) "تعثوا" اور "مفسدین" میں فرق: "تعثوا" کا مادہ "عثی" (بروزن مسی) ہے۔ جس کے معنی ہیں شدید فساد۔ البتہ یہ لفظ زیادہ تر اخلاقی اور روحانی مفاسد کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ مادہ "عیث" جو معنی کے طور پر اس کے مشابہ ہے زیادہ تر حسی مفاسد کے لئے بولا جاتا ہے۔ لہٰذا "لاتعثوا" کے معنی بھی "مفسدین" کے ہیں لیکن تاکید اور زیادہ شدت کے ساتھ۔

---

[1] فصل ۱۷، سفر خروج، جملہ ۵ و ۶۔



یہ بھی احتمال ہے کہ پورا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ فساد ابتداء میں ایک چھوٹے سے نقطے سے شروع ہوتا ہے پھر اس میں وسعت اور پھیلاؤ آجاتا ہے اور اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک وہی چیز ہے جو لفظ "تعثوا" سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں "مفسدین" فساد انگیز پروگرام کے آغاز کی طرف اور "تعثوا" اس کے دوام و استمرار اور اسے وسعت دینے کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۱) **بنی اسرائیل کی زندگی میں خلافِ معمول واقعات:** بعض لوگ جو منطقِ اعجاز سے واقف نہیں وہ اتنے پانی اور اتنے چشموں کے ایک پتھر سے ابلنے اور جاری ہونے کو بعید شمار کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل جن کا اہم تر حصہ معجزاتِ انبیاء پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم اسے اپنے مقام پر بیان کر چکے ہیں، کوئی امر محال یا علت و معلول کے قانون میں کوئی استثناء نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک خارقِ عادت چیز ہے یعنی اس علت و معلول کے خلاف ہے جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عالمِ ہستی اور نظامِ علت و معلول کو پیدا کرنے والا اس پر حاکم ہے نہ کہ اس کا محکوم۔ خود ہماری روزمرہ زندگی میں موجودہ علت و معلول کے نظام کے استثنائی واقعات تھوڑے نہیں ہیں۔[۱]

(۱۱۱) **"انفجرت" اور "انبجست" میں فرق:** زیرِ بحث آیت میں "انفجرت" استعمال ہوا ہے جب کہ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ میں اس کی جگہ "انبجست" آیا ہے۔ پہلے کا معنی ہے پانی کا سمت بہاؤ اور دوسرے کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا اور آرام سے جاری ہونا۔ ممکن ہے دوسری آیت اس پانی کے جاری ہونے کے ابتدائی مرحلے کی طرف اشارہ ہو تاکہ پریشانی کا سبب نہ بنے اور بنی اسرائیل اسے اپنے کنٹرول میں کر سکیں اور "انفجرت" اس کے آخری مرحلے کی طرف اشارہ ہو جس سے مراد تیز بہاؤ ہے۔

کتاب مفرداتِ راغب میں آیا ہے کہ "انبجاس" وہاں بولا جاتا ہے جہاں پانی چھوٹے سے سوراخ سے نکل رہا ہو اور انفجار اس وقت کہتے ہیں جب پانی وسیع جگہ سے باہر آرہا ہو جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں یہ تعبیر اس سے پوری طرح سازگار ہے۔

۶۱ - وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ
لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ
قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ
لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟ ع

[۱] زیادہ وضاحت کے لئے کتاب "رہبرانِ بزرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔



ترجمہ

۶۱- اور (یاد کرو اس وقت کو) جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ہی قسم کی غذا پر اکتفا کریں اپنے خدا سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین سے اگنے والی سبزیوں میں سے اور ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز اگائے۔ موسیٰ نے کہا: کیا بہتر غذا کے بدلے پست انتخاب کرتے ہو (اب اگر ایسا ہی ہے تو کوشش کرو اور اس بیابان سے نکل کر) کسی شہر میں داخل ہو جاؤ کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تو وہیں ہے۔ خداوند عالم نے ذلت و محتاجی (کی مہر) ان کی پیشانی پر لگا دی اور نئے سرے سے وہ غضب پروردگار میں مبتلا ہو گئے کیونکہ وہ آیاتِ الٰہی سے کفر کرتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ گنہ گار، سرکش اور تجاوز کرنے والے تھے۔

تفسیر

ان نعماتِ فراواں کی تفصیل کے بعد جن سے خدا نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا۔ زیر نظر آیت میں ان عظیم نعمتوں پر ان کے کفران اور ناشکر گزاری کی حالت کو منعکس کیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔ شاید تاریخِ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہ ملے گی کہ کچھ لوگوں پر اس طرح سے الطافِ الٰہی ہو لیکن انہوں نے اس طرح سے اس مقابلے میں ناشکر گذاری اور نافرمانی کی ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم سے ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی غذا پر قناعت کر لیں (من وسلویٰ کتنی ہی اچھی اور لذیذ غذا ہو ہم مختلف قسم کی غذا چاہتے ہیں) (واذ قلتم یموسیٰ لن نصبر علیٰ طعام واحد) لہٰذا خدا سے خواہش کرو کہ وہ زمین سے جو کچھ اگایا کرتا ہے ہمارے لئے بھی اگائے سبزیوں میں سے، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز (فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلھا وقثائھا وفومھا وعدسھا وبصلھا)۔
لیکن موسیٰ نے ان سے کہا: کیا تم بہتر کی بجائے پست تر غذا پسند کرتے ہو (قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر) جب معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر اس بیابان سے نکلو اور کسی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرو کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ وہاں ہے (اھبطوا مصرا فان لکم ما سالتم)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا نے ان کی پیشانی پر ذلت و فقر کی مہر لگا دی (وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ) اور وہ دوبارہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے (وباؤ بغضب من اللہ)۔
یہ اس لئے ہوا کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے (ذٰلک بانھم کانوا یکفرون بایات اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق) یہ سب اس لئے تھا کہ وہ گناہ، سرکشی اور تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے (ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون)۔



چند اہم نکات

(۱) یہاں مصر سے کون سی جگہ مراد ہے: بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ لفظ مصر اس آیت میں اپنے کلی مفہوم کی طرف اشارہ ہے یعنی تم اس وقت اس بیابان میں ایک خود سازی کے اور آزمائشی پروگرام میں شریک تھے۔ یہاں قسم قسم کی غذائیں نہیں ہیں لہذا شہروں میں جاؤ، وہاں چلو پھرو وہاں ہر چیز موجود ہے لیکن یہ خود سازی کا اور اصلاحی پروگرام وہاں نہیں ہے۔ وہ اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے کبھی شہر مصر کی طرف واپس جانے کا تقاضا کیا اور نہ کبھی اس کی طرف واپس گئے۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی تفسیر کی ہے البتہ اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ تمہارا اس بیابان میں رہنا اور اس ایک قسم کی غذا سے استفادہ کرنا تمہاری کمزوری، ناتوانی اور زبوں حالی کی وجہ سے ہے۔ تم طاقت ور بنو، دشمنوں کیساتھ جنگ کرو، شام کے شہر اور سرزمین مقدس ان سے چھین لو تاکہ تمہیں تمام چیزیں میسر آسکیں۔[2]

اس آیت کی تیسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ مراد وہی ملک مصر ہے یعنی اگر تم ایک قسم کی غذا سے اس بیابان میں فائدہ اٹھاتے ہو تو اس کے بدلے تمہارے پاس ایمان ہے اور تم آزاد و خود مختار ہو اور اگر یہ چیزیں نہیں چاہتے تو پلٹ جاؤ اور دوبارہ فرعونیوں یا ان جیسے لوگوں کے غلام اور قیدی بن جاؤ تاکہ ان کے دستر خوان سے بچی ہوئی قسم قسم کی غذائیں کھا سکو۔ تم شکم سیری اور کھانے پینے کے پیچھے لگے ہوئے ہو یہ نہیں سوچتے کہ اس وقت تم غلام اور قیدی تھے اور آج آزاد اور سر بلند ہو۔ اب اگر حقیقت میں تم کچھ چیزوں سے محروم بھی ہو تو یہ آزادی کی قیمت ہے جو ادا کر رہے ہو۔[3]

لیکن اس سلسلے میں پہلی تفسیر ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس دلیل کی بنا پر جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

(۲) **کیا نت نئی چیز کی خواہش انسانی مزاج کا خاصہ نہیں:** اس میں شک نہیں کہ نت نئی چیز کی خواہش انسان کی زندگی کے لوازمات اور خصوصیات میں سے ہے یہ بات انسانی زندگی کا حصہ ہے کہ وہ ایک قسم کی غذا سے اکتا جاتا ہے لہذا یہ کوئی غلط نہیں پھر آخر بنی اسرائیل کیوں تنوع کی درخواست پر لائق سرزنش قرار پائے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتے کے ذکر سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی میں کھانا، سونا، شہوت اور طرح طرح کی لذتیں بنیادی چیز نہیں ہیں ایسے اوقات بھی آتے ہیں کہ ان امور کی طرف توجہ انسان کو اس کی اصل غرض اور اولین مقصد سے دور کر دیتی ہے جو دراصل ایمان، پاکیزگی، تقوی اور اصلاح ذات ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسان ان تمام چیزوں کو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ نت نئی چیز کی خواہش درحقیقت کل کے اور آج کے استعمار گروں کا ایک بہت بڑا جال ہے اور خصوصاً آج کے زمانے میں اس تنوع طلبی سے استفادہ کیا جاتا ہے اور انسان کو قسم قسم کی غذاؤں، لباس، سواری اور مکان کی

---

[1] علاوہ ازیں لفظ "مصراً" کی تنوین اس کے نکرہ ہونے کی دلیل ہے لہذا اس سے شہر مصر مراد نہیں ہو سکتا۔

[2] تفسیر المنار، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[3] تفسیر فی ظلال



خواہش کا اسیر بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے اور ان چیزوں کی قید کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔

(iii) **کیا من و سلویٰ ہر غذا سے بہتر و برتر تھا:** اس میں شک نہیں کہ مختلف سبزیوں کی غذا جس کا بنی اسرائیل حضرت موسیٰ سے تقاضا کرتے تھے انتہائی قیمتی تھی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کو صرف ایک پہلو سے نہیں دیکھنا چاہیئے کیا یہ درست ہے کہ انسان مختلف قسم کی غذاؤں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو قیدی بنالے۔

جب کہ ایک قول کے مطابق "من" ایک پہاڑی شہد ہے یا شہد کی طرح کی ایک طاقت بخش اور مفید میٹھی چیز ہے۔ یہ ایک مفید ترین اور طاقت سے بھرپور غذا تھی۔ اس میں تازہ گوشت میں موجود پروٹین کے اجزاء بھی ایک خاص پرندے سلویٰ کی صورت میں موجود تھے بلکہ وہ کئی جہت سے عام طور پر موجود پروٹین کے اجزاء سے بہتر تھے کیونکہ "من" کا ہضم ہونا بہت آسان ہے جب کہ سلویٰ کے ہضم کے لئے معدے کے کارخانے کو تھکا دینے والی فعالیت کی ضرورت ہے۔[1]

اس ضمن میں متوجہ رہنا چاہیئے کہ لفظ "فوم" جو بنی اسرائیل کے تقاضوں میں سے ہے بعض نے اس کے معنی گندم اور بعض نے لہسن بیان کئے ہیں البتہ ان میں سے ہر ایک خصوصی امتیاز رکھتا ہے لیکن بعض کا نظریہ ہے کہ گندم زیادہ صحیح ہے کیونکہ بعید ہے کہ انہوں نے ایسی غذا طلب کی ہو جس میں گندم نہ ہو۔[2]

(iv) **ذلت کی مہر بنی اسرائیل کی پیشانی پر کیوں ثبت کی گئی:** مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دو لحاظ سے خواری اور ذلت میں گرفتار ہوئے۔ ایک تو یہ ان کا کفر اختیار کرنا، احکام خدا کی خلاف ورزی کرنا اور توحید سے شرک کی طرف منحرف ہونا اور دوسرا یہ کہ وہ حق والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نمائندوں کو قتل کرتے تھے۔ یہ سنگدلی، قساوت اور قوانین الٰہی بلکہ نوع انسانی میں موجود تمام قوانین سے بے اعتنائی کی دلیل ہے جب کہ آج بھی یہودیوں کے ایک گروہ کے پاس وہ قوانین وضاحت سے موجود ہیں۔ یہی ان کی ذلت اور بدبختی کا سبب ہے۔[3]

یہودیوں کی سرنوشت اور ان کی ذلت آمیز زندگی کے بارے میں سورہ آل عمران آیہ ۱۱۲ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔[4]

---

[1] قرآن بر فراز قرون و اعصار، صفحہ ۱۲۳

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] اس وقت جب کہ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ لبنان کی اسلامی سرزمین یہودیوں کی وحشت انگیزیوں اور برباد کن مظالم کی زد میں ہے۔ ہزاروں عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان یہاں تک کہ ہسپتالوں کے بیمار دردناک طریقے سے جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ان کی لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔ البتہ اس سنگدلی کا کفارہ انہیں عنقریب اسی دنیا میں ادا کرنا پڑے گا۔

[4] تفسیر نمونہ، ج ۳۔



۶۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ○

ترجمہ

۶۲۔ جو ایمان لائے ہیں (مسلمان) اور یہودی نصاریٰ اور صابئین (حضرت یحییٰ، حضرت نوح یا حضرت ابراہیم کے پیروکار) جو بھی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح بجالائے ان کی جزا و اجر ان کے پروردگار کے ہاں مسلم ہے اور ان کے لئے (آئندہ یا گذشتہ) کسی قسم کا خوف اور غم نہیں ہے اور ہر دین کے پیروکار جو اپنے عہد میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں ان کے لئے اجر ہے۔

تفسیر

بنی اسرائیل سے مربوط ابحاث میں دراصل قرآن ایک کلی اصول اور عمومی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قدر و قیمت حقیقت و واقعیت کی ہے نہ کہ ظاہریت کی۔ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان خالص اور عمل صالح قابل قبول ہے۔ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں (مسلمان) اسی طرح یہودی، عیسائی اور صابئین (حضرت یحییٰ، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے پیروکار) جو بھی خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آئیں اور نیک عمل انجام دیں ان کا اجر و عوض پروردگار کے پاس مسلم ہے (ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصٰریٰ والصّٰبئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم)۔ لہٰذا انہیں آئندہ کا خوف ہے نہ گذشتہ کا غم (ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

یہ آیت تقریباً اسی عبارت کے ساتھ سورہ مائدہ کی آیہ ۶۹ میں آئی ہے اور کافی فرق کے ساتھ سورہ حج آیہ ۱۷ میں اس مفہوم کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت کے بعد کی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ یہودی اور عیسائی اتراتے تھے کہ ہمارا دین دیگر ادیان سے بہتر ہے اور وہ جنت کو بلا شرکتِ غیرے اپنے لئے مخصوص سمجھتے تھے اور شاید یہی فخر مسلمانوں کی ایک جماعت میں بھی تھا۔ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ ظاہری ایمان (اسلام) عمل صالح کے بغیر چاہے مسلمانوں کا ہو یا یہود و نصاریٰ یا کسی اور دین کے پیروکاروں کا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ خدا اور قیامت کے دن کی بڑی عدالت پر حقیقی اور خالص ایمان جو نیکی اور عمل صالح کے ساتھ ہو وہی خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کا حامل ہے۔ صرف یہی پروگرام جزا اور اطمینان و امان کا باعث ہے۔

ایک اہم سوال

بعض بہانہ ساز مذکورہ بالا آیت کو غلط افکار کے لئے دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ اسے صلح کل کے عنوان سے پیش



کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر مذہب کے پیرو کو اپنے ہی مذہب پر عمل کرنا چاہیئے لہٰذا ان کے نزدیک ضروری نہیں کہ یہودی، عیسائی یا دوسرے مذاہب کے پیروکار آج مسلمان ہو جائیں بلکہ اگر وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح انجام دیں تو کافی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے: ہم واضح طور پر جانتے ہیں کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ قرآن سورہ آل عمران آیہ ۸۵ میں کہتا ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اپنے لئے انتخاب کرے گا تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں قرآن یہود و نصاریٰ اور باقی ادیان کے ماننے والوں کو دعوتِ اسلام دینے والی آیات سے بھرا پڑا ہے۔ اگر مندرجہ بالا تفسیر صحیح ہو تو یہ قرآن کی بہت سی آیات سے صریح تضاد ہو گا لہٰذا ضروری ہے کہ اس آیت کے واقعی اور حقیقی معنی تلاش کئے جائیں۔

اس مقام پر دو تفسیریں سب سے زیادہ واضح اور مناسب نظر آتی ہے۔

(۱) پہلی یہ کہ اگر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے گروہ اپنی کتب کے مضامین پر عمل کریں تو مسلماً رسولِ اسلام پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان کتبِ آسمانی میں مختلف صفات و علامات کے ساتھ آپؐ کے ظہور کی بشارت موجود ہے جس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں آئے گی۔

سورہ مائدہ آیہ ۶۸ میں ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم

کہیے کہ اے اہل کتاب! تمہاری اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک تم تورات، انجیل اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے اسے قائم اور برقرار نہ رکھو (اور اس میں سے ایک رسول اسلام پر ایمان لانا ہے جن کے ظہور کی بشارت تمہاری کتب میں آچکی ہے)۔

(۲) دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس آیت کی نظر ایک سوال کی طرف ہے جو ابتدائے اسلام میں بہت سے مسلمانوں کو مدینہ میں درپیش تھا۔ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اگر راہِ حق و نجات فقط اسلام ہے تو ہمارے آباؤ اجداد کا کیا بنے گا۔ کیا پیغمبرِ اسلام کو نہ پہچاننے اور ان پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں سزا و عذاب کا سامنا ہوگا۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے خبر دی کہ جو شخص اپنے زمانے میں اس وقت کے برحق نبی اور کتاب آسمانی پر ایمان لے آیا ہو اور اس نے عمل صالح انجام دیا ہو وہ نجات یافتہ لوگوں میں ہے اور اس کے لئے فکر و تردد کی کوئی بات نہیں۔

لہٰذا ظہورِ مسیحؑ سے پہلے کے مومنین اور عمل صالح انجام دینے والے یہودی نجات یافتہ ہیں اور یہی صورت ظہورِ رسولِ اسلام سے پہلے کے عیسائی مومنین کی ہے۔

یہی مفہوم مذکورہ آیت کی شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔



چند اہم نکات

(۱) حضرت سلمان کی عجیب و غریب سرگذشت : اس آیت کی تفسیر میں جو شانِ نزول بیان ہوا ہے اُسے یہاں ذکر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

تفسیر جامع البیان (طبری) جلد اول میں منقول ہے :
سلمان اہل جندیشا پوریں سے تھے۔ حاکم وقت کے بیٹے سے ان کی پکی اور نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی۔ ایک دن اکٹھے شکار کے لئے جنگل کی طرف گئے۔ اچانک ان کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ انہوں نے اس شخص سے اس کتاب کے متعلق کچھ سوالات کئے تو راہب نے اُن کے جواب میں کہا: یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں خدا کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی نافرمانی اور معصیت سے منع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں زنا، چوری اور لوگوں کا مال ناحق کھانے سے روکا گیا ہے۔ یہ وہی انجیل ہے جو عیسیٰ مسیح پر نازل ہوئی ہے۔
راہب کی گفتگو نے ان کے دل پر اثر کیا اور بہت تحقیق کے بعد وہ دونوں اس کے دین کے پیرو ہو گئے۔ اُس نے انہیں حکم دیا کہ اس سرزمین کے لوگوں کی ذبح کی ہوئی بھیڑ بکریوں کا گوشت حرام ہے۔
سلمان اور حاکم وقت کا بیٹا روزانہ اس سے مذہبی مسائل سیکھتے تھے۔ عید کا دن آگیا۔ حاکم نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں اشراف اور بزرگان شہر کو دعوت دی گئی اور اس سلسلے میں اس نے اپنے بیٹے سے بھی خواہش کی کہ وہ اس دعوت میں شرکت کرے لیکن اس نے قبول نہ کی۔ اُس نے بہت اصرار کیا تو لڑکے نے بتایا کہ یہ غذا میرے لئے حرام ہے۔ اس نے پوچھا تمہیں یہ حکم کس نے دیا ہے اس پر اس نے راہب کا تعارف کرایا۔ حاکم نے راہب کو بلوایا اور اس سے کہا: چونکہ قتل ہماری نگاہ میں ایک بہت بڑا اور بُرا کام ہے لہٰذا ہم تمہیں قتل نہیں کرتے لیکن تم ہمارے علاقے سے نکل جاؤ۔
سلمان اور ان کے دوست نے اس موقع پر اس راہب سے ملاقات کی اور دوسری ملاقات کا پروگرام "دیر موصل" میں طے پایا۔
راہب کے چلے جانے کے بعد سلمان چند روز تو اپنے باوفا دوست کے منتظر رہے اور وہ بھی سفر کی تیاریوں میں سرگرم تھا لیکن سلمان آخر کار زیادہ صبر نہ کر سکے اور چل پڑے ....
موصل کے گرجے میں سلمان بہت زیادہ عبادت کرتے تھے راہب مذکور جو اس گرجے کا مالک تھا اس نے سلمان کو زیادہ عبادت سے روکنا چاہا اور کہا: کہیں تم ناکارہ ہی نہ ہو جاؤ۔ لیکن سلمان نے اس سے سوال کیا کہ زیادہ عبادت کی فضیلت زیادہ ہے یا کم عبادت کی؟ تو اس نے کہا کہ فضیلت تو زیادہ عبادت ہی کی زیادہ ہے۔
اس کے بعد وہ راہب جو گرجے کا مالک تھا اور وہاں پر موجود دوسرے راہبوں جتنی عبادت نہیں کر



سکتا تھا اس گرجے سے دوسری جگہ چلا گیا اور گرجے کے عالم کو سلمان کے بارے میں سفارش کر گیا۔

کچھ عرصے بعد گرجے کا وہ عالم بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے چلا اور سلمان کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہاں اس نے سلمان کو حکم دیا کہ دن میں علمائے نصاریٰ کے درس میں جائیں اور تحصیل علم و دانش کریں۔ وہ درس وہیں مسجد میں منعقد ہوتے تھے۔

ایک دن اس عالم نے سلمان کو رنجیدہ پایا تو اس کا سبب دریافت کرنے لگا۔ سلمان نے جواب میں کہا: نیکیاں تو گذشتہ لوگوں کے نصیب میں تھیں جو پیغمبرانِ خدا کی خدمت میں رہتے تھے۔ عالم دین نے اسے بشارت دی کہ انہی دنوں ملتِ عرب میں ایک پیغمبر ظہور کرنے والا ہے جو تمام انبیاء سے برتر و بالا ہے۔ عالم مذکور نے مزید کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھے امید نہیں کہ میں انہیں مل سکوں لیکن تم جوان ہو تم انہیں پا سکو گے۔

مزید کہنے لگا: اس پیغمبر کی کئی ایک نشانیاں ہیں۔ ان میں سے خاص نشانی اس کے کندھے پر ہے۔ وہ صدقہ نہیں لیتا اور ہدیہ قبول کرتا ہے۔

موصل کی طرف واپسی کے دوران ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آنے کے نتیجے میں سلمان سے عالم دین کہیں بیابان میں کھو گیا۔

حلب کے دو عرب قبیلے وہاں پہنچے۔ انہوں نے سلمان کو قید کر لیا اور اونٹ پر سوار کر کے مدینہ لے آئے اور انہیں قبیلہ "جہینہ" کی ایک عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔

سلمان اور اس عورت کا ایک غلام باری باری اس عورت کا گلہ روزانہ چرانے کے لئے لے جاتے تھے سلمان نے اس مدت میں کچھ رقم جمع کر لی اور پیغمبر اسلام کی بعثت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک روز وہ ریوڑ چرانے میں مشغول تھے کہ ان کا ساتھی آیا اور کہنے لگا: تمہیں معلوم ہے آج ایک شخص مدینہ میں آیا ہے جس کا خیال ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور خدا کا بھیجا ہوا ہے۔

سلمان نے اپنے ساتھی سے کہا: تم یہاں رہو، میں ہو کر آتا ہوں۔ سلمان شہر میں داخل ہوئے۔ پیغمبر اکرمؐ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ کے گرد چکر لگا رہے تھے اور منتظر تھے کہ پیغمبرؐ کا کرتہ آپؐ کے کندھے سے کسی طرح ہٹے اور آپؐ کے کندھے کے درمیان مخصوص نشان دیکھ سکیں۔ پیغمبرؐ ان کی خواہش کی طرف متوجہ ہوئے، آپؐ نے کرتہ اٹھایا تو سلمان نے وہ نشان (مہر نبوت) دیکھا یعنی پہلی نشانی دیکھ لی۔

پھر وہ بازار چلے گئے۔ کچھ گوشت اور روٹی خریدی اور رسول اللہؐ کی خدمت میں لے آئے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا کیا ہے۔ سلمان نے جواب دیا صدقہ ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں، غریب مسلمانوں کو دے دو تاکہ وہ اسے استعمال کر لیں۔

سلمان دوبارہ بازار گئے پھر کچھ گوشت اور روٹی خریدی اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں لے آئے۔



رسول اللہؐ نے پوچھا کیا ہے۔ سلمان نے جواب دیا ہدیہ ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ آنحضرتؐ اور حاضرین نے اس ہدیہ میں سے کھایا۔

سلمان پر مقصد واضح ہو گیا کیونکہ اسے اپنی تینوں نشانیاں مل گئیں۔ دورانِ گفتگو سلمان نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور دیرِ موصل کے راہبوں کے متعلق باتیں کیں۔ ان کی نماز، روزہ، پیغمبر پر ایمان اور آپؐ کی بعثت کے بارے میں ان کے انتظار کا حال سنایا۔ کسی نے سلمان سے کہا کہ اگر وہ پیغمبر کو پا لیتے تو آپؐ کی پیروی کرتے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریمؐ پر زیرِ بحث آیت نازل ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ادیانِ حق پر حقیقی ایمان رکھتے تھے لیکن وہ پیغمبرِ اسلام کو نہیں پا سکے انہیں کیا اجر ملے گا۔

(۲) صابئین کون ہیں؟ : مشہور عالم راغب مفردات میں لکھتا ہے:

یہ ایک گروہ ہے جو حضرت نوحؑ پیغمبر کا پیروکار تھا۔

ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ کرنا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ لوگ کسی آسمانی دین کے پیرو تھے اور خدا و قیامت پر ایمان رکھتے تھے۔

رہا کہ بعض لوگ انہیں مشرک اور ستارہ پرست کہتے ہیں یا بعض اور لوگ انہیں مجوسی کہتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ حج کی آیت ۱۷ مشرکین اور مجوسیوں کو صابئین کے مدمقابل قرار دیتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یوں ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕیْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا ..

لہٰذا یہ مجوس اور مشرکین کے علاوہ ایک مستقل گروہ ہے۔

صابئین کون لوگ ہیں ـــــ اس بارے میں مفسرین اور ادیان شناس لوگوں کے مختلف اقوال ہیں اور اس لفظ (صابئین) کا اصلی مادہ کیا ہے۔ اس بارے میں بھی بحث ہے۔

شہرستانی نے کتاب "ملل و نحل" میں لکھا ہے کہ صابئہ "صبا" سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ گروہ حق سے ٹیڑھا ہو گیا تھا اور یہ لوگ راہِ انبیاء سے منحرف ہو گئے تھے۔

اس بنا پر انہیں "صابئہ" کہا گیا ہے۔

فیومی کی مصباح المنیر میں ہے کہ صبا کا معنی ہے: وہ شخص جو ایک دین سے نکل کر دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے۔

"فرہنگ دہخدا" میں اس بات کی تائید کی گئی ہے کہ یہ کلمہ عبری ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ "صابئین" جمع ہے صابی عبری کی اور اصل عبری (ص ب ع) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی میں ڈوب جانا یعنی تعمید کرنے والے[1]

جب اس لفظ کو عربی بنایا گیا تو اس کی "ع" ساقط ہو گئی اور "مغتسلہ" جو ایک عرصے سے اس آئین کے پیروکار ہیں

---

[1] غسلِ تعمید عیسائیوں کے ہاں بچوں اور نئے عیسائی ہونے والوں کو دیتے ہیں۔ مترجم



کے ایک مقام کا نام تھا جو خوزستان میں ہے وہ کلمہ "صابی" کا جامع اور صحیح ترجمہ ہے۔

جدید اور معاصر محققین بھی اسے عبری لفظ سمجھتے ہیں۔

"دائرۃ المعارف" فرانسیسی، جلد چہارم صفحہ ۲۳ میں اس لفظ کو عبری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس میں اس لفظ کے معنی پانی کے اندر جانا یا تعمید بیان کئے گئے ہیں۔

ژسینوس سلمانی کہتا ہے: یہ لفظ اگرچہ عبری ہے تاہم احتمال ہے کہ ایسی اصل سے مشتق ہو جس کا معنی ستارہ ہے۔

"کشاف اصطلاح الفنون" کا مؤلف کہتا ہے صابئین ایک گروہ ہے جس کے لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، زبور پڑھتے تھے اور قبلہ کی طرف منہ کرتے تھے۔

کتاب "التنبیہ والاشراف" ص ۱۹۶ پر امثال و حکم کا تذکرہ کرتے ہوئے ابتداء میں کہا گیا ہے کہ زرتشت نے جب مجوس آئین و دین گشتاسب کے سامنے پیش کیا اور اس نے قبول کیا اس سے قبل اس ملک کے لوگ "صفا" مذہب کے پیرو تھے اور وہ صابئین تھے۔ یہ وہ مذہب ہے جسے "یوزاسب" نے "طہورس" کے زمانے میں پیش کیا تھا۔

اس گروہ کے بارے میں اختلافات اور ایسی گفتگو کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جمعیت تھوڑی تھی، وہ اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مصر تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ سے منع کرتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان کا مذہب خصوصی ہے عمومی نہیں اور ان کا پیغمبر انہی کی نجات کے لئے مبعوث ہوا ہے اور بس۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی حالت ایک بھید ہی رہی اور ان کی جمعیت بھی روز بروز ختم ہوتی گئی اور یہ بھی کہ ان کے ہاں مفصل غسل اور طولانی تعمیدوں جیسے خاص احکام تھے یا انہیں سردیوں اور گرمیوں میں انجام دینا پڑتے تھے۔ وہ اپنے ہم مذہب کے علاوہ کسی سے شادی حرام سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں حتی الامکان رہبانیت اور عورتوں سے ترک مباشرت کا تاکیدی حکم تھا اور مسلمانوں سے زیادہ میل جول کی وجہ سے اپنے مذہب کو بدل دیتے تھے۔

(۳) صابئین کے عقائد: ان کے مندرجہ ذیل اہم عقائد تھے:

ان کا اعتقاد تھا کہ پہلی مقدس آسمانی کتاب حضرت آدمؑ پر نازل ہوئی، پھر حضرت نوحؑ پر، ان کے بعد سام پر، پھر رام پر، اس کے بعد ابراہیم خلیل اللہؑ پر، پھر حضرت موسیٰؑ اور اس کے بعد یحییٰ بن زکریاؑ پر نازل ہوئی۔ وہ مقدس کتابیں جو ان کی نگاہ میں اہمیت رکھتی ہیں یہ ہیں:

۱۔ "کنیزاربا" اس کتاب کو "سدرہ" یا "صحف آدم" بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب خلقت کی کیفیت اور موجودات کی پیدائش کے بارے میں بحث کرتی ہے۔

۲۔ کتاب "ادرافشادہی" یا "سدرادہی"۔ یہ حضرت یحییٰ کی زندگی، ان کے احکامات اور تعلیمات کے بارے میں ہے۔

ان کا اعتقاد ہے کہ یہ کتاب جبرئیلؑ کے ذریعہ حضرت یحییٰؑ پر وحی و الہام ہوئی۔

۳۔ کتاب "قلستا": یہ شادی بیاہ کے مراسم کے بارے میں ہے۔

ان کے پاس اور بھی بہت سی کتابیں ہیں اختصار کے لئے ان سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔



محققین کے نزدیک اس دین کے پیروکاروں کی کیفیت دیکھ کر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یحییٰ بن زکریاؑ کے پیرو ہیں۔ اس وقت اس مذہب کے پیرو تقریباً پانچ ہزار افراد خوزستان (دریائے کارون کے کنارے)، اہواز، خرم شہر، ابادان اور شادگان وغیرہ میں رہتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے مذہب کو حضرت یحییٰ بن زکریاؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ مسیحی جنہیں "یحیٰ تعمید دہندہ" یا "یوحنای معمد" کہتے ہیں۔ [1]

کتاب بلوغ الادب کا مؤلف کہتا ہے۔ صابئین ایک بہت بڑی قوم ہے اور ان کے بارے میں اختلاف اس مذہب کے افراد کی معرفت کے لحاظ سے ہے۔

سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جمعیت دو گروہوں مومن اور کافر میں تقسیم ہوتی ہے۔

یہ حضرت ابراہیم خلیلؑ کی وہی قوم ہے جس کی دعوت پر آپؑ مامور تھے۔ یہ لوگ "حران" میں جو صابئین کی سرزمین ہے زندگی گذارتے تھے اور دو طرح کے تھے صابئین حنیف اور صابئین مشرک۔

مشرک، ستاروں، آفتاب، ماہتاب ...... کا احترام کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ نماز و روزہ کو بھی انجام دیتے تھے، کعبہ کو محترم سمجھتے تھے اور حج بھی بجالاتے تھے۔ یہ لوگ مردار، خون اور خنزیر کے گوشت نیز محارم سے نکاح کو مسلمانوں کی طرح حرام سمجھتے تھے۔ اس مذہب کے پیروکاروں میں سے کچھ لوگ بغداد میں حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے جن میں ایک ہلال بن محسن صابی بھی تھا۔

ان لوگوں نے اپنے گمان کے مطابق اپنے دین کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کی اچھائی لے لو اور اس کی برائی سے دور رہو۔ انہیں اسی بنا پر صابئین کہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو کسی دین کے تمام احکام کی انجام دہی کی قید سے سرکشی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ ایک لحاظ سے تمام ادیان کے موافق اور تمام ادیان کے مخالف ہیں۔

صابئین حنیف کا گروہ مسلمانوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اور ان کے مشرک بت پرستوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔

آخر بحث میں ہم دوبارہ ذکر کر دیں کہ اس گروہ کی دو قسمیں ہیں۔ صابئین مشرک اور صابئین حنیف۔ ان دونوں کے درمیان بہت مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ [2]

مندرجہ بالا تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر کسی پیغمبر خدا کے پیروکار تھے اگرچہ جس سے وہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اس پیغمبر کے تعین میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ وہ بہت کم لوگ ہیں جو ختم ہونے کے قریب ہیں۔

۶۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ

---

[1] مزید تفصیلات کے لئے کتاب "آراء و عقائد بشری" کی طرف رجوع کریں۔
[2] اقتباس از بلوغ الادب ج ۲، ص ۲۲۸ و ۲۳۳۔



وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

۶۴- ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

ترجمہ

۶۳- اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہِ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا اور (تمہیں کہا کہ) جو کچھ (آیات و احکام کی صورت میں) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) شاید اس طرح تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

۶۴- اس کے بعد پھر تم نے روگردانی کی اور اگر تم پر خدا کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

تفسیر

ان آیات میں بنی اسرائیل سے تورات میں شامل احکامات پر عمل کرنے کے عہد و پیمان اور پھر ان کی طرف سے اس پیمان کی خلاف ورزی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

کہا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا۔ (و اذ اخذنا میثاقکم) اور کوہِ طور کو تمہارے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔ (ورفعنا فوقکم الطور) اور تمہیں کہا گیا کہ جو آیاتِ الٰہی تمہیں دی گئی ہیں انہیں قدرت و قوت سے تھامو (خذوا ما اٰتینکم بقوۃ) اور اس میں جو کچھ ہے اسے غور و فکر سے دل میں یاد رکھو اور اس پر عمل کرو) تاکہ پرہیزگار ہو جاؤ (واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون)۔

لیکن تم نے اپنے عہد و پیمان کو طاقِ نسیان کر دیا اور اس واقعے کے بعد روگرداں ہو گئے (ثم تولیتم من بعد ذلک) اور اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

چند اہم نکات

(۱) **عہد و پیمان سے مراد:** یہاں عہد و پیمان سے مراد و مقصود وہی ہے جس پر اس سورہ کی چالیسویں آیت میں بحث ہو چکی ہے اور آیت ۸۳ اور ۸۴ میں بھی ہو گی۔

اس عہد و پیمان میں یہ چیزیں شامل تھیں: پروردگار کی توحید پر ایمان رکھنا، ماں باپ، عزیز و اقارب، یتیم اور حاجتمندوں سے نیکی کرنا اور خونریزی سے پرہیز کرنا۔ یہ کلی طور پر ان صحیح عقائد اور زندگی پروگراموں کے بارے میں عہد و پیمان تھا جن کا تورات



میں ذکر کیا گیا تھا۔

سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ خدانے یہودیوں سے پیمان لیا کہ وہ تمام انبیاء پر ایمان رکھیں گے اور ان کی کمک کریں گے اور راہ خدا میں صدقہ اور خرچ کریں گے نیز اس آیت کے آخر میں ضمانت دی گئی ہے کہ اس عہد پر عمل کریں گے تو اہل بہشت میں سے ہو جائیں گے۔

(۲) کوہ طور ان کے سروں پر مسلط کرنے سے کیا مقصود تھا: عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی، ابن زید کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں:

> جس وقت حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے واپس آئے اور اپنے ساتھ تورات لائے تو اپنی قوم کو بتایا کہ میں آسمانی کتاب لے کر آیا ہوں جو دینی احکام اور حلال و حرام پر مشتمل ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے عملی پروگرام قرار دیا ہے۔ اسے لے کر اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس بہانے سے کہ یہ ان کے لئے مشکل احکام ہیں، یہودی نافرمانی اور سرکشی پر تل گئے۔ خدا نے بھی فرشتوں کو مامور کیا کہ وہ کوہ طور کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیں۔ اسی اثناء میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں خبر دی کہ عہد و پیمان باندھ لو، احکام خدا پر عمل کرو، سرکشی و بغاوت سے توبہ کرو تو تم سے یہ عذاب ٹل جائے گا ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ اس پر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ تورات کو قبول کیا اور خدا کے حضور سجدہ کیا۔ جب کہ ہر لحظہ وہ کوہ طور کے اپنے سروں پر گرنے کے منتظر تھے لیکن بالآخر ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

یہی مضمون سورہ بقرہ آیہ ۹۳ میں، سورہ نساء آیہ ۱۵۴ میں اور سورہ اعراف آیہ ۱۷۱ میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوہ طور کے بنی اسرائیل کے سروں پر مسلط ہونے کی کیفیت کے سلسلے میں مفسرین کی ایک جماعت کا اعتقاد ہے کہ حکم خدا سے کوہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور سائبان کی طرح ان کے سروں پر مسلط ہو گیا۔ (اعراف۔ ۱۷۱)[1] جب کہ بعض دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ میں سخت قسم کا زلزلہ آیا، پہاڑ اس طرح لرزنے اور حرکت کرنے لگا کہ جو لوگ پہاڑ کے دامن میں تھے انہوں نے پہاڑ کے ایک حصے کا سایہ اپنے سروں پر واضح طور پر دیکھا، ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی وقت وہ ان کے سروں پر آگرے گا لیکن خدا کے لطف و کرم سے زلزلہ رک گیا اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہو گیا۔[2] یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا زلزلے اور شدید بجلی کے زیر اثر اپنی جگہ سے اکھڑ کر ان کے سروں کے اوپر سے بحکم خدا اس طرح گزرا ہو کہ چند لمحے انہوں نے اسے اپنے سروں پر دیکھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے لیکن یہ عذاب ان سے ٹل گیا اور وہ ٹکڑا کہیں دور جا گرا۔

---

[1] مجمع البیان اور بعض دیگر تفاسیر۔

[2] المنار زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



(۳) کیا اس عہد و پیمان میں جبر کا پہلو ہے: اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ ان کے سروں پر پہاڑ کا مسلط ہونا ڈرانے دھمکانے کے طور پر تھا نہ کہ جبر و اضطرار کے طور پر ورنہ جبری عہد و پیمان کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔
لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ سرکش اور باغی افراد کو تہدید و سزا کے ذریعے حق کے سامنے جھکایا جائے۔ یہ تہدید اور سختی جو وقتی طور پر ہے ان کے غرور کو توڑ دے گی۔ انہیں صحیح غور و فکر پر ابھارے گی اور اس راستے پر چلتے چلتے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔

بہرحال یہ پیمان زیادہ تر عملی پہلوؤں سے مربوط تھا ورنہ عقائد کو تو جبر و اکراہ سے نہیں بدلا جاسکتا۔

(۴) کوہ طور: طور سے مراد یہاں اسم جنس ہے یا یہ مخصوص پہاڑ ہے۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں۔
بعض کہتے ہیں کہ طور اسی مشہور پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل ہوئی۔
لیکن بعض کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ طور لغوی معنی کے لحاظ سے مطلق پہاڑ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورہ اعراف کی آیہ ۱۷۱ میں "جبل" سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ

(۵) **خذوا ما اتیناکم بقوۃ** کا مفہوم: اس جملے کی تفسیر میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آنجنابؑ سے لوگوں نے پوچھا:

قوة الابدان او قوة القلب

قوت و طاقت آیاتِ الٰہی تھامنے سے مراد قوت جسمانی ہے یا قوت معنوی۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

فیهما جمیعا

جسمانی و معنوی سب طاقتیں مراد ہیں[1]

یہ حکم تمام آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے لئے ہے کہ ہر زمانے میں ان تعلیمات کی حفاظت و اجراء کے لئے مادی و روحانی دونوں قسم کی قوتوں اور توانائیوں کے ساتھ تیار رہیں۔

۶۵۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ○

۶۶۔ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ○

---

[1] تفسیر المیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ محاسن برقی۔



ترجمہ

۶۵۔ جنہوں نے ہفتے کے دن کے بارے میں حکم کی نافرمانی اور گناہ کیا۔ تمہیں ان کی حالت کا علم ہے کہ انہیں ہم نے دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں کر دیا۔

۶۶۔ ہم نے عذاب کے اس واقعے کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت قرار دیا ہے اور پرہیزگاروں کے لئے اسے نصیحت بنایا ہے۔

تفسیر

یہ دو آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح یہودیوں کی عصیان و نافرمانی کی روح اور مادی امور کی طرف ان کی شدید رغبت اور وابستگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پہلے کہا گیا ہے: تم ان کی حالت کو تو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن کے بارے میں نافرمانی اور گناہ کیا تھا (ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت)۔

نیز تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ہم نے ان کو کہا کہ دھتکارے ہوئے بندروں کی طرح ہو جاؤ (فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین)

ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد کے زمانوں کے لئے بھی درس عبرت قرار دیا ہے (فجعلنٰھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا)۔

اور اسی طرح پرہیزگاروں کے لئے بھی پند و نصیحت قرار دیا ہے (وموعظۃ للمتقین)۔

اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے یہودیوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہفتے کے دن تعطیل کیا کریں۔ ان میں سے کچھ لوگ دریا کے کنارے رہتے تھے اور آزمائش و امتحان کے طور پر انہیں حکم ملا کہ اس دن مچھلیاں نہ پکڑیں لیکن دوسرے دنوں کے برعکس ہفتے کے دن مچھلیاں بڑی کثرت سے پانی کی اوپر والی سطح پر ظاہر ہو جاتی تھیں لہٰذا وہ کوئی حیلہ سوچنے لگے اور ایک قسم کے شرعی بہانے سے انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑ لیں۔ خدا تعالیٰ نے اس جرم کی سزا دی اور اُن کے انسانی چہرے حیوانی شکل میں بدل گئے۔

ان کے چہروں کا مسخ اور تبدیل ہونا جسمانی طور پر تھا یا نفسیاتی و اخلاقی طور پر، نیز یہ کہ یہ لوگ کہاں رہتے تھے اور کون سے بہانے کے ذریعے انہوں نے مچھلیاں پکڑی تھیں۔ ان تمام سوالات کے جوابات اور اس سلسلے کے دوسرے مسائل اسی تفسیر کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۳ سے ۱۶۶ تک کے ذیل میں آئیں گے۔

جملہ کونوا قردۃ خاسئین[1] سرعتِ عمل سے کنایہ ہے یعنی ایک اشارے اور فرمان سے تمام نافرمانوں کے چہرے

---

[1] خاسئ "خسأ" مادہ سے ہے جس کا معنی ذلت کے ساتھ دھکیلنا ہے۔ یہ لفظ اصل میں کتے کو دور کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں اس سے دھتکارنے کا وسیع تر معنی لیا گیا ہے جس میں حقارت شامل ہے لہٰذا یہ لفظ دوسرے مواقع پر بھی استعمال ہونے لگا۔



بدل گئے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں یوں منقول ہے:

مابین یدیھا سے اس زمانے کی نسل اور **ما خلفھا** سے مراد ہم مسلمان ہیں یعنی یہ درس عبرت بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں بلکہ یہ تمام انسانوں کے لئے ہے[1]

٦٧۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○

٦٨۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ
وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ○

٦٩۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ
فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ○

٧٠۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ
شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ○

٧١۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ
مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا
ع ٨ كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ○

٧٢۔ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ ج

٧٣۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

٧٤۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔



مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ○

ترجمہ

۶۷۔ اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو (اور اس کے بدن کا ایک ٹکڑا اس مقتول کے ساتھ لگاؤ جس کا قاتل نہیں پہچانا جا رہا تا کہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے اور یہ شور و غوغا ختم) وہ کہنے لگے تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ (موسیٰ نے کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں (اور کسی سے مذاق و استہزاء کروں)۔

۶۸۔ وہ کہنے لگے (تو پھر) اپنے خدا سے یہ کہو کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ کس قسم کی گائے ہونا چاہیئے۔ اُس نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ گائے نہ بوڑھی ہو کر جو کام سے رہ گئی ہو اور نہ بالکل جوان ہو بلکہ ان کے درمیان ہو جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو۔

۶۹۔ وہ کہنے لگے! اپنے خدا سے کہو ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ وہ کہنے لگا: خدا فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی ہو ایسے رنگ کی جو دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔

۷۰۔ وہ کہنے لگے اپنے خدا سے کہیے کہ وہ واضح کرے کہ وہ کس قسم کی گائے ہو کیونکہ یہ گائے تو ہمارے لئے مبہم ہو گئی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے۔

۷۱۔ اُس نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی سینچے، بھلی چنگی اور ایک رنگ کی ہو جس میں کوئی دھبہ تک نہ ہو۔ وہ کہنے لگے اب (جاکے) ٹھیک ٹھیک بیان کیا اور پھر انہوں نے (ایسی گائے تلاش کی) اور اسے ذبح کیا حالانکہ وہ مائل نہ تھے کہ اس کام کو انجام دیں۔

۷۲۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر (اس کے قاتل کے بارے میں) تم میں پھوٹ پڑ گئی اور خدا نے (اس حکم کے ذریعے جو مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) اسے آشکار کر دیا جسے تم چھپا رہے تھے۔

۷۳۔ پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے ساتھ لگا دو (تا کہ وہ زندہ ہو کر قاتل کی نشاندہی کر دے)۔ اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ سکو۔

۷۴۔ پھر اس واقعے کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ کچھ پتھر تو وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جن میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ان میں سے پانی کے قطرات ٹپکتے ہیں اور ان میں سے بعض خوفِ خدا سے (پہاڑ کی بلندی سے) نیچے گر جاتے ہیں (لیکن تمہارے دل نہ خوفِ خدا سے دھڑکتے ہیں اور نہ ہی وہ علم و دانش اور انسانی احساسات کا سرچشمہ ہیں) اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔



تفسیر

بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہم مختصر طور پر جو دیگر واقعات پڑھ چکے ہیں ان کے برعکس ان آیات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ یہ واقعہ قرآن میں صرف ایک ہی دفعہ ذکر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں ایسے بہت سے نکات بھی نظر آتے ہیں جو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ان میں سے بنی اسرائیل کی بہانہ سازی اس ساری داستان میں واضح ہے نیز حضرت موسیٰؑ کی گفتگو سے ان کے ایمان کے درجات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ تمام چیزوں سے قطع نظر یہ واقعہ مسئلہ معاد و قیامت کی زندہ سند اور گواہ ہے۔

پہلے ہم اس واقعے کی تشریح اور آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں بعد ازاں اس کے نکات کی طرف جائیں گے۔

جیسا کہ آیاتِ قرآن اور اقوال مفسرین سے ظاہر ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نامعلوم طور پر قتل ہو جاتا ہے اس کے قاتل کا کسی طرح پتہ نہیں چلتا۔ بنی اسرائیل کے قبائل کے درمیان جھگڑا اور نزاع شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے اور اپنے تئیں بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کے لئے مقدمہ حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ آپ سے اس موقع پر مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس کا حل چاہتے ہیں۔ چونکہ عام اور معروف طریقوں سے اس قضیے کا فیصلہ ممکن نہ تھا اور دوسری طرف اس کشمکش کے جاری رہنے سے ممکن تھا بنی اسرائیل میں ایک عظیم فتنہ کھڑا ہو جاتا لہٰذا جیسا کہ آپ ان آیات کی تفسیر میں پڑھیں گے حضرت موسےٰ پروردگار سے مدد لے کر اعجاز کے راستے اس مشکل کو حل کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] اس طرف توجہ ضروری ہے کہ موجودہ تورات کی فصل ۲۱ سفر تثنیہ میں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ موجود ہے البتہ موجودہ تورات میں جو کچھ ہے وہ ایک حکم کی صورت میں ہے جب کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ واقعے کی ایک صورت میں ہے۔ بہر حال فصل ۲۱ میں پہلے جملے سے نویں جملے تک کی عبارت کچھ یوں ہے :

> اگر کسی مقتول کو ایسی زمین میں جو خداوند خدا نے تجھے میراث دی ہے، صحرا میں پڑا دیکھو اور معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا قاتل کون ہے۔ اس وقت تیرے مشائخ اور قاضی باہر جا کر ان شہروں کے فاصلے کی پیمائش کریں جو مقتول کے اردگرد ہیں اور وہی شہر مقرب ہے جو مقتول کے زیادہ قریب ہے۔
>
> اس شہر کے مشائخ ہی اس گائے کو درہ ناہموار میں ایسی جگہ لے جائیں جہاں کوئی کھیتی باڑی نہ ہوئی ہو۔ وہیں درہ کے دروازے پر گائے کی گردن کاٹ دیں۔ بنی لیوی کے کاہن حضرات نزدیک آئیں۔ خداوند تیرے خدا نے انہیں منتخب کیا ہے تاکہ وہ اس کی خدمت کریں اور خدا کے نام کے ساتھ دعائے خیر کریں اور نزاع اور جھگڑے کا فیصلہ ان کے حکم کے مطابق ہو اور وہ شہر جو قتل کے نزدیک ہے اس کے تمام مشائخ اپنے ہاتھ اس گائے پر دھوئیں جو درہ (باقی آئندہ صفحہ پر)



فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا (قاتل کو تلاش کرنے کے لئے) پہلی گائے (جو تمہیں مل جائے) اس کو ذبح کرو (واذ قال موسیٰ لقومہٖ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ)۔

انہوں نے بطورِ تعجب کہا: کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو (قالوا اتتخذنا ھزوا)۔

موسیٰ نے ان کے جواب میں کہا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں (قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین)۔ یعنی استہزاء اور تمسخر کرنا نادان اور جاہل افراد کا کام ہے اور خدا کا رسول یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اس کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ استہزاء و مذاق نہیں بلکہ سنجیدہ گفتگو ہے تو کہنے لگے: اب اگر ایسا ہی ہے تو اپنے پروردگار سے کہیے کہ ہمارے لئے مشخص و معین کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی)۔ "اپنے خدا سے کہو" ان کے سوالات میں یہ جملہ بتکرار آیا ہے۔ اس میں ایک طرح کا سوئے ادب یا سربستہ استہزاء و مذاق پایا جاتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے تھے "ہمارے خدا سے دعا کیجئے" کیا وہ حضرت موسیٰؑ کے خدا کو اپنے خدا سے جدا سمجھتے تھے۔

بہر حال حضرت موسیٰؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: خدا فرماتا ہے ایسی گائے ہو جو نہ بہت بوڑھی ہو کر بے کار ہو چکی ہو اور نہ ہی جوان بلکہ ان کے درمیان ہو (قال انہ یقول انھا بقرۃ لا فارض ولا بکر عوان بین ذلک)[1]۔

اس مقصد کے لئے کہ وہ اس سے زیادہ اس مسئلے کو طول نہ دیں اور بہانہ تراشی سے حکم خدا میں تاخیر نہ کریں اپنے کلام کے آخر میں مزید کہا: جو تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو (فافعلوا ما تؤمرون)۔

لیکن انہوں نے پھر بھی زیادہ باتیں بنانے اور ڈھٹائی دکھانے سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور کہنے لگے: اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما لونھا)۔

موسیٰؑ نے جواب میں کہا: وہ گائے ساری کی ساری زرد رنگ کی ہو جس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا لگے (قال انہ یقول انھا بقرۃ صفراء فاقع لونھا تسر النظرین)[2]۔

خلاصہ یہ کہ وہ گائے مکمل طور پر خوش رنگ اور چمکیلی ہو۔ ایسی دیدہ زیب کہ دیکھنے والوں کو تعجب میں ڈال دے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اسی طرح ہر مرتبہ بہانہ جوئی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کے دروازے پر ذبح ہوئی ہے اور باآواز کہیں کہ یہ خون ہمارے ہاتھوں نے نہیں بہایا اور ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ اے خداوندا! اپنی قوم اسرائیل کو کہ جسے دوبارہ تو نے خرید کیا ہے بخش دے اور اپنی قوم اسرائیل کو خون ناحق سے منسوب نہ کر اور وہ خون ان کے لئے معاف ہو جائے گا۔ اس طریقے سے خونِ ناحق اپنے درمیان سے رفع کرے گا۔ کیونکہ خداوند کی نظر میں وہی درست ہے جسے تو عمل میں لائے گا۔ (عہد قدیم مطبوعہ ۱۸۷۸ء)

[1] "فارض" کے متعلق راغب مفردات میں کہتا ہے کہ یہ سن رسیدہ گائے کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ایسی بوڑھی جس سے بچہ نہ ہو سکے اور "عوان" کا معنی ہے درمیانی۔

[2] "فاقع" کا معنی ہے خالص، ایک جیسا زرد رنگ۔



مشکل میں ڈالتے گئے۔ پھر کہنے لگے اپنے پروردگار سے کہیے کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ گائے (کام کرنے کے لحاظ سے) کیسی ہونی چاہیئے، (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی)۔ کیونکہ یہ گائے ہمارے لئے مبہم ہوگئی ہے (ان البقر تشابہ علینا) اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے (و انا ان شاء اللہ لمھتدون)۔

حضرت موسیٰ نے پھر سے کہا: خدا فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہو جو اتنی سدھائی ہوئی نہ ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے (قال انہ یقول انھا بقرۃ لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث) ہر عیب سے پاک ہو (مسلمۃ) حتیٰ کہ اس میں کسی قسم کا دوسرا رنگ نہ ہو (لا شیۃ فیھا)۔

اب کے بہانہ سازی کے لئے ان کے پاس کوئی سوال باقی نہ تھا۔ جتنے سوالات وہ کر سکتے تھے سب ختم ہو گئے تو کہنے لگے: اب تو نے حق بات کہی (قالوا الآن جئت بالحق)

پھر جس طرح ہو سکا انہوں نے وہ گائے مہیا کی اور اسے ذبح کیا لیکن دراصل وہ یہ کام کرنا نہ چاہتے تھے (فذبحوھا وما کادوا یفعلون)

اس واقعے کی جزئیات بیان کرنے کے بعد قرآن دوبارہ یہ تمام واقعہ بعد کی دو آیات میں مختصراً اس طرح بیان کرتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا پھر اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے اور خدا نے (ایک حکم کے ذریعے جو مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) جس چیز کو تم چھپائے ہوئے تھے آشکار کر دیا (و اذ قتلتم نفساً فادٰرئتم فیھا واللہ مخرج ما کنتم تکتمون)۔

پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارو (تاکہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے) (فقلنا اضربوہ ببعضھا) بے شک خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے (کذالک یحیی اللہ الموتیٰ)۔

اور وہ تمہیں اپنی اس قسم کی آیات دکھاتا ہے تاکہ تم حقیقت کو پا سکو (ویریکم آیاتہ لعلکم تعقلون)۔

زیر بحث آیات میں سے آخری میں بنی اسرائیل کی قساوت اور سنگدلی کو بیان کیا گیا ہے: ان تمام واقعات کے بعد اور اس قسم کی آیات و معجزات دیکھنے کے باوجود تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہیں اور اس سے بھی زیادہ (ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ) کیونکہ کچھ پتھر تو ایسے ہیں جن میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں (وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار) یا پھر بعض وہ ہیں جن میں شگاف پڑ جاتا ہے اور ان میں سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگتے ہیں (وان منھا لما یشقق فیخرج منہ الماء) اور کبھی ان میں سے کچھ پتھر (پہاڑ کی بلندی سے) خوف خدا کے باعث گر پڑتے ہیں (وان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ) لیکن تمہارے دل تو ان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ان سے علم و عواطف کا چشمہ جوش مارتا ہے نہ محبت کے قطرات ٹپکتے ہیں اور نہ ہی یہ کبھی خوف خدا سے دھڑکتے ہیں۔

آخری جملے میں ہے: جو کچھ تم انجام دے رہے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔

یہ دراصل اس گروہ بنی اسرائیل اور ان کے خطوط پر چلنے والے تمام لوگوں کے لئے تہدید ہے۔



چند اہم نکات

(۱) زیادہ اور غیر مناسب سوالات: اس میں شک نہیں کہ سوالات مشکلات کے حل کی کلید ہیں اور جہل و نادانی کو دُور کرنے کا نسخہ ہیں لیکن ہر چیز کی طرح اگر یہ بھی حد سے تجاوز کر جائیں یا بے موقع کئے جائیں تو کجروی کی علامت ہیں اور نقصان دہ ہیں جیسے اس داستان میں ہم اس کا نمونہ دیکھ رہے ہیں۔

بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس گائے کی کوئی قید یا خاص شرط ہوتی تو خدائے حکیم و دانا جب انہیں حکم دے رہا تھا اسی وقت بیان کر دیتا لہٰذا معلوم ہوا کہ اس حکم کو بجالانے کے لئے کوئی اور شرط نہ تھی اسی لئے لفظ "بقرۃ" اس مقام پر نکرہ کی شکل میں ہے لیکن وہ اس مسلمہ بنیاد سے بے پرواہ ہو کر طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ شاید وہ یہ چاہتے ہوں کہ حقیقت مشتبہ ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور یہ اختلاف اسی طرح بنی اسرائیل میں رہے، اور قرآن کا یہ جملہ "فذبحوھا وما کادوا یفعلون" بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی "انہوں نے گائے ذبح کر تو دی لیکن وہ چاہتے نہ تھے کہ یہ کام انجام پائے"۔

اس داستان کے سلسلے کی آیت ۲، سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک گروہ قاتل کو جانتا تھا اور اصل واقعے سے مطلع تھا۔ شاید یہ قتل ان کے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا کیونکہ اس آیت میں ہے "واللہ مخرج ما کنتم تکتمون" یعنی "تم جسے چھپاتے ہو خدا اُسے آشکار کرے گا"۔

ان سب سے قطع نظر ہٹ دھرم اور خود پسند قسم کے لوگ باتیں بنایا کرتے ہیں اور زیادہ سوالات کرتے ہیں اور ہر چیز کے لئے بہانہ سازی کیا کرتے ہیں۔ قرآن نشاندہی کرتے ہیں کہ اصولی طور پر وہ نہ خدا کے متعلق معرفت رکھتے تھے اور نہ ہی حضرت موسیٰ کے مقام کو سمجھتے تھے اسی لئے تو ان سب سوالوں کے بعد یہ کہنے لگے "الآن جئت بالحق" یعنی "اب تم حق بات لائے ہو" گویا اس سے پہلے جو کچھ تھا باطل تھا۔

بہر حال انہوں نے جتنے سوالات کئے خدا نے ان کی ذمہ داری کو اتنا ہی سخت تر کر دیا کیونکہ ایسے لوگ اسی قسم کے بدلے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسی لئے روایات میں ہے کہ جس مقام پر خدا نے خاموشی اختیار کی ہے وہاں پوچھ گچھ اور سوال نہ کرو کیونکہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔ اسی بناء پر امام علی بن موسیٰؑ الرضا سے روایت ہے:

اگر انہوں نے ابتداء ہی میں کوئی گائے منتخب کر لی ہوتی اور اسے ذبح کر دیتے تو کافی تھا۔

ولکن شددوا فشدد اللہ علیھم

لیکن انہوں نے سختی کی تو خدا نے بھی سخت رویہ اختیار کیا۔[1]

(۲) یہ تمام اوصاف کس لئے تھے: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ابتداء میں بنی اسرائیل کی ذمہ داری مطلق تھی اور اس میں

---

[1] المیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر عیاشی



کوئی قید اور شرط نہ تھی لیکن ان کی شدت اور ذمہ داری ادا کرنے میں پس و پیش نے ان کے لئے حکم کو بدل دیا اور وہ زیادہ سخت ہو گیا۔[1]

لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں جو شرائط اور قیود لگائی گئیں وہ انسانی برادری کی اجتماعی زندگی کی کسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں۔ گویا قرآن اس نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ ایک ایسی حیات بخش صورت کی ضرورت ہے جو ذلول نہ ہو یعنی بلاشرط تسلیم ہو اور قید و شرط کی وجہ سے بوجھل، اسیر اور زیر دست نہ ہو اور یونہی اس میں مختلف رنگ بھی نظر نہیں آنے چاہئیں بلکہ یک رنگ اور خالص ہو۔

جو لوگ رہبری اور معاشرے کو زندہ کرنے کے لئے اٹھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مردہ دلوں اور مردہ افکار کو زندہ کیا جائے انہیں دوسروں کا مطیع نہیں ہونا چاہیئے۔ مال و ثروت، فقر و تونگری، طاقت اور افرادی قوت یہ چیزیں ان کے مقصد پر اثر انداز نہ ہوں۔ خدا کے علاوہ کوئی چیز ان کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ وہ صرف حق کے لئے سر تسلیم خم کریں۔ وہ دین و آئین کے پابند ہوں۔ ان کے وجود پر خدائی رنگ کے علاوہ کوئی رنگ اثر پذیر نہ ہو۔ ایسے ہی لوگ اضطراب اور تشویش کے بغیر لوگوں کے کام آسکتے ہیں لیکن اگر دل دنیا کی طرف مائل ہو اور دنیا کا غلام ہو، اس پر مادیت رنگ چڑھ گیا ہو اور اس رنگ کی وجہ سے وہ عیب دار ہو جائے تو ایسا شخص اس عیب اور نقص کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کر سکتا اور نہ حیات بخش صورت پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) قتل کا سبب کیا تھا: تواریخ اور تفاسیر سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا سبب مال تھا یا شادی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک ثروت مند تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اس دولت کا وارث اس کے ایک چچا زاد بھائی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ دولت مند کافی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے چچا زاد بھائی نے بہت انتظار کیا کہ وہ دنیا سے چلا جائے تاکہ اس کا وارث بن سکے لیکن اُس کا انتظار بے نتیجہ رہا لہٰذا اس نے اسے ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا اور بالآخر اسے تنہائی میں پا کر قتل کر دیا اور اس کی لاش سڑک پر رکھ دی اور گریہ و زاری کرنے لگا اور حضرت موسیٰؑ کی بارگاہ میں مقدمہ پیش کیا کہ بعض لوگوں نے میرے چچا زاد بھائی کو قتل کر دیا ہے۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ قتل کا سبب یہ تھا کہ اپنے چچا زاد بھائی کو قتل کرنے والے نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس نے یہ درخواست رد کر دی اور لڑکی کو بنی اسرائیل کے ایک نیک اور پاکباز جوان سے بیاہ دیا۔ شکست خوردہ چچا زاد نے لڑکی کے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا اور چھپ کر اسے قتل کر دیا اور حضرت موسیٰؑ کے پاس شکایت لے کر آیا کہ اس کا چچا زاد بھائی قتل ہو گیا اور اس کے قاتل کو تلاش کیا جائے۔

چونکہ قرآن کا طریق کار ہے کہ گذشتہ واقعات کو ہمہ گیر حیثیت سے اور قاعدہ و کلیہ کے طور پر تربیتی نقطہ نظر سے بیان کرے لہٰذا ضمناً یہ بھی ممکن ہے اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ مفاسد کا سرچشمہ اور قتل و غارت کی وجہ دو موضوعات رہتے ہیں ایک ثروت و دولت اور دوسرا بے قید جنسی خواہشات۔

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل سے پہلے نسخ حکم مصالح کے پیش نظر جائز ہے اور شریعت موسیٰؑ میں نسخ احکام ہوتا تھا۔ یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ کبھی سخت حکم سزا کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی دیگر بحثیں اپنے اپنے مقام پر بیان موجود ہیں۔



(۴) اس داستان کے عبرت خیز نکات : یہ عجیب داستان خدا کی ہر چیز پر لامتناہی قدرت کی دلیل کے علاوہ مسئلہ معاد پر بھی دلالت کرتی ہے۔ اسی لئے آیہ ۷۳ میں ہے: "کذٰلک یحیی اللہ الموتیٰ" یعنی اسی طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے اور "ویریکم آیاتہ" وہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے" پروردگار کی قدرت و عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ آیت اس بات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ اگر خدا کسی گروہ پر غضبناک ہوتا ہے تو ایسا بغیر وجہ اور دلیل کے نہیں ہوتا کیونکہ اس واقعے میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے سامنے جو باتیں کرتے تھے وہ نہ صرف حضرت کے ساتھ انتہائی جسارت آمیز سلوک تھا بلکہ خدا تعالیٰ کی مقدس بارگاہ کے لحاظ سے بھی بے ادبی اور جسارت تھی۔

ابتدا میں کہتے ہیں "کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو" گویا خدا کے عظیم پیغمبر کو مذاق کا الزام دے رہے تھے۔ بعض اوقات کہتے "اپنے خدا سے خواہش کرو" تو کیا موسیٰؑ کا خدا ان کے خدا کے علاوہ کوئی اور تھا۔ جب کہ حضرت موسیٰؑ انہیں صراحت سے کہہ چکے تھے کہ "خدا نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر اس سوال کا جواب دے دو تو ہم ہدایت حاصل کر لیں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا بیان ناکمل اور گمراہی کا سبب ہے اور آخر میں کہتے ہیں "اب حق بات لے آئے ہو"

یہ سب باتیں ان کی جہالت، نادانی، خود خواہی اور ہٹ دھرمی پر دلالت کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ داستان ہمیں درس دیتی ہے کہ ہمیں سخت گیر نہیں ہونا چاہیئے تا کہ خدا بھی ہم پر سختی نہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ شاید گائے کو ذبح کرنے کے لئے اس لئے منتخب کیا گیا ہو کہ بچی کھچی گاؤ پرستی اور بت پرستی کی نکران کے دماغ سے نکل جائے۔

باپ سے نیکی

اس موقع پر مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اس قسم کی گائے اس علاقے میں ایک ہی تھی۔ بنی اسرائیل نے اسے بہت مہنگے داموں خریدا۔ کہتے ہیں اس گائے کا مالک ایک انتہائی نیک آدمی تھا جو اپنے باپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک دن جب اس کا باپ سویا ہوا تھا اسے ایک نہایت نفع بخش معاملہ درپیش آیا، صندوق کی چابی اس کے باپ کے پاس تھی لیکن اس خیال سے کہ تکلیف اور بے آرامی نہ ہو اس نے اسے بیدار نہ کیا لہٰذا اس معاملے سے صرف نظر کر لیا۔ بعض مفسرین کے نزدیک بیچنے والا ایک جنس ستر ہزار میں اس شرط پر بیچنے کو تیار تھا کہ قیمت فوراً ادا کی جائے اور قیمت کی ادائیگی اس بات پر موقوف تھی کہ خریدنے کے لئے اپنے باپ کو بیدار کر کے صندوقوں کی چابیاں اس سے حاصل کرے۔ وہ ستر ہزار میں خریدنے کو تو تیار تھا لیکن کہتا تھا کہ قیمت باپ کے بیدار ہونے پر ہی دوں گا۔ خلاصہ یہ کہ سودا نہ ہو سکا۔ خداوند عالم نے اس نقصان اور کمی کو اس طرح پورا کیا کہ اس جوان کے لئے گائے کی فروخت کا یہ نفع بخش موقع فراہم کیا۔

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ باپ بیدار ہوا تو اسے واقعے سے آگاہی ہوئی۔ اس نیکی کی وجہ سے اس نے وہ گائے اپنے بیٹے کو بخش دی اس طرح اسے دولے پناہ نفع میسر آیا[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج اول



رسولِ اسلام اس موقع پر فرماتے ہیں۔

انظروا الی البر ما بلغ باھلہ

نیکی کو دیکھو وہ نیکوکار سے کیا کرتی ہے [1]

۷۵۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰہِ
ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ○

۷۶۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا
اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ○

۷۷۔ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ○

ترجمہ

۷۵۔ کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تم پر (یعنی۔ تمہارے آئین کے احکامات پر) ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کلام خدا کو سنتا تھا اور سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتا تھا جب کہ وہ لوگ علم و اطلاع بھی رکھتے تھے۔

۷۶۔ جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے سے خلوت کرتے ہیں تو ان میں سے بعض دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان مطالب کو مسلمانوں کے سامنے کیوں دہراتے ہو جو خدا نے (رسول اسلام کی صفات کے بارے میں) تم سے بیان کئے ہیں کہ کہیں (قیامت کے دن) بارگاہِ الٰہی میں تمہارے خلاف وہ ان سے استدلال کریں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

۷۷۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے واقف ہے۔

تفسیر

شانِ نزول

بعض مفسرین مندرجہ بالا آخری دو آیات کے شانِ نزول کے سلسلے میں امام باقرؑ سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج اول، ص ۹۹



یہودیوں کے ایک گروہ کے لوگ جو حقیقت کے دشمن نہ تھے۔ جب مسلمانوں سے ملاقات کرتے تو جو تورات میں پیغمبر اسلامؐ کی صفات کے متعلق آیا تھا انہیں سنا دیتے تھے۔ یہودیوں کے بڑے لوگ اس سے آگاہ ہوئے اور انہیں منع کیا اور کہا کہ محمدؐ کی وہ صفات جو تورات میں آئی ہیں تم انہیں ان کے سامنے بیان نہ کرو کہ کہیں خدا کے سامنے ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ بن جائیں۔ یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔ [1]

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ان آیات میں خدا بنی اسرائیل کا واقعہ چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کر رہا ہے اور ایک سبق آموز نتیجہ پیش کرتا ہے۔

کہتا ہے: تم کس طرح یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ قوم تم پر (یعنی تمہارے دین کے احکامات پر) ایمان لے آئے گی، حالانکہ ان میں سے ایک گروہ خدا کی باتیں سننے، سمجھنے اور ادراک کرنے کے بعد ان میں تحریف کر دیتا ہے۔ جب کہ ان لوگوں کو علم و اطلاع بھی ہے (افتطمعون ان یؤمنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلم اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ و ھم یعلمون)۔

اگر تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ قرآن کے زندہ بیانات اور پیغمبر اسلامؐ کے اعجاز کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے تو اسے اہمیت نہ دو کیونکہ یہ انہی لوگوں کی اولاد ہیں جو قوم کے منتخب افراد کی حیثیت سے موسیٰ بن عمران کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے، انہوں نے خدا کی باتیں سنی تھیں اور اس کے احکام کو سمجھا تھا لیکن ان میں سے بعض جب لوٹ کر آئے تو کلام خدا میں تحریف کر دی۔

"قد کان فریق منھم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب تحریف کرنے والے نہ تھے۔ پھر بھی یہ اس بات کے لئے کافی تعداد تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں کے عناد و دشمنی پر تعجب نہ کیا جائے۔

اسباب النزول میں ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ جب کوہ طور سے واپس آیا تو لوگوں سے کہنے لگا کہ ہم نے خود سنا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہمارے فرائض کو جتنا بجا لا سکتے ہو انجام دو اور جنہیں بجا نہیں لا سکتے انہیں چھوڑ دو۔

بہر حال ابتدا میں یہ توقع بجا تھی کہ قوم یہود دوسروں سے پہلے اسلام کی آواز پر لبیک کہے گی کیونکہ (مشرکین کے برخلاف) وہ لوگ اہل کتاب تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے رسول اسلامؐ کی صفات بھی اپنی کتاب میں پڑھی تھیں لیکن قرآن کہتا ہے ان کے ماضی پر نظر کرتے ہوئے ان سے تمہاری توقع کا کوئی محل نہیں کیونکہ بعض اوقات کسی گروہ کی صفات اور مزاج کی کج روی اس بات کا سبب بنتی ہے کہ حق سے انتہائی قرب کے باوجود وہ اس سے دور رہے۔

بعد کی آیت اس حیلہ گر اور منافق گروہ کے متعلق ایک اور حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ان میں سے پاک دل لوگ جب مومنین سے ملاقات کرتے ہیں تو اظہار ایمان کرتے ہیں (اور پیغمبر کی وہ صفات جو ان کی کتب میں موجود ہیں ان کی خبر دیتے ہیں) (و اذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا) لیکن علیحدگی اور خلوت میں ان سے ایک گروہ کہتا ہے تم ان مطالب کو جو

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔



خدا نے تورات میں تمہارے لئے بیان کئے ہیں مسلمانوں کو کیوں بتلاتے ہو (واذا خلا بعضھم الی بعض قالوا اتحد ثونھم بما فتح اللّٰہ علیکم) کہ کہیں قیامت کے دن خدا کے سامنے تمہارے خلاف ان سے استدلال کریں، کیا تم سمجھتے نہیں (لیحاجوکم بہ عند ربکم افلا تعقلون)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ آیت کی ابتداء یہودی منافقین کے سلسلے میں گفتگو کر رہی ہو، جو مسلمانوں کے سامنے ایمان کا دم بھرتے تھے اور تنہائی میں انکار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ یہودیوں میں سے پاک دل لوگوں کو بھی سرزنش کرتے ہیں کہ تم نے کتب مقدس کے اسرار سے مسلمانوں کو کیوں آگاہ کیا ہے۔

بہر حال یہ پہلی آیت کے بیان کی تائید کرتی ہے یعنی جس گروہ کے ذہنوں پر ایسے خیالات کا قبضہ ہے ان سے ایمان کی اتنی توقع نہ رکھا کرو۔

"فتح اللّٰہ علیکم" سے مراد ممکن ہے خدا کا وہ فرمان و حکم ہو جو بنی اسرائیل کے پاس تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان کے لئے نئی شریعت سے متعلق خبروں کے دروازوں کے کھلنے کی طرف اشارہ ہو۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس منافق گروہ کا اللہ کے بارے میں ایمان اس قدر کمزور تھا کہ وہ اسے ایک مادی انسان کی طرح سمجھتے تھے اور تصور کرتے تھے کہ اگر کوئی حقیقت مسلمانوں سے چھپا لیں تو وہ خدا سے بھی چھپی رہے گی لہٰذا بعد کی آیت صراحت سے کہتی ہے، کیا یہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے (اولا یعلمون ان اللّٰہ یعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

۷۸۔ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

۷۹۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝

ترجمہ

۷۸۔ اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب خدا کو چند خیالات اور آرزوؤں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے اور انہوں نے فقط اپنے گمانوں سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔

۷۹۔ افسوس اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر سکیں، افسوس ہے ان پر اس سے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں جو کچھ وہ کماتے ہیں ان پر اس کے لئے بھی افسوس ہے۔



شانِ نزول

وہ اوصاف پیغمبر جو تورات میں آئے تھے بعض علمار یہود نے انہیں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے یہ تبدیلی اپنے مقام و منصب کی حفاظت کی خاطر کی تھی اور ان منافع کی خاطر جو انہیں ہر سال عوام کی طرف سے ملتے تھے۔ جب پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے اوصاف کو تورات میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق پایا۔ اس پر انہیں ڈر ہوا کہ اس حقیقت کے واضح ہونے کی صورت میں ان کے منافع خطرے میں پڑ جائیں گے لہذا انہوں نے تورات میں مذکور حقیقی اوصاف کی بجائے ان کے مخالف اوصاف لکھ دیئے۔ یہودی عوام نے وہ اوصاف کم و بیش سن رکھے تھے اس لئے وہ اپنے علمار سے پوچھتے کہ کیا یہ وہی پیغمبر موعود نہیں جس کے ظہور کی آپ ہمیں بشارت دیا کرتے تھے۔ اس پر وہ تورات کی تحریف شدہ آیات پڑھتے تھے تاکہ وہ خاموش ہو جائیں۔[1]

تفسیر

عوام کو لوٹنے کی یہودی سازش

گذشتہ آیات کے بعد محل بحث آیات یہودیوں کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ عوام اور حیلہ ساز علمار (البتہ ان میں سے کچھ علمار ایسے بھی تھے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو گئے)۔

قرآن کہتا ہے: ان میں سے ایک گروہ میں ایسے افراد ہیں جو علم نہیں رکھتے اور کتاب خدا میں سے چند ایک خیالات اور آرزوئیں اخذ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے اور انہوں نے صرف اپنے ظن و گمان سے وابستگی اختیار کر لی ہے (ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی وان ھم الا یظنون)۔

"امیون" "اُمّی" کی جمع ہے۔ یہاں یہ لفظ ان پڑھ اور لاعلم کے معنی میں استعمال ہوا یعنی جس حالت میں شکم مادر سے پیدا ہوا اسی طرح رہ گیا اور کسی استاد کے مدرسے کو نہیں دیکھا۔

ہوسکتا ہے یہ لفظ اس طرف اشارہ کر رہا ہو کہ کچھ مائیں جاہلانہ محبت اور الفت کی وجہ سے اپنی اولاد کو جدا نہیں کرتی تھیں اور اسے مدرسے جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں لہذا وہ لوگ بے علم رہ جاتے تھے۔[2]

امانی "امنیۃ" کی جمع ہے جس کا معنی "آرزو" ہے۔ ممکن ہے یہاں ان موہوم خیالات اور امتیازات کی طرف اشارہ ہو یہودی اپنے بارے میں جن کے قائل تھے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کہا کرتے تھے ہم خدا کی اولاد اور اس کے خاص دوست ہیں۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (مائدہ - ۱۸)

---

[1] مجمع البیان میں زیر نظر آیت کے ذیل میں اجمالی طور پر یہ شان نزول بیان کی گئی ہے اور تفصیلی طور پر دیگر متعلقہ آیات کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

[2] "امی" کے معنی چھٹی جلد (تفسیر نمونہ) میں سورہ اعراف آیہ ۱۵۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں۔



اور یہ بھی کہ کہا کرتے تھے کہ چند دن کے سوا جہنم کی آگ ہم تک ہرگز نہیں پہنچے گی (بعد کی آیات میں یہودیوں کی اس گفتگو پر بحث ہوگی)۔

یہ بھی احتمال ہے کہ "امانی" سے مقصود وہ تحریف شدہ آیات ہوں جو علمار یہود عوام کے ہاتھوں میں دے دیتے تھے اور شاید جملہ "لا یعلمون الکتاب" اس مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال اس آیت کا آخری حصہ "ان ھم الا یظنون" اس بات کی دلیل ہے کہ اساس و اصول دین اور مکتب وحی کو پہچاننے کے لئے ظن و گمان کی پیروی صحیح کام نہیں بلکہ لائق سرزنش ہے چاہیے کہ ہر شخص اس سلسلے میں تحقیق کے ساتھ کافی قدم اٹھائے۔

علمائے یہود کا ایک اور گروہ تھا جو اپنے فائدے کے لئے حقائق میں تحریف کر دیتا تھا جیسا کہ قرآن بعد کی آیت میں کہتا ہے: افسوس ہے ان لوگوں پر جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھ دیتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہیں (فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ) اور ان کی غرض یہ ہے کہ اس کام سے تھوڑی سی قیمت وصول کریں (لیشتروا بہ ثمنا قلیلا) افسوس ہے ان پر اس سے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں (فویل لھم مما کتبت ایدیھم) اور افسوس ہے ان پر اس سے جو وہ ان خیانتوں کے ذریعے کماتے ہیں (وویل لھم مما یکسبون)

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے وسیلہ بھی ناپاک اختیار کیا اور اس سے نتیجہ بھی غلط حاصل کرتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر جب کام حرام ہے تو کمائی بھی حرام ہوگی:

ان اللہ اذا حرم شیئا حرم ثمنہ

یقیناً جب اللہ نے کوئی چیز حرام قرار دی ہے تو اس کا مول بھی حرام کیا ہے۔

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کے ضمن میں حضرت صادق سے ایک حدیث نقل کی ہے جو قابلِ غور نکات کی حامل ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

ایک شخص نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: یہودی عوام جب اپنے علمار کے بغیر اپنی آسمانی کتاب کے متعلق کوئی اطلاع نہ رکھتے تھے پھر علمار کی تقلید اور ان کے قول کو قبول کرنے پر خدا ان کی مذمت کیوں کرتا ہے اور کیا یہودی عوام اور ہمارے عوام میں جو اپنے علمار کی تقلید کرتے ہیں کوئی فرق ہے؟

امامؑ نے فرمایا: ہمارے عوام اور یہودی عوام کے درمیان ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے مساوات۔ جس لحاظ سے دونوں مساوی ہیں اس جہت سے خدا نے ہمارے عوام کی بھی اسی طرح مذمت کی ہے۔ رہی وہ جہت جس میں وہ ان سے مختلف ہیں وہ یہ ہے کہ یہودی عوام اپنے علمار کی حالت سے آشنا تھے وہ جانتے تھے کہ ان کے علمار جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، حرام اور رشوت کھاتے ہیں اور احکام الٰہی میں تغیر و تبدل کرتے ہیں۔ اپنی فطرت سے وہ یہ حقیقت جانتے تھے کہ ایسے لوگ فاسق ہیں اور یہ جائز نہیں کہ خدا اور اُس کے احکام کے بارے میں ان کی باتیں قبول کی جائیں اور یہ بھی جانتے تھے



کہ انبیاء و مرسلین کے بارے میں ان کی شہادت قبول کرنا مناسب نہیں۔ اس بناء پر خدا نے ان کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء سے ظاہر بہ ظاہر فسق و فجور اور سخت تعصب دیکھیں اور انہیں دنیا و مال حرام پر حریص ہوتا دیکھیں پھر بھی جو شخص ان کی پیروی کرے وہ یہودیوں کی طرح ہے۔ خداوند عالم نے فاسق علماء کی پیروی کی وجہ سے ان کی مذمت کی ہے۔

فاما من کان من الفقهاء صائنا لنفسه حافظاً لدينه مخالفاً على هواه مطيعاً لامر مولاه فللعوام ان يقلدوه۔

باقی رہے وہ علماء و فقہاء جو اپنی روح کی پاکیزگی کی حفاظت کریں، اپنے دین کی نگہداری کریں، ہوا و ہوس کے مخالف ہوں اور اپنے مولا و آقا کے فرمان کے مطیع ہوں عوام کو چاہیئے کہ ان کی تقلید کریں۔[1]

واضح ہے کہ حدیث احکام میں اندھی تقلید کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ عوام علماء کی رہنمائی میں علم و یقین کے حصول کے لئے پیروی کریں کیونکہ یہ حدیث پیغمبر کی پہچان کے ضمن میں ہے جو مسلماً اصول دین میں سے ہے اس میں اندھی تقلید جائز نہیں۔

۸۰۔ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

۸۱۔ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

۸۲۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ ع

ترجمہ

۸۰۔ اور انہوں نے کہا: چند دن کے سوا آتش جہنم ہم تک نہیں پہنچے گی۔ کہیئے کیا تم نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہوا ہے کہ خدا اپنے پیمان کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا پھر تم خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔

۸۱۔ ہاں جو لوگ گناہ کمائیں اور گناہ کے اثرات ان کے سارے جسم پر محیط ہوں وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۹۴، کتاب القضاء، باب ۱۰، اور تفسیر صافی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔



۸۲۔ وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ اہل جنت ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

تفسیر

بلند پروازی اور کھوکھلے دعوے

اس مقام پر قرآن یہودیوں کے بے بنیاد دعووں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے انہیں مغرور کر رکھا تھا اور جو ان کی کجرویوں کا سرچشمہ تھا۔ قرآن نے یہاں اس کا جواب دیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: وہ کہتے ہیں جہنم کی آگ چند روز کے سوا ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی (وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ)۔

کہیئے: کیا خدا نے تم سے کوئی عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ خدا جس کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا پھر بغیر جانے کسی چیز کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہو (قل اتخذتم عند اللہ عھدا فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون)۔

ملت یہود کو اپنے بارے میں نسلی برتری کا زعم تھا اور یہ قوم سمجھتی تھی کہ جو وہ ہے وہی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو گنہگار ہیں انہیں فقط چند دن عذاب ہوگا اس کے بعد انہیں ہمیشہ کی جنت ملے گی۔ یہ اُن کی خود خواہی و خود پرستی کی واضح دلیل ہے۔

یہ امتیاز طلبی کسی بھی منطق کی رُو سے روا نہیں اور بارگاہ الٰہی میں اعمال پر جزا و سزا کے سلسلے میں تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہودیوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا جس کی بناء پر ان کے لئے جزا و سزا کے کلی قانون میں استثناء ہو جائے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت ایک منطقی بیان کے ذریعے اس غلط خیال کو باطل کر دیتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: تمہاری یہ گفتگو دو صورتوں میں سے ایک کی مظہر ہے یا تو اس سلسلے میں خدا کی طرف سے کوئی خاص عہد و پیمان ہوا ہے جب کہ ایسا پیمان تم سے ہوا نہیں یا پھر تم جھوٹ بولتے ہو اور خدا پر تہمت لگاتے ہو۔

بعد کی آیت ایک کلی و عمومی قانون بیان کرتی ہے جو ہر لحاظ سے عقلی و منطقی بھی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہاں وہ لوگ جو کسب گناہ کریں اور آثار گناہ ان کے سارے وجود کو ڈھانپ لیں وہ اہل دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (بلیٰ من کسب سیئۃ و احاطت بہ خطیئتہ فاولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خٰلدون)۔ یہ ایک کلی قانون ہے۔ کسی قوم و ملت اور کسی گروہ و جمعیت کے گنہگاروں میں اور دیگر انسانوں میں موجود گنہ گاروں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔

رہے پرہیزگار مومنین تو ان کے بارے میں بھی ایک کلی قانون ہے جو سب کے لئے یکساں ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے۔ وہ اہل بہشت ہیں اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے



(والذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت اولٰئک اصحٰب الجنة ۚ ھم فیھا خٰلدون)۔

چند اہم نکات

(۱) غلط کمائی: کسب اور اکتساب کا معنی ہے جان بوجھ کر اپنے اختیار سے کوئی چیز حاصل کرنا۔ اس لحاظ سے "بلٰی من کسب سیئة" ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے۔ جو علم، ارادہ اور اختیار سے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور "کسب" شاید اس لئے ہے کہ سرسری نظر میں گنہ گار گناہ کو اپنے نفع میں اور اس کے ترک کرنے کو اپنے نقصان میں سمجھتا ہے۔ ایسے لوگوں ہی کے بارے میں چند آیات کے بعد اشارہ ہوگا جہاں فرمایا گیا ہے:

انہوں نے آخرت کو اس دنیا کی زندگی کے لئے بیچ ڈالا اور ان کی سزا میں کسی قسم کی تخفیف نہیں ہے۔

(۲) "آثار گناہ نے احاطہ کر لیا ہے" سے کیا مراد ہے: لفظ خطیئة بہت سے مواقع پر ان گناہوں کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر سرزد نہ ہوئے ہوں لیکن محل بحث آیت میں گناہ کبیرہ کے معنی میں ہے[1] یا اس سے مراد ہے آثار گناہ[2] جو انسان کے دل و جان پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

بہر حال احاطہ گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس قدر گناہوں میں ڈوب جائے کہ اپنے لئے ایک ایسا قید خانہ بنالے جس کے سب سوراخ بند ہوں۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ابتداء میں ایک عمل ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک حالت و کیفیت میں بدل جاتا ہے۔ اس کا دوام و تسلسل ملکہ و عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جب وہ شدید ترین ہو جاتا ہے تو انسان کا تمام وجود گناہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب کسی قسم کا پند و نصیحت، موعظہ اور رہنماؤں کی رہنمائی اس کے وجود پر اثر انداز نہیں ہوتی اور حقیقت میں اپنے ہاتھوں اپنی یہ حالت بناتا ہے۔ ایسے اشخاص ان کیڑوں کی مانند ہیں جو اپنے گرد جالا تن لیتے ہیں جو انہیں قیدی بنا کر بالآخر ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

واضح ہے کہ ایسے لوگوں کا انجام ہمیشہ جہنم میں رہنے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

کچھ آیات ہیں جن کے مطابق خدا صرف مشرکین کو نہیں بخشے گا لیکن غیر مشرک قابل بخشش ہیں مثلاً:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ (نساء - ۴۸)

ایسی آیات اور زیر بحث آیات جن میں ہمیشہ جہنم میں رہنے کا تذکرہ ہے اگر ان دونوں طرح کی آیات کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے گنہ گار آخرکار گویا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور مشرک و بے ایمان ہو کر دنیا سے جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر کبیر از فخرالدین رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المیزان، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔



(iii) نسل پرستی کی ممانعت: زیر بحث آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل پرستی کی روح جو آج بھی دنیا میں بھی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ ہے اُس زمانے میں یہودیوں میں موجود تھی اور وہ اپنے لئے بہت سے خیالی امتیازات کے قائل تھے۔ کتنے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کئی ہزار سال گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ نفسیاتی بیماری ان میں موجود ہے اور درحقیقت غاصب اسرائیلی حکومت کی پیدائش کا سبب بھی یہی نسل پرستی ہے۔

یہودی نہ صرف دنیا میں اپنی برتری کے قائل ہیں بلکہ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ نسلی امتیاز آخرت میں بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کے گنہگار لوگ دوسری قوموں کے گنہگاروں کے برعکس صرف تھوڑی سی مدت کے لئے خفیف سی سزا پائیں گے۔ انہی غلط خیالات نے انہی طرح طرح کے جرائم، بدبختیوں اور سیہ کاریوں میں مبتلا کیے رکھا ہے۔[1]

۸۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ○
۸۴۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○
۸۵ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

---

[1] سورہ نساء آیہ ۱۳۲ کے ذیل میں بھی جھوٹے امتیازات کی بحث تفسیر نمونہ جلد ۴ میں آئے گی۔



وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

۸۶۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ۱۰ ع ۱۰
وَلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ع

ترجمہ

۸۳۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا کہ تم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے اور ماں باپ، ذوی القربیٰ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کروگے اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کروگے۔ نیز نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ ادا کروگے۔ لیکن عہد و پیمان کے باوجود چند افراد کے سوا تم سب نے روگردانی کی اور (ایفائے عہد سے) پھر گئے۔

۸۴۔ اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے پیمان لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤگے اور ایک دوسرے کو اپنی سرزمین سے باہر نہیں نکالوگے، تم نے اقرار کیا اور تم خود (اس پیمان پر) گواہ تھے۔

۸۵۔ پھر تم ہو کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دیتے ہو اور گناہ و ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے ان پر تسلط حاصل کرتے ہو (اور یہ سب اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو تم نے خدا سے باندھا ہے) لیکن اگر ان میں سے بعض قیدیوں کی شکل میں تمہارے پاس آئیں اور فدیہ دے دیں تو انہیں آزاد کردیتے ہو حالانکہ انہیں باہر نکالنا ہی تم پر حرام ہے۔ کیا تم آسمانی کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لے آتے ہو اور کچھ سے کفر اختیار کرتے ہو۔ جو شخص (احکام و قوانین خدا میں تبعیض کا) یہ عمل انجام دیتا ہے اس کے لئے اس جہان کی رسوائی اور قیامت میں سخت ترین عذاب کی طرف بازگشت کے سوا کچھ نہیں اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

۸۶۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کے لئے آخرت کو بیچ دیا ہے لہٰذا ان کی سزا میں تخفیف نہیں ہوسکتی اور کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے عہد و پیمان کا ذکر تو کہیں کہیں آیا ہے لیکن اس بارے میں تفصیل بیان نہیں ہوئی لیکن محل بحث آیت میں اس عہد و پیمان کی شقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر یا تمام کی تمام ان امور میں سے ہیں جنہیں ادیانِ الٰہی کے ثابت شدہ احکام کا نام دینا چاہیئے کیونکہ تمام آسمانی ادیان میں یہ پیمان اور احکام موجود ہیں۔ ان آیات میں قرآن یہودیوں کو شدید سرزنش کر رہا ہے کہ تم نے اس پیمان کو کیوں توڑ دیا۔ قرآن انہیں یہ پیمان توڑنے کی



پاداش میں اِس جہان کی رسوائی اور اُس جہان کے شدید عذاب سے ڈرا رہا ہے۔

یہ پیمان جس کے بنی اسرائیل خود شاہد تھے اور اس کا اقرار کرتے تھے ان امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدائے یکتا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے اور کسی بت کے سامنے سر تعظیم نہیں جھکاؤ گے (واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لاتعبدون الا اللّٰہ)۔

۲۔ ماں باپ سے نیکی کروگے (وبالوالدین احساناً)۔

۳۔ اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مدد طلب کرنے والے محتاجوں سے بھی نیکی کروگے (وذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین)۔

۴۔ اجتماعی طور پر لوگوں کے ساتھ تمہارا سلوک اچھا ہوگا اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کروگے (وقولوا للناس حسناً)۔

۵۔ نماز قائم کروگے اور ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ رہوگے (واقیموا الصلوٰۃ)۔

۶۔ زکوٰۃ ادا کرنے اور محروم لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کروگے (واتوا الزکوٰۃ)۔

لیکن تم میں سے مختصر سے گروہ کے علاوہ سب نے اپنے عہد سے منہ موڑ لیا اور اپنے پیمان کو ایفا کرنے سے روگردانی کی (ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون)۔

۷۔ یاد کرو اس وقت کو جب تم سے ہم نے عہد لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے (واذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دماءکم)۔

۸۔ ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے باہر نہیں نکالو گے (ولا تخرجون انفسکم من دیارکم)۔

۹۔ اگر کوئی شخص تم میں سے جنگ کے دوران قید ہوجائے تو سب اس کی آزادی کے لئے مدد کروگے، فدیہ دو گے اور اسے آزاد کراؤ گے (پیمان کا یہ مفہوم "افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" سے حاصل کیا گیا ہے جو بعد میں آئے گا)۔

پھر تم نے ان سب شرائط کا اقرار کیا اور اس پیمان پر خود گواہ ہوئے (ثم اقررتم وانتم تشھدون)۔

لیکن تم نے ان میں سے بہت سی شرائط کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ تم وہی تھے جو ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور اپنے میں سے کچھ لوگوں کو ان کی زمین سے نکال دیتے تھے (ثم انتم ھؤلاء تقتلون انفسکم وتخرجون فریقا منکم من دیارھم)۔ جب کہ اس گناہ اور تجاوز میں تم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے (تظاھرون علیھم بالاثم والعدوان) اور یہ سب کچھ اس عہد و پیمان کے خلاف تھا جو تم خدا سے باندھ چکے تھے۔

اس دوران میں جب ان میں سے بعض قیدیوں کی صورت میں تمہارے پاس آتے تو تم فدیہ دیتے اور انہیں آزاد کراتے تھے (وان یاتوکم اسٰری تفادوھم) حالانکہ انہیں پہلے گھر ہی سے نکالنا تم پر حرام تھا (وھو محرم علیکم اخراجھم) اور تعجب کی بات یہ کہ فدیہ دینے اور قیدیوں کو آزاد کرانے میں تم تورات کے حکم اور پیمان الٰہی سے سند



حاصل کرتے تھے۔ کیا کتاب الٰہی کے بعض احکامات پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر اختیار کرتے ہو (افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض) یہ جو تم احکام الٰہی میں تبعیض و تفریق روا رکھے ہو اس کی جزا اس جہان کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں (فما جزآء[1] من یفعل ذٰلک منکم الا خزی فی الحیٰوة الدنیا) اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت ترین عذاب کی طرف پلٹیں گے (ویوم القیٰمة یردون الی اشد العذاب) اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔ بلکہ اس نے تمہارے اعمال کی کلیات و جزئیات کو بڑی باریکی سے شمار کیا ہے اور اس کے مطابق تمہیں بدلا دے گا۔

محل بحث آیت کے آخر میں اُن کے ان اعمال کا اصلی سبب بیان کیا ہے جو خلاف حقیقت ہیں۔ فرمایا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی ہے (اولٰئک الذین اشتروا الحیٰوة الدنیا بالاٰخرة) اسی بناء پر ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی اور کوئی ان کی مدد کے لئے کھڑا نہیں ہوگا (فلا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینصرون)۔

چند اہم نکات

(۱) آیات کا تاریخی پس منظر: جیسا کہ مفسرین نے نقل کیا ہے بنی قریظہ اور بنی نضیر جو یہودیوں کے دو گروہ تھے[2] ان کی آپس میں قریبی رشتہ داری تھی تاہم دنیاوی منافع کی خاطر ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔ بنی نضیر، قبیلہ خزرج سے مل گئے تھے۔ جو مدینہ کے مشرکین کا قبیلہ تھا اور بنو قریظہ اوس کے ساتھ مل گئے تھے۔

ان دو قبیلوں کے درمیان جو جنگیں ہوتی تھیں ہر گروہ اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کرتا تھا اور اس طرح دوسرے گروہ کے خلاف لڑتا اور جب جنگ کی آگ سرد پڑ جاتی تو تمام یہودی جمع ہو جاتے اور ایک دوسرے سے اتحاد کرتے تاکہ فدیہ ادا کرکے اپنے قیدیوں کو آزاد کرالیں۔ اس عمل میں وہ تورات کے حکم اور قانون کو سند مانتے حالانکہ اوس و خزرج دونوں مشرک تھے اولاً ان کی مدد کرنا ہی جائز نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ وہی قانون جو فتنہ کا حکم دیتا ہے قتل کرنے سے بھی روکتا ہے[3]۔ یہودی دیگر ہٹ دھرم اور نادان قوموں کی طرح ایسے بہت سے اعمال انجام دیتے تھے جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔

(۲) احکام الٰہی میں تبعیض، اس کا سبب اور نتیجہ: ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن مجید یہودیوں کی ایک دوسرے کے خلاف اعمال سرانجام دینے اور احکام الٰہی میں تبعیض و تفریق کرنے کی بناء پر سرزنش کرچکا ہے اور انہیں آخرت کے سخت

---

[1] جملہ "ماجزا" میں لفظ "ما" ممکن ہے نافیہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ استفہامیہ ہو لیکن نتیجے کے طور پر ہر دو طرح سے کوئی فرق نہیں۔

[2] قریظہ و نضیر، اوس و خزرج کی طرح دو بھائی تھے جن میں سے ہر ایک کی نسل سے ایک گروہ پیدا ہوا۔

[3] تفسیر مجمع البیان، تفسیر المنار اور تفسیر فی ظلال میں زیر بحث آیات کے پس منظر میں یہی تاریخ بیان کی ہے۔



عذاب سے ڈرایا گیا ہے خصوصاً یہ کہ وہ چھوٹے چھوٹے احکام پر تو عمل کرتے ہیں لیکن اہم ترین احکام (مثلاً ایک دوسرے کا خون بہانے کی حرمت اور اپنے ہم مذہب لوگوں کو گھروں سے بے گھر نہ کرنے کے حکم) کی مخالفت کرتے تھے۔

دراصل وہ فقط ایسے احکام کی اہمیت کے قائل تھے جو ان کی دنیاوی زندگی کے لئے نفع بخش تھے۔ جہاں ان کے منافع کا تقاضا ہوتا وہ ایک دوسرے کا خون تک بہادیتے اور جب سب کے لئے خسارے اور نقصان کا احتمال ہوتا تو اپنی آئندہ احتمالی قید کے پیشِ نظر قیدیوں کو فدیہ ادا کرکے آزاد کرا لینے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے۔

اصولی طور پر ایسے قوانین پر انسان کا عمل جو اس کے نفع میں ہیں، فرمانِ خدا کی اطاعت قرار نہیں پا سکتا کیونکہ اس عمل کا سبب خدا کا فرمان نہیں تھا بلکہ شخصی منافع کی حفاظت اس کا مقصود تھا۔ اطاعت گذار، عاصی و گنہگار سے اس وقت ممتاز ہوتا ہے جب قانون کے مطابق عمل شخصی منافع کے خلاف ہو، مگر عوام کے نفع میں ہو۔ جو لوگ ایسے قوانین کی پیروی کرتے ہیں وہی صحیح لوگ ہیں اور جو تبعیض کرتے ہیں وہ واقعی سرکش ہیں لہذا اجرائے قوانین میں تبعیض (بعض پر عمل کرنا اور بعض پر نہ کرنا) بغاوت و سرکشی کی روح کی غماز ہے اور بعض اوقات ایمان نہ ہونے کی نشانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایمان کا اثر وہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں قانون کسی شخص کے شخصی منافع کے خلاف ہو ورنہ ان احکامِ الٰہی پر عمل کرنا جو انسان کے منافع کی حفاظت کرتے ہیں قابلِ فخر ہے نہ ایمان کی نشانی۔ لہٰذا مومنین اور منافقین کے درمیان ہمیشہ ایسے مواقع پر امتیاز کیا جاتا ہے۔ مومنین خدا کے تمام قوانین کے سامنے یکساں طور پر سرِ تسلیم خم کرتے تھے لیکن منافق تبعیض کے طرف دار ہوتے ہیں اور احکامِ خدا میں فرق کا یہ سبب ہے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے ایسے عمل کا نتیجہ رسوائی، ذلت اور بربادی ہے۔ وہ قوم جو مادی پہلو وہ بھی خاص شخصی فائدے کے حصول کے علاوہ اپنی فکر کا کوئی دریچہ کھلا نہیں رکھتی وہ جلد یا دیر سے کسی طاقتور قوم کے چنگل میں گرفتار ہو جائے گی، عزت کی بلندی سے ذلت و پستی کے گڑھے میں جا گرے گی اور انسانی معاشروں میں رسوا ہو جائے گی۔ یہ تو ہے دنیاوی نظر سے۔ رہا آخرت کی نظر سے تو جس طرح قرآن کہتا ہے ایسے تبعیض گروں کے لئے سخت ترین سزا منتظر کھڑی ہے۔ ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ یہ قانون بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے اور آج ہم مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح مؤثر ہے۔

(iii) قوموں کی زندگی کے لئے بنیادی احکام: یہ آیات اگرچہ بنی اسرائیل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تاہم ایسے کلی قوانین کی حامل ہیں جو تمام دنیا کی قوموں کے لئے ہیں۔ قوموں کی زندگی، بقا، کامیابی اور شکست کے عوامل ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر ملت کی بقا اور سربلندی اس میں ہے کہ وہ اپنا سہارا خدا کو قرار دے جو سب سے بڑی طاقت و قوت ہے اور ہر حالت میں اس سے مدد لے یہ ایسی قدرت پر بھروسہ ہوگا جس کے لئے فنا و زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ اس طرح انہیں کسی کا خوف اور وحشت نہ ہوگی۔ ظاہر ہے ایسی قدرت و طاقت عظیم خالقِ کائنات کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی ایسا سہارا فقط خدا ہے (لا تعبدون الا اللہ)۔



دوسری طرف قوموں کی بقاء اور ہمیشگی کے لئے افرادِ ملت کے مابین خصوصی وابستگی ضروری ہے، ایسا یوں ممکن ہے۔ کہ ہر شخص اپنے ماں باپ سے جن سے زیادہ قریب کی وابستگی ہے، عزیز و اقارب سے جو وابستگی کے اعتبار سے ایک فاصلے پر ہیں اور پھر معاشرے کے تمام افراد سے نیکی اور اچھائی کے ساتھ پیش آئے تاکہ سب ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں (وبالوالدین احسانا وذی القربی.... وقولوا للناس حسنا)۔

قوم کے کمزور و ناتواں افراد کی تقویت روحانی اور مادی طور پر اس ہمیشگی میں کافی حصہ رکھتی ہے اور اس طرح دشمن کے لئے کوئی کمزور جگہ باقی نہیں رہتی اور قوم میں کوئی فرد مشکلات اور سختی میں نہیں رہتا کہ وہ ان مشکلات کے نتیجے میں اپنے آپ کو دشمن کے دامن میں جا گرائے (والیتمیٰ والمساکین)

ہر قوم کے زندہ رہنے کے لئے مالی و اقتصادی بنیاد کا استحکام بھی بڑا حصہ ادا کرتا ہے جو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انجام پذیر ہوتا ہے (واتوا الزکوٰۃ)

ایک طرف کامیابی کے لئے یہ امور ہیں اور دوسری طرف قوموں کی شکست اور بربادی کا راز اس وابستگی کے ٹوٹ جانے اور کشمکشوں اور اندرونی جنگ شروع ہونے میں ہے۔ وہ قوم جس میں داخلی جنگ شروع ہو جائے اور تفرقہ بازی کا پتھر اس میں پھینک دیا جائے، اس کے افراد ایک دوسرے کی مدد کی بجائے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جائیں، ایک دوسرے کے مال اور زمین پر قبضہ جمانے پر تل جائیں، ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے آستینیں الٹائے پھریں اور ہر گروہ دوسرے کو بے گھر کرنے اور اس کے مال پر تصرف کرنے کے لئے تیار کھڑا ہو تو وہ قوم جلد یا کچھ دیر میں نابود ہو جائے گی اور اس کا ملک ویران ہو جائے گا اور وہ بیچارگی و بدبختی کا شکار ہو جائے گی (لا تسفکون دمائکم ولا تخرجون انفسکم من دیارکم)۔

وہ قوم جو محروم و بے نوا افراد کی مدد اور دستگیری کی بجائے ان کا خون بہانے لگے، ان کی زمین اور مال پر تصرف کرے اور انہیں بے گھر کر دے وہ زندہ رہنے اور سربلند ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی (فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا)۔

قوموں کی بربادی اور زوال کے عوامل میں قوانین و احکام میں تبعیض بھی شامل ہے۔ یعنی جس میں ان کا فائدہ ہو بجا لائیں اور جس میں نقصان ہو اسے بھول جائیں (افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض)۔

۸۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى
ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ○
۸۸۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ○



ترجمہ

۸۷۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور پھر یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں بخشیں اور روح القدس کے ذریعے ہم نے اس کی تائید کی۔ جس وقت بھی کوئی پیغمبر تمہاری خواہش کے خلاف آیا، تم اس کے مقابلے میں تکبر کرتے رہے (اور اس پر ایمان لانے سے احتراز کرتے رہے اور اسی پر بس نہیں کی) ان میں سے ایک گروہ کی تم نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کر دیتے رہے۔

۸۸۔ (آپ کی دعوت کے جواب میں وہ بطور استہزاء و تمسخر) کہتے ہیں ہمارے دل غلاف کے اندر ہیں (اور ہم تمہاری باتوں میں سے کچھ نہیں سمجھتے) (اور ہاں ایسا ہی ہے) خدا نے ان کے کفر کی بنا پر انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (اسی لئے وہ نہیں سمجھتے اور کسی چیز کا ادراک نہیں کر پاتے) اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر

ان آیات کے مخاطب تو بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ اپنے مفاہیم اور معیار کے اعتبار سے عمومیت کی حامل ہیں۔ اور دوسرے تمام لوگ بھی اس خطاب کا مصداق ہیں۔

قرآن کہتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب (تورات) دی (ولقد اٰتینا موسی الکتاب) اور پھر مسلسل یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے (وقفینا من بعدہ بالرسل)۔ ان پیغمبروں میں داؤد، سلیمان، یوشع، زکریا اور یحییٰ شامل ہیں۔

اور عیسیٰ بن مریم کو روشن دلائل دیئے اور روح القدس کے ذریعے اس کی تائید کی (واٰتینا عیسی ابن مریم البینات وایدنٰہ بروح القدس)۔

لیکن ان عظیم مرسلین نے ان اصلاحی پروگراموں کے باوجود جب بھی کوئی بات تمہاری خواہش نفس کے خلاف کہی تو تم نے ان کے مقابلے میں تکبر اختیار کیا اور تم نے ان کی فرمانبرداری نہیں کی (افکلما جاءکم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم)۔

یہ ہوا و ہوس کی حاکمیت تم پر اس قدر غالب تھی کہ ان مرسلین میں سے کچھ کی تم نے تکذیب کی اور کچھ کو تو قتل ہی کر دیا (ففریقا کذبتم و فریقا تقتلون)۔

اگر تمہاری طرف سے یہ تکذیب اور جھٹلانا مؤثر ثابت ہوتا اور تمہارا مقصد اسی سے پورا ہو جاتا تو تم اسی پر اکتفاء کر لیتے اور خدا کے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگتے۔

گذشتہ آیات کی تفسیر میں "احکام الٰہی میں تبعیض ...." کے ذیل میں ہم یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ ایمان کا معیار اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے مواقع تو وہ ہیں جو میلان طبع اور خواہش نفس کے خلاف ہوں ورنہ تو ہر ہوا پرست اور بے ایمان بھی ان احکام کے سامنے ہم آہنگی اور تسلیم کا مظاہرہ کرتا ہے جو اس کے میلان طبع اور فائدے کے مطابق ہیں۔



اس آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رہبرانِ الٰہی اپنی تبلیغ رسالت کی راہ میں ہوا پرستوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ صحیح رہبری اس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں اگر پیغمبر چاہیں کہ خود کو لوگوں کی آزادانہ ہوا و ہوس کے مطابق چلائیں تو پھر ان کا کام کسی کے پیچھے لگنا ہوا نہ کہ رہبری کرنا۔

دل کے اندھے، بے ایمان لوگ ان خدائی رہبروں کی دعوت جس کا مقصد سعادتِ بشر کے علاوہ کچھ نہ تھا کا استقبال کرنے کی بجائے اس قدر مزاحمت کرتے تھے کہ ان میں سے بعض کو قتل ہی کر دیتے تھے۔

بعد کی آیت کہتی ہے کہ یہ لوگ دعوتِ انبیاء یا آپ کی دعوت کے جواب میں تمسخر اور مذاق کے طور پر کہتے ہیں ہمارے دل تو غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں اور ہم ان باتوں میں سے کچھ سمجھ نہیں پاتے (وقالوا قلوبنا غلف)۔[1]

اور ہے ایسا ہی — کیونکہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (اسی بناء پر وہ کسی بات کو سمجھ نہیں پاتے) اور ان میں بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں (بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلا ما یؤمنون)۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر والا جملہ ان یہودیوں کے بارے میں ہو جنہوں نے پیغمبرانِ خدا کی تکذیب کی یا انہیں قتل کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان یہودیوں کے متعلق ہو جو پیغمبر خدا کے ہم عصر تھے۔ آنحضرت کی گفتگو کے جواب میں وہ انتہائی ڈھٹائی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تاہم یہ آیت ہر صورت میں اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسان ہوا و ہوس کی پیروی کے زیر اثر اس طرح راندۂ درگاہ خدا ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس راستے میں اسے حقیقت بہت کم نظر آتی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) مختلف زمانوں میں انبیاء کی پے درپے آمد: جیسا کہ کہا جا چکا ہے جب ہوا پرست اور بے ایمان لوگ انبیاء کی دعوت کو اپنی ہوا و ہوس اور ناجائز منافع سے ہم آہنگ نہیں پاتے تھے تو ان کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے خصوصاً لوگ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد ان کی تعلیمات کو طاقِ نسیاں کر دیتے۔ اس بناء پر ضروری تھا کہ یاد دہانی کے لئے خدا کی جانب سے یکے بعد دیگرے مرسلین آتے رہیں تاکہ ان کا مکتب اور پیغام پرانا نہ ہونے پائے اور وہ دستِ فراموشی کے حوالے نہ ہو جائے۔

سورہ مومنون آیہ ۴۴ میں ہے:

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا۔

پھر ہم نے پے درپے اپنے رسول بھیجے، جب کوئی رسول کسی امت کے پاس آتا تو لوگ اس کی تکذیب

---

[1] "غلف" "اغلف" کی جمع ہے جس کا معنی ہے۔ غلاف دار



کرتے (لیکن) ہم تو انہیں یکے بعد دیگرے بھیجتے ہی رہتے تھے۔

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں جہاں انبیاء کے بھیجنے کی غرض و غایت کی تشریح کی گئی ہے وہاں اس حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے:

فبعث فیھم رسلہ وواتر الیھم انبیائہ لیستأدوھم میثاق فطرتہ ویذکروھم منسی نعمتہ ویحتجوا علیھم بالتبلیغ ویثیروا لھم دفائن العقول۔

خدا نے اپنے رسولوں کو ان کی طرف مبعوث کیا اور اپنے انبیاء کو ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ لوگوں سے ان کے فطری عہد و پیمان کی ادائیگی کا مطالبہ کریں اور انہیں خدا کی فراموش شدہ نعمتیں یاد دلائیں اور انبیاء تبلیغات کے ذریعے لوگوں پر اتمام حجت کریں اور تاکہ عقول کے مخفی خزانے ان کی تعلیمات کے ذریعے آشکار ہوں۔

لہٰذا مختلف زمانوں اور صدیوں میں انبیاء خدا کے آنے کا مقصد خدا کی نعمتوں کی یاد دہانی کرانا، پیمان فطرت کی ادائیگی کی طرف توجہ دلانا اور گذشتہ انبیاء کی تبلیغات اور دعوتوں کی تجدید کرنا تھا تاکہ ان کی دعوتیں اور ان کے اصلاحی پروگرام متروک اور فراموش نہ ہو جائیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ پیغمبر اسلام کیونکر خاتم انبیاء ہیں اور ان کے بعد نبی کی کیوں ضرورت نہیں تو اس پر انشاء اللہ سورہ احزاب کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں بحث ہوگی۔

(۲) روح القدس کیا ہے؟: بزرگ مفسرین روح القدس کے بارے میں مختلف تفاسیر بیان کرتے ہیں۔ ہم یہاں چند ایک درج کرتے ہیں:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل ہے۔ اس تفسیر کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسٰی کی مدد کی۔

اس تفسیر کی شاہد سورہ نحل کی آیہ ۱۰۲ ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔

کہیے! روح القدس نے اسے تم پر حقیقت کے ساتھ نازل کیا۔

رہا یہ سوال کہ جبرائیل کو روح القدس کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں میں روحانیت کا پہلو چونکہ غالب ہے لہٰذا ان پر روح کا اطلاق بالکل طبیعی اور فطری ہے اور "قدس" اس فرشتے کے بہت زیادہ تقدس اور پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ کچھ دوسرے مفسرین کا عقیدہ ہے کہ روح القدس وہی ایک غیبی طاقت ہے جو حضرت عیسٰی کی تائید کرتی تھی اور اس مخفی خدائی طاقت سے وہ مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرتے تھے البتہ یہ غیبی طاقت ضعیف تر صورت میں تمام مومنین میں درجاتِ ایمان کے تفاوت کے حساب سے موجود ہے۔ اور یہ وہی خدائی امداد ہے جو انسان کو اطاعات اور مشکل



کاموں کی انجام دہی میں مدد دیتی ہے اور گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں ایک شاعر اہلبیتؑ کے بارے میں ہے کہ جب وہ امامؑ کے سامنے اشعار پڑھ چکا تو آپؑ نے فرمایا:

انما نفث روح القدس علی لسانک

روح القدس نے تیری زبان پر دم کیا ہے اور جو کچھ تونے کہا ہے اسی کی مدد سے ہے۔ [1]

۳۔ بعض مفسرین نے روح القدس کا معنی انجیل بیان کیا ہے۔ [2]

ان میں سے پہلی دو تفاسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔

(iii) **روح القدس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ:** "قاموس" کتاب مقدس میں ہے:

روح القدس تیسرا اقنوم۔ اقانیم ثلاثہ الٰہیہ میں سے شمار ہوتا ہے اور اسے روح کہتے ہیں کیونکہ وہ مبدع اور مخترع حیات ہے اور مقدس اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے مخصوص کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مومنین کے دلوں کی تقدیس کرتا ہے۔ حضرت مسیح اور خدا سے اسے جو وابستگی ہے اس بناء پر اسے روح اللہ اور روح المسیح بھی کہتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک اور احتمال بھی آیا ہے اور وہ یہ ہے:

وہ روح القدس جو ہمیں تسلی دیتا ہے۔ وہ وہی ہے جو ہمیشہ ہمیں سچائی، ایمان اور اطاعت کے قبول و ادراک کی ترغیب دیتا ہے اور وہی ہے جو گناہ و خطا میں مرجانے والے لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور انہیں پاک و منزہ کرکے حضرت واجب الوجود کی عظمت و بزرگی کے لائق بناتا ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس کتاب مقدس قاموس کی عبارت میں دو معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے:

(۱) ایک یہ کہ روح القدس تین خداؤں میں سے ایک ہے جو کہ عقیدہ تثلیث کے مطابق ہے اور یہ وہ مشرکانہ عقیدہ ہے جسے ہم ہر لحاظ سے مردود سمجھتے ہیں۔

(۲) دوسرا مفہوم اوپر بیان کی گئیں تین تفاسیر میں سے دوسری سے ملتا جلتا ہے۔

(iv) **بے خبر اور غلاف میں لپٹے دل:** مدینہ کے یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغات کا پوری کوشش سے مقابلہ کرتے اور آپؑ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے اور جب بھی آپؐ کے بار دعوت سے بچنے کو کوئی

---

[1] رسول اکرمؐ نے حسان بن ثابت سے بھی غدیر خم کے موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر فرمایا تھا:

لن یزال معك روح القدس ما ذبت عنا

جب تک ہمارا دفاع کرو گے روح القدس تمہارے ساتھ رہے گا۔

سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۴۹۵، مادہ کیت

[2] تفسیر المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



بہانہ ملتا اس سے پورا فائدہ اٹھاتے اس آیت میں ان کی ایک گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے تھے ہمارے دل پردے اور غلاف میں لپٹے ہیں۔ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات وہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے لیکن قرآن کہتا ہے: بات یہی ہے کہ جو وہ کہہ رہے ہیں کیونکہ کفر و نفاق کے باعث اُن کے دل بے خبری، ظلمت، گناہ اور کفر کے پردوں میں لپیٹے جا چکے ہیں اور خدا نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

سورہ نساء آیہ ۱۵۵ میں بھی یہی مفہوم مذکور ہے:

وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

اور ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دل غلاف میں لپٹے ہیں اس لئے تمہاری بات سمجھ نہیں پاتے لیکن یہ تو اس بناء پر ہے کہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ لہٰذا ان میں سے چند ایک کے علاوہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۸۹۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

۹۰۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

ترجمہ

۸۹۔ اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے۔ جو ان (یہودیوں) کے پاس ہیں۔ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں تھے اور مشرکین کی زیادتیوں کے مقابلے میں) فتح کی امید رکھتے تھے (سمجھتے تھے کہ اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

۹۰۔ انہوں نے اپنے نفسوں کو بُری قیمت پر بیچا ہے کیونکہ غلط کاری کے مرتکب ہوتے ہوئے وہ ان آیات سے کافر



ہوگئے ہیں جو خدا کی بھیجی ہوئی ہیں (چونکہ پیغمبر اسلام بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں) اور خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے فضل سے اپنی آیات نازل کرتا ہے لہٰذا ان پر یکے بعد دیگرے خدا کا غضب نازل ہوا اور کافروں کے لئے ذلیل و خوار کرنے والی سزا اور بدلہ ہے۔

شانِ نزول

زیر نظر آیت کے بارے میں امام صادقؑ سے روایت ہے:

یہودیوں نے اپنی کتب میں دیکھ رکھا تھا کہ پیغمبر اسلام کا مقام ہجرت "عیر" اور "اُحد" کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا۔ (یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اردگرد ہیں) یہودی اپنے علاقے چھوڑ کر رسول کی ہجرت کی سرزمین کی تلاش میں نکلے اس دوران وہ "حداد" نامی پہاڑ تک پہنچے اور کہنے لگے "حداد" یہی اُحد ہے۔ وہیں سے وہ منتشر ہوگئے ہر گروہ نے ایک جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ سرزمین "تیما" میں جا بسے بعض "فدک" میں قیام پذیر ہوئے اور کچھ "خیبر" میں رہنے لگے۔ (کچھ مدت بعد) تیما کے رہنے والوں نے اپنے دوسرے بھائیوں سے ملنا چاہا۔ اس اثنا میں ایک عرب وہاں سے گذرا۔ اُس سے انہوں نے سواریاں کرائے پر لیں۔ عرب کہنے لگا میں تمہیں "عیر" اور "اُحد" کی پہاڑیوں میں سے لے جاؤں گا۔ اس سے کہنے لگے جب ان دو پہاڑوں کے درمیان پہنچو تو ہمیں آگاہ کرنا۔ وہ عرب جب سرزمین مدینہ پہنچا تو اس نے انہیں بتایا کہ یہ جگہ ہی کوہِ عیر اور کوہِ اُحد کے درمیان ہے۔ پھر اس نے اشارے سے بتایا کہ یہ عیر ہے اور یہ اُحد ہے۔ یہودی اس کی سواریوں سے اُتر پڑے اور کہنے لگے ہم اپنے مقصد تک آپہنچے ہیں۔ اب ہمیں تیری سواریوں کی ضرورت نہیں، اب تو جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائیوں کو خط لکھا کہ ہم نے وہ زمین تلاش کر لی ہے تم بھی ہماری طرف کوچ کرو۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم چونکہ یہاں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ گھر بار اور مال منال کا اہتمام کر چکے ہیں اور یہاں سے اس سرزمین کا کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں۔ جس وقت پیغمبر موعود ہجرت کر کے آئیں گے ہم بھی تمہارے پاس آجائیں گے۔

وہ سرزمین مدینہ ہی میں رہے اور بہت مال و دولت جمع کر لی۔ یہ خبر "تبع" نامی ایک بادشاہ کو پہنچی۔ اس نے آکر ان سے جنگ کی۔ یہودی اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہوگئے۔ اُس نے ان سب کا محاصرہ کر لیا۔ پھر انہیں امان دے دی۔ وہ بادشاہ کے پاس آئے۔ "تبع" نے کہا مجھے یہ سرزمین پسند آئی ہے اور میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جواب میں کہا: ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سرزمین ایک پیغمبر کا مقام ہجرت ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی شخص بادشاہ کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا۔ تبع کہنے لگا کہ میں اپنے خاندان میں سے کچھ لوگ یہاں چھوڑ دیتا ہوں تاکہ جب وہ پیغمبر آئے یہ اس کی



مدد کریں۔ لہٰذا اس نے دو مشہور قبائل "اوس" اور "خزرج" کو یہاں ٹھہرا دیا۔ جب ان قبیلوں نے خوب مال و دولت جمع کر لیا۔ تو یہودیوں کے مال پر تجاوز کرنے لگے۔ یہودی ان سے کہا کرتے تھے، جب محمد مبعوث ہوں گے تو تمہیں ہمارے علاقے سے نکال دیں گے۔

جب حضرت محمد مبعوث ہوئے تو اوس اور خزرج آپ پر ایمان لے آئے جو انصار مشہور ہوئے مگر یہودیوں نے آپ کا انکار کیا۔ آیت "وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا" کا یہی مفہوم ہے۔

وہی لوگ جو خاص عشق و محبت کی وجہ سے، رسول اللہؐ پر ایمان لانے کے لئے آئے تھے جو اوس و خزرج کے مقابلے میں فخر کرتے تھے کہ ایک رسول مبعوث ہوگا اور ہم اس کے یار و مددگار ہوں گے۔ جب رسول اللہؐ کی ہجرت ہوئی اور آپؐ نے ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی، وہی قرآن جو تورات کی تصدیق کرتا تھا، تو وہ اس سے کفر کرنے لگے۔

تفسیر

ان آیات میں بھی یہودیوں اور ان کی زندگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ جیسا کہ شان نزول میں ہے یہ لوگ رسول خدا پر ایمان لانے کے شوق اور دل بستگی کے ساتھ مدینہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ تورات میں پیغمبرؐ کی نشانیوں کو دیکھتے تھے اور بے چینی سے آپؐ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے۔ لیکن جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب (قرآن) آئی جو ان علامتوں کے مطابق تھی جو یہودیوں کے پاس تھیں حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس پیغمبرؐ کے ظہور کی خوشخبری دیتے تھے اور پیغمبرؐ کے ظہور کے ذریعے دشمنوں پر فتح پانے کی امید لگائے بیٹھے تھے اور جب کہ وہ کتاب اور پیغمبرؐ کو پہلے سے پہچانتے تھے پھر بھی اس سے کفر اختیار کر بیٹھے (ولما جاءهم كتب من عند الله مصدق لما معهم و كانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا ۚ فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به)۔

کافروں پر خدا کی لعنت ہو (فلعنة الله على الكافرين)۔

بعض اوقات انسان کسی حقیقت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے لیکن اس کے قریب پہنچ کر جب اسے اپنے ذاتی فائدے کے خلاف پاتا ہے تو ہوا و ہوس کے نتیجے میں اسے ٹھوکر مار دیتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے بلکہ کبھی تو اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

لیکن یہودیوں نے تو انتہائی خسارے کا سودا کیا۔ جو لوگ پیغمبر موعود کی پیروی کے لئے اپنے علاقے کو چھوڑ کر، بہت سی مشکلات جھیل کر سرزمین مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے تاکہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں، جب موقع آیا تو منکرین اور کافرین کی صف میں کھڑے ہو گئے ہو گئے لہٰذا اس مقام پر قرآن کہتا ہے، کیسی بری قیمت پر انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کیا (بئسما اشتروا به انفسهم)۔

وہ حسد کی بنا پر اس چیز سے کافر ہو گئے جو خدا نے نازل کی تھی۔ انہیں اعتراض تھا کہ کیوں خدا اپنے فضل سے



جس شخص پر چاہتا ہے اپنی آیات نازل کر دیتا ہے (ان یکفروا بما انزل اللہ بغیا ان ینزل اللہ من فضلہ علی من یشاء من عبادہ ج)۔

گویا اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر موعود بنی اسرائیل میں سے اور خود انہی میں سے ہوگا لیکن جب کسی اور پر قرآن نازل ہوا تو انہیں تکلیف پہنچی اور وہ سیخ پا ہوگئے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: لہٰذا خدا کے غضب نے یکے بعد دیگرے انہیں گھیر لیا اور کافروں کے لئے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے (فباءو بغضب علی غضب ط وللکٰفرین عذاب مھین)۔

چند اہم نکات

(۱) خسارے کا سودا: درحقیقت یہودیوں نے ایک خسارے کا سودا کیا تھا۔ کیونکہ ابتداء میں وہ اسلام اور اسلام کے پیغمبر موعود کے داعی تھے۔ یہاں تک کہ تمام مشکلات جھیل کر مدینہ کی زندگی انہوں نے اسی مقصد کے لئے انتخاب کی تھی۔ لیکن پیغمبر خدا کے ظہور کے بعد صرف اس بناء پر کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں یا آپ کی وجہ سے ان کے ذاتی منافع خطرے میں پڑ گئے تھے، وہ آپ کے کافر و منکر ہوگئے اور یہ بہت زیادہ خسارے اور نقصان کا معاملہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد کو نہ پہنچے بلکہ اپنی تمام قوتیں اور طاقتیں صرف کر کے اس کے برعکس حاصل کرے اور خدا کا غضب اور ناراضی بھی الگ اٹھانی پڑے۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے ارشادات میں ہے:

لیس لانفسکم ثمن الا الجنۃ فلا تبیعوھا الا بھا۔

تمہارے نفسوں کی قیمت جنت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی لہٰذا اپنے نفسوں کو اس کے علاوہ کسی چیز کے بدلے نہ بیچو۔[1]

مگر یہودی اس گراں بہا سرمائے کو مفت میں گنوا بیٹھے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ سودا ان کے اصل وجود کا بیان کیا گیا ہے یعنی حق و حقیقت سے منکر و کافر ہیں یا اپنی حقیقت ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ کیونکہ کفر کے ساتھ ان کے وجود کی قیمت بالکل گر جاتی ہے گویا اپنی شخصیت گنوا بیٹھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان غلاموں کی طرح ہیں جنہوں نے اپنا وجود بیچ کر اسے دوسرے کی قید میں دے دیا ہو بیشک وہ ہوا و ہوس کے قیدی اور شیطان کے بندے ہیں۔

لفظ "اشتروا" اگرچہ عموماً خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی بیچنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ لغت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ بیچنے ہی کے معنی میں ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے

---

[1] نہج البلاغۃ، کلمات قصار، کلمہ ۴۵۶۔



اپنا وجود مال و متاع کی طرح بیچا ہے اور اس کے بدلے غضب پروردگار یا کفر و حسد خریدا ہے۔

(۱) فباؤ بغضب علیٰ غضب : بنی اسرائیل جب صحرائے سینا میں سرگرداں تھے اس عالم کی سرگذشت کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وباؤ بغضب من اللہ (وہ غضب خدا کی طرف پلٹے) اس کے بعد مزید کہتا ہے: یہ خدا کا غضب ان پر انبیاء کے قتل اور آیاتِ خدا سے کفر کی وجہ سے تھا۔

سورہ آل عمران آیہ ۱۱۲ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ یہودی آیاتِ الٰہی سے کفر اور قتل انبیاء کی وجہ سے غضب الٰہی کا شکار ہوئے یہ پہلا غضب ہے جو انہیں دامن گیر ہوا۔

ان کے باقی ماندہ افراد نے پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد ان سے اپنے بڑوں والی روش ہی جاری رکھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے آئین کے خلاف تھے بلکہ ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اسی طرز عمل کی وجہ سے ایک نئے غضب نے انہیں گھیر لیا اسی لئے فرمایا: فباؤ بغضب علیٰ غضب۔

دراصل لفظ "باؤ" کا معنیٰ ہے وہ لوٹے اور انہوں نے سکونت اختیار کی اور یہ کنایہ ہے استحقاق پیدا کرنے سے۔ یعنی انہوں نے غضب پروردگار کو اپنے لئے منزل و مکان کی طرح انتخاب کیا۔

یہ سرکش و باغی گروہ حضرت موسیٰ کے قیام سے پہلے اور پیغمبر اسلام کے ظہور سے قبل دونوں مواقع پر ایسے قیام کے سختی سے طرفدار تھے لیکن دونوں قیاموں کے روبہ عمل ہونے کے بعد وہ اپنے عقیدے سے پھر گئے اور یکے بعد دیگرے اپنی جان کے بدلے غضب خدا خرید لیا۔

۹۱- وَاِذَا قِیْلَ لَہُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَہٗ ۗ وَھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَہُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰہِ مِنْ قَبْلُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

۹۲- وَلَقَدْ جَآءَکُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۹۳- وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِہِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِہٖٓ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○



ترجمہ

۹۱۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس (چیز) پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوئی (اس پر نہیں جو دوسری قوموں میں سے کسی پر نازل ہو) اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کر لیتے ہیں جب کہ وہ حق ہے اور ان آیات کی تصدیق کرتا ہے جو ان پر نازل ہو چکی ہیں۔ کہیے کہ اگر سچ کہتے ہو تو پھر اس سے پہلے انبیاء کو قتل کیوں کیا کرتے تھے۔

۹۲۔ نیز موسٰی تمہارے لئے سب معجزات لے کر آئے (تو پھر کیوں تم نے) بعد ازاں بچھڑے کو منتخب کر لیا اور اس عمل سے تم نے (اپنے اوپر) ظلم کیا۔

۹۳۔ اور تم سے ہم نے وہ پیمان لیا اور تم پر کوہ طور بلند کیا (اور تم سے کہا) یہ قوانین و احکام جو ہم نے تمہیں دیے ہیں انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو اور صحیح طرح سے سنو۔ تم نے کہا، ہم نے سن لیا ہے اور پھر نافرمانی کی ہے اور کفر کے نتیجے میں بچھڑے کی محبت سے تمہارے دلوں کی آبیاری ہوئی اگر تم ایمان رکھتے ہو تو کہہ دو کہ تمہارا ایمان تمہیں کیسا بُرا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کی تفسیر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودیوں نے ان زحمتوں اور مشکلوں کے باوجود جو انہوں نے تورات کے پیغمبر موعود تک پہنچنے کے لئے جھیلیں۔ اب حسد کی وجہ سے، یا اس بنا پر کہ یہ پیغمبر بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے یا اس لئے کہ ان کے ذاتی فائدے خطرے میں پڑ جائیں گے یا پھر اور وجوہات کے باعث اس کی اطاعت اور اس پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا۔

زیر بحث آیات میں سے پہلی میں یہودیوں کے اس تعصب نسلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ فرمایا: جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں ہم تو اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے (نہ کہ دوسری قوموں پر) اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کریں گے (واذا قیل لھم اٰمنوا بمآ انزل اللّٰہ قالوا نؤمن بمآ انزل علینا و یکفرون بما وراءہ)۔

وہ انجیل پر ایمان لائے ہیں قرآن پر بلکہ وہ فقط نسلی امتیاز اور اپنے ذاتی فائدے نظر میں رکھے ہوئے ہیں جب کہ قرآن جو محمدؐ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے اور ان نشانیوں اور علامتوں کے مطابق ہے جو پیغمبر موعود کے بارے میں وہ اپنی کتاب میں پڑھ چکے ہیں (وھو الحق مصدقاً لما معھم)۔

اس کے بعد قرآن ان کے جھوٹ سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: اگر تمہارے ایمان نہ لانے کا بہانہ یہ ہے کہ محمدؐ تم میں سے نہیں ہے تو پھر گذشتہ زمانے میں اپنے انبیاء پر ایمان کیوں نہیں لائے ہو اور کیوں انہیں قتل کرتے رہے ہو اگر سچ کہتے ہو اور ایمان دار ہو (قل فلم تقتلون انبیاء اللّٰہ من قبل ان کنتم مؤمنین)۔



اگر وہ سچے دل سے ایمان لائے ہوتے تو خدا کے عظیم انبیاء کو قتل نہ کرتے کیونکہ تورات تو انسانی قتل کو بہت بڑا گناہ قرار دیتی ہے۔

علاوہ ازیں خود یہ کہنا کہ ہم تو صرف ان قوانین و احکام پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوئے ہوں، دراصل توحید اور شرک کا مقابلہ کرنے کے مفہوم سے واضح کجروی ہے۔ یہ ایک طرح کی خود خواہی اور خود پرستی ہے شخصی صورت میں ہو یا نسلی شکل میں۔ توحید اس لئے ہے کہ ایسے خیالات کو وجود انسانی میں سے جڑ سے اکھاڑ پھینکے تاکہ انسان خدا کے قوانین کو صرف اس لئے قبول کرے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اگر خدائی احکامات صرف اس شرط پر قبول کئے جائیں کہ وہ خود ہم پر نازل ہوں تو حقیقت میں یہ شرک ہے نہ کہ ایمان اور یہ کفر ہے نہ کہ اسلام اور اس طرح احکامات قبول کرنا ہرگز ایمان کی دلیل نہیں ہے۔ اسی لئے تو مندرجہ بالا آیت میں ہے: اذا قیل لھم اٰمنوا بما انزل اللہ۔ یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ۔ اس آیت میں نہ محمدؐ کا نام ہے نہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا۔

ان کے کذب کو ظاہر کرنے کیلئے قرآن صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بعد کی آیت میں ان کے خلاف ایک اور سند پیش کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: موسیٰ نے تمام معجزات و دلائل تمہارے سامنے پیش کئے لیکن تم نے اس کے بعد بچھڑے کو منتخب کیا اور اس کام کی وجہ سے تم ظالم و ستم گار ٹھہرے (ولقد جاءکم موسیٰ بالبینٰت ثم اتخذتم العجل من بعدہ و انتم ظالمون)۔

اگر تم سچ کہتے ہو کہ تم اپنے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہو تو پھر یہ بچھڑے کی پرستش اور وہ بھی توحید پر واضح دلائل کے بعد کیا ہے۔ یہ کیسا ایمان ہے جو صرف موسیٰؑ کے اوجھل ہونے اور کوہ طور پر جانے سے تمہارے دلوں سے زائل ہو گیا اور کفر نے ایمان کی جگہ اور بچھڑے نے توحید کا مقام حاصل کر لیا۔ بے شک اس کام سے تم نے اپنے اوپر، معاشرے پر اور آئندہ نسلوں پر ظلم کیا ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں ان کے دعویٰ کے بطلان پر ایک اور سند پیش کی گئی ہے اس ضمن میں کوہ طور کے عہد و پیمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا: ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا اور تم سے کہا کہ جو حکم ہم تمہیں دیں اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور صحیح طور سے سنو لیکن تم نے کہا ہم نے سن کر اس کی مخالفت کی (واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ واسمعوا قالوا سمعنا وعصینا)۔

بے شک ان کے دلوں کی بچھڑے کی محبت سے آبیاری ہوئی اور کفر نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا (واشربوا فی قلوبھم العجل بکفرھم)۔

شرک اور دنیا پرستی نے جس کی مثال سامری کے بنائے ہوئے سونے کے بچھڑے سے ان کی محبت ہے، ان کے تار و پود میں اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا اور ان کے سارے وجود میں اس کی جڑیں پہنچ گئی تھیں۔ اسی بنا پر وہ خدا کو بھول گئے تھے۔



عجیب مسخرہ پن ہے یہ کیسا ایمان ہے جو خدا کے پیغمبروں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے جو بت پرستی اور بچھڑے کی پرستش کو بھی روا جانتا ہے اور خدا سے باندھے ہوئے محکم میثاقوں کو طاقِ نسیان کر دیتا ہے۔

اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تمہیں کیسے برے احکام دیتا ہے (قل بئسما یامرکم بہ ایمانکم ان کنتم مؤمنین)۔[1]

چند اہم نکات

(ا) "قالوا سمعنا وعصینا" کا مفہوم: اس کا معنیٰ ہے "ہم نے سنا اور معصیت کی"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زبان سے یہ الفاظ کہتے ہیں بلکہ ظاہراً اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے اس واقعیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ ایک عمدہ کنایہ ہے جو روزمرہ گفتگو میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(اا) "واشربوا فی قلوبھم العجل" کا مفہوم: یہ بھی ایک عمدہ کنایہ ہے جو یہودی قوم کی حالت بیان کرتا ہے۔

جیسا کہ مفردات راغب میں ہے کلمہ "اشراب" کے دو معانی ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ "اشربت البعیر" کے باب سے ہو یعنی "میں نے اونٹ کی گردن میں رسی باندھی" اس معنیٰ کے لحاظ سے مندرجہ بالا جملہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ "محبت و وابستگی کی مضبوط رسی نے ان کے دلوں کو بچھڑے سے باندھ دیا"۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اس کا مادہ "شراب" سے ہو جس کا معنیٰ ہے "آبیاری کرنا"۔ اور "دوسرے کو پانی دینا" اس صورت میں لفظ "حب" مقصود ہو گا۔ یوں مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہو گا "بنی اسرائیل نے اپنے دلوں کی بچھڑے کی محبت سے آبیاری کی"۔

یہ اہل عرب کی عادات کا حصہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق سخت قسم کا تعلق یا زیادہ کینہ ظاہر کرنا چاہیں تو مندرجہ بالا تعبیر ہی کی طرح کا انداز اختیار کرتے ہیں۔

اس سے ضمناً ایک اور نکتہ بھی نکلا کہ بنی اسرائیل کے ان غلط کاموں پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اعمال ان کے دلوں کی اس سرزمین کا حاصل ہیں جس کی شرک کے پانی سے آبیاری کی گئی ہے اور جو سرزمین ایسے پانی سے سیراب ہو اس سے خیانت، قتلِ انبیاء اور گناہ و ظلم کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس بات کی اہمیت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جب دینِ یہود میں موجود قتل کی قباحت اور انسان کے قتل کے برائی کے احکام پر نظر جاتی ہے جنہیں خاص اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہودیوں کا دین اس ظلم کو اس قدر برا سمجھتا تھا کہ قاموس کتاب مقدس صفحہ ۶۰۷ کی تحریر کے مطابق قتلِ عمد اور

---

[1] بنی اسرائیل کے بیان نیز اس کی تشریح اور خصوصیات اسی سورہ کی آیت ۵۱ اور ۹۳ میں بیان ہو چکی ہیں۔



اس کی قباحت اسرائیلیوں کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ مدتیں گذر جانے کے بعد اور مدتوں ایسے شہروں میں پناہ لینے کے بعد بھی جنہیں پناہ گاہ کہا جاتا تھا اور مقاماتِ مقدسہ پر التجا کے باوجود بھی قابل بری الذمہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس سے ہر صورت میں قصاص لیا جاتا

یہ تو نفی عام انسان کے قتل کے بارے میں ہے چہ جائیکہ خدا کے انبیاء کا قتل۔ پس اگر بنی اسرائیل تورات پر ایمان رکھتے تو انبیاء کو قتل نہ کرتے۔

۹۴۔ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۹۵۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

۹۶۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۹۴۔ کہہ دو اگر (جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو) خدا کے ہاں آخرت کا گھر دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر مرنے کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

۹۵۔ لیکن وہ بُرے اعمال کی صورت میں جو آگے بھیج چکے ہیں ان کے باعث کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے اور خدا ظالموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔

۹۶۔ انہیں سب لوگوں سے زیادہ حریص یہاں تک کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر لالچی (دولت جمع کرنے اور اس دنیا کی) زندگی پر پاؤ گے (یہاں تک کہ) ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار سال عمر پائے حالانکہ یہ طولانی عمر (بھی) اسے خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی اور خدا ان کے اعمال دیکھتا ہے۔

تفسیر

خود پسند گروہ

قرآن مجید کی مختلف آیات کے علاوہ بھی یہودیوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بلند نسل سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہی انسانی معاشرے کے منتخب پھول ہیں اور بہشت انہی کے لئے بنائی گئی ہے اور جہنم کی آگ



ان سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی، وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں۔ خلاصہ یہ کہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند انہا تنہا دارند" یعنی تمام عالم کی اچھائیاں انہی میں جمع ہیں۔

ان کی یہ خوشبودار، خود خواہی قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے جن میں یہودیوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

سورہ مائدہ کی آیت ١٨ میں ہے:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ

یعنی۔ ہم خدا کے فرزند اور خاص دوست ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیہ ١١١ میں ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

یعنی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہودی اور عیسائی کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جا سکتا۔

سورہ بقرہ کی آیہ ٨٠ میں ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ

چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ ہمیں نہیں چھو سکتی۔

یہ موہوم خیالات ایک طرف تو انہیں ظلم و زیادتی اور گناہ و طغیان کی طرف مائل کرتے اور دوسری طرف تکبر، خود پسندی اور خود کو سب سے بلند سمجھنے کی دعوت دیتے۔

مندرجہ بالا آیات میں قرآن مجید انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر خدا کے ہاں باقی لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر موت کی تمنا کرو اگر سچ کہتے ہو (قل ان کانت لکم الدار الآخرة عند الله خالصة من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صدقین)۔

یعنی۔ کیا تم مائل نہیں ہو کہ جوار رحمت خدا میں جا کر پناہ لو اور جنت کی بے شمار نعمتیں تمہارے اختیار میں ہوں۔

کیا تم اپنے محبوب کے دیکھنے کے آرزومند نہیں ہو۔

یہودی چاہتے تھے کہ وہ یہ بات کر کے مسلمانوں کو آزردہ خاطر کریں کہ بہشت تو یہودیوں کے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ ہم تو دوزخ میں بس چند دن جلیں گے اور یا کہتے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی ہوگا۔ قرآن نے ان کے اس جھوٹ سے پردہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ جب وہ دنیا کی زندگی کو کسی طرح ترک کرنے کو تیار نہیں تو یہی ان کے جھوٹے ہونے کی محکم دلیل ہے۔

واقعاً اگر انسان کا دار آخرت کے بارے میں وہی ایمان ہو جو بزعم خود یہودیوں کا تھا تو وہ اس دنیا سے کیسے لو لگا سکتا ہے اور کیسے اس کے حصول کے لئے ہزاروں گناہوں کا مرتکب ہو سکتا ہے اور وہ موت سے یہاں تک کہ اپنے مقصد

کی راہ میں بھی کیسے ڈر سکتا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے۔ اپنے آگے بھیجے ہوئے بُرے اعمال کی وجہ سے وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے (ولن یتمنوہ ابدا بما قدمت ایدیھم) اور خدا ستمگاروں سے واقف ہے (واللہ علیم بالظلمین)۔

جی ہاں — وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال ناموں میں کیسی سیاہیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے قبیح اور سنگین گناہوں سے مطلع تھے۔ خدا بھی ان ظالموں کے اعمال سے آگاہ ہے۔ اسی لئے ان کے لئے آخرت کا گھر عذاب، سختی اور رسوائی کا گھر ہے اور اسی بناء پر وہ اس کی خواہش نہیں رکھتے۔

محل بحث آیت مادی چیزوں کے متعلق اُن کے شدید حرص کا تذکرہ یوں کرتی ہے: انہیں تم اس زندگی پر سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ (ولتجدنھم احرص الناس علی حیوٰۃ ج)۔ یہاں تک کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر (ومن الذین اشرکوا ج)۔ مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی میں حریص، دنیا پر قبضہ کرنے میں حریص، سب کچھ اپنے لئے سمجھنے میں حریص یہاں تک یہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص ہیں حالانکہ مشرکین کو فطری طور پر مال جمع کرنے میں سب سے زیادہ حریص ہونا چاہیئے۔

ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہزار سال تک زندہ رہے (یود احدھم لو یعمر الف سنۃ ج) زیادہ ثروت جمع کرنے کے لئے یا سزا کے خوف سے۔

ہاں — وہ موت سے ڈرتے ہیں اور ہزار سالہ عمر کی تمنا کرتے ہیں لیکن یہ طولانی عمر بھی انہیں عذاب خدا سے نہیں بچا سکے گی (وما ھو بمزحزحہ من العذاب ان یعمر ط)۔

اگر وہ گمان کرتے ہیں کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ نہیں ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ خدا ان کے اعمال کے بارے میں بصیر و بینا ہے (واللہ بصیر بما یعملون)۔

چند اہم نکات

(۱) ہزار سال عمر کی تمنا: توجہ رہے کہ ہزار سال سے مراد ہزار سال کا عدد نہیں بلکہ یہ طولانی عمر سے کنایہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عدد تکثیر ہے نہ کہ عدد تعداد۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہزار کا عدد اس زمانے میں عربوں کے نزدیک سب سے بڑا عدد تھا اور اس سے بڑے عدد کا ان کے پاس کوئی نام نہیں تھا لہٰذا سب سے بڑا مبالغہ یہی شمار ہوتا تھا۔[1]

(۲) "علیٰ حیوٰۃ": نکرہ کی صورت میں یہ تعبیر کچھ مفسرین کے بقول تحقیر کے لئے ہے یعنی انہوں نے دنیا کی زندگی سے دل وابستہ کر رکھا ہے یہاں تک کہ اس جہان کی پست ترین زندگی کو بھی جو بدبختی میں گزرے وہ آخرت کے گھر پر ترجیح دیتے ہیں۔[2]

---

[1] المنار جلد ۱ صفحہ ۳۳۱

[2] المیزان ج ۱، صفحہ ۲۳۰ و المنار ج ۱، ص ۳۹۰۔



(iii) یہودیوں کی نسل پرستی: اس میں شک نہیں کہ بہت سی جنگوں اور خونریزیوں کا سرچشمہ نسل پرستی تھی خصوصاً دنیا کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم جو تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ انسانی جانوں کی تباہی اور آبادی کی ویرانی کا باعث ہوئیں اس میں آلمانیوں (نازیوں) کی نسل پرستی کے جنون سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اگر طے ہو جائے کہ دنیا کے نسل پرستوں کی صف بندی کی جائے یا فہرست مرتب کی جائے تو یہودی پہلی لائن میں ہوں گے۔

اس وقت بھی انہوں نے جو حکومت اسرائیل کے نام سے تشکیل دی ہے اسی نسلی تفاخر کی بنیاد پر ہے اور اس کی تشکیل میں وہ کیسے کیسے مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کی بقاء کے لئے کیسی کیسی دہشت ناکیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

حالت تو یہ ہے کہ دین موسوی کو بھی اپنی نسل میں محصور سمجھتے ہیں اور نسل یہود کے علاوہ کوئی یہودی مذہب قبول کرے تو یہ ان کیلئے کوئی توجہ طلب بات نہیں اسی لئے تو وہ دیگر اقوام میں اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج نہیں کرتے اسی وجہ سے وہ ساری دنیا میں نفرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں کیونکہ دنیا کے لوگ ایسے اشخاص کو ہرگز پسند نہیں کرتے جو دوسروں کے مقابلے میں اپنے نسلی امتیاز کے قائل ہوں۔

اصولی طور پر نسل پرستی شرک کی ایک قسم ہے اسی لئے تو اسلام سختی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے جن کا امتیاز فقط تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔

(iv) موت سے خوف کی بنیاد: زیادہ تر لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور اس سے خوف زدہ ہیں۔ تحلیل و تجزیہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی دو میں سے کوئی ایک بنیاد ہے:

(۱) بہت سے لوگ موت کو فنا، عدم اور ہلاکت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان فنا اور ہلاکت سے خوف کھاتا ہے اور اگر انسان کے لئے موت کا یہی مفہوم ہو تو یقیناً موت سے گریزاں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بہترین حالات اور کامیابی کے درجہ کمال کے وقت بھی زندگی کے خاتمے کا خیال زندگی کے شہد کو زہر بنا دیتا ہے اور انسان ہمیشہ اس فکر سے پریشان رہتا ہے۔

(۲) وہ لوگ جو موت کو وجود کی انتہا نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک وسیع تر اور عالی تر گھر کی زندگی کے لئے تمہید سمجھتے ہیں لیکن اپنے اعمال کی وضع، تباہ کاریوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے موت سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ موت کو اپنے برے اعمال کے نتائج تک پہنچنے کی ابتدا سمجھتے ہیں اسی لئے محاسبۂ الٰہی اور سزا سے بھاگتے ہوئے وہ چاہتے ہیں کہ جتنا ہو سکے موت کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔

مندرجہ بالا آیت دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لیکن ـــــ خدا کے پیغمبر ایک طرف موت کے بعد ہمیشہ کی زندگی کا ایمان لوگوں کے دلوں میں زندہ کرتے ہیں اور موت کا وہ وحشت ناک چہرہ جو فنا و نابودی کی نشاندہی کرتا ہے اسے بدل کر اس کا حقیقی چہرہ پیش کرتے ہیں جو



دراصل عالی ترین زندگی کا دریچہ ہے اور دوسری طرف "پاکیزہ عمل" کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اعمال کی سزا کی وجہ سے جو وحشت ہے وہ زائل ہو جائے اسی لئے تو صاحب ایمان لوگ موت سے کسی قسم کا خوف نہیں رکھتے۔

۹۷۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ○

۹۸۔ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ○

ترجمہ

۹۷۔ (وہ کہتے ہیں: چونکہ وہ فرشتہ جو تم پر وحی لے کر آتا ہے جبرائیل ہے اور ہماری جبرائیل سے دشمنی ہے۔ لہٰذا ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے) کہیئے: جو جبرائیل کا دشمن ہے (درحقیقت خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکم خدا سے آپ کے دل پر قرآن اتارا ہے وہ قرآن جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور مومنین کیلئے ہدایت و بشارت ہے۔

۹۸۔ جو شخص خدا، فرشتوں، خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں، جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے (خدا اس کا دشمن ہے کیونکہ) خدا کافروں کا دشمن ہے۔

شان نزول

کہتے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ میں تشریف لائے تو ایک دن ابن صوریا (ایک یہودی عالم) فدک کے یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ آپ کے پاس آئے اور آنحضرت سے مختلف سوالات کئے اور وہ نشانیاں جو آپ کی نبوت و رسالت کے بارے میں تھیں تلاش کرنے لگا منجملہ ان کے انہوں نے کہا:

اے محمدؐ! تمہیں نیند کس طرح آتی ہے کیونکہ ہمیں پیغمبر موعود کی نیند کے متعلق اطلاع مل چکی ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

تنام عيناى و قلبى يقظان.

یعنی— میری آنکھ تو سو جاتی ہے لیکن میرا دل بیدار رہتا ہے۔

وہ کہنے لگے:

آپ نے سچ کہا ہے اے محمدؐ!



پھر بہت سے سوال کیے۔ بعدازاں ابن صوریا نے کہا:

ایک بات رہ گئی ہے اگر اس کا صحیح جواب دے دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی پیروی کریں گے۔ ذرا بتائیے کہ جو فرشتہ آپ پر وحی لے کر آتا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

جبریل۔

ابنِ صوریا نے کہا:

وہ تو ہمارا دشمن ہے وہ تو جہاد اور (دشمنوں سے) جنگ کے بارے میں سخت احکام لے کر آتا ہے لیکن میکائیل ہمیشہ سادہ اور راحت بخش احکام لاتا ہے اگر آپ کی وحی کا فرشتہ میکائیل ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔[1]

تفسیر

بہانہ ساز قوم

آیت کی شانِ نزول دیکھنے سے دوبارہ اس بہانہ ساز قوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے پیغمبرِ معظم حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے لے کر آج تک یہی روش اختیار کئے رکھی ہے اور ہر زمانے میں حق کے زیر بار آنے کی بجائے بہانے تلاش کئے ہیں۔

یہاں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں بہانہ صرف یہ ہے کہ چونکہ جبریلؑ آپ پر وحی لانے والا فرشتہ ہے جو خدا کے سخت احکام لاتا ہے لہٰذا ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ ہم اس کے دشمن ہیں اگر میکائیل ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا اور آسان تھا کہ ہم ایمان لے آئیں۔

ان سے پوچھا جائے کہ کیا خدا کے فرشتے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کیا اصولاً وہ خواہش کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنی طرف سے کچھ کہتے ہیں؟ وہ تو قرآن کے مطابق ایسے ہیں:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ

یعنی — جو کچھ خدا حکم دیتا ہے وہ وہی انجام دیتے ہیں۔ (تحریم-۶)

ان بہانہ سازیوں کا جواب زیرِ نظر آیات میں اس طرح دیتا ہے: ان سے کہہ دو جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے وہ

---

[1] مجمع البیان میں یہ حدیث ابن عباس کے حوالے سے موجود ہے۔ دوسری تفاسیر مثلاً فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر، المیزان، المنار، وغیرہ میں بھی (کچھ اختلاف کے ساتھ) یہ روایت موجود ہے۔



درحقیقت خدا کا دشمن ہے کیونکہ اس نے تو خدا کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا ہے (قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علیٰ قلبک باذن اللہ)۔

وہ قرآن جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے (مصدقا لما بین یدیہ)۔

وہی جو مومنین کے لئے ہدایت و بشارت کا سبب ہے (وھدی وبشرٰی للمومنین)۔

اس آیت میں دراصل اس گروہ کو تین واضح جواب دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ جبرئیل کوئی چیز اپنی طرف سے نہیں لاتا جو کچھ ہے "باذن اللہ" ہے۔

دوسرا یہ کہ گذشتہ کتب میں سے صداقت اور روشنی کی نشانیاں اس میں موجود ہیں کیونکہ یہ انہی نشانیوں کے مطابق ہے (مصدق لما بین یدیہ) یعنی اس کا کوئی جواز نہیں کہ تم تورات پر تو ایمان لے آؤ لیکن قرآن سے کفر اختیار کرو جو تورات کی نشانیوں کے مطابق ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان کے مضامین ہم آہنگ ہیں اور یہ بات قرآن کی سچائی کی ترجمان ہے اور یہ قرآن مومنین کے لئے ہدایت وبشارت کا سبب ہے [1]

اگلی آیت میں یہی مضمون مزید تاکید و تہدید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ فرماتا ہے: جو شخص خدا، فرشتوں، خدا کے پیغمبروں، جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے۔ خدا اس کا دشمن ہے کہ خدا کافروں کا دشمن ہے (من کان عدواللہ وملئکتہ ورسلہ وجبریل و میکٰل فان اللہ عدو للکٰفرین)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان میں تشکیک و تفاوت نہیں ہے جو اللہ، فرشتے، خدا کے رسول، جبرئیل و میکائیل بلکہ کسی فرشتے کا دشمن ہے اور جو ان میں تشکیک و تفاوت کا قائل ہے پروردگار اس کا دشمن ہے۔

یہ الفاظ دیگر احکام الٰہی جو نوع انسانی کے لئے سودمند اور تکامل بخش ہیں خدا کی طرف سے فرشتوں کے ذریعے پیغمبروں پر نازل ہوتے ہیں اب اگر ذمہ داریاں مختلف ہوں تو تقسیم کار کے فرق کو تضادِ کار تو نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب ایک ہی راہ مستقیم پر ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ یہودی اور دیگر منکرین قرآن یہ جان لیں کہ انہوں نے جبرئیل، دیگر ملائکہ اور پیغمبروں کی دشمنی اختیار کرکے ایک بڑے طاقتور کی دشمنی مول لی ہے۔ قرآن کہتا ہے جو ان سے دشمنی رکھے خدائے بزرگ اس کا دشمن ہے کہ بے شک خدا کافروں کا دشمن ہے۔

رہی "قلب" کی بحث۔ کہ قرآن میں اس سے کیا مراد ہے تو یہ اسی سورہ کی آیت ،، کے ذیل میں آچکی ہے۔

جبرئیل و میکال

جبرئیل کا نام تین مرتبہ اور میکال کا نام ایک مرتبہ اسی مقام پر آیا ہے [2] انہی آیات سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے

---

[1] المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] جبرئیل کا نام مورد بحث آیت میں دو مرتبہ اور سورہ تحریم، آیہ ۴ میں ایک مرتبہ مذکور ہے۔



کہ دونوں فرشتے بزرگ اور مقرب الٰہی ہیں۔ مسلمانوں کی عمومی تحریروں میں جبریل "ہمزہ" کے ساتھ اور میکال "ہمزہ" اور "یا" کے ساتھ آتا ہے لیکن متن قرآن میں جبریل اور میکال ہے۔

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ جبریل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل "جبرئیل" ہے جس کا معنی ہے "مرد خدا" یا "قوت خدا" (جبر کا معنی قوت یا مرد ہے اور ئیل کا معنی خدا ہے)

محل بحث آیات کے مطابق جبرئیل پیغمبر کے لئے وحی کا قاصد تھا اور آپ کے قلب مبارک پر قرآن نازل کرنے والا تھا جب کہ سورۂ نحل کی آیہ ۱۰۲ کے مطابق روح القدس وحی لاتا تھا اور سورۂ شعراء، آیہ ۱۹۱ میں ہے کہ روح الامین تدریجاً قرآن پیغمبر اکرم پر لاتا رہا لیکن جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے روح القدس اور روح الامین سے مراد جبرئیل ہی ہیں۔

ہمارے پیش نظر ایسی احادیث ہیں جن کے مطابق جبرئیل مختلف شکلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوتے رہے اور مدینہ میں جبرئیل زیادہ تر دحیہ کلبی کی شکل میں آنحضرتؐ کے سامنے ظاہر ہوتے تھے جو ایک خوبصورت جوان تھا۔

سورۂ نجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جبرئیل کو دو مرتبہ (اس کی اصل شکل میں) دیکھا ہے[1]

اسلامی کتب میں جن چار فرشتوں کا عموماً مقرب بارگاہ الٰہی شمار کیا گیا ہے وہ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل ہیں۔ جن میں سے جبرئیل بلند مرتبہ ہیں۔

یہودیوں کی کتب میں بھی جبرئیل اور میکال کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ منجملہ ان کے کتاب دانیال میں جبرائیل کو شیطانوں کے سربراہ کو مغلوب کرنے والا اور میکائیل کو قوم اسرائیل کا حامی کہا گیا ہے لیکن بعض کے بقول کوئی ایسی چیز جو جبرئیل کی یہودیوں سے دشمنی پر دلالت کرے دسترس میں نہیں آئی[2] اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں یہودیوں کا جبریل سے اظہار دشمنی ایک بہانہ تھا تاکہ اس کے ذریعے اسلام قبول کرنے سے بچ جائیں یہاں تک کہ ان کی مذہبی کتب میں بھی اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۹۹۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝

۱۰۰۔ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

۱۰۱۔ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

---

[1] اعلام قرآن، ص ۲۷۶
[2] اعلام قرآن، ص ۲۹۶



ترجمہ

۹۹۔ تیرے لئے ہم نے روشن نشانیاں بھیجیں اور سوائے فاسقین کے کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

۱۰۰۔ اور کیا جب بھی (یہودی) کوئی پیمان (خدا اور رسول سے) باندھتے ان میں سے ایک گروہ اسے پس پشت نہیں ڈال دیتا تھا (اور اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا) اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

۱۰۱۔ اور جب بھی خدا کی طرف سے کوئی رسول ان کی طرف آیا جب کہ وہ ان نشانیوں کے مطابق بھی تھا جو ان کے پاس تھیں اور ان میں سے ایک جماعت نے جو حامل کتاب (اور عالم) لوگوں پر مشتمل تھی خدا کی کتاب کو ایسے پس پشت ڈال دیا گویا وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔

شان نزول

مندرجہ بالا پہلی آیت کے سلسلے میں ابن عباس سے شان نزول منقول ہے کہ ابن صوریا نے ڈھٹائی اور عناد کی بنا پر پیغمبر اسلام سے کہا:

تمہاری لائی ہوئی کوئی چیز ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور خدا نے تم پر کوئی واضح نشانی نازل نہیں کی کہ ہم تمہاری اتباع کریں۔

اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی اور اسے صراحت سے جواب دیا۔[1] یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شان نزول آیات کے مفاہیم کو کبھی محدود نہیں کر سکتا اور ان کی کلیت و عمومیت میں کمی نہیں ہوتی اگرچہ ان کے آغاز کا سبب وہی ہوتا تھا۔

تفسیر

پیمان شکن یہودی

زیر بحث پہلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کافی دلیلیں، روشن نشانیاں اور واضح آیات پیغمبر اکرم کے پاس تھیں۔ جو لوگ انکار کرتے وہ دراصل آپ کی دعوت کی حقانیت کو جان چکے تھے لیکن مخصوص اغراض کی خاطر مخالفت میں کھڑے ہو جاتے۔ قرآن کہتا ہے: ہم نے تم پر آیات بینات نازل کیں اور فاسقین کے سوا کوئی ان سے کفر نہیں کرتا (ولقد انزلنا الیک ایٰت بینٰت وما یکفر بھا الا الفٰسقون)۔

آیات قرآن پر غور و فکر کرنے سے ہر پاک دل اور حق جو انسان کے لئے راستے واضح اور روشن ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی ان آیات کے مطالعے سے پیغمبر اسلام کی صداقت اور قرآن کی عظمت کو پا لیتا ہے لیکن اس حقیقت کو صرف وہی

---

[1] مجمع البیان و تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا دل گناہ کے اثر سے سیاہ نہ ہو چکا ہو اور تعجب نہیں کہ فاسق لوگ فرمان خدا کی اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنی صحیح فطرت کو تسلسل گناہ کے باعث گنوا بیٹھتے ہیں، وہ کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کے بعد یہودیوں کے ایک گروہ کی ایک بہت قبیح صفت یعنی ایفائے عہد کی عدم پاسداری اور پیمان شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا جب کبھی انہوں نے خدا اور پیغمبر سے عہد و پیمان باندھا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت نہیں ڈال دیا اور اس کی مخالفت نہیں کی (اوکلما عٰھدوا عھدا نبذہ فریق منھم) بے شک وہ ایسے ہی ہیں اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے (بل اکثرھم لا یؤمنون)۔

خدا نے کوہ طور پر ان سے یہ عہد لیا تھا کہ تورات کے احکام پر عمل کریں گے لیکن انہوں نے یہ عہد توڑ دیا اور اس پر عمل نہیں کیا۔ ان سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ پیغمبر موعود (پیغمبر اسلام، جن کے آنے کی بشارت تورات میں موجود تھی) پر ایمان لے آئیں، انہوں نے اس عہد پر بھی عمل نہیں کیا۔

جب پیغمبر اسلامؐ مدینہ میں آئے تو بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں سے عہد و پیمان ہوا کہ وہ آپؐ کے دشمن کی مدد نہیں کریں گے لیکن آخر کار انہوں نے یہ عہد بھی توڑ دیا اور جنگ احزاب (خندق) میں اسلام کے خلاف مشرکین مکہ کا ساتھ دیا۔

بنیادی طور پر یہودیوں کی اکثریت کا پرانا طریقہ اور سنت ہے کہ وہ اپنے عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتے۔ ہم آج بھی واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ صہیونیوں اور اسرائیل کا مفاد جہاں خطرے میں ہو بین الاقوامی معاہدوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ زیر بحث آیات میں سے آخری اس موضوع کو صراحت سے اور گویا تاکید سے بیان کرتی ہے۔ فرمایا: خدا کا بھیجا ہوا ان کے پاس آیا جو ان نشانیوں کے مطابق تھا جو ان کے ہاں موجود تھیں، ان میں سے ایک جماعت جو صاحب کتاب لوگوں (علماء) پر مشتمل تھی اس نے کتاب خدا کو اپنے پس پشت ڈال دیا گویا انہیں علم ہی نہ تھا (ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتٰب کتٰب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون)۔

مندرجہ بالا ابحاث میں قرآن نے بنی دیگر بحثوں کی ایک جمعیت کی اکثریت کے گناہ کی وجہ سے سب کو قابل ملامت قرار نہیں دیا بلکہ "فریق" اور اکثریت کے الفاظ استعمال کرکے اقلیت کے تقویٰ و ایمان کے حصے کی حفاظت کی ہے اور حق طلبی و حق جوئی کی یہی راہ و رسم ہے۔

۱۰۲۔ وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡكِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّیٰطِیۡنَ كَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَكَیۡنِ
بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ
وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنفَعُهُمْ ط وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ قف
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

١٠٣- وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ط لَّوْ كَانُوا
يَعْلَمُونَ ○ ع ١٢

ترجمہ

١٠٢- (یہودی) اس کی پیروی کرتے ہیں جو سلیمان کے زمانے میں شیاطین لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے سلیمان (نے کبھی بھی جادو سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے اور وہ) کافر نہیں ہوئے۔ لیکن شیاطین نے کفر کیا ہے اور لوگوں کو اس جادو کی تعلیم دی۔ جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا وہ دونوں فرشتے جادو کرنے کا طریقہ (لوگوں کو اسے باطل کرنے کے طریقے سے آگاہ کرنے کیلئے) سکھاتے تھے وہ کسی کو کوئی بھی چیز سکھانے سے پہلے اسے کہتے تھے کہ ہم تیری آزمائش کا ذریعہ ہیں، کہیں کافر نہ ہو جانا (اور ان تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا) لیکن وہ ان دو فرشتوں سے وہ مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں (نہ یہ کہ اس تعلیم کو جادو کے اثر کو باطل کرنے کے لئے استفادہ کریں) مگر وہ حکم خدا کے بغیر کبھی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ وہ صرف انہی حصوں کو سیکھتے جو ان کے لئے نقصان دہ تھے اور انہیں ان کا کوئی فائدہ نہ تھا اور یقیناً وہ یہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال و متاع کا خریدار ہو اُسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا اور کاش وہ یہ جانتے کہ کس قدر قبیح اور ناپسندیدہ تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچتے تھے۔

١٠٣- اگر وہ توجہ کرتے اور ایمان لے آتے اور پرہیزگاری کو اپنا شیوہ بناتے تو خدا کے پاس جو اس کا بدلا تھا وہ ان کے لئے بہتر تھا۔

تفسیر

سلیمانؑ اور بابل کے جادوگر

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں کچھ لوگ آپ کے ملک میں سحر و جادو کا عمل کرنے لگے حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ تمام تحریریں اور اوراق جمع کرکے ایک مخصوص جگہ پر رکھ دو (انہیں محفوظ رکھنا شاید اس



بنار پر تھا کہ ان میں سحر و جادو کو باطل کرنے کے لئے مفید مطالب بھی تھے۔

حضرت سلیمان کی رحلت کے بعد کچھ لوگوں نے انہی تحریروں کو باہر نکالا اور جادو کی ترویج شروع کر دی۔ بعض نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہنے لگے کہ سلیمان بالکل پیغمبر نہ تھے بلکہ وہ اسی سحر اور جادو کی مدد سے ان کے ملک پر قابض تھے اور اسی سے وہ خارقِ عادت امور انجام دیتے تھے۔

بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے بھی ان کی پیروی کی اور جادوگری کے بہت زیادہ دلدادہ ہوگئے یہاں تک کہ تورات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب پیغمبر اسلامؐ نے ظہور فرمایا اور آیاتِ قرآنی کے ذریعے خبر دی کہ سلیمانؑ خدا کے پیغمبروں میں سے تھے تو یہودیوں کے بعض احبار و علماء کہنے لگے:

"کیا محمد پر حیرت نہیں جو کہتا ہے سلیمان پیغمبرانِ خدا میں سے تھا جب کہ وہ تو جادوگر تھا"۔[1]

یہودیوں کی یہ گفتگو خدا کے ایک بزرگ پیغمبر پر تہمت و افتراء تھی یہاں تک کہ اس کا لازمی نتیجہ حضرت سلیمانؑ کی تکفیر تھا کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق تو سلیمان ایک جادوگر تھے اور غلط طور پر اپنے آپ کو پیغمبر کہتے تھے۔

قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ سلیمان ہرگز کافر نہ تھے بلکہ شیاطین اور لوگوں کو جادو سکھلانے والے کافر ہوگئے تھے۔

پہلی زیر بحث آیت یہودیوں کی برائیوں کے ایک اور پہلو کا پتہ دیتی ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت سلیمانؑ کو جادوگری کا الزام دیا تھا: فرمایا: (یہ یہودی) اس کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین سلیمانؑ کے زمانے میں لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے (واتبعوا ما تتلوا الشیٰطین علیٰ ملک سلیمان)۔

ممکن ہے "واتبعوا" کی ضمیر پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں، یا حضرت سلیمانؑ کے زمانے کے یہودیوں یا دونوں کی طرف اشارہ ہو لیکن گذشتہ آیات سے مناسبت کے لحاظ سے یہ پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔

شیاطین سے بھی ممکن ہے سرکش انسان یا جن یا دونوں مراد ہوں۔

بہرحال اس گفتگو کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: سلیمان کبھی کافر نہیں ہوئے (وما کفر سلیمان)۔ انہوں نے کبھی جادو کو ذریعہ بنایا اور نہ بلاوجہ اپنی رسالت کا دعویٰ کیا۔

لیکن شیاطین کافر ہوئے ہیں اور انہی نے جادو کی تعلیم دی ہے (ولکن الشیٰطین کفروا یعلمون الناس السحر)۔

پھر وہ مزید کہتا ہے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل ہوا (وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت)۔[2]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۹۲، اور مجمع البیان زیر نظر آیت کے ذیل میں (تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔

[2] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "ما انزل" کا عطف "ما تتلوا" پر ہے اور جو تفسیر اوپر بیان ہوئی ہے وہ اسی بنیاد پر ہے لیکن بعض "السحر" پر عطف سمجھتے ہیں اور بعض "ما" کو بھی نافیہ قرار دیتے ہیں۔



گویا انہوں نے دو طرف سے جادو کی طرف ہاتھ بڑھایا ایک تو شیاطین کی تعلیم سے جو حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تھے اور دوسرا خدا کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کے ذریعے سے جو لوگوں کو جادو باطل کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

ان دو خدائی فرشتوں کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جادو کا اثر زائل کرنے کا طریقہ سکھائیں لہٰذا وہ کسی بھی شخص کو کچھ سکھانے سے پہلے کہہ دیتے تھے کہ ہم تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں، کافر نہ ہو جاؤ اور ان تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا) (وما یعلمٰن من احد حتی یقولا انما نحن فتنة فلا تکفر)۔

یہ دو فرشتے اس زمانے میں لوگوں کے پاس آئے جب جادو کا بازار گرم تھا اور لوگ جادوگروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اور ان فرشتوں نے جادوگروں کے جادو کو باطل کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھایا۔

چونکہ کسی چیز (مثلاً بم) کو بے کار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے سے اس چیز (مثلاً بم کی ساخت) سے آگاہ ہو پھر ہی اسے بیکار کرنے کا طریقہ سیکھے لیکن یہودیوں میں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں نے اسے زیادہ سے زیادہ جادو پھیلانے کا ذریعہ بنا لیا اور اتنا آگے بڑھے کہ ایک عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کو بھی متہم کیا کہ اگر مادی عوامل ان کے زیر فرمان ہیں اور جن و انس ان کی فرمانبرداری کرتے ہیں تو یہ سب جادو کی وجہ سے ہے۔

بدکار لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے برُے مسلک اور پروگرام کی توجیہ کے لئے بزرگوں کو اسی مسلک کا پیرو ہونے کا اتہام دیتے ہیں۔

بہرحال وہ اس خدائی آزمائش میں کامیاب نہ ہو سکے وہ ان دو فرشتوں سے ایسے مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال سکیں (فیتعلمون منهما ما یفرقون به بین المرء وزوجه)۔

مگر خدا کی قدرت ان تمام قدرتوں پر حاوی ہے لہٰذا وہ حکم خدا کے بغیر ہرگز کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے (وماهم بضارین به من احد الا باذن الله)۔

وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لئے مضر ہوتیں اور نفع بخش نہ ہوتیں (ویتعلمون ما یضرهم ولا ینفعهم)۔

انہوں نے اس اصلاحی خدائی پروگرام کی تحریف کر دی اور بجائے اس کے کہ وہ اسے اصلاح اور جادو کے مقابلے کا ذریعہ بناتے فساد کا ذریعہ بنا ڈالا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال و متاع کا خریدار ہو اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا (ولقد علموا لمن اشتراه ماله فی الاٰخرة من خلاق ط)[۱]

بے شک کتنی بری اور قبیح تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچ رہے تھے اے کاش ان میں علم و دانش ہوتی (ولبئس ما شروا به انفسهم لو کانوا یعلمون)۔

---

[۱] "خلاق" کا اصل معنیٰ تو "خلق و عادت" ہے لیکن کبھی "نصیب" اور "حصہ" کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔



انہوں نے جان بوجھ کر اپنی اور اپنے معاشرے کی سعادت و نیک بختی کو ٹھکرا دیا اور کفر و گناہ کے گرداب میں غوطہ زن ہو گئے حالانکہ اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدا کے ہاں سے جو بدلہ اور ثواب انہیں ملتا وہ ان کے لئے ان تمام امور سے بہتر ہوتا۔ اے کاش وہ متوجہ ہوتے (ولو انھم اٰمنوا واتقوا لمثوبة من عند اللّٰہ خیر لو کانوا یعلمون)۔

چند اہم نکات

(۱) **ہاروت اور ماروت کا واقعہ:** بابل میں نازل ہونے والے فرشتوں کے بارے میں لکھنے والوں نے کئی قصے کہانیاں اور افسانے تراشے اور خدا کے ان دو بزرگ فرشتوں کے سر تھوپ دیے حتیٰ کہ انہیں خرافات اور افسانوں کا عنوان بنا دیا گیا اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کسی دانشمند کے لئے اس تاریخی واقعہ کی تحقیق اور مطالعہ بہت مشکل ہو گیا لیکن جو کچھ زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور عقلی و تاریخی لحاظ سے صحیح ہے نیز مصادر حدیث کے مطابق ہے، ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

سرزمین بابل پر سحر اور جادوگری اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی اور لوگوں کی پریشانی اور تکلیف کا باعث بن چکی تھی خدا نے دو فرشتوں کو انسانی صورت میں مامور کیا کہ وہ جادو کے عوامل اور اسے باطل کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھائیں تاکہ وہ جادوگروں کے فساد اور شر سے محفوظ رہ سکیں۔

لیکن یہ تعلیمات بہر حال غلط مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہیں کیونکہ فرشتے مجبور تھے کہ جادوگروں کا جادو باطل کرنے کے لئے پہلے جادو کے طریقے کی تشریح کریں تاکہ لوگ اس طرح اس کی پیش بندی کر سکیں اس وجہ سے ایک گروہ جادو کا طریقہ سیکھنے کے بعد خود جادوگروں کی صف میں شامل ہو گیا اور لوگوں کے لئے نئی زحمت کا سبب بنا حالانکہ وہ فرشتے لوگوں کو تنبیہ کرتے تھے اور ان کے لئے صراحتاً کہتے تھے کہ یہ تمہارے لئے ایک طرح کی آزمائش ہے اور یہاں تک کہا کہ اس سے غلط فائدہ اٹھانا ایک طرح کا کفر ہے لیکن پھر بھی وہ لوگ ایسے کاموں میں پڑ گئے جو انسانوں کے لئے ضرر اور نقصان کا باعث تھے۔[۱]

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ بہت سی احادیث اور اسلامی مصادر سے لیا گیا ہے اور عقل و منطق سے بھی اس کی ہم آہنگی آشکار ہے۔ منجملہ ان کے ایک حدیث وہ بھی ہے جو عیون اخبار الرضا میں ہے (ایک طریق سے خود امام علیؑ بن موسیٰؑ رضاؑ سے اور دوسرے طریق سے امام حسن عسکریؑ سے منقول ہے) یہ حدیث واضح طور پر اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مورخین اور دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) لکھنے والے حضرات یہاں تک کہ بعض مفسرین بھی اس ضمن میں جعلی افسانوں کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ بعض لوگوں میں خدا کے ان دو معصوم فرشتوں

---

۱ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں و وسائل ج ۱۲، ص ۱۰۶ و ص ۱۰۷۔



کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے انہوں نے بھی ذکر کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو فرشتے تھے خدا نے انہیں زمین پر اس لئے بھیجا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اگر وہ انسانوں کی جگہ ہوتے تو وہ بھی گناہ سے نہ بچ پاتے اور خدا کی نافرمانی کرتے لہٰذا وہ دونوں بھی زمین پر اترنے کے بعد بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ستارہ زہرہ کے بارے میں بھی افسانہ تراشا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خرافات اور بے بنیاد بکواس ہیں۔ قرآن ان امور سے پاک ہے اگر مندرجہ بالا آیات کے متن میں ہی غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کا بیان ان باتوں سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔

(ز) "ہاروت" اور "ماروت" الفاظ کی حیثیت سے: ایک لکھنے والے کے نظریے کے مطابق ہاروت اور ماروت ایرانی الاصل نام ہیں وہ کہتا ہے کہ اس نے ارمنی کتاب میں "ہرروت" کا معنی "زرخیزی" اور "مرروت" کا معنی "بے موت" دیکھا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ کوہ مازیس (کوہ آرارات) کے دو خداؤں کے نام ہیں۔ اس کا نظریہ ہے کہ ہاروت و ماروت انہی دو الفاظ سے ماخوذ ہیں[۱] لیکن اس استنباط کے لئے کوئی واضح علامت و دلیل نہیں ہے۔

اوستا میں ہے:

ہرورات جو خرداد ہی ہے اور اسی طرح امروات جس کا معنی بے موت ہے جو کہ مرداد ہے۔[۲]

دھخدا نے اپنی لغت میں جو کچھ لکھا ہے وہ آخری معنی سے کچھ ملتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض کے نزدیک تو ہاروت و ماروت بابل کے رہنے والے دو مرد تھے۔

بعض نے تو انہیں شیاطین قرار دے دیا ہے حالانکہ مندرجہ بالا آیت واضح طور پر ان مفاہیم کو رد کرتی ہے (مگر یہ کہ آیات کی تفسیر و توجیہ اس کے ظاہری مفہوم کے خلاف کر دی جائے)۔

(ح) فرشتہ انسان کا معلم کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم اور متعدد روایات کے مطابق جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہاروت و ماروت خدا کے دو فرشتے تھے جو جادوگروں کی اذیت و آزار کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو تعلیم دینے آئے تھے، تو کیا فرشتہ انسان کا معلم ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب انہی احادیث میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ خدا نے انہیں انسانوں کی شکل و صورت میں بھیجا تھا تاکہ وہ یہ کام انجام دے سکیں۔

یہ حقیقت سورہ انعام کی آیت ۹ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا

اور اگر ہم فرشتے کو اپنا رسول بناتے تو اسے بھی مرد کی صورت میں بھیجتے۔

---

[۱] اعلام قرآن، ص ۶۵۵

[۲] یاد رہے کہ خرداد اور مرداد دو ایرانی مہینوں کے نام ہونے کے علاوہ دو فرشتوں کے ناموں کی حیثیت سے معروف ہیں۔ (مترجم)



(۱۷) **کوئی شخص اذنِ خدا کے بغیر کسی چیز پر قادر نہیں :** مندرجہ بالا آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جادوگر اذنِ پروردگار کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس میں جبر و اجبار کا مفہوم نہیں یہ توحید کے ایک اساسی اصول کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اس جہان کی تمام قدرتوں کا سرچشمہ قدرتِ خدا ہے۔ یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اس کے اذن و فرمان کے بغیر نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جادوگر عالمِ آفرینش میں خدا کے ارادے کے برعکس دخیل ہوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خدا کی سلطنت میں کوئی اُسے محدود کر دے بلکہ یہ تو خواص و آثار ہیں جو مختلف موجودات میں پیدا کیے گئے ہیں بعض اُن سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض غلط اور یہ آزادیٔ اختیار بھی انسانوں کی آزمائش اور ان کے تکامل کے لئے ایک زینہ ہے۔

(۷) **جادو کیا ہے اور کس وقت سے ہے :** جادو کسے کہتے ہیں اور یہ کس زمانے سے وجود میں آیا ہے یہ ایک وسیع بحث ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جادو بہت قدیم زمانے سے لوگوں میں رائج ہے۔ اس کی بالکل صحیح تاریخ دستیاب نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کس شخص نے پہلی مرتبہ جادوگری کو وجود دیا تھا۔ لیکن سحر کے معنی اور اس کی حقیقت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جادو خارقِ عادت افعال کی ایک قسم ہے۔ یہ اپنی طرف سے انسانی وجود میں کچھ آثار پیدا کر سکتا ہے اور بعض اوقات آنکھوں کا دھوکا اور ہاتھ کی صفائی ہے اور صرف نفسیاتی و خیالی پہلو رکھتا ہے۔ لغت میں سحر کے دو معانی مذکور ہیں :

۱۔ فریب، طلسم، شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی۔ قاموس میں سحر کردن کا معنی لکھا ہے دھوکا دینا۔

۲۔ "کل ما لطف دق" یعنی وہ جس کے عوامل نظر نہ آتے ہوں اور پوشیدہ ہوں۔

مفرداتِ راغب، جو قرآن کے مفردالفاظ کے لئے مخصوص ہے، میں تین معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے :

۱۔ فریب اور حقیقت و واقعیت کے بغیر خیالات جیسے شعبدہ بازی اور ہاتھ کی صفائی۔

۲۔ شیاطین کو مخصوص طریقے سے بلانا اور ان سے مدد لینا۔

۳۔ بعض نے ایک معنی اور بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے کچھ وسائل سے بعض اشخاص و موجودات کی ماہیت اور شکل بدل دینا۔ مثلاً انسان کو جادو کے ذریعے حیوانی شکل میں تبدیل کر دینا۔ لیکن یہ بات خوابِ خیال سے زیادہ نہیں ہے اور اس کی کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے۔[۱]

قرآن میں لفظ سحر اور اس کے مشتقات مختلف سورتوں مثلاً طٰہٰ، شعراء، یونس، اعراف وغیرہ میں آئے ہیں اور یہ خدا کے پیغمبروں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبرِ اسلام کے حالات کے ضمن میں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں سحر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے :

---

[۱] مفرداتِ راغب (سحر)



ا۔ وہ مقام جہاں سحر سے مقصود دھوکا، ہاتھ کی صفائی، شعبدہ بازی اور فریبِ نظر ہے اور کوئی حقیقت نہیں مثلاً :

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ۝

یوں لگتا تھا جیسے ان (جادوگروں) کی رسیاں اور لاٹھیاں اس (موسیٰؑ) کی طرف دوڑ رہی ہوں۔ (طٰہٰ، ۶۶)

ایک اور آیت یوں ہے :

فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ ۔

جب انہوں نے رسیاں کو پھینکا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا۔ (اعراف۔ ۱۱۶)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے اور یہ نہیں کہ جادوگر چیزوں میں تصرف کر سکیں اور اپنا اثر باقی رکھ سکیں بلکہ یہ تو ان کے ہاتھ کی صفائی اور فریبِ نظر ہے کہ لوگوں کو حقیقت کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔

(ب) قرآن کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سحر کی بعض اقسام واقعاً اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً زیر بحث آیت جس میں ہے کہ وہ جادو سیکھتے تھے تاکہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالیں۔

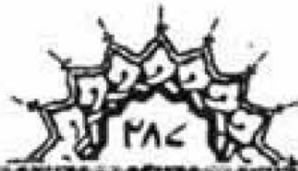
فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۖ

ایک اور بات جو مندرجہ بالا آیات میں تھی کہ وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لئے مضر ہوتیں اور نفع بخش نہ ہوتیں :

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جادو کی تاثیر صرف نفسیاتی پہلو رکھتی ہے یا اس کا جسمانی اور خارجی اثر بھی ممکن ہے۔ زیر بحث آیات میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسی لئے بعض کا نظریہ ہے کہ جادو کا اپنا اثر صرف خیالی اور نفسیاتی لحاظ سے ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جادو کی تمام یا بعض قسمیں ایسی ہیں جن میں چیزوں کے کیمیائی اور طبیعاتی خواص سے فائدہ اٹھا کر سادہ لوح عوام کو دھوکا دیا جاتا ہے اور انہیں بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے جادو کی تاریخ میں ہے کہ جادوگر اپنی رسیوں اور چھڑیوں میں کسی مخصوص کیمیائی مواد (مثلاً احتمال ہے کہ سیماب وغیرہ ہوگا) کا استعمال کیا کرتے تھے اور پھر یہ چیزیں سورج کی تپش یا کسی اور حرارت کے ذریعے حرکت میں آجاتی تھیں اور تماشائی سمجھتے تھے کہ وہ جاندار ہو گئی ہیں ایسا جادو ہمارے زمانے تک میں نایاب نہیں ہے۔



جادو اسلام کی نظر میں

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جادو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا اسلام کی نگاہ میں کوئی اشکال نہیں رکھتا۔

اس سلسلے میں تمام فقہاء اسلام کہتے ہیں جادو سیکھنا اور جادوگری کرنا حرام ہے۔

اس ضمن میں اسلام کے بزرگ رہنماؤں سے احادیث بھی وارد ہوئی ہیں جو ہماری معتبر کتب میں منقول ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

> من تعلم شیئا من السحر قلیلاً او کثیرا فقد کفر وکان اٰخر عہدہ بربہ ...[۱]
>
> جو شخص کم یا زیادہ جادو سیکھے وہ کافر ہے اور خدا سے اس کا رابطہ اسی وقت بالکل منقطع ہو جائے گا۔

لیکن اگر جادو کے جادو کو باطل کرنے کے لئے سیکھنا پڑے تو اس میں کوئی اشکال نہیں بلکہ بعض اوقات کچھ لوگوں پر اس کا سیکھنا واجب کفائی ہو جاتا ہے تاکہ اگر کوئی جھوٹا مدعی اس ذریعے سے لوگوں کو دھوکا دے یا گمراہ کرے تو اس کے جادو کو باطل کیا جا سکے اور اس کا جھوٹ فاش کیا جا سکے۔

جادوگر کا جادو باطل کرنے اور اس کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لئے جادو سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، اس کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے منقول ہے جو یوں ہے:

> ایک جادوگر جادو کے عمل کی اُجرت اور مزدوری لیتا تھا۔ وہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ میرا پیشہ جادوگری ہے اور میں اس کے بدلے اجرت لیتا ہوں اور میری زندگی کے اخراجات اسی سے پورے ہوتے ہیں۔ اسی کی آمدنی سے میں نے حج کیا ہے لیکن اب میں توبہ کرتا ہوں تو کیا میرے لئے راہِ نجات ہے۔ امام صادقؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جادو کی گرہیں کھول دو لیکن گرہیں باندھو نہیں[۲]

جادو تورات کی نظر میں

کتب عہد قدیم (تورات اور اس سے ملحق کتب) کی رُو سے بھی جادوگری ناجائز اور بہت ہی قبیح ہے۔

تورات میں ہے:

> جنّوں کی طرف توجہ نہ کرو اور جادوگروں کے بارے میں جستجو نہ کرو کہ کہیں ان سے ناپاک نہ ہو جاؤ

---

۱ وسائل الشیعہ، باب ۲۵، من ابواب ما یکتسب بہ

۲ وسائل الشیعہ باب ۲۵، من باب ما یکتسب بہ، حدیث نمبر ۱



اور خداوند تمہارا خدا میں ہوں [1]

توارات میں ایک اور مقام پر ہے:

جو شخص جنوں اور جادوگروں کی طرف توجہ کرے یہاں تک کہ زنا کے راستے سے ان کی پیروی کرے میں اپنے عتاب کا رُخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے اُسے اس کی قوم سے منقطع کردوں گا [2]

کتاب مقدس قاموس میں اس بارے میں ہے:

اور بہت ہی واضح ہے کہ جادو کے لئے شریعت موسوی میں کوئی راستہ نہیں بلکہ شریعت ان اشخاص کو جو جادو کے ذریعے مشورہ طلب کرتے تھے شدید ترین قصاص کے ساتھ منع کرتی ہے۔

لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود قاموس کتاب مقدس اعتراف کرتی ہے کہ اس کے باوجود یہودی جادو سیکھتے تھے اور تورات کے برخلاف اس پر اعتقاد رکھتے تھے کیونکہ گذشتہ تحریر کے بعد عبارت یوں آگے بڑھتی ہے:

مگر اس کے باوجود یہ فاسد مادہ یہودی قوم میں داخل ہوگیا اور یہ قوم اس کی معتقد ہوگئی اور لوگ حاجت و ضرورت کے وقت اس کی پناہ حاصل کرتے تھے [3]

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے:

یہودی کتاب خدا کی طرف پشت کرتے ہیں۔

جادو ہمارے زمانے میں

آج علوم کا ایک سلسلہ موجود ہے۔ گذشتہ زمانے میں جادوگران سے استفادہ کرکے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے وہ اجسام کے طبیعاتی اور کیمیائی خواص کو بروئے کار لاتے تھے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے جادوگروں کے واقعے کے ذیل میں بیان ہوا ہے کہ وہ اشیاء کے ان خواص سے استفادہ کرتے تھے۔ پہلے انہوں نے کچھ چیزیں سانپ کی شکل کی بنا لیں پھر کسی چیز مثلاً پارہ اور اس کی ترکیبات کی مدد سے انہیں حرکت میں لے آئے۔ البتہ اجسام کے طبیعاتی اور کیمیائی خواص سے استفادہ کرنا ہرگز ممنوع نہیں بلکہ جتنا زیادہ ہو سکے ان سے آگاہی حاصل کی جائے اور زندگی میں ان سے استفادہ کیا جائے لیکن آج بھی اگر ان کے مخفی خواص سے دھوکا دینے، بیوقوف بنانے اور غلط راہوں پر چلانے کا کام لیا جائے تو یہ امر جادو ہی کہلائے گا۔

اجسام و عناصر کے خواص کے علاوہ علوم کا ایک اور حصہ ہے جس میں مقناطیسی خواب ہپناٹزم (HYPNOTISM)

---

[1] لاویان ۱۹: ۳۱

[2] لاویان ۲۰: ۷

[3] قاموس کتاب مقدس، صفحہ ۴۷۱، تالیف امریکی مؤلف مسٹر ہاکس۔



مانیہ ٹزم (MANIATISM) اور ٹیلی پیتھی (TELEPATHY) (دوسرے افکار منتقل کرنا) بھی ثابت شدہ علوم میں شامل ہیں جن سے زندگی کے بہت سے مراحل میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن جادوگر ان سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان علوم کو دھوکا دہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آج بھی یہ علوم اگر کوئی شخص بے خبر لوگوں سے غلط فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کرے تو اسے جادو ہی کہینگے۔
خلاصہ یہ کہ جادو کا ایک وسیع مفہوم ہے اس ضمن میں جو کچھ پہلے اور اب بیان کیا ہے یہ سب جادو کے مفہوم میں شامل ہے۔

یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی بہت مضبوط ہے اور نفسیاتی ریاضتوں کے ذریعے اور قوی ہو جاتی ہے اور یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اپنے گردو پیش کے موجودات پر اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ سنیاسی اور ریاضت کرنے والے لوگ خارق عادت کام انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ کچھ ریاضتیں بھی جائز اور کچھ ناجائز ہیں۔ جو ریاضتیں جائز ہیں وہ پاک نفوس میں اصلاحی اور تربیتی قوت پیدا کرتی ہیں۔ جب کہ غیر مشروع اور ناجائز ریاضتیں شیطانی قوت پیدا کرتی ہیں۔ ممکن ہے دونوں خارق عادت چیز کا سبب بنیں جو پہلی صورت میں مثبت اور اصلاحی ہوگی۔ جب کہ دوسری صورت میں مخرب یا کم از کم فضول و بیہودہ ہوگی۔

۱۰۴۔ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَ
لِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

۱۰۵۔ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ
عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ○

ترجمہ

۱۰۴۔ اے ایمان والو! (جب پیغمبر سے قرآن کی آیات سمجھنے کے لئے مہلت مانگو تو) "راعنا" نہ کہا کرو بلکہ "انظرنا" کہا کرو (کیونکہ پہلا لفظ "ہمیں مہلت دیجئے" کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور "ہمیں بیوقوف بنائیے" کا معنی بھی دیتا ہے جو دشمنوں کو بات کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے) اور جو کچھ تمہیں حکم دیا جاتا ہے اُسے سنو اور کافروں (نیز استہزا کرنے والوں) کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۱۰۵۔ اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے تمہیں کوئی خیر و برکت نصیب ہو حالانکہ خدا



جسے چاہتا ہے اپنی خاص رحمت سے نوازتا ہے اور خدا بخشنے والا اور بڑے فضل والا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے کہ صدرِ اسلام کے مسلمان جب آنحضرتؐ سے گفتگو میں مشغول ہوتے اور آپؐ آیات و احکام الٰہی بیان کر رہے ہوتے تو کبھی کبھی درخواست کرتے کہ ذرا آہستہ گفتگو فرمائیں تاکہ وہ مطلب اچھی طرح سمجھ سکیں اور اپنے سوالات و معروضات بھی پیش کر سکیں۔ اس درخواست کے لئے وہ لفظ "راعنا" استعمال کرتے۔ اس لفظ کا مادہ "الرعی" ہے۔ جس کا معنیٰ ہے "مہلت دینا" لیکن یہودی اس کا معنیٰ ایک اور مادہ "الرعونۃ" کے حوالے سے کرتے جس کا معنیٰ ہے "بیوقوف اور احمق ہونا"۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم تھا "ہمیں مہلت دیجئے" لیکن دوسری صورت میں اس کا معنیٰ ہوتا ہے "ہمیں بیوقوف بنائیے"۔ یہاں یہودیوں کے ہاتھ بات آگئی۔ وہ اسی جملہ سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمان کہتے اور پیغمبر اور مسلمانوں سے استہزاء اور مذاق کرتے۔

پہلے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور غلط فائدہ اٹھانے کا یہ سلسلہ روکنے کے لئے مومنین کو حکم دیا کہ "راعنا" کی بجائے "انظرنا" استعمال کرو جو یہی مفہوم ادا کرتا ہے لیکن ہٹ دھرم دشمن (یہودی) کے لئے سند نہیں ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "راعنا" یہودیوں کی زبان میں ایک طرح کی گالی تھی اور اس کا مفہوم تھا "سنو کہ ہرگز نہیں سنو گے" یہ جملہ کہہ کر وہ ہنستے تھے۔

کچھ مفسرین نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہودی "راعنا" کی بجائے "راعینا" کہتے تھے جس کا معنیٰ ہے "ہمارا چرواہا" اور پیغمبر کے لئے یہ جملہ استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کرتے تھے۔[1]

تفسیر

دشمن کے ہاتھ بہانہ مت دو

شانِ نزول میں جو بات بیان کی گئی ہے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے۔ اے ایمان والو! جب پیغمبر سے آیات قرآن سمجھنے کے لئے مہلت مانگو تو "راعنا" نہ کہو بلکہ "انظرنا" کہو (کیونکہ اس کا بھی مفہوم وہی ہے لیکن دشمن کے لئے سند نہیں بنتا) (یا ایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا و قولوا انظرنا) اور جو حکم تمہیں دیا جا رہا ہے اُسے سنو۔ کافروں اور استہزاء کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے (واسمعوا ط وللکفرین عذاب الیم)۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے پروگراموں میں دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آنے دیں یہاں تک کہ ایک

---

[1] تفسیر قرطبی، تفسیر المنار، فخر رازی اور تفسیر ابو الفتوح رازی۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



چھوٹا سا جملہ جو غلط مقاصد میں دشمن کے لئے مقام بحث بن سکے اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے۔ قرآن مخالفین کی طرف سے مومنین سے غلط فائدے اٹھانے کی روک تھام کی نصیحت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک لفظ تک ایسا نہ کہیں جس کے ایسے مشترک معنی ہوں کہ دشمن جس کے دوسرے معنی کو غلط استعمال کر سکے اور مومنین کی نفسیاتی کمزوری کا باعث بنے۔ جب دامنِ کلام اور تعبیرِ سخن وسیع ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ انسان ایسے جملے استعمال کرے جو قابلِ تحریف ہوں اور غلط مفاد کا باعث ہوں۔

جب اسلام اتنی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے ہاتھ کوئی ایسا بہانہ دیا جائے تو بڑے بڑے مسائل میں مسلمانوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے۔ اب بھی ہم سے کبھی ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جو داخلی دشمن کے لئے یا بین الاقوامی مجالس میں بری تعبیر کا سبب ہوتے ہیں اور لاؤڈ سپیکر پر دشمن کے پراپیگنڈہ کے لئے سود مند ہوتے ہیں۔ ایسے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ایسے کاموں سے پرہیز کریں اور بلاوجہ داخلی اور خارجی دشمنوں کے ہاتھ بہانہ نہ دیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "راعنا" مندرجہ بالا پس منظر کے علاوہ ایک غیر مؤدبانہ انداز کا بھی حامل ہے کیونکہ "راعنا" مراعات کے مادہ (باب مفاعلہ) سے ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ہماری اعانت کرو کہ ہم تم سے مراعات کریں گے چونکہ یہ غیر مؤدبانہ تعبیر تھی (علاوہ ازیں یہودی بھی اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے) قرآن نے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا تاکہ ایک تو زیادہ مؤدبانہ لفظ استعمال کریں اور دوسرا دشمن کے ہاتھ بہانہ نہ دیں [1]

بعد کی آیت مشرکین اور اہل کتاب کی مومنین سے کینہ پروری اور عداوت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ فرمایا: اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے کوئی خیر و برکت تم پر نازل ہو (ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم)

لیکن یہ تمنا آرزو سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ خداوند عالم اپنی رحمت اور خیر و برکت جس شخص سے چاہتا ہے مخصوص کر دیتا ہے (واللہ یختص برحمتہ من یشاء) اور خدا بخشش اور فضلِ عظیم کا مالک ہے (واللہ ذوالفضل العظیم)۔

بے شک دشمن اپنے شدید کینہ اور حسد کے باعث پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں پر یہ اعزاز اور عطیہ الٰہی دیکھیں کہ خدا کی طرف سے ایک عظیم پیغمبر ایک بہت عظیم آسمانی کتاب کے ساتھ ان کے نصیب ہو لیکن کیا کوئی فضل و رحمت خدا کو کسی پر نازل ہونے سے روک سکتا ہے۔

ایک نکتہ

یا ایھا الذین امنوا کا دقیق مفہوم: قرآن مجید میں ۸۹ مقامات پر یہ پُراعجاز اور روح پرور خطاب

---

[1] تفسیر فخر رازی اور المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



نظر آتا ہے۔ مندرجہ بالا پہلی وہ آیت ہے جس میں اس خطاب سے عزت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تعبیر ان آیات کے ساتھ مخصوص ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور مکہ کی آیات میں اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پیغمبر اکرمؐ کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے مسلمانوں کی حالت میں ثابت قدمی آگئی تھی، وہ ایک مستقل اور با اثر جمعیت کی صورت میں نظر آنے لگے تھے اور انہیں پراگندگی سے نجات مل گئی تھی لہٰذا خداوند عالم نے انہیں "یا ایھا الذین اٰمنوا" کے خطاب سے نوازا ہے۔

یہ تعبیر ضمناً ایک اور نکتے کی بھی حامل ہے اور وہ یہ کہ اب تم ایمان لے آئے ہو اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہو اور اپنے اللہ سے اطاعت کا عہد و پیمان باندھ چکے ہو لہٰذا اس کے تقاضے کے مطابق اس جملے کے بعد جو حکم آرہا ہے اس پر عمل کرو بہ الفاظ دیگر تمہارا ایمان تم پر لازم قرار دیتا ہے کہ ان قوانین کے کاربند رہو۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بہت سی اسلامی کتب میں جن میں اہل سنت کی کتابیں بھی شامل ہیں پیغمبر اسلام سے یہ ایک حدیث منقول ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

ما انزل اللہ آیۃ فیھا یا ایھا الذین اٰمنوا الا و علی رأسھا و امیرھا۔

خدا نے کسی مقام پر قرآن کی کوئی آیت نازل نہیں کی جس میں یا ایھا الذین اٰمنوا ہو مگر یہ کہ اس کے رئیس و امیر حضرت علیؑ ہیں[1]

۱۰۶۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

۱۰۷۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

ترجمہ

۱۰۶۔ ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کے نسخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر یہ کہ اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسی کوئی آیت لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۰۷۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کی ملکیت خدا کے لئے ہے (اور وہ حق رکھتا ہے کہ مصالح کے مطابق احکام میں

---

[1] در منثور میں یہ حدیث ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء کے حوالے سے ابن عباس کی سند سے منقول ہے۔



ہر قسم کا تغیر و تبدل کر سکے) اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں (اور وہی ہے جو تمہارے تمام مصالح کا تعین کرتا ہے)۔

تفسیر

ان آیات میں بھی مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی سازشوں اور وسوسوں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ کبھی تو مسلمانوں سے وہ کہتے تھے دین تو یہودیوں کا دین ہے اور کبھی کہتے قبلہ تو یہودیوں ہی کا قبلہ ہے اسی لئے تو تمہارا پیغمبر ہمارے قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتا ہے لیکن جب قبلہ کا حکم بدل دیا گیا اور اس سورہ کی آیت ۱۴۴ کے مطابق مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھیں۔ اب یہودیوں کے ہاتھ پہلے والی بات تو نہ رہی لیکن وہ نیا راگ الاپنے لگے اور کہنے لگے اگر قبلہ اول صحیح تھا تو یہ دوسرا حکم کیا ہے اور اگر دوسرا حکم صحیح ہے تو پھر تمہارے پہلے اعمال باطل ہیں۔ قرآن ان آیات میں ان کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے اور مومنین کے دلوں کو روشن کرتا ہے[1]۔ قرآن کہتا ہے: ہم کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کی تنسیخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر اس سے بہتر یا اس جیسے کسی دوسرے حکم کو اس کی جگہ نافذ کر دیتے ہیں (ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا) اور خدا کے لئے یہ آسان ہے، کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (الم تعلم ان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر)۔

بعد کی آیت میں اس کی تاکید کی گئی ہے: کیا جانتے نہیں ہو کہ آسمانوں اور زمینوں کی حکومت خدا کے لئے ہے (الم تعلم ان اللہ لہ ملک السمٰوٰت والارض)۔

وہ حق رکھتا ہے کہ مصالح کے مطابق اپنے احکام میں ہر قسم کا تغیر و تبدل کرے اور وہ اپنے بندوں کے مصالح سے زیادہ آگاہ اور زیادہ بصیر ہے۔

اور کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں ہے (وما لکم من دون اللہ من ولیٍّ ولا نصیر)۔

حقیقت میں اس آیت کا پہلا جملہ احکام میں خدا کی حاکمیت اور بندوں کے تمام مصالح کی تشخیص میں اس کی قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ ان حالات میں مومنین کو نہیں چاہیئے کہ وہ ان خود غرض لوگوں کی باتوں کی طرف کان دھریں جو نسخ احکام کے مسئلہ میں شک و تردد کرتے ہیں۔

دوسرا جملہ ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہے جو خدا کے علاوہ اپنے لئے سہارے کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ عالم میں اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں۔

---

[1] یہ بھی احتمال ہے کہ مندرجہ بالا آیات کا تعلق قبلہ کی تبدیلی سے نہ ہو بلکہ بعض دیگر احکام اسلام کے تغیر و نسخ سے ہو جیسا کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اور سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں ذکر کیا ہے۔



چند اہم نکات

(۱) کیا احکام شریعت میں نسخ جائز ہے: لغت کی نظر سے نسخ کا معنی ہے ختم کرنا اور زائل کرنا اور شریعت کی منطق میں نسخ ایک حکم بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرنے کو کہتے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہجرت کے سولہ ماہ بعد تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے اس کے بعد قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا اور انہیں پابند کیا گیا کہ اب نماز کے وقت کعبہ کی طرف رخ کیا کریں۔

۲۔ سورۂ نساء آیہ ۱۵ میں بدکار عورتوں کی سزا کے سلسلے میں حکم دیا گیا تھا کہ چار گواہوں کی شہادت پر انہیں گھر میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائیں یا خدا ان کے لئے کوئی اور راستہ مقرر کرے۔

یہ آیت سورہ نور کی آیہ ۲ سے منسوخ ہو گئی اور اس آیت کی رو سے ان کی سزا سو تازیانے مقرر ہوئی۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر پہلا حکم مصلحت کا حامل تھا تو پھر اسے منسوخ کیوں کیا گیا اور اگر اس میں مصلحت نہیں تھی تو ابتدا میں نافذ کیوں کیا گیا۔ بالفاظ دیگر کیا تھا اگر ابتدا ہی سے ایسا حکم نازل ہوتا کہ تنسیخ اور تغیر کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس سوال کا جواب علمائے اسلام بہت پہلے اپنی کتب میں دے چکے ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ کچھ اپنی توضیح کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ زمانے اور علاقے کے لحاظ سے انسان کی ضروریات بدل جاتی ہیں۔ ایک دن ایک پروگرام اس کی سعادت کا ضامن تھا لیکن دوسرے دن ممکن ہے حالات بدل جانے سے وہی پروگرام اس کے راستے کا کانٹا بن جائے۔ ایک دن ایک دوا بیمار کے لئے بہت مفید ہے اور ڈاکٹر اس کے استعمال کا حکم دیتا ہے جب کہ دوسرے دن بیمار کے کچھ صحت مند ہو جانے کی وجہ سے ممکن ہے یہی دوا اس کے لئے نقصان دہ ہو لہٰذا ڈاکٹر اس دوا کو ترک کرنے اور اس کی بجائے دوسری دوا استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ممکن ہے اس سال طالب علم کے لئے کچھ درس اصلاحی اور مفید ہوں لیکن یہی دروس آئندہ سال یا بعد کے چند سال کے لئے بے فائدہ ہوں۔ معلم کو چاہیئے کہ ایسا پروگرام اور نصاب مرتب کرے جو ہر سال کی اپنی ضروریات کے مطابق ہو۔

اگر ہم تکامل انسان کی روش اور مختلف معاشروں کی طرف توجہ دیں تو یہ بات زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ کبھی ایک پروگرام مفید اور اصلاحی ہوتا ہے اور کبھی وہی نقصان دہ اور لازمی طور پر قابل تغیر ہوتا ہے خصوصاً اجتماعی، نظریاتی اور عقائدی انقلابات کے آغاز میں پروگراموں کی تبدیلی کی ضرورت مختلف اوقات میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

البتہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ احکام الٰہی کے اساسی ارکان کے اصول بالکل تبدیل نہیں ہوتے وہ ہر جگہ ایک جیسے رہتے ہیں۔ توحید، عدالت اجتماعی کے اصول اور اس قسم کے سینکڑوں احکام ہیں جو تبدیل نہیں ہوتے تغیر تو جزئیات کو



دوسرے درجے کے احکام میں ہوتا ہے۔

اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ممکن ہے مذاہب کا ارتقاء اس مقام پر پہنچ جائے کہ آخری مذہب خاتم ادیان کے عنوان سے نازل ہو اور اس طرح کہ اب احکام کی تبدیلی کی اس میں کوئی گنجائش نہ ہو۔ [1]

مشہور اگرچہ یہی ہے کہ یہودی نسخ کے کلی طور پر منکر ہیں اور وہ اسی بناء پر مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر معترض تھے لیکن وہ مجبور ہیں کہ اپنے مذہب کی بنیادی کتب کی روشنی میں نسخ کو تسلیم کریں کیونکہ تورات کے مطابق جس وقت نوح کشتی کے نیچے اترے تو خدا نے ان کے لئے تمام جانور حلال کر دیے لیکن یہی حکم موسیٰ کی شریعت میں منسوخ ہو گیا اور کچھ حیوانات حرام ہو گئے۔

تورات کے سفر تکوین، فصل ۹، شمارہ ۳ میں ہے:

ہر حرکت کرنے والا جو زندہ رہے وہ تمہاری خوراک ہوگا اور یہ سب سبزہ زار کی گھاس کی طرح ہم نے تمہیں دیے ہیں۔

(۱۱) لفظ "آیت" سے کیا مراد ہے: لغت میں "آیت" نشانی اور علامت کو کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

۱۔ قرآن کے جملے اور فقرے جو خاص علامات کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کئے گئے ہیں وہ آیت کے نام سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے:

تِلْكَ اٰيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ط

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں۔ (بقرہ ۲۵۲)

۲۔ معجزات کا ذکر آیت کے عنوان سے ہوا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ کے مشہور معجزہ ید بیضا کے بارے میں ہے:

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ

ہاتھ گریبان میں بغل کے نیچے تک لے جاؤ جب وہ باہر نکلے گا تو سفید چمکنے والا بے عیب و نقص ہوگا اور یہ ایک اور معجزہ ہے۔ (طٰہٰ۔ ۲۲)

۳۔ خدا شناسی کی دلیل یا قیامت کی نشانی کے لئے بھی لفظ آیت قرآن میں آیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ

رات اور دن کو ہم نے (خدا شناسی کے لئے) دو دلیلیں قرار دیا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۲)

قیامت پر استدلال کے موقع پر فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط

---

[1] اس موضوع کی پوری تفصیل انشاء اللہ آپ سورہ احزاب کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں گے۔



إِنَّ الَّذِیٓ أَحۡیَاهَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتَیٰٓ ۚ إِنَّهُۥ عَلَیٰ کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیرٌ ۝

اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک اور سوکھی پڑی ہوئی ہے لیکن جب اس پر (بارش کا) پانی برستا ہے تو وہ حرکت میں آتی ہے اور اس کے سبزے اُگنے لگتے ہیں، وہی ذات جس نے زمین کو زندہ کیا ہے، مُردوں کو بھی زندہ کرے گی۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(حٰمٓ السجدۃ - ۳۹)

۴- آنکھوں کو متاثر کرنے والی چیزوں کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ مثلاً اس آیت میں بلند و عالی محلات کے بارے میں ہے:

أَتَبۡنُونَ بِکُلِّ رِیعٍ ءَایَةً تَعۡبَثُونَ ۝

کیا ہر بلند جگہ پر عمارتیں بناتے ہو تاکہ ان میں مصروفِ لہو ولعب رہ سکو۔ (شعراء - ۱۲۸)

واضح ہے کہ ان مختلف معانی میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے "نشانی"۔ البتہ زیر بحث آیات میں قرآن نے کہا ہے "ہم اگر ایک آیت منسوخ کرتے ہیں تو اس جیسی یا اس سے بہتر لے آتے ہیں" یہاں آیت سے مراد حکم ہے۔ اگر ایک منسوخ ہوا تو اس سے بہتر نازل ہوگا یا اگر ایک نبی کا معجزہ منسوخ ہوا تو بعد والے نبی کو زیادہ واضح معجزہ دیا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض روایات میں مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہے کہ نسخ آیت ایک امام کی وفات اور اس کی جگہ دوسرے کی تقرری کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہ مفہوم اس نظر آیت کا ایک مصداق ہے [1]

(۱۶) "ننسھا" کی تفسیر: "ننسھا" کا لفظ محل بحث آیات میں "ننسخ" پر عطف ہے۔ اس کا مادہ "انسا" ہے۔ یہاں یہ لفظ تاخیر کرنے، حذف کرنے اور اذہان سے زائل کرنے کے معنی میں آیا ہے [2]

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ "ننسخ" کو سامنے رکھتے ہوئے اس لفظ کا مفہوم کیا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ یہاں مقصد یہ ہے کہ اگر ہم کسی آیت کو منسوخ کریں یا اس کی تنسیخ میں بعض مصالح کے پیشِ نظر تاخیر کریں تو ہر صورت میں اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آئیں گے۔ اس بناء پر لفظ "ننسخ" تھوڑی مدت کے نسخ کے لئے اور "ننسھا" دراز مدت کے نسخ کے لئے ہے۔

(۱۷) "او مثلھا" کی تفسیر: مندرجہ بالا بات کو پیشِ نظر رکھیں تو فوراً سوال پیدا ہوگا کہ "او مثلھا" سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی حکم پہلے جیسے حکم کی طرح کا ہے تو فضول نظر آتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک چیز منسوخ کرکے اس جیسی ہی دوسری چیز لائی جائے ناسخ کو منسوخ سے بہتر ہونا چاہیئے تاکہ نسخ قابلِ قبول ہو۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اول صفحہ ۱۱۴

[2] پہلی صورت میں مادہ "نساء" سے اور دوسری صورت میں مادہ "نسی" سے ہوگا۔



اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ مثل سے مراد یہ ہے کہ ایسا حکم اور قانون پیش کیا جائے جس کا اثر بھی گذشتہ زمانے میں گذشتہ قانون کا سا ہو۔
اس کی توضیح یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ایک حکم آج کئی آثار و فوائد کا حامل ہو لیکن کل اس سے یہ آثار کھو جائیں۔ اس صورت میں اسے منسوخ ہو جانا چاہیئے اور اس کی جگہ نیا حکم آنا چاہیئے جو اگر اس سے بہتر نہ ہو تو کم از کم اس جیسے آثار کا حامل ہو اور یہ چیز زمانے اور حالات سے وابستہ ہے کہ کبھی گذشتہ حکم کی طرح کا قانون چاہیئے اور کبھی اس سے بہتر۔ اس طرح کسی قسم کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

۱۰۸۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○

ترجمہ

۱۰۸۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے (نامعقول) سوال کرو جو اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے (اور اس بہانے سے ایمان لانے سے روگردانی کرو)۔ جو شخص ایمان سے کفر کا تبادلہ کرے (اور ایمان کی بجائے اسے قبول کر لے) وہ (عقل و فطرت کی) راہِ مستقیم سے گمراہ ہو چکا ہے۔

شانِ نزول

کتب تفاسیر میں اس آیت کی شانِ نزول کے سلسلے میں مختلف مطالب نظر آتے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔

۱۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ وہب بن زید اور رافع بن حرملہ رسولِ خدا کے پاس آئے اور کہنے لگے خدا کی طرف سے کوئی خط ہمارے نام پیش کیجئے تاکہ ہم اسے پڑھ کر ایمان لے آئیں یا ہمارے لئے نہریں جاری کیجئے تاکہ ہم آپ کی پیروی کریں۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ عرب کے ایک گروہ نے پیغمبر اسلامؐ سے اسی طرح کے تقاضے کئے جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ سے کئے تھے انہوں نے کہا ہمیں ظاہر بظاہر خدا کی نشاندہی کرو کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اور ایمان لے آئیں۔

۳۔ بعض نے لکھا ہے کہ ایک گروہ عرب نے پیغمبر اکرمؐ سے تقاضا کیا کہ ان کے لئے ذاتِ انواط سے ایک مخصوص درخت مقرر کر دیں۔ تاکہ وہ اس کی پرستش کر سکیں جیسے بنی اسرائیل کے جاہلوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا:

اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ



ہمارے لئے ایک بت مقرر کردیں جیسے بت پرستوں کے پاس ہیں۔ (اعراف - ۱۳۸)

مندرجہ بالا آیت ان کے جواب میں نازل ہوئی۔

تفسیر

بے بنیاد بہانے

اس آیت کے مخاطب اگرچہ یہودی نہیں ہیں بلکہ کمزور ایمان والے مسلمان یا مشرکین ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ یہودیوں کی سرگذشت سے غیر متعلق بھی نہیں۔

غالباً قبلہ کی تبدیلی کے بعد کی بات ہے کہ کچھ مسلمانوں اور مشرکین نے یہودیوں کے پراپیگنڈا کے زیر اثر پیغمبر اسلامؐ سے چند بے محل اور نامعقول تقاضے کئے جن کے نمونے شانِ نزول میں بیان ہو چکے ہیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں ایسے سوالوں سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے: کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے وہی نامعقول تقاضے کرو جو اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے ہیں، تاکہ ان بہانہ سازیوں سے ایمان سے رُخ پھیر سکو (ام تریدون ان تسئلوا رسولکم کما سئل موسیٰ من قبل ط)۔

چونکہ ایک طرح سے یہ ایمان سے کفر کا تبادلہ ہے لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے: جو شخص ایمان کی بجائے کفر کو قبول کرے وہ راہِ مستقیم سے گمراہ ہو گیا ہے (و من یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سوآء السبیل)۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلام علمی اور منطقی سوالات سے منع کرتا ہے یا دعوتِ نبی کی حقانیت سمجھنے کے لئے معجزہ طلبی سے روکتا ہے کیونکہ فہم و ادراک اور ایمان کے یہی ذرائع ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جو بہانہ سازی اور دعوتِ پیغمبر سے بچنے کے لئے بے بنیاد سوالات کرتے تھے اور خود خواہ معجزات کا ذکر کرتے تھے۔ جب کہ پیغمبر کافی دلائل و معجزات ان کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نئے طور سے آتا اور نئی خارقِ عادت چیز کا تقاضا کرتا۔ حالانکہ معجزہ اور خارقِ عادت کوئی بازیچۂ اطفال تو نہیں ہے وہ اس قدر ضروری ہے کہ جس سے پیغمبروں کے کلام کی سچائی کا اطمینان ہو سکے ورنہ پیغمبر معجزات کا کاروبار تو نہیں کرتے کہ وہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور ہر آنے والا اُن سے معجزہ طلب کرتا رہے۔

علاوہ ازیں کبھی تو وہ بالکل نامعقول تقاضے کرتے تھے مثلاً خدا کو آنکھ سے دیکھنا یا بت بنا کر دینا۔ درحقیقت قرآن لوگوں کو یہ تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم اسی طرح کے نامعقول تقاضے کرتے رہے تو تمہارے سر پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قوم موسیٰ کے سر پر آیا تھا۔

۱۰۹- وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ



حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ
اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝
۱۱۰۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۰۹۔ بہت سے اہل کتاب اس حسد کی بنا پر جو ان کے وجود میں جڑ پکڑ چکا ہے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام و ایمان کے بعد پہلی حالت کی طرف پھیرے جائیں، حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے۔ تم انہیں معاف کردو اور ان سے درگذر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا فرمان (جہاد) بھیجے۔ یقیناً خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۱۱۰۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (اور ان دو ذرائع سے اپنے معاشرے کی رُوح اور جسم کو طاقت ور بنالو اور جان لو کہ) ہر کار خیر جو اپنے لئے (دارِ آخرت کی طرف) آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں موجود پاؤ گے۔ خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم حاسد

بہت سے اہلِ کتاب ایسے تھے کہ صرف اس پر بس نہ کرتے تھے کہ خود دین اسلام قبول نہ کریں بلکہ انہیں اصرار تھا کہ مومنین بھی اپنے ایمان سے پلٹ آئیں اور اس کا سبب حسد کے سوا کچھ نہ تھا۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا: بہت سے اہل کتاب حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام پر ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے (ودکثیر من اهل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارًا حسدًا من عند انفسهم من بعد ما تبین لهم الحق)۔

اس مقام پر قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ایسے بُرے اور تباہ کن تقاضوں کے مقابلے میں تم انہیں معاف کر دو اور ان سے درگذر کرو یہاں تک کہ خدا خود اپنا فرمان بھیجے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (فاعفوا واصفحوا



حتیٰ یاتی اللہ بامرہ ان اللہ علی کل شیئ قدیر)۔

حقیقت میں مسلمانوں کو ایک تکنیکی حکم دیا گیا ہے کہ ان مخصوص حالات میں عفوو درگذر کے ہتھیار سے استفادہ کریں اور اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح میں لگے رہیں اور فرمانِ خدا کا انتظار کرتے رہیں۔

بہت سے مفسرین کے بقول یہاں فرمانِ خدا سے مراد فرمان جہاد ہے جو اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگ ابھی ہر پہلو سے اس کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی لئے تو بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ یہ آیت جہاد کی آیات کی وجہ سے منسوخ ہو گئی۔ جن کی طرف بعد میں اشارہ ہو گا۔

لیکن اسے نسخ قرار دینا شاید صحیح نہ ہو کیونکہ نسخ کا معنیٰ ہے کہ ظاہراً تھوڑی مدت کے لئے کوئی حکم جاری ہوتا ہے اور شریعت قرار پاتا ہے لیکن باطناً موقت ہے جب کہ یہاں آیت میں عفوو درگذر کا حکم ایک محدود شکل میں آیا ہے وہ اس زمانے تک محدود ہے جب تک جہاد کے متعلق فرمانِ الٰہی نہیں آیا۔ بعد کی آیت جس میں مومنین کو دو اہم اصلاحی احکام دیے گئے ہیں، ایک نماز جو انسان اور خدا کے درمیان مضبوط ربط پیدا کرتی ہے اور دوسرا زکوٰۃ جو معاشرے کے افراد کے لئے ایک دوسرے سے وابستگی کی رمز ہے اور یہ دونوں امور دشمن پر کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ فرمایا: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور ان دو ذرائع سے اپنی روح اور جسم کو طاقت بخشو (واقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ)۔

مزید فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ جو نیکی کے کام تم کرتے ہو اور جو مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہو وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ جو نیکیاں تم آگے بھیجتے ہو انہیں خدا کے ہاں (دارِ آخرت میں) موجود پاؤ گے (وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ)۔ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے (ان اللہ بما تعملون بصیر) وہ پورے طور پر جانتا ہے کہ کون سا عمل تم نے خدا کے لئے انجام دیا ہے اور کون سا اس کے غیر کے لیے۔

چند اہم نکات

(۱) "فاعفوا" اور "اصفحوا": "اصفحوا" کا مادہ "صفح" ہے اس کا معنیٰ ہے دامن کوہ، تلوار کا عرض اور رخسار اور یہ لفظ عموماً منہ پھیرنے اور صرفِ نظر کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

لفظ "فاعفوا" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روگردانی، غصہ اور بے اعتنائی کے لئے نہیں بلکہ بزرگانہ درگزر کے طور پر ہے۔ یہ دو تعبیریں ضمناً نشاندہی کرتی ہیں کہ مسلمان اس وقت بھی اس قدر قدرت وطاقت رکھتے تھے کہ عفوو درگزر نہ کرتے اور دشمن کو ضروری سزا دیتے لیکن خدا تعالیٰ نے ان کو پہلے عفوو درگزر کا حکم دیا ہے تاکہ وہ ہر لحاظ سے تیاری کر لیں یا اس لئے کہ دشمن اگر قابلِ اصلاح ہیں تو ان کی اصلاح ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں دشمن کے مقابلے میں شروع میں کبھی خشونت اور سخت گیری نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ یہ اخلاقِ اسلامی کا ضروری حصہ ہے کہ پہلے عفوو درگز



سے کام لیا جائے اگر وہ مؤثر نہ ہو تو پھر سختی کو بروئے کار لایا جائے۔

(ii) "ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر" کا جملہ: ہو سکتا ہے یہ جملہ اس مقام پر اس طرف اشارہ ہو کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ غیر عادی طریقوں سے تمہیں ان پر کامیابی دیدے لیکن انسانی زندگی کا مزاج اور عالم آفرینش کی طبیعت مقتضی ہیں کہ ہر کام تدریجاً اور مقدمات فراہم ہونے پر انجام پذیر ہو۔

(iii) "حسدا من عند انفسھم" کا مفہوم: (یعنی اس کا سبب وہ حسد ہے جو ان کی اپنی طرف سے ہے) ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ بعض اوقات حسد کا مقصد تو ذاتی غرض ہوتی ہے لیکن اسے دین کا رنگ دے دیا جاتا ہے یہاں جو حسد ہے اس میں تو یہ پہلو بھی نہیں بلکہ فقط ذاتی غرض پر مبنی ہے[1]

۱۱۱۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ
قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۱۱۲۔ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ص وَلَا
۱۲ ع۹ ۱۲ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ ع

ترجمہ

۱۱۱۔ وہ کہتے ہیں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ تو صرف ان کی تمنا ہے کہیے کہ اگر سچے ہو تو (اس دعویٰ پر) اپنی دلیل پیش کرو۔

۱۱۲۔ جی ہاں! جو بھی خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر لے اور نیکوکار ہو تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس مسلم ہے۔ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (لہٰذا جنت اور سعادت کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہے)۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات میں قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کے ایک اور فضول اور نامعقول دعویٰ کی طرف اشارہ کر کے انہیں دنداں شکن جواب دیتا ہے۔ کہتا ہے: وہ (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ یہودی و نصاریٰ کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا (وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصریٰ)۔[2]

---

[1] تفسیر المنار، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] اگرچہ لفظ "قالوا" بصورت واحد ہے لیکن معلوم ہے کہ دو گروہوں کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ الگ ہے۔ یہودی کہتے ہیں جنت ہمارے لئے مخصوص ہے اور عیسائی کہتے ہیں ہمارے لئے مخصوص ہے۔



قرآن دونوں گروہوں کے دعویٰ کا ایک ہی جگہ جواب دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: یہ توان کی فقط آرزو ہے جو کبھی پوری نہ ہوگی (تلک امانیھم)۔ پھر پیغمبر کو مخاطب کرکے فرماتا ہے: (قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین)۔ یعنی اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرو

یہ حقیقت ثابت ہونے کے بعد کہ ان کے پاس ان کے دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں اور ان کے لئے اختصاص جنت کا دعویٰ صرف خواب وخیال ہے جو ان کے سروں پر سوار ہے جنت میں داخل ہونے کا اصلی وحقیقی قانونِ کلی بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے: ہاں تو جو خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرلے اور نیکوکار ہو اس کا اجر وثواب اس کے پروردگار کے ہاں مسلّم ہے (بلیٰ من اسلم وجھہٗ للہ وھو محسن فلہٗ اجرہٗ عند ربہ ص)۔ اس لئے ایسے اشخاص کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون)۔

لہٰذا جنت، اجر وثواب الٰہی اور سعادت دائمی کا حصول کسی گروہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ یہ سب کچھ ان کے لئے ہے جن میں دو شرطیں پائی جاتی ہوں۔

۱۔ اول یہ کہ وہ حکم کے سامنے تسلیم محض ہوں، ایمان وتوحید ان کے دل پر سایہ فگن ہو اور احکام الٰہی میں کسی قسم کی تبعیض اور چون وچرا کے قائل نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ جو احکام ان کے فائدے کے ہوں وہ تو قبول کرلیں اور جو ان کے خلاف ہوں انہیں پس پشت ڈال لیں بلکہ وہ مکمل طور پر تسلیم حق ہوں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اُن کے ایمان کے آثار عمل اور کار خیر کی انجام دہی کی صورت میں ظاہر ہوں۔ وہ سب سے نیکی کریں اور تمام پروگراموں میں نیک ہوں۔

اس بیان سے دراصل قرآن یہودیوں کی نسل پرستی اور عیسائیوں کے نامعقول تعصبات کی نفی کرتا ہے اور کسی خاص گروہ میں سعادت وخوش بختی کے منحصر ہونے کو باطل قرار دیتا ہے۔ نیز ضمناً ایمان اور عمل صالح کو نجات کا معیار قرار دیتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) امانیھم: یہ امنیہ کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے ایسی آرزو جس تک انسان رسائی حاصل نہ کرسکے لیکن یہاں تو اہل کتاب میں سے مدعین کی صرف ایک آرزو تھی یعنی جنت کی اُن کے لئے تخصیص۔ چونکہ یہ آرزو کئی آرزوؤں کا سرچشمہ تھی اور اصطلاحاً کئی شاخیں اور پتے رکھتی تھی اس لئے جمع کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔

(۲) اسلم وجھہ: یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اسلام کی "وجہ" کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ (اپنے چہرے کو خدا کے سامنے خم کرنا)۔ یہ اس سبب سے ہے کہ کسی کے سامنے سپردگی کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ انسان پورے چہرے کے ساتھ اُس کے سامنے متوجہ ہو۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "وجہ" کا معنیٰ ذات ہو یعنی اپنے پورے وجود کے ساتھ فرمان پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔



(iii) بے دلیل دعوؤں سے بے اعتنائی : مندرجہ بالا آیات میں یہ نکتہ بھی ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ کسی مقام پر بھی بے دلیل باتوں کے پیچھے نہ جائیں اگر کوئی بھی شخص کچھ دعویٰ کرے تو اس سے دلیل مانگیں اور یوں اندھی تقلید کے سامنے بند باندھ دیں تاکہ ان کے معاشرے میں منطقی فکر کی حکمرانی ہو۔

(iv) وھو محسن : مسئلہ تسلیم کے بعد "وھو محسن" ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان راسخ نہ ہو نیکی اپنا وسیع مفہوم نہیں پا سکتی۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ایسے انسان کے لئے نیکی ایک جلد گزر جانے والا فعل نہیں بلکہ وہ ان کی صفت بن چکی ہے اور نیکی ذات کی گہرائی میں اتر چکی ہے۔

راہِ توحید کے راہیوں کے لیے خوف و غم نہیں :

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور کسی سے گھبراتے نہیں لیکن بیہودہ مشرک ہر چیز سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس کی اور اس کی گفتگو، بدحالی، فضول رسم و رواج اور ایسی ہی بہت سی چیزیں ہیں جن سے وہ خوفزدہ رہتے ہیں۔

۱۱۳۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ
الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۳۔ یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی (خدا کے ہاں) کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور عیسائی (بھی) کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں (اور وہ باطل پر ہیں)، حالانکہ دونوں گروہ خدا کی کتاب پڑھتے ہیں (اور انہیں ایسے تعصبات اور کینوں سے علیحدہ رہنا چاہیے)۔ نادان (اور مشرک)، لوگ بھی ان کی سی باتیں کرتے ہیں۔ خداوند عالم قیامت کے دن ان کے اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے :

جب نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا تو علماء یہود کا ایک گروہ



بھی وہاں موجود تھا۔ عیسائیوں اور ان کے درمیان آنحضرتؐ کے سامنے ہی جھگڑا شروع ہوگیا۔ رافع بن حرملہ جو ایک یہودی تھا اس نے عیسائیوں کی طرف منہ کرکے کہا: تمہارے دین کی کوئی اساس نہیں ہے نیز اس نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اور انجیل کا انکار کیا۔ نجران کے عیسائیوں میں سے ایک شخص نے بعینہٖ یہی جملہ اس کے جواب میں کہا: کہنے لگا: یہودیوں کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں اور اس نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت اور ان کی کتاب توراۃ کا انکار کیا۔ اسی اثناء میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور دونوں گروہوں کو ان کی غلط اور نادرست گفتگو پر ملامت کی[1]

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم نے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کے کچھ بے دلیل دعووں کو ملاحظہ کیا۔ زیر بحث آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بے دلیل دعویٰ کا نتیجہ تضاد ہوتا ہے اور ہر گروہ اپنی اجارہ داری کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ارشاد ہے: یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کی خدا کے ہاں کوئی اہمیت و حیثیت نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کی کوئی وقعت نہیں اور وہ باطل پر ہیں (وقالت الیھود لیست النصٰرٰی علٰی شیئٍ ص وقالت النصٰرٰی لیست الیھود علٰی شیئٍ)۔ لیست .... علٰی شیئٍ" ہوسکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ وہ درگاہِ الٰہی میں کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتے یا ان کے مذہب کی کوئی حیثیت نہیں۔

مزید فرمایا: یہ ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ آسمانی کتاب پڑھتے ہیں (وھم یتلون الکتٰب ط) یعنی کتب خدا جن سے وہ حقائق کچھ سکتے ہیں، کے حامل ہونے کے باوجود صرف تعصب، عناد اور ڈھٹائی کی باتیں کرنا تعجب انگیز ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے حضرت مسیحؑ کے آنے کے بارے میں جو بشارتیں دی ہیں ان کی طرف توجہ کریں تو یہودی بغیر تعصب کے ان کی نبوت قبول کرسکتے ہیں اور عیسائی بھی انجیل کی تعلیمات اور حضرت مسیحؑ کی گفتگو سامنے رکھیں تو توراۃ اور حضرت موسیٰؑ کی نبوت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ میں حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی تکمیل کے لئے آیا ہوں۔

قرآن مزید کہتا ہے: نادان مشرکین بھی ان کی سی باتیں کہتے تھے (حالانکہ یہ اہل کتاب ہیں اور وہ بت پرست ہیں) (کذٰلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم)۔

درحقیقت اس آیت میں قرآن نے تعصب کے اصل سرچشمہ کا ذکر کیا ہے جو جہل و نادانی ہے کیونکہ نادان انسان ہمیشہ اپنی زندگی کے گرد ہی محصور رہتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتے اور بچپن سے جس مذہب سے آشنا ہوں اپنے دل کو سختی سے اسی کے ساتھ منسلک رکھتے ہیں چاہے وہ فضول اور بے بنیاد ہو اور اس کے علاوہ ہر چیز کا

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر المنار مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔



انکار کر دیتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ہے: اس اختلاف کا فیصلہ اللہ آخرت میں خود کرے گا۔ (فاللہ یحکم بینھم یوم القیمۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

آخرت وہ مقام ہے جہاں حقائق زیادہ روشن اور واضح ہو جائیں گے۔ ہر چیز کے اسناد و مدارک آشکار ہو جائیں گے اور وہاں کوئی شخص حق کا انکار نہیں کر سکے گا۔ اس وقت تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ گویا قیامت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اختلافات باقی نہ رہیں گے۔

مندرجہ بالا آیت میں ضمناً یہ بھی ہے کہ خدا مسلمانوں کو تسلی دیتا ہے کہ اگر ان مذاہب کے پیروکار تمہارے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں اور تمہارے دین کو جھٹلاتے ہیں تو اس کی ہرگز پروا نہ کرو وہ تو خود کو بھی قبول نہیں کرتے ان میں سے ہر ایک دوسرے پر نفی کی لاٹھی چلاتا ہے۔ اصولی طور پر تعصب کا سرچشمہ جہل و نادانی ہے اور تعصب اجارہ داری کی خواہش کا منبع ہے۔

۱۱۴۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۱۴۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو مساجد میں خدا کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی ویرانی و بربادی میں کوشاں ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ خوف و وحشت کے بغیر یہ لوگ ان مقامات میں داخل ہوں (بلکہ مسلمان انہیں ان مقاماتِ مقدسہ سے روک دیں اور انہیں وہاں نہ آنے دیں) ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

شانِ نزول

کتاب "اسباب النزول" میں ابن عباس سے یوں منقول ہے:

یہ آیت مطلوس رومی اور اس کے عیسائی ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے جنگ کی، تورات کو آگ لگائی، ان کی اولاد کو قید کر لیا، بیت المقدس کو ویران کر دیا اور اس میں مردہ چیزیں پھینک دیں۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں ابن عباس سے ناقل ہیں:



بیت المقدس کو خراب کرنے اور تباہ و برباد کرنے کی کوشش مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہُوا۔

امام صادقؑ سے بھی ایک روایت منقول ہے جس میں ہے:

یہ آیت قریش کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ پیغمبر اسلام کو شہر مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے منع کر رہے تھے۔

بعض نے اس آیت کی تیسری شانِ نزول ذکر کی ہے کہ اس سے مراد وہ جگہیں اور مکانات ہیں جو مکہ میں نماز کے لئے مسلمانوں کے پاس تھے اور مشرکین نے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے وقت انہیں ویران کر دیا تھا۔[۱]

کوئی مانع نہیں کہ آیت کا نزول ان تمام حوادث و واقعات کے ضمن میں ہو۔ لہٰذا ان میں سے ہر شان نزول مسئلے کے ایک پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تفسیر شان ہائے نزول کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت کا رُخِ سخن تین گروہوں یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی طرف ہے اگرچہ گذشتہ آیات میں زیادہ تر یہودیوں کے بارے میں بحثیں آئی ہیں اور کہیں کہیں نصاریٰ کی طرف بھی اشارہ ہے۔

قبلہ کی تبدیلی کے معاملے کے بارے میں یہودی وسوسہ ڈال کر کوشش کرتے تھے کہ مسلمان بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں تاکہ اس سلسلے میں انہیں برتری حاصل رہے اور اس طرح مسجد الحرام اور کعبہ کی رونق بھی کم ہو سکے۔[۲]

مشرکین مکہ بھی پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک کر عملاً اس خدائی عمارت کی بربادی کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔

عیسائی بھی بیت المقدس پر قبضہ کرکے اس میں وہ ناپسندیدہ اعمال سرانجام دیتے جن کا ذکر ابن عباس کی روایت میں آچکا ہے تاکہ اسے برباد کر سکیں۔

ان تینوں گروہوں اور ایسے تمام اشخاص جو اس راہ پر قدم اٹھاتے ہیں کو مخاطب کرکے قرآن کہتا ہے: اس شخص سے بڑھ کے کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں خدا کا نام لینے سے روکتے ہیں اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں (ومن اظلم ممن منع مسٰجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا)۔ یوں قرآن ایسی رکاوٹ کو ظلم عظیم اور یہ کام کرنے والوں کو ظالم ترین افراد قرار دیتا ہے۔ اور واقعاً اس سے بڑا کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ درگاہ توحید کو برباد کرنے کی کوشش کی جائے، لوگوں کو حق تعالیٰ کی یاد سے روکا جائے اور معاشرے میں فساد برپا کیا جائے۔

آیت مزید کہتی ہے: مناسب نہیں کہ یہ لوگ خوف و وحشت کے بغیر ان مکانات میں داخل ہوں (اولٰئک ما

---

[۱] مجمع البیان اور المیزان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر فخر رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔



کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین ۔

یعنی- دنیا کے مسلمانوں اور توحید پرستوں کو چاہیئے کہ وہ اس مضبوطی سے قیام کریں کہ ان ستمگروں کے ہاتھ ان مقدس مقامات سے دور ہو جائیں اور ان میں سے کوئی بھی علی الاعلان بلا خوف ان مقاماتِ مقدسہ میں داخل نہ ہو سکے۔
مندرجہ بالا جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ستمگران مراکزِ عبادت کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکیں گے۔ بلکہ آخر کار ان میں بلا خوف قدم بھی نہیں رکھ سکیں گے جیسا کہ مسجد الحرام کے بارے میں مشرکین مکہ کے ساتھ ہوا۔
آخر میں ایسے عظیم ستمگروں کے لئے دنیا و آخرت میں ہلا دینے والی سزا کا ذکر ہے۔ فرمایا: ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے (لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم)۔ وہ لوگ جو خدا اور خدا کے بندوں میں جدائی ڈالنا چاہتے ہیں ان کا یہی انجام ہے۔

چند اہم نکات

(۱) مساجد کی ویرانی کی راہیں: اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت کا مفہوم وسیع اور کافی پھیلا ہوا ہے اور کسی زمان و مکان سے مخصوص نہیں ہے جیسے دیگر آیات ہیں جو اگرچہ خاص حالات میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم تمام زمانوں کے لئے مسلم ہے۔ اس بنا پر ہر شخص اور ہر وہ گروہ جو کسی طرح مساجدِ الٰہی کی تباہی و ویرانی کی کوشش کرے یا اس میں ذکرِ خدا اور عبادت سے روکے وہ اسی رسوائی اور عذابِ عظیم کا مستحق ہو گا۔ جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔
اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ مساجد میں داخل ہونے اور ان میں ذکرِ پروردگار کو روکنے اور ان کی ویرانی و بربادی کی کوشش کا صرف یہ مطلب نہیں کہ بیلچے یا ایسے کسی ہتھیار سے مسجد کو تباہ کیا جائے بلکہ ہر وہ عمل جس کا نتیجہ مسجد کی ویرانی اور اس کی رونق میں کمی ہو اس میں شامل ہے۔
آیت "انما یعمر مساجد اللہ ۔۔۔۔" (توبہ-۱۸) کی تفسیر میں تفصیل سے آئے گا کہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق تعمیر اور آبادی سے مراد مساجد کی عمارتیں بنانا ہی نہیں بلکہ مساجد میں جانا اور وہاں کی مذہبی محافل و مجالس جو یادِ خدا کا باعث ہیں کی طرف توجہ رکھنا بھی تعمیر کے مفہوم میں شامل ہے بلکہ یہی اس کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس بنا پر جو چیز یادِ خدا سے لوگوں کی غفلت کا باعث بنے اور جس سے لوگ مساجد سے دور ہوں وہ بہت بڑا ظلم ہے۔
تعجب کی بات ہے کہ اس دور میں نادان، خشک مزاج اور عقل و منطق سے عاری متعصبین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو چاہتا ہے کہ احیائے توحید کے بہانے ان مساجد اور عمارات کو برباد کر دے جو آئمہ اہل بیتؑ، بزرگانِ اسلام اور صلحائے دین کی قبور پر واقع ہیں اور ہمیشہ سے یادِ خدا کا مرکز ہیں۔ زیادہ تعجب تو اس پر ہے کہ یہ بے منطق ستمگر احیائے توحید اور ردِ شرک کے نام پر یہ افعال انجام دیتے ہوئے بہت سے گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کر جاتے ہیں۔ حالانکہ فرض کریں کہ کسی مرکزِ مقدس پر کوئی غلط کام سرانجام پا رہا ہے تو اس کام کو روکا جانا چاہیئے نہ کہ ان مراکزِ توحید کو برباد کرنا چاہیئے۔



(۲) سب سے بڑا ظلم : دوسرا نکتہ جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے یہ ہے کہ خداوند عالم ان اشخاص کو ظالم ترین قرار دیتا ہے اور واقعاً ایسا ہے کیونکہ مساجد کی تباہی و بربادی اور مراکزِ توحید سے لوگوں کو روکنے کی کوشش کا نتیجہ بے دینی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کام کا نقصان ہر دوسرے عمل سے زیادہ ہے۔ اور اس کا بُرا اور غلط انجام بہت دردناک ہے۔

قرآن میں دیگر مقامات پر بھی لفظ "اظلم" (یعنی۔ زیادہ ظالم) استعمال ہوا ہے۔ ان تمام امور کا نتیجہ شرک ہے اور توحید کی نفی ہے۔

۱۱۵۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۵۔ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ جدھر بھی رُخ کرو خدا موجود ہے اور خدا بے نیاز و دانا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے سلسلے میں مختلف روایات منقول ہیں۔

ابنِ عباس کہتے ہیں :

اس آیت کا تعلق قبلہ کی تبدیلی سے ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ جب بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ مقرر ہوا تو یہودیوں نے بُرا منایا اور مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ کیا قبلہ بھی بدلا جاسکتا ہے۔ اس آیت میں انہیں جواب دیا گیا کہ دنیا کے مشرق و مغرب کا مالک خدا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت مستحب نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی جب انسان کسی سواری پر سوار ہو تو سواری کا رُخ کچھ بھی ہو (چاہے پشت بہ قبلہ ہو) مستحب نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

کچھ اور حضرات نے جابر سے نقل کیا ہے :

پیغمبر اکرمؐ نے کچھ مسلمانوں کو ایک جنگ پر بھیجا۔ رات کے وقت جب تاریکی چھا گئی تو وہ سمت قبلہ نہ پہچان سکے اور سب نے مختلف سمتوں کی طرف نماز پڑھ لی۔ طلوع آفتاب پر انہیں معلوم ہوا کہ سب نے سمت قبلہ کے بغیر نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام سے سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ ایسی صورت میں ان کی نماز صحیح ہے (البتہ اس حکم کی کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں درج ہیں)۔



کوئی مانع نہیں کہ جتنی شان ہائے نزول اوپر ذکر ہوئی ہیں وہ سب اس آیت کے لئے صحیح ہوں اور یہ آیت قبلہ کی تبدیلی، سواری پر نماز نافلہ کی ادائیگی اور جب قبلہ کی پہچان نہ ہو رہی ہو تو نماز واجب کی ادائیگی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ علاوہ ازیں کوئی آیت شانِ نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم کو حکم کلی کی صورت میں لیا جانا چاہیئے اور بسا اوقات اس سے مختلف قسم کے احکام حاصل ہو سکتے ہیں۔

تفسیر

جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے

گذشتہ آیت میں ان ظالمین سے متعلق گفتگو تھی جو مساجد الٰہی کی آبادی سے روکتے تھے اور انہیں ویران کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ زیر نظر آیت اس بحث کا تتمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مشرق و مغرب خدا کے ہیں اور جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے (وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ)۔

ایسا نہیں کہ اگر تمہیں مساجد اور مراکز توحید میں جانے سے روک دیا جائے تو خدا کی بندگی کی راہ بند ہو جائے گی۔ اس جہان کے مشرق و مغرب اس کی ذات پاک سے تعلق رکھتے ہیں اور جس طرف رُخ کرو وہ موجود ہے۔ اسی طرح قبلہ کی تبدیلی جو بعض خاص وجوہ کے پیش نظر انجام پائی ہے اس سلسلے میں کچھ اثر نہیں رکھتی۔ کیا کوئی جگہ ہے جو خدا سے خالی ہو اصولاً تو خدا بے عدیل و بے نیاز اور عالم و دانا ہے (ان اللہ واسع علیم)۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں مشرق و مغرب سے مراد دو مخصوص سمتیں نہیں بلکہ یہ تمام اطراف کے لئے کنایہ ہے، جیسے ہم کہا کرتے ہیں کہ دشمنوں نے عداوت سے اور دوستوں نے خوف سے حضرت علیؑ کے فضائل چھپائے لیکن اس کے باوجود مشرق و مغرب آپ کے فضائل سے بھرے پڑے ہیں (یعنی تمام اطراف اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں) اور شاید خصوصیت سے مشرق و مغرب کا ذکر اس لحاظ سے ہے کہ انسان سب سے پہلے انہی سمتوں کو پہچانتا ہے اور باقی جہات ان کے ذریعے پہچانی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا

جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا ہم نے انہیں زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا۔ (اعراف - ۱۳۷)

چند اہم نکات

(۱) فلسفۂ قبلہ: یہاں سب سے پہلے جو سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جدھر رُخ کریں اگر ادھر خدا ہے تو پھر قبلہ کے تعین کی کیا ضرورت ہے۔



اس ضمن میں بعد میں بھی گفتگو ہو گی کہ قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ خدا کی ذات پاک کو کسی معین سمت میں محدود سمجھا جائے بلکہ انسان چونکہ مادی وجود ہے اور مجبور ہے کہ کسی ایک ہی طرف نماز پڑھے لہٰذا حکم دیا گیا کہ سب کے سب (استثنائی مقامات کے علاوہ) ایک ہی طرف نماز پڑھیں تاکہ لوگوں کی صفوں میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے اور انتشار و پراگندگی کی روک تھام ہو سکے۔ ضمناً یہ بات بھی ہے کہ قبلہ کے لیے جو سمت معین ہوئی ہے۔ (یعنی کعبہ) وہ ایک مقدس نقطہ ہے اور قدیم ترین مراکز توحید میں سے ہے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے افکار توحید بیدار ہوتے ہیں۔

(ii) **وجہ اللہ:** اس سے مراد خدا کا چہرہ نہیں بلکہ لفظ "وجہ" یہاں ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(iii) مختلف روایات میں اس آیت سے اُن لوگوں کی نماز صحیح ہونے کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے۔ جنہوں نے اشتباہ یا تحقیق نہ ہو سکنے کی وجہ سے خلاف قبلہ نماز پڑھی ہو مزید براں اس سے سواری پر نماز پڑھنے کے جواز کے لیے بھی استدلال کیا گیا ہے (مزید توضیح اور تفصیل کے لئے وسائل الشیعہ، کتاب الصلوٰۃ، ابواب قبلہ کی طرف رجوع کریں)۔

۱۱۶- وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○

۱۱۷- بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

ترجمہ

۱۱۶- (یہود، نصاریٰ اور مشرکین) کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے، وہ تو پاک (و منزہ) ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اس کے سامنے سرنگوں ہے (سب اس کے بندے ہیں اور کوئی بھی اس کا فرزند نہیں)۔

۱۱۷- آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا وہی ہے اور جب کسی چیز کو وجود عطا کرنے کا فرمان جاری کرتا ہے تو اس کیلئے کہتا ہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

تفسیر

یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کی خرافات

یہودی، عیسائی اور مشرک سب یہ بیہودہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا کوئی بیٹا ہے۔



سورہ توبہ کی آیت ۳۰ میں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ

یہودی کہتے ہیں عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں جو گذشتہ کافروں کی گفتگو جیسی ہے۔ خدا انہیں قتل کرے، کیسے جھوٹ بولتے ہیں۔

سورہ یونس آیہ ۶۸ میں بھی مشرکین کے بارے میں ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ

وہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے وہ تو پاک و منزہ ہے۔

اسی طرح قرآن کی دیگر بہت سی آیات میں بھی اس ناروا نسبت کا ذکر موجود ہے۔

زیر نظر پہلی آیت اس بے ہودگی کے خلاف لڑتی ہے: وہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے، وہ تو ان ناروا نسبتوں سے پاک و منزہ ہے (وقالوا اتخذ اللّٰہ ولدا سبحٰنہ)۔ خدا کو کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے لئے بیٹے کا انتخاب کرے۔ کیا وہ محتاج ہے، محدود ہے، اسے مدد کی ضرورت ہے یا اُسے بقائے نسل کی احتیاج ہے جب کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کے لئے ہیں (بل لہ ما فی السمٰوٰت والارض) اور سب کے سب اس کے سامنے سرنگوں ہیں (کل لہ قنتون)۔

وہ نہ صرف عالم ہستی کی موجودات کا مالک ہے بلکہ تمام انسانوں اور زمین کا موجد و خالق بھی وہی ہے (بدیع السمٰوٰت والارض)۔ حتیٰ کہ پہلے کی کسی منصوبے کے بغیر اور کسی مادہ کی احتیاج کے بغیر ہی اس نے ان سب کو تخلیق کیا ہے۔

اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے حالانکہ جب کسی چیز کے وجود کا حکم صادر فرماتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے (واذا قضٰی امرًا فانما یقول لہ کن فیکون)۔

چند اہم نکات

(۱) **عدم فرزند کے دلائل:** خدا کا بیٹا ہونا بے شک ان لوگوں کے کمزور افکار کی پیداوار ہے جو تمام امور میں خدا کو اپنے محدود وجود پر قیاس کرتے ہیں۔

مختلف دلائل کی بناء پر انسان بیٹے کا محتاج ہے۔ ایک طرف تو اس کی عمر محدود ہے اور بقائے نسل کے لئے بیٹا ضروری ہے۔ دوسری طرف اس کی قدرت محدود ہے، خصوصاً بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں اسے معاون و مددگار کی ضرورت ہے جو بیٹے کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے۔ تیسرا یہ کہ انسانی نفسیات میں محبت و انس کی خواہش کے پیش نظر ضروری ہے کہ کوئی اس کا



مونس و مددگار ہو۔ یہ مقصد بھی اولاد کے ذریعے پورا ہو جاتا ہے۔ واضح ہے کہ خدا کے ہاں ان میں سے کوئی بھی بات کچھ مفہوم نہیں رکھتی کیونکہ وہ تو عالم ہستی کو پیدا کرنے والا، تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا اور ازلی و ابدی ہے۔ علاوہ ازیں جسم صاحب اولاد ہونے کا لازمہ ہے اور خدا اس سے بھی منزہ ہے۔[1]

(ii) "کن فیکون" کی تفسیر: یہ تعبیر قرآن کی بہت سی آیات میں آئی ہے۔ ان میں سورہ آل عمران ۴۷ اور ۵۹، سورہ انعام آیہ ۷۳، سورہ نحل آیہ ۴۰، سورہ مریم آیہ ۳۵ اور سورہ یٰسین آیہ ۸۲ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ جملہ خدا کے ارادۂ تکوینی اور امر خلقت میں اس کی حاکمیت کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "کن فیکون" (ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتا ہے) سے مراد یہ نہیں کہ خدا کوئی لفظی فرمان "ہو جا" کی صورت میں صادر فرماتا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کو وجود عطا فرمانے کا ارادہ کرتا ہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی، پیچیدہ ہو یا سادہ، ایک ایٹم (ATOM) کے برابر ہو یا تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہو کسی علت کی احتیاج کے بغیر وہ ارادہ خود بخود عملی جامہ پہن لیتا ہے۔ اس ارادہ اور موجود کی پیدائش کے درمیان لحظے کا فاصلہ بھی نہیں ہوتا۔

اصولی طور پر کوئی زمانہ اس کے درمیان نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے حرف فا (فیکون میں) جو عموماً تاخیر زمانی کے لئے آتا ہے البتہ ایسی تاخیر جو اتصال کی توام ہو، یہاں صرف تاخیر رتبہ کے لحاظ سے ہے (جیسا کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ معلول اپنی علت سے رتبے کے لحاظ سے تو متاخر ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے نہیں)۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ارادہ الٰہی آنی الوجود ہے[2] بلکہ مراد یہ ہے کہ جیسا وہ ارادہ کرے موجود اسی طرح وجود پاتا ہے۔

مثلاً- اگر وہ ارادہ کرے کہ آسمان اور زمین چھ ادوار میں معرض وجود میں آئیں تو یقیناً بغیر کسی کمی بیشی کے وہ اسی مدت میں وجود پذیر ہوں گے اور اگر ارادہ کرے کہ ایک لحظے میں موجود ہوں تو سب کے سب ایک لحظے میں وجود پا جائیں گے۔ یہ وہ جانتا ہے کہ کیسا ارادہ کرے اور کیا مصلحت ہے۔

یا مثلاً- اگر وہ ارادہ کرے کہ بچہ شکم مادر کی جنین میں نو ماہ اور نو دن میں اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے تو لحظے بھر کی کمی بیشی کے بغیر یونہی انجام پذیر ہوگا اور اگر ارادہ کرے کہ تکامل کا یہ دور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے بھی کم مقدار میں پورا کرے تو یقیناً ایسا ہی ہوگا کیونکہ خلقت کے لئے اس کا ارادہ علت تامہ ہے اور علت تامہ و معلول کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ نہیں ہو سکتا۔

(iii) کوئی چیز کیسے عدم سے وجود میں آتی ہے: لفظ "بدیع" کا مادہ ہے "بدع" جس کا معنیٰ ہے بغیر کسی سابقہ کے کسی چیز کا وجود میں آنا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کو خدا نے بغیر کسی مادے اور بغیر کسی

---

[1] سورہ انبیاء آیہ ۲۶، تفسیر نمونہ میں اس ضمن میں مزید بحث کی گئی ہے۔

[2] یعنی ارادہ الٰہی سے کوئی چیز آناً فاناً وجود میں آ جاتی ہے۔ (مترجم)



پہلے نمونے کے وجود بخشتا ہے۔

اب یہ سوال ہوگا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے جب کہ عدم وجود کی ضد ہے۔ لہٰذا یہ کیسے علت اور منشاء وجود ہو سکتا ہے۔ کیا واقعاً یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ نیستی سبب ہستی ہو۔ مسئلہ ابداع پر ماد یین کا یہ پرانا اعتراض ہے۔

اس کا جواب پیش خدمت ہے:

پہلے مرحلے میں تو یہ اعتراض خود مادہ پرستوں پر بھی وارد ہوتا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ جہان قدیم اور ازلی ہے اور کوئی چیز بھی آج تک اس میں سے کم نہیں ہوئی اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں کئی تغیرات آئے ہیں جن سے مادے کی یہ صورت بدلی ہے جو ہمیشہ بدلتی رہتی۔ گویا صورت بدلتی ہے نہ کہ مادہ۔

اب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ مادے کی جو موجودہ صورت ہے یقیناً وہ پہلے تو نہ تھی۔ اب یہ صورت کیسے وجود میں آئی کیا عدم سے وجود میں آئی۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر عدم کیسے وجود صورت کا منشاء ہو سکتا ہے۔

مثلاً ایک نقاش قلم اور سیاہی سے کاغذ پر ایک بہترین منظر بناتا ہے۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ اس کا جوہر اور سیاہی تو پہلے سے موجود تھی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ منظر (صورت) جو پہلے موجود نہ تھا کس طرح وجود میں آیا۔ جو جواب وہ "صورت" کے عدم سے پیدا ہوجانے کے متعلق دیں گے وہی جواب ہم مادہ کے سلسلے میں دیں گے۔

دوسرے مرحلے میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ لفظ "سے" کی وجہ سے اشتباہ ہوا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عالم نیستی سے ہستی میں آیا ہے کا مطلب ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میز لکڑی سے بنائی گئی ہے۔ جس میں میز بنانے کے لئے لکڑی کا پہلے موجود ہونا ضروری ہے تاکہ میز بن سکے جب کہ عالم نیستی سے ہستی میں آیا ہے کا معنی یوں نہیں بلکہ اس کا معنی ہے کہ عالم پہلے موجود نہ تھا بعد میں وجود پذیر ہوا۔

فلسفے کی زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہر موجود ممکن (جو اپنی ذات سے وجود نہ رکھتا ہو) کو اپنی تشکیل کے لئے دو پہلو درکار ہیں "ماہیت" اور "وجود"۔

"ماہیت" ایک اعتباری معنی ہے کہ جس کی نسبت وجود و عدم کے ساتھ مساوی ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ قدر مشترک جو کسی چیز کے وجود اور عدم کو دیکھنے سے دستیاب ہو اس کا نام ماہیت ہے۔ مثلاً یہ درخت پہلے نہیں تھا۔ اب وجود رکھتا ہے۔ جو چیز وجود و عدم سے ثابت ہو وہ ماہیت ہے لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ خدا عالم کو عدم سے وجود میں لایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عالم حالت عدم کے بعد حالتِ وجود میں آگیا ہے دوسرے لفظوں میں ماہیت کو حالت عدم سے حالت وجود میں لایا گیا ہے[1]

۱۱۸۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ

---

[1] مزید وضاحت کے لئے کتاب "آفریدگارِ جہان" کی طرف رجوع کریں۔



قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

۱۱۹- اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝

ترجمہ

۱۱۸- بے علم افراد کہتے ہیں خدا ہم سے بات کیوں نہیں کرتا اور کوئی آیت ونشانی خود ہم پر کیوں نہیں نازل کرتا۔ ان سے پہلے بھی لوگ ایسی باتیں کرتے تھے۔ ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ لیکن ہم (کافی تعداد میں اپنی) آیات اور نشانیاں (حقیقت کے متلاشی) اہل یقین کے لئے روشن اور واضح کرچکے ہیں۔

۱۱۹- ہم نے تجھے حق کے ساتھ (اہل دنیا کو اچھائیوں اور برائیوں کے مقابلے میں) بشارت اور تہدید کے لئے بھیجا اور (اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد) تو اہل جہنم کی گمراہی پر جواب دہ نہیں ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات کی ابتداء میں یہودیوں کی بہانہ سازیوں کی مناسبت سے ایک اور گروہ کی بہانہ سازیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ظاہراً یہ مشرکین عرب ہی کے بارے میں ہے۔

فرمایا: بے علم لوگ کہتے ہیں خدا ہمارے ساتھ باتیں کیوں نہیں کرتا اور کیوں آیت اور نشانی خود ہم پر نازل نہیں ہوتی (وقال الذین لا یعلمون لولا یکلمنا اللہ او تاتینا ایة ط)۔

دراصل یہ لوگ جنہیں قرآن "الذین لا یعلمون" کے عنوان سے یاد کر رہا ہے دو غیر منطقی خواہشیں رکھتے تھے:

۱۔ خدا ہم سے براہ راست بات کیوں نہیں کرتا۔

۲۔ کیوں آیت اور نشانی خود ہم پر نازل نہیں ہوتی۔

غرور، ہٹ دھرمی اور خود پسندی پر مبنی ان باتوں کے جواب میں قرآن کہتا ہے: ان سے پہلے بھی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے تھے، ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن جو حقیقت کے متلاشی اور اہل یقین ہیں۔ ان کے لئے ہم نے (کافی مقدار میں) آیات اور نشانیاں واضح کی ہیں (کذلک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم قد بینا الآیات لقوم یوقنون)۔

اگر واقعاً ان کا مقصد حقیقت وواقعیت کو سمجھنا ہے تو یہی آیات جو پیغمبر اکرم پر ہم نے نازل کی ہیں روشن نشانی ہیں آپ کے صدق کلام کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک شخص پر براہ راست اور مستقلاً آیات نازل ہوں اور اس کا کیا مطلب ہے کہ خدا بلاواسطہ مجھ سے باتیں کرے۔



ایسی ہی گفتگو سورہ مدثر آیہ ۵۲ میں بھی ہے:

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝

ان میں سے ہر ایک یہ آرزو لئے بیٹھا ہے کہ چند اوراق آیات اس پر نازل ہوں۔

کیسی نامناسب خواہش ہے؟

اس کے علاوہ کہ اس کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان آیات کے ذریعے جو آپ پر نازل ہوئیں پیغمبر اکرمؐ کی صداقت کا اثبات سب لوگوں پر ممکن تھا، یہ خود پسند مشرک ایک بنیادی نکتے سے بے خبر تھے اور وہ یہ کہ ہر شخص پر آیات و معجزات نازل نہیں ہو سکتے اس کے لئے خاص قسم کی شائستگی، آمادگی اور روح کی پاکیزگی ضروری ہے۔

یہ بالکل ایسے ہے کہ شہر میں بچھے ہوئے سب بجلی کے تار (قوی ہوں یا بہت ہی کمزور) یہ آرزو کریں کہ وہی بجلی جو بہت زیادہ طاقت ور ہے اور جو سب سے پہلے مضبوط تاروں میں منتقل ہوئی ان کی طرف منتقل ہو جائے۔ یقیناً یہ توقع انتہائی غلط اور نارواہوگی۔ وہ انجینیر جس نے ان تاروں کو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے تیار کیا ہے ان کی صلاحیت (CAPACITY) معین کی ہے ان میں سے بعض بجلی بننے والے مقام سے بلا واسطہ منسلک ہیں اور بعض بالواسطہ۔

بعد کی آیت کا روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف ہے جو بتاتی ہے کہ خواہ مخواہ کی معجزہ طلبیوں اور دیگر بہانہ سازیوں کے سلسلے میں آپ کی ذمہ داری کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے تجھے حق کے ساتھ (دنیا کے لوگوں کو) بشارت دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجا ہے (انا ارسلناك بالحق بشيرا و نذيرا)۔ تمہاری ذمہ داری ہے ہمارے احکام تمام لوگوں کے سامنے بیان کرنا ان کے سامنے معجزات پیش کرنا اور عقل و منطق سے حقائق واضح کرنا۔ اس دعوت کے ذریعے نیک لوگوں کو شوق و رغبت دلاؤ اور بدکاروں کو ڈراؤ تمہارے ذمے فقط یہی ہے۔

یہ پیغام پہنچائے جانے کے بعد اگر اب ان میں سے کوئی گروہ ایمان نہ لائے تو تم اہل جہنم کی گمراہی کے ذمے دار نہیں ہو (ولا تسئل عن اصحاب الجحيم)۔

چند اہم نکات

(۱) ان کے دل ایک جیسے ہیں: مندرجہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے کہ بہانہ سازیاں اور حیلہ گریاں کوئی نئی نہیں ہیں بلکہ پہلی کجرو قومیں بھی یہی کچھ کرتی رہی ہیں گویا ان کے دل بھی اُن کے دلوں جیسے ہیں۔ یہ تعبیر اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زمانہ گذرنے کا اور انبیاء کی تعلیمات کا یہ اثر تو ہونا چاہیئے کہ آنے والی نسلیں آگاہی اور علم کی زیادہ حصہ دار ہوں اور بہانہ سازیاں اور بے بنیاد باتیں جو انتہائی جہالت و نادانی کی نشانی ہیں انہیں کنارے لگا دیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس تکاملی پروگرام سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا اور اسی طرح کی ڈفلی بجا رہے ہیں۔ گویا ان سے اُن کا ہزاروں سالہ تعلق ہے اور زمانہ بیت جانے سے ان کے افکار و نظریات میں ذرا سی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔



(۱) **خوشخبری دینا اور ڈرانا — دو اہم تربیتی اصول:** خوشخبری دینا اور ڈرانا دوسرے لفظوں میں تشویق و تہدید تمام تربیتی اور معاشرتی پروگراموں کی بنیاد ہیں۔ اچھے کام کی انجام دہی پر جزا کی رغبت اور برے کام کی انجام دہی پر سزا کا خوف ضروری ہے تاکہ راہ خیر پر چلنے کا زیادہ سے زیادہ ولولہ و جذبہ پیدا ہو اور قدم برے راستے پر اٹھنے سے باز رہ سکیں۔

صرف شوق دلانا فرد یا معاشرے کے تکامل کے لئے کافی نہیں کیونکہ انسان اگر صرف بشارتوں کا امیدوار ہو اور ان پر مطمئن ہو جائے تو ممکن ہے کہ جرائم کی طرف ہاتھ بڑھائے چونکہ اسے اطمینان ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل عیسائی فدا کا عقیدہ رکھتے ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ ان کے گناہوں کا فدیہ ہو گئے ہیں۔ ان کے رہبر کبھی انہیں جنت کی سند بیچتے ہیں اور کبھی خدا کی طرف سے ان کے گناہ بخش دیتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگ آسانی سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

قاموس کتاب مقدس میں ہے:

خدا نیز اشارہ ہے مسیح کے گراں بہا خون کے کفارہ کی طرف جب کہ ہم سب کے گناہ ان پر رکھ دیئے گئے اور ہمارے گناہوں کے ضمن میں انہوں نے اپنے آپ کو صلیب کے لئے پیش کر دیا۔

یہ منطق اس تحریف شدہ مذہب کے پیروکاروں کے لئے گناہوں میں جسارت و جرأت کا سبب بنتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو سمجھتے ہیں کہ تشویق ہی انسان کے لئے (چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا) کافی ہے اور تنبیہ و تہدید اور سزا و عذاب کا ذکر بالکل ایک طرف رکھ دینا چاہیئے وہ بڑے اشتباہ کا شکار ہیں جیسا کہ وہ لوگ جو تربیت کی بنیاد صرف خوف و تہدید پر رکھتے ہیں اور تشویق کے پہلوؤں سے غافل ہیں وہ بھی گمراہ اور بے خبر ہیں۔

یہ دونوں گروہ انسان کو پہچاننے میں اشتباہ اور غلطی کر گئے ہیں وہ متوجہ نہیں کہ انسان خوف اور امید، ذات کی محبت، زندگی سے عشق اور فنا و نابودی سے نفرت کا مجموعہ ہے۔ وہ کشش منفعت اور دفع ضرر کا مرکب ہے۔ وہ انسان جو ان دونوں پہلوؤں کا حامل ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کی تربیت کی بنیاد صرف ایک پہلو پر رکھی جائے۔

ان دونوں میں ایک توازن ضروری ہے۔ اگر تشویق و امید حد سے بڑھ جائے۔ تو جرأت و غفلت کا باعث ہے اور اگر خوف و اندیشہ حد سے گذر جائے تو اس کا نتیجہ یاس و ناامیدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات قرآن میں نذیر و بشیر یا انذار و بشارت کا ایک ساتھ ذکر ہے بلکہ یہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کبھی بشارت کو انذار پر مقدم رکھا گیا ہے اور کبھی انذار کو بشارت پر۔ زیر بحث آیت میں "بشیراً و نذیراً" ہے اور سورہ اعراف آیہ ۱۸۸ میں ہے:

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

میں ایمان لانے والے کے لئے نذیر اور بشیر ہوں۔

البتہ اکثر آیات قرآن میں بشیر، بشارت یا مبشر کو مقدم رکھا گیا ہے اور کم آیات میں نذیر مقدم ہے۔ ممکن ہے یہ اس لئے ہو کہ مجموعی طور پر رحمت خدا اس کے عذاب پر سبقت رکھتی ہے:



یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۱۲۰۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى
اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

۱۲۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَ
مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۰۔ یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ (ان کی غلط خواہشات کے سامنے طرح سر تسلیم خم نہ کریں اور
ان کے (تحریف شدہ) مذہب کی پیروی نہ کریں۔ کہیے ہدایت کامل صرف خدا کی ہدایت ہے۔ اگر آگاہی کے بعد بھی
ان کی ہوا و ہوس کی پیروی کی تو خدا کی طرف سے تمہارے لئے کوئی سرپرست و مددگار نہ ہوگا۔

۱۲۱۔ وہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور وہ اسے غور سے پڑھتے ہیں۔ پیغمبر اسلام پر ایمان
لے آئیں گے اور جو ان سے کفر اختیار کریں گے وہ خسارے میں ہیں۔

شانِ نزول

پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے:

مدینہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کا خیال تھا کہ قبلہ کے بارے میں پیغمبر اسلام ہمیشہ ان سے موافقت رکھیں گے جب خدا نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا۔ تو وہ پیغمبر اکرم سے مایوس ہوگئے (اس دوران شاید مسلمانوں میں سے بعض لوگ بھی معترض تھے کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو یہود و نصاریٰ کی رنجش کا باعث ہو)۔[1] اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ قبلہ کی ہم آہنگی کا معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ گروہ تم

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخر رازی (کچھ فرق کے ساتھ)



سے کبھی راضی نہیں ہوگا جب تک تم ان کے مذہب کو پورے طور پر تسلیم نہ کر لو۔

بعض دوسرے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ چاہتے تھے کہ ان دونوں گروہوں کو راضی کیا جائے شاید یہ اسلام قبول کرلیں اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کیونکہ وہ کسی قیمت پر آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کی پیروی نہ کرنے لگیں [1]

دوسری آیت کی شانِ نزول میں مختلف روایات ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت ان افراد کے بارے میں ہے جو جناب جعفر ابن ابوطالب کے ساتھ حبشہ سے آئے تھے اور وہ لوگ وہاں جاکر جناب جعفر سے مل گئے تھے۔ ان کی تعداد چالیس تھی۔ بتیس افراد حبشہ سے تھے اور آٹھ افراد شام کے راہب تھے جن میں مشہور راہب بحیرا بھی شامل تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں میں سے چند افراد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام، سعید بن عمرو اور تمام بن یہودا وغیرہ جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ [2]

تفسیر

وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے

گذشتہ آیت میں پیغمبر اسلام کی رسالت کا ذکر ہے۔ جس میں بشارت اور تنبیہ شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہٹ دھرم گمراہوں کے بارے میں آپ سے کوئی جواب طلبی نہ ہوگی۔ مندرجہ بالا آیات میں یہی بحث جاری ہے۔ پیغمبر اسلام سے فرمایا گیا ہے کہ آپ یہودیوں اور عیسائیوں کی رضامندی حاصل کرنے پر زیادہ اصرار نہ کریں کیونکہ وہ ہرگز آپ سے راضی نہ ہوں گے مگر یہ کہ ان کی خواہشات کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مذہب کی پیروی کی جائے (ولن ترضٰی عنك الیهود ولا النصٰرٰی حتی تتبع ملتهم)۔ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان سے کہیے کہ ہدایت صرف ہدایت الٰہی ہے (قل ان هدی الله هو الهدٰی)۔ وہ ہدایت جس میں خرافات اور پست و ناداں افراد کے افکار کی آمیزش نہ ہو یقیناً ایسی ہی خالص ہدایت کی پیروی کرنا چاہیے۔

مزید فرمایا: اگر آپ ان کے تعصبات، ہوا و ہوس اور تنگ نظریوں کو مان لیں جب کہ وحی الٰہی کے سائے میں آپ پر حقائق روشن ہو چکے ہیں تو خدا کی طرف سے آپ کا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہ ہوگا (ولئن اتبعت اهواءهم بعد الذی جاءك من العلم ما لك من الله من ولیّ ولا نصیر)۔

ادھر جب یہود و نصاریٰ میں سے کچھ لوگوں نے جو حق کے متلاشی تھے پیغمبر اسلام کی دعوت پر لبیک کہی اور اس

---

[1] تفسیر ابوالفتوح اور مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



آئین و دین کو قبول کر لیا تو سابق گروہ کی مذمت کے بعد قرآن انہیں اچھائی اور نیکی کے حوالے سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور انہوں نے اسے غور سے پڑھا ہے اور اس کی تلاوت کا حق ادا کیا ہے (یعنی فکر و نظر کے بعد اس پر عمل کیا ہے) وہ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لے آئیں گے (الذین اٰتینٰھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ اولٰئك یؤمنون بہ)۔ اور جو ان کے کافر و منکر ہو گئے ہیں انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں (ومن یکفر بہ فاولٰئك ھم الخاسرون)۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی آسمانی کتاب کی تلاوت کا واقعاً حق ادا کیا ہے اور وہی ان کی ہدایت کا سبب ہے کیونکہ پیغمبر موعود کے ظہور کی جو بشارتیں انہوں نے ان کتب میں پڑھی تھیں وہ پیغمبر اسلام پر منطبق دیکھیں اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا اور خدا نے بھی ان کی قدردانی کی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **لئن اتبعت اھواءھم**: اس جملے سے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مقام عصمت پر فائز ہونے کے باوجود کیا ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام یہودیوں کی خواہشات کی پیروی کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیات میں ایسی تعبیریں بارہا نظر آتی ہیں اور یہ کسی طرح سے بھی انبیاء کے مقام عصمت کی نفی نہیں کرتیں کیونکہ ایک طرف تو ان میں جملہ شرطیہ ہے اور جملہ شرطیہ شرط کے وقوع کی دلیل نہیں دوسری طرف عصمت انبیاء کو گناہ سے جبراً تو نہیں روکتی بلکہ پیغمبر و امام گناہ پر قدرت رکھتے ہیں اور ارادہ و اختیار کے حامل ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کے دامن گناہ سے کبھی آلودہ نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہے کہ اگر چہ خطاب پیغمبرؐ کو ہے لیکن ہو سکتا ہے مراد سب لوگ ہوں۔

(۲) **دشمن کی رضا کا حصول**: انسان کو چاہیئے کہ وہ پرکشش اخلاق سے دشمنوں کو بھی حق کی دعوت دے لیکن یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن میں کچھ لچک اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کبھی حرف حق قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ایسے لوگوں کی رضا حاصل کرنے کی فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کہا جائے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو جہنم میں جائیں اور ان پر فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

(۳) **ہدایت صرف ہدایت الٰہی ہے**: مندرجہ بالا آیات سے ضمنی طور پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ قانون جو انسان کی سعادت کا سبب بن سکتا ہے فقط قانون و ہدایت الٰہی ہے (ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ) کیونکہ انسان کا علم جتنا بھی ترقی کرے پھر بھی وہ کئی پہلوؤں سے جہالت، شک اور ناپختگی کا حامل ہو گا۔

ایسے ناقص علم کی بنیاد پر جو ہدایت ہو گی وہ کامل نہ ہو سکے گی۔ ہدایت مطلقہ تو اسی کی طرف سے ممکن ہے جو علم مطلق کا حامل ہو اور جہالت و ناپختگی سے ماوراء ہو اور وہ صرف خدا ہے۔



(۱۷) حق تلاوت کیا ہے؟ : یہ بہت ہی پُرمعنی تعبیر ہے جو مندرجہ بالا آیات میں آئی ہے۔ یہ ہمارے لئے قرآن مجید اور دیگر کتب آسمانی کے سلسلے میں واضح راستہ متعین کرتی ہے۔ ان آیات الٰہی کے مفہوم کے ضمن میں مختلف گروہ ہیں۔ ایک گروہ کو پورا اصرار ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ الفاظ و حروف کو صحیح مخارج سے ادا کیا جائے یہ گروہ مضمون اور معانی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا چہ جائیکہ اس پر عمل کی طرف توجہ دے۔ قرآن کے مطابق ایسے لوگوں کی مثال اس جانور کی سی ہے جس پر کتابیں لاد دی جائیں۔

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ط (جمعہ - ۵)

دوسرا گروہ وہ ہے جو الفاظ کی سطح سے کچھ اوپر گیا ہے۔ وہ معانی پر بھی غور کرتا ہے، قرآن کی باریکیوں اور نکات میں فکر کرتا ہے اور اس کے علوم سے آگاہی حاصل کرتا ہے لیکن عمل کے معاملے میں صفر ہے۔

ایک تیسرا گروہ ہے جو حقیقی مومنین پر مشتمل ہے۔ یہ گروہ قرآن کو کتاب عمل اور زندگی کے مکمل پروگرام کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ اس کے الفاظ پڑھنے، اس کے معانی پر فکر کرنے اور اس کے مفاہیم سمجھنے کو عمل کرنے کا مقدمہ اور تمہید سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے لوگ قرآن پڑھتے ہیں تو ان کے بدن میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں نیا عزم، نیا ارادہ، نئی آمادگی اور نئے اعمال پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہے حق تلاوت۔

امام صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک عمدہ حدیث منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

یرتلون اٰیاته ویتفقهون به ویعملون باحکامه ویرجون وعده ویخافون وعیده ویعتبرون بقصصه ویأتمرون باوامره وینتهون بنواهیه ماهو والله حفظ اٰیاته ودرس حروفه وتلاوت سوره ودرس اعشاره واخماسه — حفظوا حروفه واضاعوحدوده وانما هوتدبر اٰیاته والعمل بارکانه قال الله تعالٰی کتاب انزلناه الیك مبارك لیدبروا اٰیاته۔

مقصود یہ ہے کہ وہ اس کی آیات غور سے پڑھیں۔ اس کے حقائق سمجھیں، اس کے احکام پر عمل کریں، اس کے وعدوں کی امید رکھیں اس کی تنبیہوں سے ڈرتے رہیں۔ اس کی داستانوں سے عبرت حاصل کریں، اس کے اوامر کی اطاعت کریں، اس کے نواہی سے بچے رہیں — خدا کی قسم مقصد آیات حفظ کرنا، حروف پڑھنا، سورتوں کی تلاوت کرنا اور اس کے دسویں اور پانچویں حصوں کو یاد کرنا نہیں۔ ان لوگوں نے حروف قرآن تو یاد رکھے مگر اس کی حدود کو پامال کر دیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں غور و فکر کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں۔

۱۲۲۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ



عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○

۱۲۳- وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ
لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۲- اے بنی اسرائیل میں نے تمہیں جو نعمت دی ہے اسے یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی (لیکن تم نے اس مقام سے استفادہ نہیں کیا اور گمراہ ہو گئے)۔

۱۲۳- اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی جگہ پر بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ اس سے کوئی عوض قبول نہ کیا جائے گا، کوئی شفاعت و سفارش اس کے لئے فائدہ مند نہ ہو گی اور نہ ہی کسی طرف سے) ایسے لوگوں کی مدد کی جائے گی۔

تفسیر

قرآن کا روئے سخن پھر بنی اسرائیل کی طرف ہے۔ ان پر جو نعمتیں نازل ہوئیں قرآن ان کا ذکر کرتا ہے خصوصاً وہ فضیلت جو خدا نے ان کے زمانے کے لوگوں پر انہیں عطا کی تھی وہ یاد دلائی گئی ہے۔

فرماتا ہے: اے بنی اسرائیل! ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کیں اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر (اس زمانے میں موجود سب لوگوں پر) فضیلت بخشی (یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم و انی فضلتکم علی العلمین)۔

لیکن کوئی نعمت جواب دہی اور ذمہ داری کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ ہر نعمت عطا کرنے کے بعد خدا کسی ذمہ داری اور کسی عہد و پیمان کا بوجھ انسان کے کندھے پر رکھتا ہے لہذا بعد کی آیت میں تنبیہ کرتا ہے اور کہتا ہے: اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی بجائے جزا کا سامنا نہ ہوگا (واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا) اور کوئی چیز تاوان و فدیہ کے طور پر قبول نہ کی جائے گی (ولا یقبل منها عدل) اور (اذن خدا کے بغیر) کوئی سفارش سود مند نہ ہوگی (ولا تنفعها شفاعة) اگر کچھ کر خدا کے علاوہ وہاں کوئی انسان کی مدد کر سکتا ہے تو یہ غلط فہمی ہے کیونکہ وہاں کسی شخص کی مدد نہ کی جا سکے گی (ولاهم ینصرون) لہذا جنہیں تم نجات کی راہیں سمجھتے ہو وہ سب مسدود ہیں اور شاید دنیا میں تم انہی کا سہارا لیتے ہو۔ صرف اور صرف ایک راستہ کھلا ہے اور وہ ایمان و عمل صالح نیز گناہوں پر توبہ اور اپنی اصلاح کا راستہ ہے۔

چونکہ اس سورہ کی آیہ ۴۷ اور ۴۸ میں بھی بعینہ یہی مسائل بیان ہوئے ہیں (تعبیرات کے کچھ اختلاف کے ساتھ) اور وہاں ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں لہذا یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔



۱۲۴- وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ○

ترجمہ

۱۲۴- (وہ وقت یاد کرو) جب خدانے ابراہیم کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان سے عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے تو خدا نے ان سے کہا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام و رہبر قرار دیا۔ ابراہیم نے کہا: میری نسل اور خاندان میں سے (بھی ائمہ قرار دے)۔ خدانے فرمایا: میرا عہد (مقام امامت) ظالموں کو نہیں پہنچتا (اور تمہاری اولاد میں سے جو پاک اور معصوم ہیں وہی اس مقام کے لائق ہیں)۔

تفسیر

اس آیت سے لے کر آگے تک (بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کا موضوع شروع ہونے تک) اٹھارہ آیات ہیں جن میں خدا کے پیغمبر عظیم اور علمبردار توحید حضرت ابراہیم، خانہ کعبہ کی تعمیر اور توحید و عبادت کے اس مرکز کا تذکرہ ہے۔

دراصل ان آیات کے تین مقاصد ہیں:

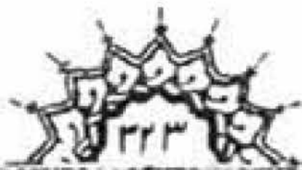
۱- یہ آیات قبلہ کی تبدیلی کے موضوع کے لئے مقدمہ کا کام دیں۔ مسلمان جان لیں کہ یہ کعبہ حضرت ابراہیم پیغمبر بت شکن کی یادگار ہے۔ اگر مشرکوں اور بت پرستوں نے اسے آج بت خانے میں تبدیل کر رکھا ہے تو یہ ایک سطحی آلودگی ہے اس سے کعبہ کے مقام و منزلت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

۲- یہودی اور عیسائی یہ دعوے کرتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم اور ان کے دین کے وارث ہیں۔ یہ آیات (دیگر بہت سی آیات سے مل کر جو یہودیوں کے بارے میں گذر چکی ہیں) واضح کر دیتی ہیں کہ وہ لوگ ابراہیمی آئین سے بیگانہ ہیں۔

۳- مشرکین عرب بھی اپنے اور حضرت ابراہیم کے درمیان اٹوٹ رشتہ بتاتے تھے انہیں بھی یہ سمجھانا مقصود تھا کہ تمہارے اور اس بت شکن پیغمبر کے پروگرام میں کوئی ربط نہیں۔

زیر بحث آیت میں پہلے فرماتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدانے ابراہیم کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں اچھی طرح کامیاب ہوئے (واذ ابتلی ابراهیم ربه بکلمات فاتمهن)۔

یہ آیت حضرت ابراہیم کی زندگی کے اہم ترین موڑ یعنی ان کی بڑی بڑی آزمائشوں اور ان میں ان کی کامیابی کے متعلق گفتگو کرتی ہیں۔ وہ آزمائشیں جنہوں نے ابراہیم کی عظمت، مقام اور شخصیت کو مکمل طور پر نکھار دیا اور ان کی شخصیت کی بلندی کو روشن کر دیا۔ جب ابراہیم ان امتحانات سے کامیاب ہو گئے تو وہ منزل آئی کہ خدا انہیں انعام دے تو فرمایا: میں نے



تمہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیا (قال انی جاعلک للناس اماماً)۔
ابراہیم نے درخواست کی میری اولاد اور خاندان سے بھی آئمہ قرار دے۔ تاکہ یہ رشتۂ نبوت و امامت منقطع نہ ہو اور صرف ایک شخص کے ساتھ قائم نہ رہے (قال و من ذریتی)۔ خدا نے اس کے جواب میں فرمایا: میرا عہد یعنی مقام امامت ظالموں تک ہرگز نہیں پہنچے گا (قال لاینال عہد الظٰلمین)۔ یعنی ہم نے تمہاری درخواست قبول کر لی ہے لیکن تمہاری ذریت میں سے صرف وہ لوگ اس مقام کے لائق ہیں جو پاک اور معصوم ہیں۔

چند اہم نکات

اس آیت میں چند ایسے اہم موضوعات ہیں جن کے بارے میں گہری نظر سے تحقیق کی ضرورت ہے:
(۱) **"کلمات" سے کیا مراد ہے:** آیات قرآن سے اور ابراہیم کے وہ نظر نواز اعمال جن کی خدا نے تعریف کی ہے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلمات (وہ جملے جو خدا نے ابراہیم کو سکھائے) دراصل ذمہ داریوں کا ایک گراں اور مشکل سلسلہ تھا جو خدا نے ابراہیم کے ذمے کیا اور اس مخلص پیغمبر نے انہیں بہترین طریقے سے انجام دیا۔
حضرت ابراہیم کے امتحانات میں یہ امور شامل تھے:
۱۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جانا جہاں کوئی انسان نہ بستا تھا۔
۲۔ بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانا اور فرمان خدا سے اسے قربان کرنے کے لئے پرعزم آمادگی کا مظاہرہ کرنا۔
۳۔ بابل کے بت پرستوں کے مقابلے میں قیام کرنا، بتوں کو توڑنا اور اس تاریخی مقدمے میں پیش ہونا اور نتیجۃً آگ میں پھینکا جانا اور ان تمام مراحل میں اطمینان و ایمان کا ثبوت دینا۔
۴۔ بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا اور اپنی زندگی کے سرائے کو ٹھوکر مارنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا۔
ایسے اور بھی بہت سے امور ہیں۔[1]
یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہت سخت اور مشکل آزمائش تھی لیکن ابراہیم ایمانی قوت کے ذریعے ان تمام میں پورا اترے اور ثابت کیا کہ وہ مقام امامت کی اہلیت رکھتے تھے۔
(۲) **امام کسے کہتے ہیں:** زیر بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جو مقام امامت بخشا گیا وہ مقام نبوت و رسالت سے بالاتر تھا۔ اس کی توضیح کے لئے امامت کے مختلف معانی بیان کئے جاتے ہیں۔
۱۔ امامت کا معنی ہے صرف دنیاوی امور میں لوگوں کی قیادت و پیشوائی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں)۔

---

[1] تفسیر المنار میں ابن عباس کے حوالے سے منقول ہے کہ انہوں نے قرآن کی چار سورتوں کی مختلف آیات میں حضرت ابراہیم کے لئے گئے امتحانات کو شمار کیا ہے جو تیس بنتے ہیں۔ (المنار۔ زیر نظر آیات کے ذیل میں)۔



۲۔ امامت کا معنیٰ ہے امور دین و دنیا میں پیشوائی (اہل سنت ہی میں بعض اس کے قائل ہیں)۔

۳۔ امامت کا معنیٰ ہے دینی پروگراموں کا ثابت ہونا جس میں حدود و احکام الٰہی کے اجراء کے لئے حکومت کا وسیع مفہوم شامل ہے اس طرح ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت و پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔

تیسرے معنیٰ کے لحاظ سے یہ مقام رسالت و نبوت سے بلند تر ہے کیونکہ نبوت و رسالت خدا کی طرف سے خبر دینا، اس کا فرمان پہنچانا اور خوشخبری دینا اور تنبیہ کرنا ہے لیکن منصب امامت میں ان امور کے ساتھ ساتھ اجرائے احکام اور نفوس کی ظاہری و باطنی تربیت بھی شامل ہے (البتہ واضح ہے کہ بہت سے پیغمبر مقام امامت پر بھی فائز تھے)۔ درحقیقت مقام امامت دینی منصوبوں کو عملی شکل دینے کا نام ہے۔ یعنی ایصال الی المطلوب، مقصود تک پہنچانا، اجرائے قوانین الٰہی کے لحاظ سے اور تکوینی ہدایت کے اعتبار سے یعنی تاثیر باطنی اور نفوذ روحانی۔ یہ وہ شارع نور ہے جو انسانی دلوں کو روشنی بخشتی ہے اور انہیں ہدایت کرتی ہے۔

اس لحاظ سے امام بالکل آفتاب کی طرح ہے جو اپنی شعاعوں سے سبزہ زاروں کی پرورش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝

وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ رحمت بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکال لے جائے اور وہ مومنین پر مہربان ہے۔ (احزاب۔ ۴۳)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کی خاص رحمتیں اور فرشتوں کی غیبی امداد مومنین کی تاریکیوں سے نور کی طرف رہبری کرتی ہے۔

یہ بات امام پر صادق آتی ہے۔ امام اور مقام امامت کے حامل عظیم پیغمبر مستعد و آمادہ افراد کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں جہالت و گمراہی سے نکال کر نور و ہدایت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زیر بحث آیت میں امامت کے مذکورہ تیسرے مفہوم ہی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ قرآن کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامت کے مفہوم میں ہدایت بھی شامل ہے۔ جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیت ۲۴ میں ہے:

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ۝

ہم نے انہیں امام بنایا تاکہ ہمارے فرمان کے مطابق ہدایت کریں۔ اس لئے کہ وہ صبر و استقامت رکھتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔

یہ ہدایت اراءۃ الطریق — راستہ دکھانا — کے معنیٰ والی نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم مرحلۂ امامت سے پہلے مقام نبوت و رسالت اور اراءۃ الطریق کے مفہوم کی ہدایت کے منصب پر تو قطعاً و یقیناً فائز تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو منصب امامت سخت آزمائشوں سے گزرنے اور یقین، شجاعت اور استقامت کے مراحل طے کرنے کے بعد حضرت ابراہیم کو عطا ہوا وہ بشارت، ابلاغ اور انذار کے معنیٰ سے ماوراء مقام ہدایت کا حامل ہے۔ لہٰذا وہ ہدایت جو امامت کے مفہوم میں داخل



ہے "ایصال الی المطلوب"، روحِ مذہب کو عملی شکل دینا اور نفوس آمادہ کی تربیت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ان اللہ اتخذ ابراھیم عبداً قبل ان یتخذہ نبیا و ان اللہ اتخذہ نبیاً قبل ان یتخذہ رسولاً و ان اللہ اتخذہ رسولاً قبل ان یتخذہ خلیلاً و ان اللہ اتخذہ خلیلاً قبل ان یتخذہ اماماً فلما جمع الاشیاء قال انی جاعلک للناس اماماً فمن عظمھا فی عین ابراھیم قال ومن ذریتی قال لاینال عھدی الظلمین قال لا یکون السفیہ امام التقی۔

خداوند عالم نے نبی بنانے سے قبل ابراہیمؑ کو عبد قرار دیا اور اللہ نے انہیں رسول بنانے سے پہلے نبی قرار دیا اور انہیں خلیل بنانے سے قبل اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ امام بناتا انہیں اپنا خلیل بنایا جب یہ تمام مقامات و مناصب انہیں حاصل ہو چکے تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بناتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عظیم دیا تو انہوں نے عرض کیا: خدایا میری اولاد سے بھی امام قرار دے۔ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں تک نہ پہنچے گا۔ بے وقوف شخص متقی لوگوں کا امام نہیں ہو سکتا۔[۱]

(iii) نبوت، رسالت اور امامت میں فرق: آیات میں موجود اشارات اور احادیث میں وارد ہونے والی مختلف تعبیرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مامور لوگ مختلف منصبوں پر فائز تھے:

۱۔ مقام نبوت — یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنا۔ لہٰذا نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہو اور جو کچھ وحی کے ذریعے معلوم ہو لوگ چاہیں تو انہیں بتادے۔

۲۔ مقام رسالت — یعنی مقام ابلاغ وحی، تبلیغ و نشر احکام الٰہی اور تعلیم و آگہی سے نفوس کی تربیت۔ لہٰذا رسول وہ ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ماموریت کے خطے میں جستجو اور کوشش کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے اور لوگوں تک اس کا فرمان پہنچائے۔

۳۔ مقام امامت — یعنی رہبری و پیشوائی اور امور مخلوق کی باگ ڈور سنبھالنا۔ درحقیقت امام وہ ہے جو حکومت الٰہی کی تشکیل کے لئے ضروری توانائیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ احکام خدا کو عملاً جاری اور نافذ کر سکے اور اگر فی الوقت باقاعدہ حکومت کی تشکیل ممکن نہ ہو تو جس قدر ہو سکے اجرائے احکام کی کوشش کرے۔

بہ الفاظ دیگر امام کا کام اور ذمہ داری احکام و قوانین الٰہی کا اجراء ہے جب کہ رسول کی ذمہ داری احکام الٰہی کا ابلاغ ہے۔ دو لفظوں میں یوں کہیے کہ رسولؐ کا کام ارائۃ الطریق ہے اور امام کی ذمہ داری ایصال الی المطلوب ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ رسول اسلامؐ کی طرح بہت سے پیغمبر تینوں عہدوں پر فائز تھے۔ وحی وصول کرتے تھے، ابلاغ

---

[۱] اصول کافی، جلد اول، باب طبقات الانبیاء والرسل والائمہ، صفحہ ۱۳۳



خداوندی کی تبلیغ کرتے نیز تشکیلِ حکومت اور اجرائے احکام کی کوشش کرتے اور باطنی طور پر بھی نفوس کی تربیت کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ امامت ہر جہت سے مقامِ رہبری کا نام ہے وہ مادی ہو یا معنوی، جسمانی ہو یا روحانی اور ظاہری یا باطنی۔
امام حکومت کا سربراہ، لوگوں کا پیشوا، مذہبی رہنما، اخلاق کا مربی اور باطنی ہدایت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اپنی مخفی اور معنوی قوت سے امام اہل افراد کی سیرِ تکامل[1] کے لئے باطنی رہبری کرتا ہے، اپنی علمی قدرت کے ذریعے نادان و جاہل افراد کو تعلیم دیتا ہے اور اپنی حکومت کی طاقت سے یا دیگر اجرائی طاقتوں سے اصولِ عدالت کا اجراء کرتا ہے۔

(۶) امامت یا حضرت ابراہیمؑ کی آخری سیرِ تکامل: امامت کی حقیقت کے بارے میں ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخصیت مقامِ تبلیغ و رسالت کی حامل ہو لیکن منصبِ امامت پر فائز نہ ہو۔ کیونکہ اس منصب کے لئے ہر پہلو سے بہت زیادہ اہلیت و لیاقت کی ضرورت ہے اور یہ وہ مقام ہے جسے ابراہیمؑ تمام امتحانات کے بعد حاصل کر سکے اس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امامت حضرت ابراہیمؑ کے لئے سیرِ تکامل کی آخری منزل تھی۔
جو لوگ سمجھتے ہیں کہ امامت کا مطلب ہے کسی شخص کا خود سے اہل اور نمونہ ہونا، تو حضرت ابراہیمؑ مسلماً آغازِ نبوت سے ایسے ہی تھے اور جو سمجھتے ہیں کہ امامت کا مطلب دوسرے کے لئے نمونہ اور ماڈل ہونا ہے تو یہ صفت ابراہیمؑ بلکہ تمام انبیاء و مرسلین میں ابتدائے نبوت سے موجود ہوتی ہے اس لئے تو سب کہتے ہیں کہ پیغمبر کو معصوم ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے اعمال اور کردار دوسروں کے لئے نمونہ قرار پاتے ہیں۔
اس سے ظاہر ہوا کہ مقامِ امامت ان چیزوں سے کہیں بلند ہے یہاں تک کہ نبوت و رسالت سے بھی بالاتر ہے اور یہ وہ مقام و منصب ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اس کی اہلیت کا امتحان دینے کے بعد بارگاہِ الٰہی سے حاصل کیا۔
زیرِ بحث آیت کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جو ہماری بات پر شاہد ہیں:

۱۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

اور ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ (انبیاء۔ ٧٣)

۲۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۔۔۔

جب انہوں نے استقامت دکھائی تو ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ (سجدہ۔ ٢٤)

پہلی آیت جو بعض انبیاء و مرسلین کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور دوسری جس میں بنی اسرائیل کے کچھ انبیاء کا ذکر ہے نشاندہی کرتی ہیں کہ امامت کا تعلق ہمیشہ سے ایک خاص قسم کی ہدایت سے رہا ہے جو فرمانِ خدا کے مطابق ہے۔

(۷) ظلم کسے کہتے ہیں؟: "لاینال عهدی الظالمین" میں جس ظلم کا ذکر ہے وہ فقط دوسروں پر ظلم ڈھانا نہیں

---

[1] سیرِ تکامل: ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ اس سفر کو اصطلاح میں سیرِ تکامل کہتے ہیں۔ (مترجم)



بلکہ یہاں ظلم کا تذکرہ عدل کے مقابلے میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔
عدالت کا حقیقی معنی ہے "ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا" اس بنا پر ظلم کا مفہوم یہ ہوگا: کسی شخص یا چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جس کے وہ اہل نہیں ہے۔"

لہٰذا ذمہ داری اور عظمت کے لحاظ سے امامت اور مخلوق کی ظاہری و باطنی رہبری ایک بہت بڑا مقام ہے۔ ایک لمحہ کا گناہ اور نافرمانی بلکہ سابقہ غلطی بھی اس مقام کی اہلیت چھن جانے کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ سے مروی احادیث میں حضرت علیؑ کے لئے رسولِ اسلام کے خلیفۂ بلافصل ہونے کے ثبوت میں محل بحث آیت سے استدلال کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ دوسرے لوگ تو زمانۂ جاہلیت میں بت پرست تھے مگر وہ شخص جس نے آن واحد کے لئے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا وہ صرف حضرت علیؑ تھے۔ مثلاً:

۱۔ ہشام بن سالم امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

قد کان ابراھیم نبیا ولیس بامام حتی قال اللہ انی جاعلك للناس اماما فقال و من ذریتی قال لاینال عھدی الظالمین من عبد صنما او وثنا لایکون اماما۔

منصب امامت پر فائز ہونے سے پہلے حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے فرمایا: میں تجھے انسانوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا: میری اولاد میں سے بھی امام قرار دے۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا جنہوں نے بتوں کی پرستش کی ہے وہ امام نہیں ہو سکتے۔[1]

۲۔ ایک اور حدیث عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

خداوند عالم نے ابراہیمؑ سے فرمایا:

لا اعطیك عھدا للظالم من ذریتك قال یارب ومن الظالم من ولدی الذی لا ینال عھدك قال من سجد لصنم من دونی لا اجعلہ اماما ابدا ولا یصلح ان یکون اماما۔

میں امامت کا عہدہ تیری اولاد میں سے ظالموں کو نہیں بخشوں گا۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا: وہ ظالم کہ جن تک یہ منصب نہیں پہنچ سکتا کون ہیں؟ خدا نے فرمایا: وہ شخص ظالم ہے جس نے بت کو سجدہ کیا ہو۔ میں ایسے کو ہرگز امام نہیں بناؤں گا۔ اور نہ ہی وہ امام بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔[2]

(۶) امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیئے: زیر بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام (ہر لحاظ سے لوگوں کے رہبر کے مفہوم کے اعتبار سے) خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیئے۔ کیونکہ امامت ایک قسم کا خدائی عہد

---

[1] اصول کافی، ج ۱، باب طبقات الانبیاء والرسل، حدیث ۱

[2] امالی از شیخ مفید و مناقب ابن مغازلی (جیسا کہ تفسیر المیزان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے)۔



پیمان ہے اور واضح ہے کہ جسے خدا معین کرے گا اس پیمان کے ایک طرف خود خدا ہوگا۔

یہ بھی ظاہر ہوا کہ جن لوگوں کے ہاتھ ظلم و ستم سے رنگے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں کہیں ظلم کا نشان موجود ہے۔ چاہے اپنے اوپر ظلم ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ ایک لمحے کے لئے بت پرستی کی ہو وہ امامت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اصطلاح میں کہتے ہیں کہ امام کو اپنی تمام زندگی میں معصوم ہونا چاہیئے۔

کیا خدا کے سوا کوئی صفت عصمت سے آگاہ ہوسکتا ہے:۔

اگر اس معیار پر جانشین پیغمبرؐ تعین کیا جائے تو حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا۔

تعجب کی بات ہے کہ المنار کے مؤلف نے حضرت ابو حنیفہ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت منحصراً اولادِ علیؑ کے شایانِ شان ہے، اسی بناء پر وہ حاکم وقت (منصور عباسی) کے خلاف تظاہرات کو جائز سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے خلفائے بنی عباس کی حکومت میں انہوں نے منصب قضاوت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ المنار کا مؤلف اس کے بعد مزید لکھتا ہے کہ آئمہ اربع سب کے سب اپنے وقت کی حکومتوں کے مخالف تھے اور انہیں مسلمانوں کی حکمرانی کے لئے اہل نہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ ظالم و ستمگر تھے۔[1]

لیکن یہ بات باعث تعجب ہے کہ ہمارے زمانے میں بہت سے علماء اہل سنت ظالم و جابر اور خودسر حکومتوں کی تائید کرتے ہیں اور انہیں تقویت پہنچاتے ہیں جب کہ یہ سب پر آشکار ہے کہ ان حکومتوں کے روابط ان دشمنانِ اسلام سے ہیں جن کا ظلم و فساد کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صرف اتنی سی بات نہیں بلکہ انہیں اولوالامر اور واجب الاطاعت سمجھتے ہیں۔

(۷) دو سوال اور ان کا جواب:۔

۱۔ امامت کے مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امام کا کام ایصال الی المطلوب اور الٰہی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے پھر اس مفہوم نے بہت سے انبیاء یہاں تک کہ سرکار رسالتؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے ہاتھوں عملی شکل تو اختیار نہیں کی بلکہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ گناہگار اور گمراہ لوگ برسر اقتدار رہے۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ امام مجبور کرکے لوگوں کو حق تک پہنچاتا ہے بلکہ اپنے اختیار، آمادگی اور اہلیت سے لوگ امام کے ظاہری و باطنی کمالات سے ہدایت حاصل کرتے ہیں یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ آفتاب زندہ موجودات کی نشوونما کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا یہ کہ بارش کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہے یہ مسلم ہے کہ یہ تاثیر عمومی پہلو رکھتی ہے لیکن صرف ان موجودات کے لئے جو یہ اثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ اور نشوونما حاصل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تفسیر امامت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر امام پہلے نبی اور رسول ہو اس کے بعد مقام امامت پر فائز ہو جب کہ جناب رسالت مآبؐ کے معصوم جانشین تو ایسے نہ تھے۔

---

[1] المنار، ج ۱، ص ۴۵۷، ص ۴۵۸



اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ امام پہلے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہو بلکہ اگر امام سے پہلے کوئی شخصیت نبوت، رسالت اور امامت تمام مناصب کی حامل ہو (جیسا کہ پیغمبر اسلام تھے) تو اس کا جانشین منصب امامت میں اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی جاری رکھ سکتا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ جب نئی رسالت کی ضرورت نہ ہو جیسا کہ پیغمبر اسلام کے بعد کیونکہ وہ خاتم انبیاء ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وحی الٰہی کے نزول کا مرحلہ اور تمام احکام کا ابلاغ انجام کو پہنچ چکا ہو اور صرف نفاذ کی منزل باقی ہو تو جانشین پیغمبر اجرائے احکام کا کام جاری رکھ سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں کہ وہ خود نبی یا رسول ہو۔[1]

(viii) **حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی عظیم شخصیت:** حضرت ابراہیمؑ کا نام قرآن مجید میں ۶۹ مقامات پر آیا ہے اور ۲۵ سورتوں میں ان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ قرآن میں اس عظیم پیغمبر کی بہت مدح و ثناء کی گئی ہے اور ان کی بلند صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کی ذات ہر لحاظ سے راہنما اور اسوۂ ہے اور وہ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے۔

خدا کے بارے میں ان کی معرفت، بت پرستوں کے بارے میں ان کی منطق، جابر و قاہر بادشاہوں کے سامنے ان کا انتھک جہاد، حکم خدا کے سامنے ان کا ایثار اور قربانیاں، طوفانی حوادث اور سخت آزمائشوں میں ان کی بے نظیر استقامت، صبر اور حوصلہ اور ان جیسے دیگر امور — ان میں سے ہر ایک مفصل داستان ہے اور ان میں مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے۔

قرآنی ارشادات کے مطابق وہ ایک نیک اور صالح،[2] فروتنی کرنے والے،[3] صدیق،[4] بردبار[5] اور ایفائے عہد کرنے والے[6] تھے۔ وہ ایک بے مثال شجاع اور بہادر تھے۔ بہت زیادہ سخی تھے۔ سورۂ ابراہیمؑ کی تفسیر میں، خاص طور پر اس کے آخری حصے میں انشاء اللہ آپ اس سلسلے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

۱۲۵۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

ترجمہ

۱۲۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لوٹ آنے کا مقام، مرکز اور جائے امن قرار دیا اور (اسی مقصد کی تمہید کے لئے) مقام ابراہیم کو اپنے لئے مقام نماز کی حیثیت سے انتخاب کرو۔ نیز ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ

---

[1] بعض لوگ درجہ بدرجہ مراحل طے کرتے ہیں مثلاً پہلے انہیں چھوٹے عہدوں پر لگایا جاتا ہے تاکہ تجربات و امتحانات کے بعد وہ بڑے عہدوں تک پہنچیں لیکن کبھی ایسے ذی استعداد لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کی صلاحیت و استعداد کو دیکھتے ہوئے انہیں بلند ترین منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ (مترجم)

[2] ص۔ ۴۷ [3] نحل۔ ۱۲۲ [4] نحل۔ ۱۲۰ [5] مریم۔ ۴۱ [6] توبہ۔ ۱۱۴



کو حکم دیا کہ میرے گھر کا طواف کرنے والوں، اس گھر کے خادموں، اور اس میں سجدہ کرنے والوں (نمازگزاروں) کے لئے اسے پاک و پاکیزہ رکھو۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیم کے مقام بلند کا ذکر تھا۔ اب خانہ کعبہ کی عظمت کا تذکرہ ہے جو انہی کے ہاتھوں تعمیر اور تیار ہوا۔ فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مثابہ (لوگوں کے پلٹ آنے کا مقام اور توجہ کا مرکز) اور مقام امن و امان قرار دیا (واذ جعلنا البیت مثابة للناس و امنا)۔

مثابہ اصل میں ثوب سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ آنا۔ چونکہ خانہ کعبہ موحدین کا مرکز تھا، وہ ہر سال اس کی طرف آتے تھے جہاں وہ فقط جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی توحید اور فطرتِ اوّل کی طرف پلٹتے تھے اس لئے کعبہ کو مثابہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز انسان کا گھر ہمیشہ اس کی بازگشت کا مرکز اور آرام و آسائش کا مقام ہوتا ہے۔ لفظ مثابہ میں ایک قسم کا قلبی آرام و آسائش کا مفہوم بھی داخل ہے۔ لفظ "امنا" جو اس کے بعد آیا ہے اس مفہوم کی تاکید کرتا ہے۔ خصوصاً لفظ "للناس" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مرکز امن و امان تمام جہانوں کے لئے ایک عمومی پناہ گاہ ہے۔ یہ درحقیقت حضرت ابراہیم کی ایک درخواست کی قبولیت کا اظہار ہے جو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں کی تھی جیسا کہ اگلی آیت میں آئے گا (رب اجعل ھذا بلدا امنا پروردگارا! اس جگہ کو محل امن و امان قرار دے)۔

اس کے بعد فرمایا: مقام ابراہیم کو اپنی نماز کی جگہ کے طور پر انتخاب کرو (واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّی)۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ مقام ابراہیم سے کون سی جگہ مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے تمام حج مقام ابراہیم ہے۔ بعض عرفہ، مشعر الحرام اور تینوں جمرات کو مقام کا نام دیتے ہیں۔ بعض تمام حرم مکہ کو مقام ابراہیم شمار کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر آیت، روایات اسلامی اور بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق یہ اس مشہور مقام ابراہیم کی طرف اشارہ ہے جو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک جگہ ہے جس کے پاس طواف کے بعد جا کر حجاج نمازِ طواف بجا لاتے ہیں۔ اس بناء پر مصلی سے مراد بھی یہی مقام نماز ہے۔

اس کے بعد اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ سے خانہ کعبہ کی طہارت کے بارے میں لیا گیا تھا۔ فرمایا: ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا اور انہیں وصیت کی کہ میرے گھر کو اس کا طواف کرنے والوں، اس کے پڑوس میں رہنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں (نمازگزاروں) کے لئے پاک رکھو (وعھدنا الی ابراھیم و اسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین و العٰکفین و الرکع السجود)۔

یہاں طہارت و پاکیزگی سے کیا مراد ہے۔ اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں بتوں کی پلیدگی سے پاک کرنا مقصود ہے۔ بعض کہتے ہیں ظاہری نجاستوں سے پاک رکھنا مراد ہے، خصوصاً خون اور قربانی کے جانوروں کی اندرونی غلاظتوں سے کیونکہ بعض جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں طہارت کا معنی خانہ توحید کی تعمیر کے وقت خلوص نیت ہے۔ لیکن چونکہ کوئی دلیل



موجود نہیں جس کی بنا پر یہاں طہارت کے مفہوم کو کسی ایک چیز میں محدود کریں لہٰذا یہاں خانہ توحید کو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگیوں سے پاک رکھنا مراد لیا جانا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کے حوالے سے خانۂ خدا کو مشرکین سے پاک رکھنے کا حکم ہے اور بعض میں بدن کی صفائی اور اسے آلودگیوں سے پاک رکھنا مراد لیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) امن و امان کی اس پناہ گاہ کے اجتماعی اور تربیتی اثرات: مندرجہ بالا آیت کے مطابق خانہ خدا (خانہ کعبہ) کا تعارف خدا کی طرف سے ایک پناہ گاہ اور مرکز امن و امان کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس سرزمین مقدس میں ہر قسم کے نزاع و کشمکش، جنگ و جدل اور خونریزی کے بارے میں اسلام میں نہایت سخت احکام موجود ہیں۔ ان احکام کے مطابق نہ صرف انسان چاہے وہ کسی طبقے سے ہوں اور کسی حالت میں ہوں یہاں امن میں رہیں بلکہ جانور اور پرندے بھی امن و امان میں رہیں اور کوئی بھی ان سے متعرض نہ ہو۔

وہ دنیا جہاں ہمیشہ نزاع اور کشمکش رہتی ہے وہاں ایک ایسے مرکز کا قیام لوگوں کی مشکلات حل کرنے کے لئے ایک اہم کردار ادا کرنے کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اس خطے کا جائے امن ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ لوگ تمام اختلافات کے باوجود اس کے جوار میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ سکیں ایک دوسرے سے مذاکرات کر سکیں اور اس طرح اہم ترین مسائل حل کر سکیں۔ دشمنیوں اور جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے اس طرح سے مذاکرات کا دروازہ کھولا گیا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ جھگڑنے والے طرفین یا ایک دوسرے کی مخالف حکومتیں چاہتی ہیں کہ جھگڑا ختم کریں اور اس مقصد کے لئے مذاکرات کریں لیکن انہیں کوئی ایسا مشترکہ پلیٹ فارم نظر نہیں آتا جو دونوں کے لئے مقدس و محترم ہو اور مرکز امن و امان ہو لیکن اسلام اور بعض گذشتہ آسمانی مذاہب میں اس کی پیش بندی کی گئی ہے۔ اسلام میں مکہ کو ایسے ہی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

اس وقت مسلمان جن جان لیوا کشمکشوں اور اختلافات میں مبتلا ہیں اس سرزمین کے تقدس اور امنیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذاکرات کا دروازہ کھول سکتے ہیں اور یہ مقام مقدس جو دلوں میں خاص قسم کی نورانیت اور روحانیت پیدا کرتا ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں کیا جا رہا۔[1]

(۲) خانۂ خدا کا نام: مندرجہ بالا آیت میں خانہ کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر واضح ہے کہ خداوند عالم جسم رکھتا ہے اور نہ اسے گھر کی ضرورت ہے۔ اس اضافت اور نسبت سے مراد نسبت اعزازی ہے۔ کسی چیز کے بزرگی اور عظمت کو بیان کرنے کے لئے اسے خدا سے منسوب کیا جاتا ہے اسی معنی میں ماہ رمضان کو شہر اللہ اور خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔

۱۲۶۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ

---

[1] سرزمین مکہ کے جائے امن ہونے کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دہم (سورہ ابراہیم، آیہ ۳۵ کے ذیل) میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔



الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۱۲۶۔ (اور یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیمؑ نے عرض کیا: پروردگارا! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں (قسم قسم کے) میووں سے روزی دے۔ (ہم نے ابراہیم کی اس دعا کو قبول کیا۔ اور مومنین کو انواع و اقسام کی برکات سے بہرہ ور کیا) کہا وہ جو کافر ہو گئے تھے انہیں تھوڑا سا فائدہ دیں گے پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف کھینچ کے لے جائیں گے اور ان کا انجام کتنا برا ہے۔

تفسیر

بارگاہ خدا میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواستیں

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے اس مقدس سرزمین کے رہنے والوں کے لئے پروردگار سے دو اہم درخواستیں کی ہیں۔ ایک کی طرف گذشتہ آیت کے ذیل میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

قرآن کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے عرض کیا پروردگارا! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے (واذ قال ابراهيم رب اجعل هٰذا بلدا امنا)۔

جیسا کہ گذشتہ آیت میں ہے کہ ابراہیمؑ کی یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں اور خدا نے اس مقدس سرزمین کو امن و امان کا ایک مرکز بنایا اور اسے ظاہری و باطنی طور پر سلامتی بخشی۔

ان کی دوسری درخواست یہ تھی کہ اس سرزمین کے رہنے والوں کو جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں طرح طرح کے ثمرات سے نوازا (وارزق اهله من الثمرات من امن منهم بالله واليوم الاخر)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ابراہیمؑ پہلے امنیت کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے بعد اقتصادی عنایات کی درخواست کرتے ہیں یہ بات اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب تک کسی شہر یا ملک میں امن و سلامتی کا دور دورہ نہ ہو کسی ستھرے اور صحیح اقتصادی ماحول کا امکان نہیں ہو سکتا۔

ثمرات سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن ظاہراً ثمرات ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں ہر قسم کی مادی نعمات شامل ہیں۔ چاہے وہ پھل ہوں یا دیگر غذائی چیزیں بلکہ کئی ایک روایات کے مطابق تو اس کے مفہوم میں معنوی نعمات بھی شامل ہیں۔



امام صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ھی ثمرات القلوب

اس سے مراد دلوں کے میوے ہیں۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پروردگار اس سرزمین کے رہنے والوں کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ تقاضا صرف ان کے لئے کیا ہے جو توحید اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جملہ لاینال عھدی الظالمین (جو گذشتہ آیات میں گذر چکا ہے) سے شاید وہ یہ حقیقت جان چکے تھے کہ ان کی آنے والی نسلوں میں سے کچھ لوگ شرک اور ظلم و ستم کی راہ اختیار کریں گے لہٰذا بارگاہِ الٰہی میں ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنی دعا سے مستثنیٰ رکھا۔

لیکن — تعجب کی بات ہے کہ ابراہیمؑ کے اس تقاضے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہم انہیں ان ثمرات میں سے تھوڑا سا حصہ دیں گے مگر انہیں بالکل محروم نہیں کیا جائے گا (قال و من کفر فامتعہ قلیلا)۔ آخرت میں انہیں عذاب جہنم کی طرف کھینچ کر لے جایا جائیگا اور یہ کیسا برا انجام ہے (ثم اضطرہ الٰی عذاب النار و بئس المصیر)۔

حقیقت میں یہ پروردگار کی صفت رحمانیت یعنی رحمت عامہ ہے۔ اس کی نعمت کے وسیع دسترخوان اور خزانۂ غیب سے یہودی اور عیسائی بھی استفادہ کرتے ہیں لیکن آخرت کا گھر جو رحمتِ خاص کا گھر ہے وہاں ان کے لئے رحمت اور نجات نہیں ہے۔

۱۲۷۔ وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

۱۲۸۔ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

۱۲۹۔ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ ۱۵

ترجمہ

۱۲۷۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (اور کہتے تھے) اے ہمارے



پروردگارا! تو ہم سے قبول فرما کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۲۸۔ پروردگارا! ہمیں اپنے فرمان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے والا قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایسی امت بنا جو تیرے حضور سرِتسلیم خم کرنے والی ہو ہمیں اپنی عبادت کا راستہ دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو تواب اور رحیم ہے۔

۱۲۹۔ پروردگارا! ان کے درمیان انہی میں سے ایک نبی مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے۔ کیونکہ تو توانا اور حکیم ہے (اور تو اس کام پر قدرت رکھتا ہے)۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو

قرآن کی مختلف آیات، احادیث اور تواریخ اسلامی سے واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بلکہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں موجود تھا کیونکہ سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۷ میں حضرت ابراہیم جیسے عظیم پیغمبر کی زبانی یوں آیا ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ

پروردگارا! میں اپنی ذریت میں سے (بعض کو) اس بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسا رہا ہوں۔

یہ آیت واضح طور پر گواہی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے شیرخوار بیٹے اسماعیلؑ اور اپنی زوجہ کے ساتھ سرزمین مکہ میں آئے تو خانہ کعبہ کے آثار موجود تھے۔

سورہ آل عمران کی آیہ ۹۶ میں بھی ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا ۔

پہلا گھر جو عبادت خدا کی خاطر انسانوں کے لیے بنایا گیا وہ سرزمین مکہ میں تھا۔

یہ مسلم ہے کہ عبادت خدا اور مرکز عبادت کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے نہیں پڑی بلکہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

اتفاقاً زیر بحث آیت کی تعبیر بھی اسی معنی کو تقویت دیتی ہے۔ فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ (جب اسماعیل کچھ بڑے ہو گئے تو) خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے اور کہتے تھے پروردگارا! ہم سے قبول فرما تو سننے والا اور جاننے والا ہے (واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم)۔

آیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس کے ستون بلند کر رہے تھے۔

نہج البلاغہ کے مشہور خطبہ قاصعہ میں بھی ہے:

الا ترون ان اللہ سبحانہ اختبر الاولین من لدن اٰدم الی الاخرین من ھذا العالم



باحجار.... فجعلها بيته الحرام ثم امر آدم وولد ان يثنو اعطا فهم نحوه....

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے آدم سے لے کر آج تک کچھ پتھروں کے ذریعے امتحان لیا... (وہ پتھر کہ) جنہیں اپنا محترم گھر قرار دیا پھر آدم اور اولاد آدم کو حکم دیا کہ اس کے گرد طواف کریں[1]

مختصر یہ کہ آیات قرآن اور روایات تاریخ کی اس مشہور بات کی تائید کرتی ہیں کہ خانہ کعبہ پہلے پہل حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بنا۔ پھر طوفان نوحؑ میں گر گیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں اس کی تعمیر نو ہوئی[2]

حضرت ابراہیمؑ کی کچھ مزید دعائیں

زیر نظر دو آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ خدا سے پانچ اہم درخواستیں کرتے ہیں۔ یہ التجائیں جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی گئیں اس قدر فکر انگیز اور معنوی و مادی زندگی کی ضروریات کی جامع ہیں کہ انسان کو خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کی روحانی عظمت سے آشنا کر دیتی ہیں۔

پہلے عرض کرتے ہیں: پروردگارا! ہمیں ہماری ساری زندگی میں اپنے فرمان کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والا قرار دے (ربنا واجعلنا مسلمين لك)۔

پھر تقاضا کرتے ہیں: ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان امت قرار دے جو تیرے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والی ہو (ومن ذريتنا امة مسلمة لك)۔

پھر درخواست کرتے ہیں: اپنی پرستش و عبادت کی راہیں دکھا اور ہمیں اس سے آگاہ فرما (وارنا مناسكنا)۔

پھر خدا کے حضور توبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہماری توبہ قبول کرلے اور اپنی رحمت کا رخ ہماری طرف فرما کہ تو تواب اور رحیم ہے (وتب علينا انك انت التواب الرحيم)۔

اس کے بعد دعا کرتے ہیں: پروردگارا! انہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما (ربنا وابعث فيهم رسولا منهم) تاکہ وہ تیری آیات ان کے سامنے پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے (يتلوا عليهم اياتك ويعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم)۔ یقیناً تو توانا اور حکیم ہے اور ان تمام کاموں کی قدرت رکھتا ہے (انك انت العزيز الحكيم)۔

---

[1] یعنی اسے اپنی توجہات کا مرکز قرار دیں۔ (مترجم)

[2] المنار کے مؤلف نے اس بات سے انکار کیا ہے۔ اس کے نزدیک خانہ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہ فقط یہ کہ روایات و تاریخ سے میل نہیں کھاتی بلکہ خود آیات قرآن سے بھی موافقت نہیں رکھتی۔



چند اہم نکات

(۱) انبیاء کی غرض بعثت : مندرجہ بالا آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے پیغمبر اسلام کے ظہور کی دعا کے ساتھ ان کی بعثت کے تین مقاصد بیان کئے ہیں :

۱۔ پہلا مقصد لوگوں کے سامنے آیات خدا کی تلاوت ہے۔ یہ دراصل ان آیات کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہ آیات عمدہ، جاذب نظر اور دلوں کو بھانے والی ہیں اور وحی کی صورت میں قلب پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں۔ تلاوت کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر ان آیات کے ذریعے خوابیدہ نفوس کو بیدار کرے۔ آیت میں لفظ "یتلوا" استعمال ہوا ہے جس کا مادہ تلاوت سے ہے۔ اس کا لغوی معنیٰ ہے پے درپے لانا۔ جب عبارتوں کو ایک دوسرے کے بعد اور صحیح نظم و ترتیب سے پڑھیں تو عرب اسے تلاوت کہتے ہیں۔ لہٰذا منظم و پے درپے تلاوت دراصل تعلیم و تربیت کے لئے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد تعلیم کتاب و حکمت شمار کیا گیا ہے کیونکہ علم و آگاہی کے بغیر تربیت ممکن نہیں تربیت دراصل تیسرا مرحلہ ہے۔ کتاب و حکمت میں اس لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد آسمانی کتاب ہو اور حکمت سے مراد وہ علوم، اسرار و علل اور مقاصد احکام ہوں جن کی پیغمبر کی طرف سے تعلیم دی جاتی ہے۔

۳۔ تیسرا مقصد تزکیہ بیان کیا گیا ہے۔ تزکیہ کا معنیٰ لغت میں نشوونما بھی بیان کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ انسانی علوم محدود ہیں اور ان میں بھی ہزاروں ابہام اور خطائیں موجود ہیں۔ انسان جو کچھ جانتا ہے اس کی صحت کا کامل یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے پیشتر اپنے علوم کی غلطیاں دیکھ چکا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ پیغمبران خدا صحیح علوم جو ہر قسم کی غلطی سے مبرا ہو مبداء وحی سے حاصل کرکے لوگوں کے درمیان تشریف لائیں تاکہ لوگوں کی غلطیوں کا ازالہ کریں اور جو باتیں انہیں معلوم نہیں ان کی انہیں تعلیم دیں اور جو کچھ وہ جانتے ہیں اس کے بارے میں انہیں اطمینان دلائیں۔

دوسری بات جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ ہماری نصف شخصیت کی تشکیل عقل و خرد سے ہوتی ہے اور نصف شخصیت طبائع، میلانات اور خواہشات سے بنتی ہے۔ اس لئے ہمیں جتنی تعلیم کی ضرورت ہے اتنی ہی تربیت کی احتیاج ہے ہماری عقل و خرد کو بھی تکامل و ترقی کی ضرورت ہے اور ہمارے باطنی طبائع کو بھی صحیح تربیت و پرورش کے لئے رہبری کی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر معلم بھی ہیں اور مربی بھی، تعلیم دینا بھی انہی کا کام ہے اور تربیت کرنا بھی۔

(۲) تعلیم مقدم ہے یا تربیت : یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن میں چار مقامات پر انبیاء کی غرض بعثت کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے تین مقامات پر تربیت تعلیم سے مقدم ہے[1] اور صرف ایک جگہ

---

[1] بقرہ آیہ ۱۵۱، آل عمران آیہ ۱۶۴، جمعہ آیہ ۲۔



(زیر بحث آیت میں) تعلیم کا ذکر تربیت پر مقدم ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عموماً جب تک تعلیم نہ ہو تربیت نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جہاں تعلیم تربیت سے مقدم ہے وہاں تو اس کی وضع طبیعی کی طرف اشارہ ہے لیکن زیادہ تر مقامات جہاں تربیت مقدم ہے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ غرض و مقصد تربیت ہے کیونکہ ہدف اور حقیقی مقصد تربیت ہے اور باقی سب مقدمات ہیں۔

(iii) پیغمبر انہی میں سے ہو: مندرجہ بالا آیت میں لفظ "منھم" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انواع انسانی کے رہبر اور مربی کے لئے ضروری ہے کہ اسی کی نوع و جنس سے ہو۔ انہی صفات اور بشری طبائع کا حامل ہو تاکہ وہ عملی پہلوؤں سے ان کے لئے بہترین نمونہ بن سکے کیونکہ واضح ہے کہ اگر ان کی نوع و جنس سے نہ ہو تو نہ وہ ان کی ضروریات، تکالیف مشکلات اور انسانوں کے مختلف مسائل کو سمجھ پائے گا اور نہ ہی انسان اسے اپنے لئے نمونہ بنا سکیں گے۔

۱۳۰- وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

۱۳۱- اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

۱۳۲- وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ؕ

ترجمہ

۱۳۰- نادان و بیوقوف لوگوں کے سوا کون شخص (اس پاکیزگی اور روشنی کے باوجود) دین ابراہیم سے روگردانی کرے گا۔ اس دنیا میں ہم نے انہیں منتخب کیا ہے اور دوسرے جہان میں بھی وہ صالحین میں سے ہیں۔

۱۳۱- (یاد کرو وہ وقت) جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا اسلام لے آؤ (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو) تو انہوں نے پروردگار کے فرمان کو دل و جان سے قبول کر لیا اور) کہا میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

۱۳۲- ابراہیم اور یعقوب نے (اپنی عمر کے آخری اوقات میں) اپنے بیٹوں کو اس دین کی وصیت کی (اور ہر ایک نے اپنے فرزندوں سے کہا) اے میرے بیٹو! خدا نے اس آئین پاک کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور تم دین اسلام کے علاوہ کسی پر نہ مرنا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا کچھ تعارف کرایا گیا ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ کی بعض خدمات اور کچھ درخواستیں جو مادی و معنوی پہلوؤں کی جامع تھیں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تمام ابحاث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ



حضرت ابراہیم اس قابل ہیں کہ عالمین کے تمام طالبانِ حق انہیں اپنے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیں۔ چاہیے کہ ان کے مکتب کو ایک انسان ساز مکتب تسلیم کرکے اس سے استفادہ کیا جائے۔ اسی بنیاد پر زیر نظر آیات میں گفتگو اس طرح سے آگے بڑھتی ہے: احمق و نادان افراد کے سوا کون شخص ابراہیم کے آئینِ پاک سے روگردانی کرے گا۔ (ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ)۔

کیا یہ حماقت اور بیوقوفی نہیں کہ انسان اس پاک و روشن دین کو چھوڑ دے اور کفر اور شرک اور فساد کی گمراہیوں میں جا پڑے۔ وہ آئین جو انسان کی رُوح و فطرت سے آشنا و سازگار ہو اور عقل و خرد سے ہم آہنگ ہو اور وہ آئین جس میں آخرت بھی ہو اور دنیا بھی اسے چھوڑ کر ایسے **منصوبوں** کے پیچھے لگنا جو دشمنِ عقل، مخالفِ فطرت اور دین و دنیا کی تباہی کا باعث ہوں حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

مزید فرمایا: ہم نے دنیا میں ابراہیم کو (ان عظیم خصوصیات و امتیازات کی بنا پر) منتخب کیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا (ولقد اصطفینٰہ فی الدنیا وانہ فی الاٰخرۃ لمن الصٰلحین)۔

ابراہیم خدا کے چنے ہوئے اور صالحین کے سردار ہیں۔ اسی بناء پر انہیں اسوہ و نمونہ قرار دیا جانا چاہیئے۔ بعد کی آیت میں اسی مفہوم پر تاکید کرتے ہوئے ابراہیم کی برگزیدہ صفات میں سے ایک خصوصیت جو حقیقت میں ان تمام صفات کی بنیاد ہے کا تذکرہ کیا گیا ہے، یاد کرو اس وقت کو جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ ہمارے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ انہوں نے کہا میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوں (اذقال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العٰلمین)۔

ہاں وہ ابراہیم جو فداکاری کا سراپا اور ایثار کا پتلا ہے جب اپنے ہی اندر سے آوازِ فطرت سنتا ہے کہ پروردگار اس سے فرما رہا ہے کہ سرِ تسلیم خم کرو تو وہ کاملاً سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ ابراہیم اپنی فکر و ادراک سے سمجھتے اور دیکھتے ہیں کہ ستارے، آفتاب اور ماہتاب سب نکلتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں اور قانونِ آفرینش کے تابع ہیں لہٰذا کہتے ہیں کہ یہ میرے خدا نہیں ہیں۔

> اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ
>
> میں نے اپنا رخ خدا کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدے کی راہ میں اپنے تئیں خالص کر دیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (انعام - ۷۹)

گذشتہ آیات میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل جب خانہ کعبہ تعمیر کر چکے تو قبولیتِ اعمال کی دعا کے بعد جو پہلی درخواست کی وہ یہ تھی کہ واقعاً وہ فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم ہوں اور ان کی اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھ کھڑی ہو۔ درحقیقت نوعِ انسانی بلکہ تمام مخلوق میں پہلی بات جو کسی کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے وہ خلوص اور پاکیزگی ہے۔ اسی لئے جب حضرت ابراہیم نے کاملاً اپنے تئیں فرمانِ حق کے سامنے سرنگوں کر لیا تو محبوبِ خدا ہو گئے اور خدا نے انہیں چن لیا اور اسی عنوان سے ان کا اور ان کے مکتب کا تعارف کرایا۔ حضرت ابراہیم نے آغازِ زندگی سے آخر



تک ایسے ایسے کام کئے ہیں جو کم نظیر ہیں بلکہ بعض تو بے نظیر ہیں۔ بت پرستوں اور ستارہ پرستوں سے ان کا لاجواب جہاد اور ان کا آگ میں کود جانا کہ جس سے ان کا سخت ترین دشمن نمرود تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بے اختیار بول اٹھا:

من اتخذ الٰھا فلیتخذ الٰھا مثل الٰہ ابراھیم

اگر کوئی خدا کا انتخاب کرنا چاہے تو وہ ابراہیم کے خدا جیسا خدا منتخب کرے[1]

اسی طرح بیوی اور شیر خوار بچے کو اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں سرزمینِ مقدس میں لاکر چھوڑ دینا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اپنے جوان بیٹے کو قربان گاہ پرلے جانا ان میں سے ہر امر حضرت ابراہیم کی راہ و روش کو جاننے کے لئے ایک نمونہ ہے۔

جو وصیت اور نصیحت آپ نے اپنی آخری عمر میں اپنے فرزندانِ گرامی سے کی وہ بھی نمونہ ہے جس کا ذکر زیرِ نظر آیات میں سے آخر میں آیا ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ اور یعقوب نے عمر کے آخری لمحات میں اپنی اولاد کو توحید کے مکتبِ مقدس کی وصیت کی (ووصّی بھا ابراھیم بنیه ویعقوب)۔

ہر ایک نے اپنی اولاد سے کہا: اے میرے فرزندو! خدا نے اس آئینِ توحید کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے (یٰبنی ان اللہ اصطفٰی لکم الدین)۔

اس وصیتِ ابراہیمی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن گویا اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا کہ اے انسان! تم فقط آج کے لئے اپنی اولاد کے لئے جواب دہ نہیں بلکہ اس کے آئندہ کے بھی جواب دہ ہو۔ اس جہان سے آنکھوں کو بند کرتے وقت اپنی اولاد کی مادی زندگی ہی کے لئے فکر نہ کرو بلکہ ان کی معنوی و روحانی زندگی کے لئے بھی فکر کرو۔

یہ وصیت حضرت ابراہیمؑ ہی نے نہیں کی بلکہ ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنے دادا کی اس روش کو جاری رکھا اور انہوں نے بھی اپنی آخری عمر میں اپنی اولاد کو سمجھایا کہ دیکھو! تمہاری کامیابی و کامرانی اور سعادت ایک چھوٹے سے جملے میں پوشیدہ ہے اور وہ ہے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔

تمام انبیاء میں یہاں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت یعقوبؑ کا ذکر آیا ہے شاید یہ اس مقصد کے لئے ہو کہ یہود و نصاریٰ کہ جن میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی طرح اپنے تئیں حضرت یعقوبؑ سے وابستہ کرتے ہیں انہیں سمجھایا جائے کہ تمہارا یہ شرک آلود طور طریقہ اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی تمہاری ہٹ اس شخصیت کے طریقے سے نہیں ملتی جس سے اپنا ربط جوڑتے ہو۔

۱۳۳۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

---

[1] نور الثقلین، ج ۲، ص ۴۳۹



وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

۱۳۴۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۔ کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد کس کی پرستش کرو گے۔ انہوں نے کہا: آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا خدا ہے اور ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

۱۳۴۔ (بہرحال) وہ ایک امت تھے کہ گذشتہ زمانے میں ان کے اعمال ان سے مربوط تھے اور تمہارے اعمال بھی خود تم سے مربوط ہیں اور ان کے اعمال کی بازپرس کبھی تم سے نہ ہوگی۔

شانِ نزول

یہودیوں کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو اسی دین کی وصیت کی جس کے یہودی معتقد ہیں (اس کی تمام تحریفوں کے ساتھ) خدا تعالیٰ نے ان کے اس عقیدے کی تردید میں یہ آیات نازل کیں۔[1]

تفسیر

سب اپنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں

جیسا کہ شانِ نزول میں ہے آیت کے ظاہر سے بھی یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی گفتگو کے دوران منکرینِ اسلام کا ایک گروہ حضرت یعقوبؑ سے کوئی غلط بات منسوب کرتا تھا۔ قرآن ان کے اس بے دلیل دعویٰ کے متعلق کہتا ہے: کیا تم یعقوب کی موت کے وقت موجود تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو ایسی وصیت کی تھی (ام كنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت)۔

جو بات تم ان سے منسوب کرتے ہو وہ تو نہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے اس وقت اپنے بیٹوں سے گفتگو کی یہ تھی کہ انہوں نے پوچھا: میرے بعد کس چیز کی پرستش و عبادت کرو گے (اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدی)۔ انہوں نے جواب میں کہا: آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا خدا ہے (قالوا نعبد الٰهك و الٰه اٰبائك ابراهيم و اسمٰعيل و اسحٰق الٰها واحدا)۔ اور ہم اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (و

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی



نحن لہ مسلمون)۔

یعقوبؑ نے توحید اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی وصیت نہیں کی اور یہی اصول تمام حقائق تسلیم کرنے کی بنیاد ہے۔ زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت حضرت یعقوبؑ کو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ پریشانی تھی اور اس فکر کے آثار ان کی پیشانی سے ہویدا تھے اور آخرکار اس خلش کو وہ زبان پر لائے اور پوچھا: میرے بیٹو! میرے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے۔ خصوصاً پوچھا کس چیز کی، یہ نہیں کہا کس شخص کی کیونکہ ان کے گرد و پیش ایسے لوگ رہتے تھے جو بت پرست تھے اور کئی ایک چیزوں کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ یعقوب چاہتے تھے کہ وہ جان لیں کہ کیا اس طور طریقے کی طرف تو کسی کا رجحان اس کے دل کی گہرائیوں میں موجود نہیں۔ لیکن بیٹوں کے جواب کے بعد انہیں سکون قلب نصیب ہوا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت یعقوبؑ کے باپ یا دادا نہیں تھے بلکہ ان کے چچا تھے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ لغتِ عرب میں کبھی کبھی لفظ "اب" جس کا معنی باپ ہے چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں اگر یہ لفظ آزر کے لئے استعمال ہوا ہے تو یہ اس مفہوم کے خلاف نہیں کہ آزر ابراہیمؑ کا والد نہ تھا بلکہ چچا تھا۔

زیر نظر دوسری آیت گویا یہودیوں کے ایک اشتباہ کی نفی کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے آباء و اجداد، ان کے اعزازات اور خدا کے ہاں ان کی عظمت پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور اپنے بارے میں سمجھتے کہ اگر وہ گناہگار ہوں تو بھی ان بزرگوں کی وجہ سے نجات یافتہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے: بہر حال وہ ایک امت تھے جو گزر گئے ہیں اور ان کے اعمال ان سے وابستہ ہیں اور تمہارے اعمال خود تمہارے ساتھ مربوط ہیں (تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم)۔ تم کبھی ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں (جیسا کہ وہ تمہارے اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں) (ولا تسئلون عما كانوا يعملون) لہٰذا بجائے اس کے کہ تم اپنی توانائی اپنے بزرگوں کے متعلق ایسے فخر و مباہات کی تحقیق میں صرف کرو اپنے عقیدہ اور عمل کی اصلاح کرو۔

اگرچہ ظاہراً اس آیت کے مخاطب اہل کتاب اور یہودی ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ حکم انہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہم مسلمان بھی اس کے حقیقی مفہوم کے مخاطب ہیں[1]

۱۳۵۔ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۱۳۶۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ

---

[1] سادات کرام اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائیں۔ (مترجم)



إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ
مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○
۱۳۷۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي
شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

ترجمہ

۱۳۵۔ (اہل کتاب) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ یا عیسائی تاکہ ہدایت پالو کہہ دیجئے (یہ تحریف شدہ مذاہب ہرگز ہدایت بشر کا سبب نہیں بن سکتے) بلکہ ابراہیمؑ کے خالص دین کی پیروی کرو وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے۔

۱۳۶۔ کہیے ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء اسباط پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو پروردگار کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (نسلی تعصبات اور ذاتی اغراض ہمارے لئے سبب نہیں بنتیں کہ ہم بعض کو قبول کرلیں اور بعض کو چھوڑ دیں)۔

۱۳۷۔ اگر وہ بھی اس پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر روگردانی کریں گے تو وہ حق سے جدا ہوں گے اور خدا تم سے ان کے شر کو دور کرے گا اور وہ سننے والا اور دانا ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے:

چند یہودی علماء اور نجران کے کچھ عیسائی علماء مسلمانوں سے بحث مباحثہ کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے تئیں دینِ حق پر قرار دیتا اور دوسرے کی نفی کرتا تھا۔ یہودی کہتے کہ ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰ دیگر انبیاء سے برتر ہیں اور ہماری کتاب بہترین کتاب ہے۔ اسی طرح عیسائی دعویٰ کرتے تھے کہ مسیحؑ بہترین رہنما ہیں اور انجیل بہترین کتاب ہے۔ ان دو مذاہب کے پیروکاروں میں سے ہر ایک مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دیتا تھا۔ یہ آیات اسی موقع پر ان کے جواب میں نازل ہوئیں۔

تفسیر

صرف ہم حق پر ہیں

خود پرستی اور خود محوری کا اکثر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان حق کو فقط اپنی ذات میں منحصر سمجھتا ہے اور باقی سب کو باطل



پرست قرار دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لے جیسا کہ محل بحث پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اہل کتاب کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی بن جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے (وقالوا کونوا ھودًا او نصٰری تھتدوا)۔

کہیے کہ تحریف شدہ مذاہب اس قابل نہیں کہ وہ ہدایت بشر کا سبب بنیں بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خالص دین کے پیروکار بنو تاکہ ہدایت حاصل کرو۔ وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے (قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین)۔

صحیح دیندار افراد وہ ہیں جو خالص توحید کے پیروکار ہیں وہ توحید جو کسی قسم کے شرک سے آلودہ نہ ہو اور پاک و صاف دین کو کجرو دین سے ممتاز کرنے والی اہم ترین بنیاد توحید خالص ہی ہے۔

اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ خدا کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہ کریں اور سب کی تعلیمات کا احترام کریں کیونکہ دین حق کے اصول سب کے ہاں ایک ہی جیسے ہیں۔ موسیٰؑ و عیسیٰؑ بھی ابراہیمؑ کے آئین حق کے پیروکار تھے جو شرک سے پاک تھا، اگرچہ ان کے دین میں نادان پیروکاروں نے تحریف کر دی اور اسے شرک آلودہ کر دیا (یہ گفتگو اس بات کے خلاف نہیں کہ آج ہمیں اپنی شرعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے آخری آسمانی دین کی پیروی کرنا چاہیے یعنی صرف اسلام کی نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور کی جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے)۔ اسی لئے بعد کی آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے کہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں جو اس کی طرف سے ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور بنی اسرائیل کے اسباط پیغمبروں پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا ہے (قولوا اٰمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم)۔ خلاصہ یہ کہ ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے اور فرمان حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (لا نفرق بین احد منھم ونحن لہٗ مسلمون)۔

خود محوری، نسلی تعصبات اور ایسی دیگر چیزیں ہمارے لئے اس بات کا موجب نہیں بنتیں کہ ہم کچھ کو مان لیں اور کچھ کا انکار کر دیں۔ وہ سب خدائی معلم ہیں جنہوں نے مختلف تربیتی طریقوں سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے قیام کیا۔ لیکن سب کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ تھا توحید خالص اور حق و عدالت کے سائے میں نوع بشر کی ہدایت، اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنے خاص زمانے میں بعض مخصوص ذمہ داریوں اور خصوصیات کا حامل تھا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اگر یہ لوگ ان امور پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پا لیں گے (فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہٖ فقد اھتدوا)۔ اگر رو گردانی کریں گے تو حق سے جدا ہیں (وان تولوا فانما ھم فی شقاق ج)۔

اگر وہ نسلی و خاندانی تعصبات اور ایسی دیگر چیزوں کو مذہب میں داخل نہ کریں اور خدا کے تمام پیغمبروں پر بلا استثناء ایمان لے آئیں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں اور اگر یہ صورت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے حق کو چھوڑ دیا ہے اور



باطل کے پیچھے رواں ہیں۔

لفظ "شقاق" دراصل شگاف، نزاع اور جنگ کے معنیٰ میں ہے اور اس مقام پر اس سے مراد کفر، گمراہی، حق سے دوری اور باطل کی طرف توجہ لیا گیا ہے اور ان سب معانی کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ گذشتہ آیت کے نازل ہونے اور حضرت عیسیٰؑ کا باقی انبیاء کی صف میں ذکر آنے کے بعد عیسائیوں کی ایک جماعت کہنے لگی کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ حضرت عیسیٰؑ دیگر انبیاء کی طرح تھے وہ تو خدا کے بیٹے تھے لہٰذا زیر نظر آیات میں سے تیسری آیت نازل ہوئی اور انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ گمراہی اور کفر کا شکار ہیں۔ بہر حال آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے کہ وہ دشمن کی سازشوں سے ہراساں نہ ہوں فرمایا: خدا ان کے شر کو ان سے دور کرے گا کہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کی سازشوں سے آگاہ ہے (فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم)۔

چند اہم نکات

(۱) **دعوتِ انبیاء کی وحدت:** آیاتِ قرآنی میں بارہا اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر ایک ہی ہدف اور غرض رکھتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے کیونکہ سب ایک ہی منبع وحی والہام سے فیض حاصل کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ خدا کے تمام پیغمبروں کا ایک جیسا احترام کریں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، یہ بات اس کی نفی نہیں کرتی کہ خدا کی طرف سے آنے والی نئی شریعت گذشتہ شریعتوں کی ناسخ ہوتی ہے۔ آئینِ اسلام آخری آئین ہے کیونکہ خدا کے پیغمبر معلمین کی طرح تھے اور ان میں سے ہر ایک انسانی معاشرے کی علیحدہ جماعتوں (CLASSES) میں تربیت کے لئے آئے اور واضح ہے کہ جب ایک جماعت (CLASS) کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے تو طلباء دوسرے معلم کے پاس اور اوپر کی جماعت میں چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ آخری پیغمبر کے پروگراموں کو جو دین کے تکامل کا آخری مرحلہ ہے عملی شکل دیں۔

(۲) **اسباط کون تھے:** سبط، سَبط اور انبساط کا معنیٰ ہے کسی چیز کا آسانی سے پھیلاؤ۔ درخت کو کبھی کبھی سَبَط (بر وزن سَبَد) کہتے ہیں، کیونکہ اس کی شاخیں آسانی سے پھیل جاتی ہیں۔ اولاد اور خاندان کی شاخوں کو سبط اور اسباط کہتے ہیں اور اس کی وجہ وہ پھیلاؤ اور وسعت ہے جو نسل میں پیدا ہوتی ہے۔

اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے خاندان اور قبائل ہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں سے پیدا ہوئے چونکہ ان میں سے بھی انبیاء ہوئے ہیں لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں اسباط کو بھی ان افراد کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے جن پر آیات نازل ہوئیں۔ اس وجہ سے اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل یا اولادِ یعقوب میں سے وہ قبائل ہیں جن میں انبیاء آئے۔ اس سے مراد خود حضرت یعقوبؑ کے بیٹے نہ تھے کہ جس بناء پر کہا جا سکے کہ وہ سب کے سب نبوت کی اہلیت نہ رکھتے تھے کیونکہ وہ تو اپنے بھائی کے معاملے میں گناہ کے مرتکب ہوئے تھے۔



(iii) حنیف: حنیف کا مادہ ہے حنف (بروزن ہدف) جس کا معنی ہے گمراہی سے درستی اور راستی کی طرف میلان رجحان پیدا کرنا۔ اس کے برعکس ہے جنف یعنی راستی سے کجی کی طرف جھکنا۔ توحید خالص کے پیروکار چونکہ شرک سے منہ موڑ کر اس حقیقی اساس کی طرف مائل ہیں اس لئے انہیں حنیف کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حنیف کا ایک معنی ہے مستقیم اور صاف۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ مفسرین نے "حنیف" کی جو مختلف تفسیریں کی ہیں مثلاً: بیت اللہ کا حج، حق کی پیروی، حضرت ابراہیمؑ کی پیروی، خلوص عمل وغیرہ سب کی برگشت اسی جامع مفہوم کی طرف ہوتی ہے۔

۱۳۸۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○

۱۳۹۔ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○

۱۴۰۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۴۱۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۳۸۔ خدائی رنگ (ایمان، توحید اور اسلام کا رنگ قبول کریں) اور خدائی رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے اور ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں۔

۱۳۹۔ کہیے: کیا تم ہم سے خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہی تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور ہم تو خلوص سے اس کی عبادت کرتے ہیں (اور ہم مخلص مؤحد ہیں)۔

۱۴۰۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباط یہودی یا عیسائی تھے۔ کہیے تم بہتر جانتے ہو یا خدا (اور باوجودیکہ تم جانتے ہو کہ وہ یہودی یا عیسائی نہ تھے کیوں حقیقت چھپاتے ہو) اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم و ستمگر ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت کو چھپائے اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

۱۴۱۔ (بہرحال) وہ ایک امت تھے جو گزر گئے۔ جو انہوں نے کیا ہے وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ تمہارے لئے ہے۔ تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو۔



تفسیر

غیر خدائی رنگ دھو ڈالو

گذشتہ آیات میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو تمام انبیاء کے پروگراموں کے سلسلے میں جو دعوت دی گئی تھی اس ضمن میں فرماتا ہے: صرف خدائی رنگ قبول کرو (جو ایمان اور توحید کا خالص رنگ ہے) (صبغۃ اللہ)[1]۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: کونسا رنگ خدائی رنگ سے بہتر ہے اور ہم تو فقط اس کی پرستش و عبادت کرتے ہیں (اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں) (ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون)۔

اس طرح قرآن حکم دیتا ہے کہ نسلی، قبائلی اور ایسے دیگر رنگ جو تفرقہ بازی کا سبب ہیں ختم کر دیں اور سب کے سب صرف خدائی رنگ میں رنگ جائیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کا معمول تھا کہ وہ اپنی اولاد کو غسل تعمید دیتے تھے اور کہتے تھے اس خاص رنگ سے غسل دینے سے نومولود کے وہ ذاتی گناہ دھل جاتے ہیں جو اسے حضرت آدم سے ورثے میں ملے ہیں۔

قرآن اس بے بنیاد منطق پر خط بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ خرافات، بیہودگی اور تفرقہ اندازی کے ظاہری رنگوں کی بجائے رنگ حقیقت اور رنگ الٰہی قبول کرو تاکہ تمہاری روح اور نفس ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو۔ واقعاً یہ کیسی خوبصورت اور لطیف تعبیر ہے۔ اگر لوگ خدائی رنگ قبول کر لیں یعنی وحدت، عقیدت، پاکیزگی اور پرہیزگاری کا رنگ، عدالت، مساوات، برادری اور برابری کا رنگ اور توحید و اخلاص کا رنگ اختیار کر لیں اور ان سے تمام جھگڑے، کشمکش (جو کئی رنگوں میں اسیر ہونے کا سبب ہیں) ختم کر سکتے ہیں اور شرک، نفاق اور تفرقہ بازیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

امام صادقؑ سے مروی متعدد احادیث میں انہی طرح طرح کے رنگوں کو دور کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ یہ روایات اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"صبغۃ اللہ سے مراد اسلام کا پاکیزہ آئین ہے۔"[2]

یہودی وغیرہ بعض اوقات مسلمانوں سے حجت بازی کرتے اور کہتے کہ پیغمبر ہماری قوم ہی میں مبعوث ہوتے تھے۔ ہمارا دین قدیم ترین ہے اور ہماری کتاب آسمانی کتابوں میں سے زیادہ پرانی ہے اگر محمد بھی پیغمبر ہوتے تو ہم ہی سے مبعوث ہوتے اور کبھی کہتے کہ عربوں کی نسبت ہماری نسل ایمان و وحی قبول کرنے کے لئے زیادہ آمادہ ہے کیونکہ عرب تو بت پرست تھے۔

---

[1] عرب جس مقام پر "صبغۃ اللہ" کہتے ہیں اس سلسلے میں مفسرین نے کئی احتمالات بیان کئے ہیں جن میں سے تین واضح ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے (صبغنا صبغۃ اللہ) دوسرا یہ کہ ملت ابراہیم کی جگہ آیا ہو جو گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ تیسرا یہ کہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہو (اتبعوا صبغۃ اللہ)۔

[2] نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۳۲۔



جب کہ ہم نہ تھے کبھی وہ خود کو خدا کی اولاد کہتے کہ بہشت تو فقط ہمارے لئے ہے۔ قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں ان سب خیالات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے۔ قرآن پہلے پیغمبرؐ سے یوں خطاب کرتا ہے: ان سے کہیے کہ خدا کے بارے میں تم ہم سے گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے (قل اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا و ربکم)۔

پروردگار کسی نسل یا قبیلے کے لئے ہی نہیں وہ تو تمام جہانوں اور تمام عالم ہستی کا پروردگار ہے۔ یہ بھی جان لو کہ ہم اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور اعمال کے علاوہ کسی شخص کے لئے کوئی وجہ امتیاز نہیں (ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم)۔ فرق یہ ہے کہ ہم خلوص سے اس کی پرستش کرتے ہیں اور خالص موحد ہیں لیکن تم میں سے بہت سوں نے توحید کو شرک آلود کر رکھا ہے (ونحن لہ مخلصون)۔

اس کے بعد کی آیت میں ان بے بنیاد دعووں میں سے کچھ کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباط سب یہودی یا عیسائی تھے (ام تقولون ان ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط کانوا ھوداً او نصاریٰ)۔ کہیے تم بہتر جانتے ہو یا خدا (قل ءانتم اعلم ام اللہ) خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ تم بھی کم و بیش جانتے ہو کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے بہت سے پیغمبر دنیا میں آئے اور اگر نہیں جانتے تو پھر بغیر اطلاع کے ان کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت، گناہ اور حقیقت سے پردہ پوشی ہے اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت چھپائے (ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ)۔ مگر یہ جان لو کہ خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔

تعجب ہے کہ جب انسان ہٹ دھرمی اور تعصب کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر مسلمات تاریخ تک کا انکار کر دیتا ہے۔ مثلاً یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبروں تک کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا پیروکار شمار کرتے ہیں جب کہ وہ ان سے پہلے دنیا میں آئے اور یہاں سے چل بسے۔ وہ ایسی واضح حقیقت و واقعیت کو چھپاتے ہیں جس کا تعلق لوگوں کی قسمت اور دین و آئین سے ہے۔ اس لئے قرآن انہیں ظالم ترین افراد قرار دیتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں کہ کچھ لوگ جان بوجھ کر حقائق کو چھپاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں ایسے لوگوں کے نظریات کا ایک اور جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا: فرض کرو یہ سب دعوے سچے ہیں تو بھی وہ ایسے لوگ تھے جو گزر گئے ہیں ان کا دفتر اعمال بند ہو چکا ہے، ان کا زمانہ بیت چکا ہے اور ان کے اعمال انہی سے تعلق رکھتے ہیں (تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت) اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہو گی (ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون)۔

مختصر یہ کہ ایک زندہ قوم کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کا سہارا لے اور ان پر بھروسہ کرے نہ کہ اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کی تاریخ کا سہارا لے۔ ایک انسان کو صرف اپنی فضیلت و منقبت پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ باپ کی فضیلت سے اسے کیا حاصل چاہے وہ کتنا ہی صاحب فضل کیوں نہ ہو۔



۱۴۲۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ترجمہ

۱۴۲۔ عنقریب کم عقل لوگ کہیں گے (مسلمانوں کو) ان کے پہلے قبلہ سے کس چیز نے روگردان کیا۔ کہہ دو: مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

قبلہ کی تبدیلی کا واقعہ

اس آیت اور اس کے بعد کی چند آیات میں تاریخ اسلام کی ایک اہم تبدیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے لوگوں میں ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں اور چند ماہ تک مدینہ میں پیغمبر اسلام حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد قبلہ بدل گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں۔ مدینہ میں کتنے ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی جاتی رہی اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ یہ مدت سات ماہ سے لے کر سترہ ماہ تک بیان کی گئی ہے لیکن یہ جتنا عرصہ بھی تھا اس دوران میں یہودی مسلمانوں کو طعن زنی کرتے رہے کیونکہ بیت المقدس دراصل یہودیوں کا قبلہ تھا وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں بلکہ ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ یہ باتیں پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے لئے ناگوار تھیں۔ ایک طرف وہ فرمان الٰہی کے مطیع تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے طعنے ختم ہونے کو نہ آتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اکرمؐ آسمان کی طرف دیکھتے تھے گویا وحی الٰہی کے منتظر تھے۔ اس انتظار میں ایک عرصہ گذر گیا یہاں تک کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا۔ ایک روز مسجد بنی سالم میں پیغمبرؐ نماز ظہر پڑھا رہے تھے۔ دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ جبرئیل کو حکم ہوا کہ پیغمبر کا بازو تھام کر ان کا رخ انور کعبہ کی طرف پھیر دیں۔[1]

اس واقعے سے یہودی بہت پریشان ہوئے اور اپنے پرانے طریقے کے مطابق، ڈھٹائی، بہانہ سازی اور طعن بازی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پہلے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کا کوئی اپنا قبلہ نہیں یہ ہمارے پیروکار ہیں۔ لیکن جب خدا کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے پھر زبان اعتراض دراز کی۔ چنانچہ محل بحث آیت میں قرآن کہتا ہے:۔ بہت جلد کم عقل لوگ کہیں گے ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے (سیقول السفھاء

---

[1] مجمع البیان، ج ۱، ص ۲۲۳



من الناس ما ولّٰهم عن قبلتهم التی کانوا علیها) مسلمانوں نے اس سے کیوں اعراض کیا ہے جو گذشتہ زمانے میں انبیاء ماسلف کا قبلہ رہا ہے۔ اگر پہلا قبلہ صحیح تھا تو اس تبدیلی کا کیا مقصد۔ اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر تیرہ سال اور چند ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے کیوں نماز پڑھتے رہے ہیں۔

خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے: ان سے کہہ دو عالم کے مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے (قل لله المشرق والمغرب یهدی من یشاء الی صراط مستقیم)۔

ان حیلہ بازوں کے جواب میں یہ ایک قطعی اور واضح دلیل تھی کہ بیت المقدس اور کعبہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ خدا کا ذاتی طور پر تو کوئی گھر نہیں ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ فرمان خدا کا پاس کیا جائے۔ جس طرف خدا حکم دے اُدھر نماز پڑھی جائے وہ مقام مقدس و محترم ہے اور کوئی جگہ حکم خدا کے بغیر ذاتی اہمیت نہیں رکھتی۔ حقیقت میں قبلہ کی تبدیلی آزمائش اور تکامل کے مراحل میں سے ہے ان میں سے ہر ایک ہدایت الٰہی کا مصداق ہے اور وہی ہے جو انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) سفہاء: سفہاء جمع ہے سفیہ کی۔ اصل میں اس کا معنی وہ شخص ہے جس کا بدن ہلکا پھلکا ہو اور آسانی سے اِدھر اُدھر ہو جائے۔ اہل عرب جانوروں کی کم وزن رسیوں کو جو ہر طرف حرکت کرتی رہتی ہیں سفیہ کہتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں یہ لفظ کم ذہن شخص کے معنی میں استعمال ہونے لگا، یہ کم عقلی امور دین میں ہو یا امور دنیا میں۔

(۲) نسخ احکام: پہلے کہا جا چکا ہے کہ مختلف زمانوں میں تنسیخ احکام اور تربیتی پروگراموں کی تبدیلی کوئی نیا مسئلہ یا عجیب و غریب چیز نہیں کہ اس پر اعتراض ہو سکے۔ لیکن اس بات کو یہودیوں نے اسلام سے انکار کرنے کے لئے بڑی بات بنا دیا۔ اور اس سلسلے میں بہت پراپیگنڈا کیا۔ قرآن نے انہیں منطقی اور دندان شکن جواب دیئے اور وہ مجبوراً خاموش ہو گئے اس سلسلے کی آیات آپ ابھی ملاحظہ کریں گے۔

۱۴۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝



ترجمہ

۱۴۳- (جیسے تمہارا قبلہ درمیانی ہے) اسی طرح خود تمہیں بھی ہم نے ایک درمیانی امت بنایا ہے (جو ہر لحاظ سے افراط و تفریط کے درمیان حد اعتدال میں ہے) تاکہ لوگوں کے لئے تم ایک نمونے کی امت بن سکو اور پیغمبر تمہارے سامنے نمونہ ہو اور ہم نے وہ قبلہ (بیت المقدس) کہ جس پر تم پہلے تھے فقط اس لئے قرار دیا تھا کہ وہ لوگ جو پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت دی ہے دشوار تھا (یہ بھی جان لو کہ تمہاری وہ نمازیں جو پہلے قبلہ کی طرف رخ کرکے ادا کی تھیں صحیح ہیں) اور خدا ہرگز تمہارے ایمان (نماز) کو ضائع نہیں کرتا کیونکہ خدا لوگوں پر رحیم اور مہربان ہے۔

تفسیر

زیر نظر آیت میں قبلہ کی تبدیلی کے فلسفے اور اسرار کی طرف کچھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا: (جس طرح تمہارا قبلہ درمیانی ہے) اسی طرح تمہیں ہم نے درمیانی امت قرار دیا ہے (وکذلک جعلناکم امۃ وسطا) ایسی امت جو کندرو ہو نہ تندرو، افراط میں ہو نہ تفریط میں بلکہ ایک نمونہ ہو۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کا قبلہ کیسے درمیانی قبلہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی تقریباً مشرق کی طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر عیسائی قومیں مغربی ممالک میں رہتی ہیں اور حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت (بیت المقدس) میں ہے اس لئے وہ مشرق کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہیں اس لحاظ سے مشرقی سمت کی طرف ان کا قبلہ شمار ہوتی ہے اور یہودی جو زیادہ تر شامات، بابل اور دیگر ایسے علاقوں میں رہتے تھے کہ انہیں تقریباً مغرب کی طرف رخ کرنا پڑتا تھا اس لحاظ سے مغربی سمت ان کا قبلہ تھا لیکن اس وقت کے مسلمان جو مدینہ میں رہتے تھے ان کے لئے کعبہ جنوب کی سمت میں اور مشرق و مغرب کے درمیان بنتا تھا جو ایک درمیانی خط شمار ہوگیا۔

یہ مطالب دراصل لفظ کذلک سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ مفسرین نے اس کی دیگر تفاسیر بھی بیان کی ہیں جو بحث و تمحیص کے قابل ہیں۔

بہرحال — قرآن چاہتا ہے کہ اسلام کے تمام پروگراموں کے باہمی تعلق کا ذکر کرے اور وہ یوں کہ نہ صرف مسلمانوں کا قبلہ درمیانی ہے بلکہ اس کے تمام پروگرام اس خوبی کے حامل ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: غرض یہ ہے کہ تم ایک ایسی امت جو گواہ (اور ایک نمونہ کی حامل ہو) قرار پاؤ، پیغمبر بھی ایک گواہ (اور ایک نمونہ) بن کر تمہارے سامنے موجود ہو (لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)۔

امت مسلمہ کا ساری دنیا کے لئے گواہ ہونا اور اسی طرح پیغمبر کا مسلمانوں پر گواہ ہونا یہ تعبیر ممکن ہے اسوہ اور نمونہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ گواہوں کا انتخاب ہمیشہ ان لوگوں میں سے کیا جاتا ہے جو نمونہ ہوں یعنی ان عقائد، معارف اور



تعلیمات کی وجہ سے جس کے تم حامل ہو ان کے ذریعے ایک ایسی امت بنو جو نمونہ ہو جیسے پیغمبر تمہارے درمیان ایک نمونہ، ماڈل اور اسوہ ہیں۔ یعنی تم اپنے عمل اور پروگرام کے ذریعے گواہی دیتے ہو کہ انسان دیندار بھی ہو سکتا ہے اور دنیا کے ساتھ بھی وابستہ رہ سکتا ہے۔ انسان معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے معنوی اور روحانی پہلوؤں کی مکمل حفاظت کر سکتا ہے اور دین و دنیا ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ تم ان عقائد اور پروگراموں کے ذریعے گواہی دیتے ہو کہ دین و علم اور دنیا و آخرت نہ صرف یہ کہ متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں۔

اس کے بعد قرآن تبدیلی قبلہ کی ایک اور رمز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے اس قبلہ (بیت المقدس) جس پر تم قبل ازیں تھے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ پیغمبر کی پیروی کرنے والے جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں (وماجعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیه)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ وہ افراد جو آپ کی پیروی کرتے ہیں بلکہ فرمایا: وہ لوگ جو رسول خدا کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تم پیغمبر اور فرستادۂ خدا ہو اس لئے انہیں بغیر کسی قید و شرط کے تمہارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔ قبلہ کے سلسلے میں پیروی تو آسان سی بات ہے اگر اس سے بڑھ کر بھی کوئی حکم ملے تو اس میں چون و چرا کرنا شرک اور بت پرستی کے دور کے عادات و رسوم کے ترک نہ کئے جانے کی دلیل ہے۔

من ینقلب علی عقبیه - اس کا مطلب ہے پاؤں کے پچھلے حصے پر پلٹ جانا۔ یہ رجعت پسندی اور پسماندگی کی طرف اشارہ ہے۔

مزید فرماتا ہے: اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت کی تھی دشوار تھا (وان کانت لکبیرة الا علی الذین هدی الله)۔

واقعاً جب تک خدائی ہدایت نہ ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات اہم ہے کہ تسلیم حقیقت اس کا نام ہے کہ ایسے احکام جاری ہوں تو کسی سنگینی و سختی کا احساس تک نہ ہو بلکہ چونکہ حکم اس کی طرف سے ہے لہٰذا شہد سے شیریں تر معلوم ہو۔

وسوسہ ڈالنے والے دشمن یا نادان دوست خیال کرتے تھے کہ ہو سکتا ہے قبلہ بدل جانے سے پہلے اعمال باطل ہو جائیں اور اجر و ثواب برباد ہو جائے اس کے لئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: خدا ہرگز تمہارا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ انسانوں کے لئے رحیم و مہربان ہے (وما کان الله لیضیع ایمانکم ان الله بالناس لرءوف رحیم)۔

اس کے احکام طبیب کے نسخوں کی طرح ہیں۔ ایک روز ایک نسخہ نجات بخش ہے اور دوسرے دن دوسرا۔ ہر ایک اپنی جگہ درست اور سعادت و تکامل کا ضامن ہے لہٰذا قبلہ کی تبدیلی تمہاری گذشتہ یا آئندہ کی نمازوں کے لئے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہ بنے کیونکہ وہ سب کی سب صحیح تھیں اور صحیح ہیں۔



چند اہم نکات

(۱) قبلہ کی تبدیلی کے اسرار :۔ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی ان سب کے لئے اعتراض کا موجب بنی جن کا گمان تھا کہ ہر حکم کو مستقل رہنا چاہیے۔ وہ کہتے تھے اگر ہمارے لئے ضروری تھا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں تو پہلے دن یہ حکم کیوں نہ دیا گیا اور اگر بیت المقدس مقدم ہے جو گذشتہ انبیاء کا بھی قبلہ شمار ہوتا ہے تو پھر اسے کیوں بدلا گیا۔

دشمنوں کے ہاتھ بھی طعن زنی کا میدان آگیا۔ شاید وہ کہتے تھے کہ پہلے تو انبیا ماسبق کے قبلہ کی طرف نماز پڑھتا تھا لیکن کامیابیوں کے بعد اس پر قبیلہ پرستی نے غلبہ کر لیا ہے لہٰذا اپنی قوم اور قبیلے کے قبلہ کی طرف پلٹ گیا ہے۔ یا کہتے تھے کہ اس نے دھوکا دینے اور یہود و نصاریٰ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پہلے بیت المقدس کو قبول کر لیا اور جب یہ بات کارگر نہ ہو سکی تو اب کعبہ کی طرف رخ کر لیا ہے۔

واضح ہے کہ ایسے وسوسے اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں ابھی نورِ علم نہ پھیلا ہو اور جہاں شرک و بت پرستی کی رسمیں موجود ہوں کیسا تذبذب و اضطراب پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے زیرِ نظر آیت میں قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ یہ مومنین اور مشرکین میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک عظیم آزمائش تھی۔ خانہ کعبہ اس وقت مشرکین کے بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا حکم دیا گیا کہ مسلمان وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ لیا کریں تاکہ اس طرح مشرکین سے اپنی صفیں الگ کر سکیں لیکن جب مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی حکومت و ملت کی تشکیل ہو گئی اور مسلمانوں کی صفیں دوسروں سے مکمل طور پر ممتاز ہو گئیں تو اب یہ کیفیت برقرار رکھنا ضروری نہ رہا۔ لہٰذا اس وقت کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا جو قدیم ترین مرکزِ توحید اور انبیاء کا بہت پرانا مرکز تھا۔

ایسے میں ظاہر ہے کہ جو کعبہ کو اپنا خاندانی معنوی اور روحانی سرمایہ سمجھتے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے مشکل تھا اور اسی طرح بیت المقدس کے بعد کعبہ کی طرف پلٹنا لہٰذا اس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی تاکہ شرک کے جتنے آثار ان میں باقی رہ گئے تھے اس کٹھالی میں پڑ کر جل جائیں اور ان کے گذشتہ شرک آلود رشتے ناتے ٹوٹ جائیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اصولی طور پر تو خدا کے لئے مکان نہیں ہے۔ قبلہ تو صرف وحدت اور صفوں میں اتحاد کی ایک رمز ہے اور اس کی تبدیلی کسی چیز کو دگرگوں نہیں کر سکتی۔ اہم ترین امر تو خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور تعصب اور ضد پرستی کے بتوں کو توڑنا ہے۔

(۲) امتِ اسلامی ایک درمیانی امت ہے :۔ لغت میں وسط کا معنیٰ ہے دو چیزوں کے درمیان حد اوسط۔ اس کا ایک اور معنیٰ ہے جاذبِ نظر، خوبصورت، عالی اور شریف۔ ظاہراً ان دونوں معانی کی ایک ہی حقیقت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ شرافت، زیبائی اور عظمت عموماً اسی چیز میں ہوتی ہے جو افراط و تفریط سے دور ہو اور مقامِ اعتدال پر ہو۔

قرآن نے امتِ مسلمہ کے لئے اس مقام پر کیسی عمدہ تعبیر بیان کی ہے کہ اسے درمیانی اور معتدل امت کا نام



دیا ہے:-

یہ امت معتدل ہے ___ عقیدہ کے لحاظ سے کہ راہ غلو اپناتی ہے نہ تقصیر و شرک کی راہ چلتی ہے، جبر کی طرفدار ہے نہ تفویض کی، صفاتِ الٰہی کے بارے میں تشبیہ کا عقیدہ رکھتی ہے نہ تعطیل کا ___ یہ امت معتدل ہے ___ معنوی و مادی قدروں کے لحاظ سے ___ نہ کلی طور پر دنیائے مادہ میں غرق ہے کہ معنویت اور روحانیت کو بھول جائے اور نہ ہی عالم معنویت و روحانیت میں ایسے ڈوبی ہوئی ہے کہ جہان مادہ سے بالکل بے خبر ہو جائے ___ یہ امت معتدل ہے ___ اور ___ یہودیوں کے اکثر گروہوں کی طرح نہیں کہ جو مادی اغراض کے سوا کچھ نہیں جانتے ___ اور ___ نہ عیسائی راہبوں کی طرح جو تارک دنیا ہی بنے رہتے ہیں ___ یہ امت معتدل ہے علم و دانش کی نظر سے ___ اس طرح نہیں کہ اپنی معلومات پر جمود کا شکار ہو جائے اور دوسروں کے علوم کی پذیرائی نہ کرے اور نہ اس طرح احساس کمتری میں مبتلا ہے کہ ہر آواز کے پیچھے لگ جائے ___ یہ امت معتدل ہے ___ روابط اجتماعی کی نظر سے اس طرح کہ اپنے گرد حصار بنا کر ساری دنیا سے الگ نہیں ہو جاتی اور نہ اپنی اصالت و استقلال کو ہاتھ سے جانے دیتی ہے کہ مشرق و مغرب کے فریب خوردہ لوگوں کی طرح ان اقوام ہی میں گم ہو جائے ___ یہ امت معتدل ہے ___ اخلاقی طور طریقوں میں، عبادت و تفکر کے لحاظ سے ___ غرض یہ امت ہر جہت سے معتدل ہے۔

ایک حقیقی مسلمان صرف ایک جہت کا انسان نہیں ہوتا بلکہ مختلف جہات سے وہ کمال انسانیت کا نمونہ ہوتا ہے گویا ___ صاحب فکر، باایمان، منصف مزاج، مجاہد، ثابت، بہادر، مہربان، فعال اور غیر حریص ہوتا ہے۔

حدوسط ایسی تعبیر ہے جو ایک طرف امت اسلامی کے گواہ ہونے کا اظہار کرتی ہے کیونکہ خطِ وسط پر موجود لوگ دائیں بائیں کے تمام منحرف خطوط کو جانتے ہیں اور دوسری طرف اس میں اس مفہوم کی علت و سبب بھی پوشیدہ ہے یعنی فرماتا ہے اگر تم پوری دنیا کی مخلوق کے شاہد ہو تو اس کی دلیل تمہارا اعتدال اور امت وسط ہونا ہے۔[1]

(آ) وہ امت جو ہر لحاظ سے نمونہ بن سکتی ہے: وہ تمام چیزیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں کسی امت میں جمع ہو جائیں تو یقیناً وہ حق و حقیقت کا ہراول دستہ بن جائے کیونکہ اس کے پروگرام حق کو باطل سے ممتاز کرنے کے لئے میزان و معیار ہوں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ کئی ایک روایات میں منقول ہے کہ اہل بیتؑ نے فرمایا:

نحن الامة الوسطی و نحن شهداء الله علی خلقه و حججه فی ارضه ... نحن الشهداء علی الناس .... الینا یرجع الغالی و بنا یرجع المقصر۔

ہم امت وسط ہیں ہم مخلوق پر شاہد الٰہی ہیں اور زمین پر اس کی حجت ہیں .... ہم ہیں لوگوں پر گواہ .... غلو کرنے والوں کو ہماری طرف پلٹنا چاہیئے اور تقصیر کرنے والوں کو چاہیئے کہ یہ راہ چھوڑ کر ہم سے آملیں۔[2]

---

[1] المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ [2] ظاہراً یہاں 'یرجع' کی بجائے 'یلحق' ہونا چاہیئے (مترجم)۔

[2] نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۳۴۔



جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں ایسی روایات آیت کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں بلکہ اس امت میں نمونہ و اسوہ کے اکمل مصادیق کا تعارف کراتی ہیں اور ایسے نمونوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو پہلی صف میں موجود ہیں۔

(۱۷) "لنعلم" کی تفسیر: لنعلم (تاکہ ہم جان لیں) اور ایسے دیگر الفاظ جو قرآن میں خدا کے لئے استعمال ہوئے اس معنیٰ میں نہیں کہ خدا ایک چیز پہلے سے نہیں جانتا اور اس کے بعد اس سے آشنا ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد اس چیز کا ثابت ہونا اور خارجی شکل میں ظاہر ہونا ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ خداوند عالم ازل سے تمام حوادث و موجودات سے واقف ہے اگرچہ وہ اشیاء تدریجاً عالم وجود میں آتی ہیں لہٰذا ان حوادث و موجودات کا حدوث اُس کے علم و دانش میں کسی قسم کی زیادتی کا باعث نہیں بنتا بلکہ وہ جس چیز کو پہلے سے جانتا تھا اس ذریعے سے وہ عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک انجینئر ایک بلڈنگ کا نقشہ تیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کام کو اس مقصد کے لئے انجام دیتا ہوں تاکہ جو نتیجہ میری نظر میں ہے اسے دیکھوں یعنی اپنے علمی نقشے کو عملی جامہ پہنا دوں (البتہ خدا کا علم انسانی علم سے بہت مختلف ہے لیکن یہ مثال کسی حد تک مسئلے کو واضح کر دیتی ہے)۔

وان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللّٰہ — البتہ خلافِ عادت قدم اٹھانا اور بے جا احساسات کے زیر اثر نہ آنا بہت مشکل ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو واقعاً خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۷) قبلہ کا فلسفہ: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بنیادی طور پر قبلہ کی طرف منہ کرنے کا مقصد کیا ہے کیا خدا زمان و مکان سے مافوق و بالاتر نہیں۔ کیا قرآن خود نہیں کہتا:

فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ۔

جدھر رخ کرو خدا کو پالو گے۔

اس بناء پر کسی ایک طرف رُخ کرنے کا اثر و نتیجہ کیا ہے اور وہ بھی اس اصرار سے کہ جہتِ قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو چاروں طرف نماز پڑھنا چاہیئے تاکہ یہ یقین پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی ذمہ داری ادا کر چکے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ —

اسلام کے نزدیک اتحاد کی بہت اہمیت ہے اور اسلام ہر ایسے حکم کو واجب یا کم از کم مستحب قرار دیتا ہے جو ہم آہنگی اور وحدت کا سبب بنے۔ اب اگر رُخ قبلہ معین نہ ہوتا اور ہر شخص کسی ایک طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا تو عجیب نقشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات کا پرستش و عبادت سے بہت پرانا تعلق ہے۔ اس لئے کتنی اچھی بات ہے کہ ایک تو وحدت کی حفاظت کے لئے اور دوسرا عبادت کے اصلی مراکز کی طرف زیادہ توجہ کے لئے ایک ہی نقطے کو قبلہ کے طور پر منتخب کر لیا جائے۔ تاکہ تمام اہل جہان عبادت کے وقت اپنے افکار کو ایک ہی نقطے پر مرکوز کر لیں اور اس طرح ایسے لاتعداد دائرے کھینچ



دیں کہ جن کا ایک ہی مرکز عبادت ہو تا کہ وہ ان کی وحدت کی رمز بن جائے۔

۱۴۴۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۴۴۔ ہم تمہارے چہرے کو دیکھتے ہیں جب تم آسمان کی طرف پھیرتے ہو (اور قبلہ نما کے تعیین کے لئے فرمانِ خدا کے انتظار میں رہتے ہو)۔ اب تمہیں اس قبلہ کی طرف جس سے تم خوش ہو پھیر دیتے ہیں۔ اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف کرلو اور تم (مسلمان) جہاں کہیں ہو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر دو۔ جنہیں آسمانی کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکم جو ان کے پروردگار کی طرف سے صادر ہوا ہے درست ہے (کیونکہ وہ اپنی کتب میں پڑھ چکے ہیں کہ رسول اسلام دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے) اور (وہ جو ایسی آیات مخفی رکھتے ہیں) خداوند عالم ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

جہاں کہیں ہو کعبہ کی طرف رخ کرلو

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے بیت المقدس مسلمانوں کا عارضی قبلہ تھا لہٰذا پیغمبر اسلام انتظار میں تھے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہو خصوصاً اس بناء پر کہ پیغمبر اکرم کے ورودِ مدینہ کے بعد یہودیوں نے اس بات کو اپنے لئے سند بنا لیا تھا اور ہمیشہ مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں اور ہم سے پہلے یہ قبلہ کے متعلق کچھ جانتے بھی نہ تھے، اب ہمارے قبلہ کو قبول کر لینا ہمارا مذہب قبول کر لینے کی دلیل ہے۔ یہ اور ایسے دیگر اعتراضات کرتے رہے۔

محل بحث آیت میں اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم دیکھتے ہیں کہ تم منتظر نگاہوں سے مرکزِ نزولِ وحی، آسمان کی طرف دیکھتے ہو (قد نری تقلب وجهك فی السماء) اب ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیتے ہیں جس سے تم خوش ہو (فلنولینك قبلة ترضٰها) ابھی سے اپنا چہرہ مسجد الحرام اور خانہ کعبہ کی طرف پھیر دو (فول وجهك شطر المسجد الحرام)۔ نہ فقط مدینہ میں بلکہ جہاں کہیں بھی تم (مسلمان) ہو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف پھیر دو (وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ)۔



جیساکہ بیان کیا جاچکاہے کہ روایات کے مطابق قبلہ کی یہ تبدیلی نماز ظہر کی حالت میں واقع ہوئی جوایک حساس اوراہم مقام ہے۔ وحیِ خدا کے قاصد نے پیغمبرؐ کے بازوؤں کو پکڑ کر آپ کا رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور مسلمانوں نے بھی فوراً اپنی صفوں کو پھیر لیا یہاں تک ایک روایت میں ہے کہ عورتوں نے اپنی جگہ مردوں کو اور مردوں نے اپنی جگہ عورتوں کو دے دی (یاد رہے کہ بیت المقدس شمال کی جانب تھا جب کہ کعبہ جنوب میں واقع تھا)۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ گذشتہ کتب میں پیغمبر اسلامؐ کی نشانیوں میں سے ایک قبلہ کی تبدیلی بھی تھی۔ اہل کتاب نے چونکہ پڑھ رکھا تھا کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے (یصلی الی القبلتین) اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں اس حکم کے بعد مزید فرمایا: وہ کہ جنہیں آسمانی کتاب دی گئی جانتے ہیں کہ یہ حکم حق ہے اور پروردگار کی طرف سے ہے (وان الذین اوتوا الکتٰب لیعلمون انہ الحق من ربھم)۔

علاوہ ازیں یہ امر کہ پیغمبر اسلامؐ اپنے گرد و پیش کی عادات سے متاثر نہیں ہوئے اور کعبہ جو بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس علاقے کے تمام عربوں کے احترام کا مرکز تھا ابتداء میں نظر انداز کر دیا اور ایک محدود اقلیت کا قبلہ اپنا لیا یہ خود ان کی دعوت کی صداقت اور ان کے پروگراموں کے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل تھا۔

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: خدا ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما یعملون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ قبلہ کی تبدیلی کو آپ کی صداقت کی نشانی کے طور پر تسلیم کر لیتے جس کا ذکر گذشتہ کتب میں آچکا تھا، اسے چھپانے لگے اور الٹا پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ خدا ان کے اعمال اور نیتوں سے خوب آگاہ ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **نظمِ آیات:** زیر بحث آیت کے مفاہیم واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ پہلی آیت سے قبل نازل ہوئی ہے لیکن قرآن میں اس کے بعد موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآن، تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں۔ بلکہ بعض اوقات کچھ ایسی مناسبتیں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ آیت جو بعد میں نازل ہوئی تھی پہلے آجاتی ہے (ان وجوہات میں مطالب کی اولیت اور اہمیت بھی شامل ہے)۔

(۲) **پیغمبر اکرمؐ کا کعبہ سے خاص لگاؤ:** مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ خصوصیت سے چاہتے تھے کہ قبلہ کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے اور آپ انتظار میں رہتے تھے کہ خدا کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی حکم نازل ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے آثار سے عشق تھا علاوہ ازیں کعبہ توحید کا قدیم ترین مرکز تھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ بیت المقدس تو وقتی قبلہ ہے لیکن آپؐ کی خواہش تھی کہ حقیقی و آخری قبلہ جلد معین ہو جائے۔ آپؐ چونکہ حکم خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے تھے، یہ تقاضا زبان تک نہ لاتے صرف منتظر نگاہیں آسمان کی طرف



لگائے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا کہ آپؐ کو کعبہ سے کس قدر عشق اور لگاؤ ہے۔

آسمان شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ وحی کا فرشتہ اُوپر سے آپؐ پر نازل ہوتا تھا ورنہ خدا کے لئے کوئی محل و مقام ہے نہ اس کی وحی کے لئے۔

(iii) "شطر" کا معنی: دوسری بات جو اس مقام پر قابلِ غور یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "کعبہ" کی بجائے "شطر المسجد الحرام" آیا ہے۔ یہ شاید اس بنا پر ہو کہ دور کے علاقوں میں نماز پڑھنے والوں کے لئے خانہ کعبہ کا حقیقی تعین بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا خانہ کعبہ کی بجائے جو اصلی قبلہ ہے مسجد الحرام کا ذکر کیا گیا ہے جو وسیع جگہ ہے۔ خصوصاً لفظ "شطر" کا انتخاب ہوا جس کا معنیٰ ہے جانب یا سمت۔ یہ اس لئے کہ اسلامی حکم پر عملدر آمد سب لوگوں کے لئے آسان ہو۔ علاوہ ازیں نماز جماعت کی طویل صفیں اکثر اوقات کعبہ کے طول سے بھی لمبی ہوتی ہیں۔ اس موقع کے لئے بھی شرعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دور کے رہنے والوں کے لئے صحیح حدود کعبہ یا مسجد الحرام کا تعین بہت مشکل کام ہے لیکن اس سمت منہ کرکے کھڑا ہونا سب کے لئے آسان ہے۔

(iv) ہمہ گیر خطاب: اس میں شک نہیں کہ قرآن ظاہراً پیغمبرؐ سے خطاب کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم عام ہے اور سب مسلمانوں کے لئے ہے (سوائے ان چند مواقع کے جن کے پیغمبرؐ سے مخصوص ہونے کی دلیل موجود ہے) اس بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو الگ اور مومنین کو الگ کیوں حکم دیا گیا ہے کہ مسجد حرام کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں۔

ممکن ہے یہ تکرار اس لئے ہو کہ قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ شور و غل کا حامل تھا لہٰذا امکان تھا کہ نئے مسلمانوں کے ذہن شور و غل اور زہریلے اعتراضات کی وجہ سے تشویش کا شکار ہوتے اور وہ عذر کرتے کہ "فول وجهك" تو فقط پیغمبرؐ سے خطاب ہے اور اس طرح خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے کتراتے لہٰذا اس مقام پر ایک مخصوص خطاب کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے ایک عمومی خطاب کیا ہے تاکہ انہیں تاکید کرے کہ قبلہ کی تبدیلی کا یہ معاملہ مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم سب کے لئے یکساں ہے۔

(v) کیا قبلہ کی تبدیلی پیغمبرؐ کو خوش کرنے کے لئے تھی: قرآن کہتا ہے: "قبلة ترضها" (یعنی — وہ قبلہ جس سے تو خوش ہے) ممکن ہے اس سے یہ وہم پیدا ہو کہ یہ تبدیلی پیغمبرؐ کو خوش کرنے کے لئے تھی۔ لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے تو یہ وہم دور ہو جائے گا کہ یہ بیت المقدس تو عارضی قبلہ تھا اور پیغمبر اکرمؐ آخری قبلہ کے اعلام کا انتظار کر رہے تھے تاکہ ایک طرف تو یہودیوں کی زبان بندی ہو جائے اور دوسری طرف اہل حجاز آئین اسلام کی طرف زیادہ مائل ہوں کیونکہ وہ کعبہ سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ ضمناً یہ بھی کہ یہ پہلا قبلہ تھا لہٰذا اس طرف رخ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ اسلام

لہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ شطر کا ایک معنی "نصف" ہے اس مفہوم کی بناء پر شطر المسجد الحرام اور وسط المسجد الحرام ہم معنیٰ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ مسجد حرام کے وسط میں ہے (تفسیر کبیر فخر رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔



کوئی نسلی دین نہیں ہے اور یہ بھی کہ اس سے خانہ کعبہ میں بت پرستوں کے موجود بتوں کا بطلان بھی ظاہر ہو جاتا۔

(۷) کعبہ ایک عظیم دائرے کا مرکز ہے: اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر مسلمان نماز گزاروں کی صفوں کو دیکھے جو کعبہ رُخ نماز پڑھ رہے ہیں تو اسے کئی دائرے نظر آئیں گے جن میں ایک دائرہ دوسرے کے اندر ہے یہاں تک کہ دائرے سمٹتے سمٹتے اصل مرکز یعنی کعبہ تک جا پہنچتے ہیں اس سے ایک وحدت و مرکزیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلامی قبلے کا تصور بلاشبہ عیسائیوں کے اس طریقہ کار سے کہیں معیاری ہے جس کے مطابق تمام عیسائیوں کو حکم ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں مشرق کی طرف رخ کرکے عبادت بجا لائیں۔

یہی وجہ ہے کہ علم ہیئت اور علم جغرافیہ نے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں میں تیزی سے ترقی کی کیونکہ زمین کے مختلف حصوں میں قبلہ کا تعین اس علم کے بغیر ممکن نہ تھا۔

۱۴۵۔ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (وقف لازم)

ترجمہ

۱۴۵۔ قسم ہے کہ اگر تم ہر قسم کی آیت (دلیل اور نشانی) ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ تو یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور تم بھی اب کبھی ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کروگے (اور وہ اب یہ تصور نہ کریں کہ دوبارہ قبلہ کی تبدیلی کا امکان ہے) اور ان میں سے بھی کوئی دوسرے کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتا اور اگر تم علم و آگاہی کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کرو تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤگے۔

تفسیر

وہ کسی قیمت پر سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے

آپ گذشتہ آیت کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب جانتے تھے کہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی تبدیلی سے نہ صرف یہ کہ پیغمبر اسلامؐ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ آپؐ کی حقانیت کی دلیل ہے کیونکہ وہ اپنی کتب میں پڑھ چکے تھے کہ پیغمبر موعود دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن بے جا تعصب اور سرکشی کے بھوت نے انہیں حق قبول کرنے نہ دیا۔

اصولی طور پر اگر انسان مسائل پر پہلے سے حتمی فیصلہ نہ کرچکا ہو وہ افہام و تفہیم کے قابل ہوتا ہے اور دلیل، منطق یا معجزات کے ذریعے اس کے نظریات میں تبدیلی آسکتی ہے اور اس کے سامنے حقیقت کو ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن اگر



وہ پہلے سے اپنا موقف حتمی طور پر طے کرلے۔ خصوصاً ہٹ دھرم، متعصب اور نادان لوگوں کو کسی قیمت پر نہیں بدلا جاسکتا۔ اسی لئے قرآن محل بحث آیت میں قطعی طور پر کہہ رہا ہے: قسم ہے کہ اگر تم کوئی آیت دلیل اور نشانی ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ، یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے (ولئن اتیت الذین اوتوا الکتاب بکل اٰیة ما تبعوا قبلتک)۔

لہٰذا تم اس کام کے لیے اپنے آپ کو نہ تھکاؤ اور ان کی ہدایت کے درپے نہ ہو کیونکہ یہ کسی قیمت پر حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے اور ان میں اصلاً تلاش حقیقت کی روح ہی مردہ ہو چکی ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمام انبیاء کو کم و بیش ایسے افراد کا سامنا کرنا پڑا جو یا اہل ثروت اور بااثر تھے یا پڑھے لکھے منحرف یا مغرور یا جاہل و متعصب عوام تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: تم بھی ہرگز ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کروگے (وما انت بتابع قبلتھم)۔ یعنی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے شور و غوغا، قیل و قال اور طعن و تشنیع سے دوبارہ مسلمانوں کا قبلہ بدل جائے گا تو یہ ان کی جہالت ہے بلکہ یہ قبلہ اب ہمیشہ کے لئے ہے۔

درحقیقت مخالفین کا شور و غل ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان پختہ ارادے سے کھڑا ہو جائے اور واضح کردے کہ وہ راہ حق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرے گا۔

مزید فرمایا: وہ بھی اپنے معاملے میں ایسے متعصب ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے قبلہ کا پیرو اور تابع نہیں (وما بعضھم بتابع قبلة بعض) یعنی — یہودی عیسائیوں کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں نہ عیسائی یہودیوں کے قبلہ کی۔

پھر بطور تاکید اور زیادہ قطعیت سے پیغمبرؐ سے کہتا ہے: اگر علم و آگہی کے بعد، جو خدا کی طرف سے تمہیں پہنچ چکی ہے تم ان کی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہوگئے اور ان کی پیروی کرنے لگے تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظالمین)۔

قضیہ و شرطیہ صورت میں پیغمبرؐ سے خطاب، قرآن میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ درحقیقت ان کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ سب لوگ جان لیں کہ قوانین الٰہی میں کسی قسم کی تبعیض اور فرق و اختلاف قبول نہیں کیا جائے گا۔ عام لوگ تو ایک طرف خود انبیاء بھی ان سے ماوراء نہیں ہیں۔ اس بناء پر اگر بفرض محال پیغمبر بھی حق سے انحراف کرے تو وہ بھی عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔ اگرچہ انبیاء کے بارے میں ایسا مفروضہ ان کے ایمان، بے پناہ علم اور مقام تقویٰ و پرہیزگاری کے پیش نظر ممکن العمل نہیں اور اصطلاح میں اسے یوں کہتے ہیں کہ قضیہ شرطیہ وجود شرط پر دلالت نہیں کرتا۔

۲۔ تمام لوگ اپنا احتساب کرلیں اور جان لیں کہ جب پیغمبر کے بارے میں یہ معاملہ ہے تو انہیں پوری کوشش سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہئیں اور دشمن کے انحرافی میلانات اور شور و غوغا کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہئیں اور شکست تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔

۳۔ یہ واضح ہو جائے کہ پیغمبر بھی اپنی طرف سے کسی تبدیلی اور الٹ پھیر کا اختیار نہیں رکھتا اور ایسا نہیں کہ وہ جو چاہے



کرے بلکہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے اور اس کے فرمان کے تابع ہے۔

۱۴۶۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝

۱۴۷۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ ع

ترجمہ

۱۴۶۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہیں وہ اس (پیغمبر) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اگرچہ ان میں سے ایک گروہ حق کو پہچاننے کے باوجود اسے چھپاتا ہے۔

۱۴۷۔ (قبلہ کی تبدیلی کا یہ فرمان) تمہارے پروردگار کا حکم حق ہے لہذا ہرگز تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

تفسیر

وہ پیغمبر اکرمؐ کو پورے طور پر پہچانتے ہیں:

گذشتہ ابحاث کے بعد اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے بارے میں زیر نظر آیات میں گفتگو فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اہل کتاب کے علماء پیغمبر کو اپنی اولاد کی مانند اچھی طرح پہچانتے ہیں (الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم) اس پیغمبر کا نام، نشانیاں اور خصوصیات یہ اپنی مذہبی کتب میں پڑھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض کوشش کرتے ہیں کہ جان بوجھ کر حق کو چھپائے رکھیں (وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون)۔

ان میں سے ایک گروہ تو اسلام کی واضح نشانیوں کو دیکھ کر اسے قبول کر چکا ہے جیسا کہ عبداللہ بن سلام جو علمائے یہود میں سے تھا اور بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا، منقول ہے کہ وہ کہتا تھا:

انا اعلم بہ منی بابنی

میں پیغمبرؐ اسلام کو اپنے فرزند سے بھی بہتر پہچانتا ہوں۔[1]

یہ آیت ایک عجیب و غریب حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ پیغمبرؐ اسلام کی جسمانی و روحانی صفات اور ان کے علاقے کی نشانیاں گذشتہ کتب میں اس قدر زندہ، روشن اور واضح تھیں کہ جن سے آپ کی پوری تصویر ان لوگوں کے ذہنوں

---

[1] المنار، ج ۲ اور تفسیر کبیر از فخرالدین رازی (ذیل آیت زیر بحث)



میں موجود تھی جو ان کتب سے وابستہ تھے۔ کیا کسی کو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کتب میں پیغمبر اسلام کا کوئی نام و نشان نہ ہو اور پھر بھی پیغمبر اس صراحت سے ان کے سامنے کہیں کہ میری تمام صفات تمہاری کتب میں موجود ہیں، اگر ایسا ہوتا تو کیا اہل کتاب کے تمام علماء پیغمبر سے شدید اور صریح مقابلے پر نہ اتر آتے اور انہیں یہ نہ کہتے کہ یہ تم ہو اور یہ ہیں ہماری کتابیں، کہاں ہیں تمہارے وہ نام و صفات۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ان کا ایک عالم فقط اس بناء پر آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس لئے ایسی آیات صرف آپ کی سچائی اور حقانیت کی دلیل ہیں۔

اس کے بعد گذشتہ ابحاث کی تاکید کے طور پر قبلہ کی تبدیلی کے متعلق فرمایا: یہ فرمان تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، پس تم کبھی بھی تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا (الحق من ربك فلا تكونن من الممترين)۔ اس طرح اس جملے میں پیغمبر کی دلجوئی کی گئی ہے اور انہیں تاکید کی گئی ہے کہ وہ دشمن کے زہریلے پراپیگنڈا کے سامنے ذرہ برابر بھی تردد و شک کو راہ نہ دیں۔ چاہے قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ ہو یا کوئی اور چاہے دشمن اس کے خلاف اپنی تمام قوتیں جمع کر لیں۔

اس گفتگو میں اگر چہ مخاطب پیغمبر اکرم ہیں لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ واقع میں تمام لوگ مراد ہیں۔ ورنہ مسلم ہے کہ وہ پیغمبر جس کا وحی سے دائمی تعلق ہو کبھی کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ وحی اس کے لئے شہود، حس اور یقین کا درجہ رکھتی ہے۔

۱۴۸۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۱۴۸۔ ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے اس کے لئے معین کیا ہے (اس بناء پر اب قبلہ کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرو اور اس کی بجائے) نیکیوں اور اعمال خیر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، خدا تمہیں (اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا کے لئے قیامت کے دن) حاضر کرے گا، کیونکہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت یہودیوں کے جواب میں ہے جو قبلہ کی تبدیلی کے متعلق زیادہ شور و غل بپا کئے تھے۔ فرمایا: ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے معین کیا ہے (اور وہ اس کی طرف رُخ کرتا ہے۔ ولكل وجهة هو موليها)۔

انبیاء کی طویل تاریخ میں کئی ایک قبلے تھے اور ان کی تبدیلی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں۔ قبلہ کوئی اصول دین نہیں کہ جس میں تبدیلی و تغیر نہیں ہو سکتا اور نہ یہ کہ امور تکوینی کی طرح ہے کہ آگے پیچھے نہ ہو سکے لہٰذا قبلہ کے بارے میں زیادہ گفتگو



نہ کرو اور اس کی بجائے اعمال خیر اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ (فاستبقوا الخیرات)۔ بجائے اس کے کہ اس انفرادی مسئلے میں وقت صرف کرتے رہو خوبیوں اور پاکیزگیوں کی تلاش میں نکلو اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو کیونکہ تمہارے وجود کی قدر و قیمت نیک اور پاک اعمال ہیں۔

یہ مضمون بعینہٖ اس سورہ کی آیہ ۱۷۷ کی طرح ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج۔

نیکی یہ نہیں کہ اپنے چہرے مشرق و مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ خدا، روز جزاء، ملائکہ، کتاب اور انبیاء پر ایمان لے آؤ (اور نیک اعمال بجا لاؤ)۔

اب اگر تم اسلام یا مسلمانوں کو آزمانا چاہتے ہو تو ان پروگراموں میں آزماؤ نہ کہ قبلہ کی تبدیلی کے مسئلہ میں۔

اس کے بعد اعتراض کرنے والوں کو تنبیہ کرنے اور نیک لوگوں کو شوق دلانے کے لئے فرمایا: تم جہاں کہیں ہو گے خدا تم سب کو حاضر کرے گا (اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً) تاکہ نیک لوگوں کو عمل خیر کی جزا اور برے لوگوں کو عمل بد کی سزا دی جا سکے۔

ایسا نہیں کہ ایک گروہ تو بہترین کام انجام دے رہا ہو اور دوسرا ز ہر اگلنے، تخریب کاری کرنے اور دوسروں کے کاموں کو خراب کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ کرتا ہو اور پھر دونوں ایک جیسے ہوں اور ان کے لئے کوئی حساب و کتاب اور جزا سزا نہ ہو۔ چونکہ ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے یہ جملہ عجیب ہو کہ خدا خاک کے منتشر ذرات کو، وہ جہاں کہیں ہوں جمع کرے گا اور دوبارہ وہی انسان عرصہ وجود میں قدم رکھے لہذا بلا فاصلہ فرمایا: اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (ان اللہ علی کل شیئ قدیر) درحقیقت آیت کے آخر میں یہ جملہ اس سے پہلے والے جملے (اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً) کی دلیل ہے۔

چند اہم نکات

(۱) امام مہدیؑ کے یار و انصار جمع ہوں گے: آئمہ اہل بیتؑ سے مروی ہے کئی ایک روایات میں "اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً" سے اصحاب حضرت مہدیؑ مراد لیے گئے ہیں۔ منجملہ ان روایات کے کتاب روضہ کافی میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے اس جملہ کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد کیا:

یعنی اصحاب القائم الثلاثمائة والبضعة عشر رجلاهم واللہ الامة المعدودة قال یجتمعون واللہ فی ساعة واحدة قزع کقزع الخریف۔

اس سے مقصود اصحاب امام قائمؑ ہیں جو تین سو تیرہ افراد ہیں۔ خدا کی قسم "امت معدودہ" سے وہی مراد ہیں۔ بخدا موسم خریف کے بادلوں کی طرح سب ایک لحظے میں جمع ہو جائیں گے۔ جیسے وہ بادل تیز ہوا



کے نتیجے میں جمع ہو کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں [1]

امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے :

وذلك والله ان لو قام قائمنا يجمع الله اليه جميع شيعتنا من جميع البلدان ۔

بخدا جب حضرت مہدی قیام کریں گے خدا سب شہروں سے ہمارے تمام شیعوں کو ان کے پاس جمع کر دے گا۔ [2]

اگر قبل اور بعد کے قرائن نہ ہوتے تو یہ تفسیر قابل قبول تھی لیکن ان قرائن کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔[3] آیت میں "هُوَ مُوَلِّيهَا" کی شباہت "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا" سے ہے لیکن فرض کریں کہ یہ آیت اسی تفسیر کی طرف اشارہ ہے تو یہ جبری قضا و قدر کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ وہ قضا و قدر ہے جو آزادی کے مفہوم سے موافقت رکھتی ہو گی[4]

۱۴۹۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

۱۵۰۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

ترجمہ

۱۴۹۔ تم جس بھی جگہ (شہر اور مقام) سے نکلو (جب وقت نماز ہوتو) اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو، یہ قبلہ پروردگار کی طرف سے حکم حق ہے اور خدا تمہارے کردار سے غافل نہیں ہے۔

۱۵۰۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو اور تم (مسلمان) جہاں کہیں ہو اپنا رخ اس کی طرف کرو تاکہ

---

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۳۱۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۳۳۱

[3] یعنی یہ روایات آیت کی باطنی تفسیر ہیں۔ (مترجم)

[4] مزید وضاحت کے لئے کتاب انگیزۂ پیدائش مذہب، فصل قضا و قدر سے رجوع کریں۔



لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل وحجت نہ ہو۔ (کیونکہ گذشتہ کتب میں پیغمبر کی جو نشانیاں آئی ہیں ان میں یہ بھی تھی کہ وہ پیغمبر دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا)۔ ان لوگوں کے سوا جو ظالم ہیں (جو ہر صورت میں ہٹ دھرمی اور زہر اگلنے سے باز نہیں آتے لیکن) ان سے نہ ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرو (یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے تھی کہ میں تمہاری تربیت کروں، تمہیں تعصب کی قید سے نکالوں اور تمہیں استقلال عطا کروں) اور اپنی نعمت تم پر مکمل کردوں تاکہ تم ہدایت حاصل کرلو۔

تفسیر

یہ آیات تبدیلیٔ قبلہ کی مسئلے اور اس کے بعد پیش آنے والے امور کے بارے میں ہیں۔

پہلی آیت میں ایک تاکیدی حکم کے طور پر فرماتا ہے: جس جگہ (شہر اور علاقے) سے نکلو نماز کے وقت اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلو (ومن حیث خرجت فول وجہک شطر المسجد الحرام)۔

پھر تاکیدِ مزید کے طور پر فرماتا ہے: یہ حکم حق ہے اور تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے (وانہ للحق من ربک)۔

آیت کے آخر میں تنبیہ اور دھمکی کے طور پر سازش کرنے والوں سے کہتا ہے اور ساتھ ہی مومنین کو خبردار کرتا ہے: اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔

پے درپے تاکیدوں کا یہ سلسلہ جو اگلی آیت میں بھی جاری رہے گا۔ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ اور سابق حکم کی منسوخی ایک تازہ مسلمان گروہ کے لئے بہت گراں اور سنگین تھا نیز لیچڑ اور خشونت پسند دشمن کے لئے بھی زہر اگلنے اور پراپیگنڈا کرنے کا ذریعہ تھا۔

اس مقام پر اور ایسے دیگر تمام تحولات اور تکاملی انقلابات کے موقع پر ایسی قطعی صراحت اور پے درپے تاکیدیں ہی شکوک وشبہات کا ازالہ کرسکتی ہیں۔ کسی گروہ کا قائد ورہبر اگر ایسے حساس مواقع پر اٹل فیصلہ، حتمی ارادہ اور ناقابلِ تبدیل عزم کے ساتھ اپنا موقف معین کرے تو اس سے دوستوں کا ارادہ بھی مستحکم ہوتا ہے اور دشمن بھی ہمیشہ کے لئے مایوس ہوجاتا ہے۔ قرآن میں یہ نکتہ بار بار وضاحت سے نظر آتا ہے۔ نیز یہ تاکیدات محض تکرار نہیں بلکہ ان کے ساتھ نئے احکام بھی ہیں جیسے گذشتہ آیت میں شہر مدینہ میں مسلمانوں کی قبلہ کے بارے میں ذمہ داری کا تعین ہوا تھا لیکن اس اور اگلی آیت میں مسافر نمازیوں کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ہر مقام اور علاقے کے بارے میں حکم واضح کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں مسجد الحرام کی طرف رُخ کرنے کے بارے میں ہر مقام سے متعلق ایک عمومی حکم ہے۔ فرماتا ہے: جہاں سے نکلو اور جس طرف جاؤ، نماز کے وقت اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرلو (ومن حیث خرجت فول وجہک شطر المسجد الحرام)۔

یہ صحیح ہے کہ اس جملے میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے لیکن مسلماً اس کے مخاطب سب نماز پڑھنے والے ہیں



تاہم بعد کے جملے میں اس کی توضیح و تاکید کے لئے فرماتا ہے : اور تم (مسلمان) جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اس کی طرف کر لو (وحیث ماکنتم فولوا وجوهكم شطرہ)۔

پھر اسی آیت کے ذیل میں تین اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے :

۱۔ **مخالفین کو خاموش کرنا:** فرماتا ہے : یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے عمل میں آئی ہے تاکہ لوگ تمہارے خلاف حجت نہ لا سکیں (لئلا یکون للناس علیکم حجة ق) کیونکہ گذشتہ آسمانی کتب میں پیغمبر کی نشانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا۔ اگر قبلہ کی یہ تبدیلی صورت پذیر نہ ہوتی تو ایک طرف یہودیوں کی زبان مسلمانوں کے خلاف کھل جاتی اور وہ کہتے کہ تورات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پیغمبر موعود کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن محمدؐ میں یہ نشانی تو موجود نہیں اور دوسری طرف مشرکین اعتراض کرتے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ دین ابراہیمؑ کو زندہ کرنے آیا ہے تو پھر خانہ کعبہ کو کیوں فراموش کر دیا۔ جب کہ اس کی بنیاد ابراہیمؑ نے رکھی ہے۔ لیکن قبلہ کی اس تبدیلی نے ان کے یہ اعتراضات ختم کر دیئے۔ مگر ہمیشہ حیلہ باز اور ستم پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی منطق کو نہیں مانتے لہٰذا قرآن نے ان کے استثناء کو ملحوظ رکھا اور فرمایا: مگر ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے (الا الذين ظلموا منھم)۔

یہ کسی صراط مستقیم پر قائم نہیں ہیں۔ اگر تم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو تو کہتے ہیں یہ تو یہودیوں کا قبلہ ہے تم مسلمان اپنا کوئی مستقل قبلہ نہیں رکھتے اور اگر کعبہ کی طرف پلٹ آؤ تو کہتے ہیں کہ تم میں ثبات و بقار نہیں ہے تمہارا باقی دین بھی بہت جلد تبدیل ہو جائے گا۔

یہ بہانہ ساز اور حیلہ گر حق کے نام پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی ظلم روا رکھتے ہیں کیونکہ ان کی ہدایت میں سدِ راہ بنتے ہیں۔

۲۔ **ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو:** قرآن اس لیچڑ اور خشونت پسند گروہ کو ظالم قرار دینے کے بعد فرماتا ہے : ان کی زہریلی اور حوصلہ شکن باتوں سے ہرگز نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو (فلا تخشوھم واخشونی)۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ممکن تھا بعض لوگ ان سے وحشت زدہ ہوں۔

یہ تربیت توحید اسلامی کا ایک کلی اور بنیادی اصول ہے کہ خدا کے علاوہ (یا پھر نافرمانی حق کے سوا) کسی چیز یا شخص سے نہ ڈرنا ہر صاحب ایمان مسلمان کا شعار ہے۔ اگر روح و جان پر اس فکر کی حکمرانی ہو تو اہل ایمان کو کبھی شکست نہ ہوگی۔

لیکن وہ مسلمان نما جو اس حکم کے برعکس کبھی مشرقی طاقت سے خائف ہوں اور کبھی مغربی طاقت سے خوف زدہ، کبھی داخلی منافقین سے لرزاں ہوں کبھی خارجی دشمنوں سے ترساں — یعنی خدا کے سوا ہر چیز اور ہر شخص سے ڈریں وہ ہمیشہ زبوں حال، ذلیل اور شکست خوردہ رہیں گے۔

۳۔ **تکمیل نعمتِ خدا:** قبلہ کی تبدیلی کے ضمن میں آخری دلیل یوں بیان ہوئی ہے : یہ اس لئے ہوا کہ میں تمہاری



تربیت کروں، تمہیں تعصب کی قید سے چھڑاؤں اور اپنی نعمت تم پر تمام کروں تاکہ تمہاری ہدایت ہوسکے (ولاتم نعمتی علیکم و لعلکم تھتدون)۔

قبلہ کی تبدیلی درحقیقت مسلمانوں کے لئے ایک طرح کی تربیت اور تکمیل نعمت تھی تاکہ وہ نظم وضبط سے آشنا ہوں اور تقلید و تعصب سے دور ہو جائیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ خداوند عالم نے ابتداء میں مسلمانوں کی صفوں کو بت پرستوں سے ممتاز کرنے کے لئے حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو تاکہ ان کا مقام مشرکین کے مقابلے میں واضح ہو جائے کیونکہ مشرکین کعبہ کو سجدہ کرتے تھے جو اس وقت بہت بڑا بت خانہ بنا ہوا تھا لیکن ہجرت کے بعد جب حکومت اسلامی کی تشکیل ہو چکی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم صادر ہوا اور مسلمان توحید کے قدیم ترین مرکز کی طرف منہ کرنے لگے اور یوں تکامل تربیت کا ایک مرحلہ طے ہو گیا۔

۱۵۱۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۞

۱۵۲۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۞ ع

ترجمہ

۱۵۱۔ جس طرح (قبلہ کی تبدیلی کے ذریعے ہم نے تم پر اپنی نعمت کامل کی اسی طرح) ہم نے تمہارے درمیان تمہاری نوع اور جنس میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ تمہیں ہماری آیات پیش کرے۔ تمہاری پرورش و تربیت کرے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تمہیں بتائے۔

۱۵۲۔ تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور (نعمتوں کے جواب میں) کفران نعمت کا ارتکاب نہ کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیت کے آخری حصے میں خداوند عالم نے قبلہ کی تبدیلی کی ایک دلیل تکمیل نعمت اور ہدایت مخلوق بیان کی ہے۔ زیر بحث آیت میں لفظ "کما" اسی طرف اشارہ ہے کہ صرف قبلہ کی تبدیلی تمہارے لئے نعمت خدا نہیں بلکہ خدا نے تمہیں اور بھی بہت سی نعمتیں دی ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہاری نوع میں سے تمہارے لئے رسول بھیجا ہے۔ لفظ "منکم" (یعنی تمہاری جنس سے) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ وہ نوع بشر میں سے ہے اور صرف بشر ہی بشر کے لئے مربی، رہبر اور نمونہ ہو سکتا ہے اور وہی اپنی نوع کی تکالیف، ضروریات اور مسائل سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یا یہ مقصد ہے کہ وہ تمہارے قبیلہ و خاندان میں سے ہے اور تمہارا ہم وطن ہے کیونکہ شدید نسلی تعصب کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ عرب



کسی ایسے پیغمبر کے زیر بار ہوتے جو ان کی نسل و قوم میں سے نہ ہوتا جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۱۹۸ اور ۱۹۹ میں ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۙ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۙ

اگر ہم قرآن ایسے شخص پر نازل کرتے جو عرب نہ ہوتا اور وہ ان کے سامنے اسے پڑھتا تو یہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔

یہ ان کے لئے بہت اہم نعمت شمار ہوتی تھی کہ پیغمبر خود انہی میں سے تھے۔ البتہ یہ تو ابتدائے کار کی بات تھی لیکن آخر میں قوم، قبیلہ، وطن اور جغرافیائی سرحدوں کا معاملہ اسلامی پروگراموں سے حذف کر دیا گیا اور اسلام کے حقیقی اور دائمی قانون کا اعلان کیا گیا جو وطن، مذہب اور نسل کی بجائے انسانیت کو متعارف کراتا ہے۔

اس نعمت کے تذکرے کے بعد چار دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہیں پیغمبرؐ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں۔

۱۔ وہ ہماری آیات تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے: (یتلوا علیکم ایٰتنا)۔ لفظ "یتلوا" لغت میں تلاوت کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے پے در پے لے آنا۔ اسی لئے جب عبارتیں کسی مسلسل صحیح نظام کے تحت بن رہی ہوں تو عرب اسے تلاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی پیغمبر خدا کی باتیں ایک صحیح اور مناسب نظام کے تحت پے در پے تمہارے سامنے پڑھتا ہے تاکہ تمہارے دلوں کو تیار کرے کہ وہ انہیں قبول کریں اور ان کے معانی سمجھیں۔ یہ منظم اور مناسب تلاوت تعلیم و تربیت کے لئے آمادگی پیدا کرتی ہے۔ جس کی طرف بعد کے جملوں میں اشارہ ہوگا۔

۲۔ وہ تمہاری تربیت و پرورش کرتا ہے: (و یزکیکم)۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ تزکیہ کا معنی ہے بڑھانا اور نشو و نما دینا۔ یعنی پیغمبر آیات خدا کے ذریعے تمہارے معنوی و مادی اور انفرادی و اجتماعی کمالات کو بڑھاتا ہے اور تمہیں نمو بخشتا ہے۔ تمہارے وجود کی شاخوں پر فضیلت کے پھول کھلاتا ہے اور زمانہ جاہلیت کی بری صفات جو تمہارے معاشرے کو آلودہ کئے ہوئے ہیں ان کے زنگ سے تمہارے وجود کو پاک کرتا ہے۔

۳۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے: (و یعلمکم الکتاب والحکمۃ)۔ اگرچہ تعلیم، تربیت پر مقدم ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے کہ اصل مقصد تربیت ہے اسے تعلیم سے پہلے بیان فرمایا جو کہ تعلیم تو مقصد کے لئے وسیلہ ہے۔

باقی رہا کتاب و حکمت کا فرق یہ ممکن ہے کہ کتاب قرآن کی آیات اور وحی الٰہی کی طرف اشارہ ہو جو بصورت اعجاز پیغمبر پر نازل ہوئی اور حکمت سے مراد ہو پیغمبرؐ کی گفتگو اور تعلیمات جو حقائق قرآن کی وضاحت اور تفسیر کے لئے ہیں اور اس کے قوانین و احکام کو عملی شکل دینے کے لئے بیان فرمائی جاتی رہی ہیں۔ انہی تعلیمات کو سنت کہتے ہیں جن کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب احکام و قوانین کی طرف اور حکمت اسرار، فلسفہ، علل اور اس کے نتائج کی طرف اشارہ ہو۔



بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حکمت سے مراد وہ حالت اور استعداد ہے جو تعلیمات قرآن سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے انسان تمام امور کا حساب و کتاب رکھتا ہے اور ہر ایک کو اس کے مقام پر بجا لاتا ہے[1]

تفسیر المنار کا مؤلف یہ تفسیر ذکر کرکے کہ حکمت سے مراد سنت ہے اسے غیر صحیح قرار دیتا ہے اور اس کے لئے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۹ سے استدلال کرتا ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط

یہ ایسے امور ہیں جنھیں تمہارا پروردگار حکمت میں سے تم پر وحی کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس اعتراض کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ حکمت کا مفہوم وسیع ہے لہذا ہو سکتا ہے یہاں آیات قرآن اور وہ اسرار مراد ہوں جو وحی کے ذریعے پیغمبرؐ پر نازل ہوئے جہاں حکمت کا ذکر کتاب (قرآن) کے ساتھ آیا ہے (جیسے زیر نظر اور ایسی دیگر آیات) وہاں مسلماً حکمت سے مراد کتاب کے علاوہ کچھ اور ہے اور وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

۴۔ تم جو نہیں جانتے وہ تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے: (و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون)۔ یہ مفہوم اگرچہ گذشتہ جملے میں موجود ہے جس میں کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذکر ہے لیکن قرآن اسے خصوصیت سے الگ بیان کر رہا ہے تاکہ انہیں سمجھائے کہ اگر انبیاء و رسل نہ ہوتے تو بہت سے علوم ہمیشہ کے لئے مخفی رہتے۔ وہ فقط اخلاقی و اجتماعی رہبر نہیں ہیں۔ بلکہ علمی رہنما بھی ہیں ان کی رہنمائی کے بغیر انسانی علوم کے کسی پہلو میں پختگی ممکن نہ تھی۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت میں خدا نے اپنی پانچ نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ ہیں:

پہلی — پیغمبرؐ کا نوع بشر میں سے ہونا۔

دوسری — لوگوں کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرنا۔

تیسری اور چوتھی — تعلیم و تربیت کرنا۔ اور

پانچویں — لوگوں کو ان امور کی تعلیم دینا جو پیغمبرؐ کے بغیر وہ نہیں جانتے تھے۔

خدا کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت سے صحیح طور پر استفادہ کیا جائے جو سپاس گزاری کا طریقہ ہے اور کفران نعمت نہ کیا جائے۔

فرماتا ہے: مجھے یاد رکھو تاکہ میں تمہیں یاد رکھوں اور میرا شکر بجا لاؤ اور کفران نعمت نہ کرو (فاذکرونی اذکرکم و اشکروالی ولا تکفرون)۔

واضح ہے کہ "مجھے یاد کرو تاکہ میں تمہیں یاد کروں" یہ جملہ خدا اور بندوں کے درمیان کسی ایسے رابطے کی طرف اشارہ

---

[1] تفسیر فی ظلال، ج ۱، ص ۱۹۳۔



نہیں جیسے انسانوں کے درمیان ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں: تم ہمیں یاد کیا کرو ہم تمہیں یاد کیا کریں گے بلکہ یہ ایک تربیتی و تکوینی بنیاد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی مجھے یاد رکھو — ایسی پاک ذات کی یاد جو تمام خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور اس طرح اپنی روح اور جان کو پاکیزہ اور روشن رکھو اور رحمت پروردگار کی قبولیت کے لئے آمادہ رہو۔ اس ذات کی طرف متوجہ رہنا اور اسے یاد رکھنا ہر قسم کی فعالیتوں میں زیادہ مخلص، زیادہ مصمم، زیادہ قوی اور زیادہ متحد کرے گا۔

اسی طرح شکر گزاری اور کفرانِ نعمت نہ کرنا کوئی تکلفاً نہیں اور یہ فقط کلمات کی زبان سے ادائیگی نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر نعمت کو ٹھیک اس کی جگہ پر صرف کرنا اور اسی مقصد کی راہ میں خرچ کرنا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے تاکہ یہ امر خدا تعالیٰ کی نعمت و رحمت میں اضافے کا باعث ہو۔

چند اہم نکات

(۱) "فاذکرونی اذکرکم" کی تفسیر میں مفسرین کی موشگافیاں: مفسرین نے اس جملے کی تشریح میں بہت سی باتیں کی ہیں۔ بندوں کے یاد کرنے اور خدا کے یاد کرنے سے کیا مراد اس سلسلے میں بہت سے مفاہیم بیان کئے گئے ہیں جنہیں تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی نے دس موضوعات کے تحت جمع کیا ہے:

۱۔ مجھے اطاعت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں اپنی رحمت کے ذریعے تمہیں یاد کروں۔ اس مفہوم کی شاہد سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۲ ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

۲۔ مجھے دعا کے ساتھ یاد کرو تاکہ میں تمہیں اجابت کے ساتھ یاد کروں۔ اس کی شاہد سورہ مومن کی آیت ۶۰ ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ؕ

مجھ سے دعا کرو تو میں قبول کروں گا۔

۳۔ مجھے ثناء و طاعت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہیں ثناء و نعمت سے یاد کروں۔

۴۔ مجھے دنیا میں یاد کرو تاکہ میں تمہیں آخرت میں یاد کروں۔

۵۔ مجھے خلوتوں میں یاد کرو تاکہ میں تمہیں اجتماعات میں یاد کروں۔

۶۔ مجھے نعمتوں کی فراوانی کے وقت یاد کرو میں تمہیں سختیوں میں یاد کروں گا۔

۷۔ مجھے عبادت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہاری مدد کروں۔ اس کا شاہد سورہ الحمد کا یہ جملہ ہے:



اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

۸۔ مجھے مجاہدت و کوشش کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہیں ہدایت کے ذریعے یاد کروں۔ اس کی شاہد سورۂ عنکبوت کی آیہ ۶۹ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

۹۔ مجھے صدق و اخلاص سے یاد کرو میں تمہیں نجات اور مزید خصوصیت سے یاد کروں گا۔

۱۰۔ میری ربوبیت کا تذکرہ کرو میں رحمت کے ساتھ یاد کروں گا (ساری سورۂ حمد اس معنیٰ کی شاہد بن سکتی ہے)۔[1]

ان میں سے ہر مفہوم آیت کے وسیع جلووں میں سے ایک جلوہ ہے اور زیرِ نظر آیت میں یہ تمام مفاہیم بلکہ ان کے علاوہ بھی مطالب شامل ہیں مثلاً:

مجھے شکر کے ساتھ یاد کرو تاکہ میں تمہیں فراوانی نعمت سے یاد کروں۔ سورہ ابراہیم کی آیہ ۷ میں ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بے شک خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ تکوینی و تربیتی اثر رکھتی ہے۔ یاد خدا سے یہ اثر انسان تک پہنچتا ہے اور ان توجہات کے نتیجے میں روح و جان ان برکات کے نزول کی استعداد پیدا کر لیتی ہے جن کا تعلق یاد خدا سے ہے۔

(۱) ذکر خدا کیا ہے: یہ مسلم ہے کہ ذکر خدا سے مراد صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ زبان تو دل کی ترجمان ہے یعنی دل و جان سے اس کی ذات پاک کی طرف توجہ رکھا کرو۔ وہ توجہ جو انسان کو گناہ سے باز رکھے اور اس کے حکم کی اطاعت کے لئے آمادہ کرے۔ اسی بنا پر متعدد احادیث میں پیشوایانِ اسلام سے منقول ہے کہ ذکر خدا سے مراد عملی یاد آوری ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؑ کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ثلاث لا تطيقها هذه الامة: المؤاساة للحق فی ماله وانصاف الناس من نفسه و ذكر الله علی كل حال وليس هو سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر و لكن اذا ورد علی مايحرم الله عليه خاف الله تعالیٰ عنده وتركه۔

تین کام ایسے ہیں جو یہ امت (مکمل طور پر) انجام دینے کی توانائی نہیں رکھتی: اپنے مال میں دینی بھائی کے ساتھ مواسات و برابری، اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں عادلانہ فیصلہ

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی، ج ۴، ص ۱۴۴ (مختصر تفسیر اور کچھ اضافے کے ساتھ)۔



اور خدا کو ہر حالت میں یاد رکھنا اور اس سے مراد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی فعل حرام اس کے سامنے آئے تو خدا سے ڈرے اور اسے ترک کرے[1]

۱۵۳۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○

۱۵۴۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۵۳۔ اے ایمان والو! (زندگی کے سخت ترین حوادث کے موقع پر) صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ (کیونکہ) خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۱۵۴۔ جو راہِ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو، وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔

شانِ نزول

زیر نظر دوسری آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بعض مفسرین نے ابن عباس سے اس طرح نقل کیا ہے:

یہ آیت جنگ بدر میں قتل ہونے والوں کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ ان کی تعداد چودہ تھی، چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بعض لوگ اس طرح گفتگو کرتے کہ فلاں مر گیا — اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ شہداء کے لئے مردہ و میت کہنا صحیح نہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں تعلیم و تربیت اور ذکر و شکر کے متعلق گفتگو تھی۔ ان کے وسیع تر مفہوم جس میں اکثر دینی احکام شامل ہیں کو سامنے رکھتے ہوئے محل بحث پہلی آیت میں صبر و استقامت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جس کے بغیر گذشتہ مفاہیم کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔

پہلے فرمایا: اے ایمان والو! صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کرو (یایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ) اور ان دو قوتوں (استقامت اور خدا کی طرف توجہ) کے ساتھ مشکلات و سخت حوادث سے جنگ کے لئے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، صفحہ ۱۴۰ بحوالہ کتاب خصال۔



آگے بڑھو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (ان اللہ مع الصٰبرین)۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صبر کا معنیٰ ہے بدبختیوں کو گوارا کرنا۔ اپنے آپ کو ناگوار حوادث کے سپرد کرنا اور عوامل شکست کے سامنے ہتھیار ڈال دینا لیکن صبر کا مفہوم اس کے برعکس ہے۔ صبر و شکیبائی کا معنیٰ ہے ہر مشکل اور حادثے کے سامنے استقامت، اسی لئے بعض علماء اخلاق نے صبر کے تین پہلو بیان کئے ہیں۔

۱۔ اطاعت پر صبر (ان مشکلات کے مقابلے میں صبر کرنا جو اطاعت کی راہ میں پیش آئیں)۔

۲۔ گناہ پر صبر (سرکش و طغیان خیز گناہ اور شہوات پر ابھارنے والے اسباب کے مقابلے میں قیام کرنا)۔

۳۔ معصیبت پر صبر (ناگوار حوادث کے مقابلے میں ڈٹے رہنا، پریشان نہ ہونا اور حوصلہ نہ ہارنا)۔

ایسے موضوعات بہت کم ہیں جن کی صبر و استقامت کی طرح قرآن مجید میں تکرار و تاکید ہے۔ قرآن مجید میں تقریباً ستر مرتبہ صبر کے متعلق گفتگو ہوئی جن میں دس مقامات خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

بڑے بڑے جوانمردوں کے حالات زندگی گواہ ہیں کہ ان کی کامیابی کا اہم ترین یا واحد عامل صبر تھا جو لوگ اس خوبی سے بے بہرہ ہیں وہ بہت سے مصائب و آلام میں شکست کھا جاتے ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی پیش رفت اور ترقی میں جس قدر کردار صبر ادا کرتا ہے۔ اتنا اسباب، استعداد اور ہوشیاری کا عمل دخل نہیں۔

اسی بناء پر قرآن مجید میں نہایت تاکیدی انداز سے اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن ایک مقام پر کہتا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

صابرین بے حساب اجر و جزا حاصل کریں گے۔ (زمر-۱۰)

ایک اور مقام پر حوادث پر صبر کرنے کے بارے میں ہے:

ان ذٰلک من عزم الامور

یہ محکم ترین امور میں سے ہے۔

در اصل استقامت اور پامردی انسان کے بلند ترین فضائل میں سے ہے اور اس کے بغیر باقی فضائل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسی لئے نہج البلاغہ میں ہے:

علیکم بالصبر فان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد ولا خیر فی جسد لا رأس معہ ولا فی ایمان لا صبر معہ۔

صبر و استقامت تمہارے لئے لازمی ہے کیونکہ ایمان کے لئے صبر کی وہی اہمیت ہے جو بدن کے لئے سر کی، جیسے سر کے بغیر بدن کا کوئی فائدہ نہیں ایسے ہی صبر کے بغیر ایمان میں کوئی پائیداری نہیں اور نہ اس کا کوئی نتیجہ ہے [1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۸۲۔



اسلامی روایات میں صبر کو اس لئے اعلیٰ ترین قرار دیا گیا ہے تاکہ انسان گناہ کے وسائل مہیا ہونے کے باوجود استقامت دکھلائے اور لذتِ گناہ سے آنکھیں بند کرلے۔

ابتدائی انقلابی مسلمان چاروں طرف سے طاقتور، خونخوار اور بے رحم دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے لہٰذا محل بحث آیت میں انہیں خصوصیت سے حکم دیا گیا کہ مختلف حوادث کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیں۔ خدا پر ایمان کی صورت میں نتیجہ شخصی استقلال، اعتماد اور اپنی مدد آپ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام نے اس حقیقت کی بڑی وضاحت سے نشاندہی کی ہے کہ یہی تمام کامیابیوں کی حقیقی بنیاد تھی۔

دوسری چیز جو مندرجہ بالا آیت میں صبر کے ساتھ خصوصیت سے متعارف کرائی گئی ہے نماز ہے۔ اسی لئے اسلامی احادیث میں ہے:

کان علیؑ اذا اھالہ امر فزع قام الی الصلوٰۃ ثم تلی ھذہ الآیۃ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔

حضرت علیؑ کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تو نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے اور نماز کے بعد اس مشکل کو حل کرنے کے لئے نکلتے اور اس آیت کی تلاوت کرتے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔[1]

اس بات پر بالکل تعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ جب انسان ایسے سخت حوادث اور ناقابل برداشت مشکلات سے دوچار ہو تو وہ ان کے سامنے اپنی طاقت اور استطاعت کو ناچیز سمجھتا ہے اور قہراً وہ ایک ایسے سہارے کا محتاج ہوتا ہے جو ہر جہت سے غیر محدود اور لامتناہی ہو۔ نماز انسان کو ایسے ہی مبداء سے مربوط کردیتی ہے اور اس کا سہارا پاکر انسان مطمئن دل سے آسانی کے ساتھ مشکلات کی خوفناک موجوں کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔

اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں دراصل دو اصول سکھائے گئے ہیں ایک خدا پر بھروسہ کرنا جس کی طرف نماز اشارہ کرتی ہے اور دوسرا اپنی مدد آپ اور اپنے آپ پر اعتماد جسے صبر کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

پامردی، صبر اور استقامت کے مسئلے کے بعد دوسری آیت میں شہداء کی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس کا صبر و استقامت سے قریبی ربط ہے۔

پہلے ان لوگوں (شہداء) کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے فرمایا: جو راہِ خدا میں قتل ہوں اور شربتِ شہادت نوش کریں انہیں کبھی مردہ نہ کہو (ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط) اس کے بعد مزید تاکید سے فرمایا: بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور و ادراک نہیں رکھتے (بل احیاء ولکن لا تشعرون)۔

عموماً ہر تحریک میں ایک گروہ بزدل اور راحت طلب لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ایک طرف لے جاتا ہے اور کنارہ کش رہتا ہے۔ یہ لوگ اتنا ہی نہیں کرتے کہ خود کام نہ کریں بلکہ دوسروں کو بھی بددل کرنے کی کوشش کرتے

---

[1] المیزان، ج ۱، صفحہ ۱۵۲، بحوالہ کتاب کافی۔



ہیں۔ جب بھی کوئی ناخوشگوار حادثہ رونما ہوتا ہے تو یہ لوگ اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں اور اسے اس تحریک اور قیام کیلئے بے فائدہ اور بے مصرف ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ اس سے غافل ہیں کہ آج تک کوئی مقدس مقصد اور گراں قدر مشن قربانی یا قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہوا اور یہ اس دنیا کی ایک سنت رہی ہے۔ قرآن کریم بارہا ایسے لوگوں کے متعلق بات کرتا ہے اور انہیں سخت سرزنش اور ملامت کرتا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کا ایک گروہ ابتدائے اسلام میں بھی تھا جب کوئی شخص میدانِ جہاد میں شہادت کی سعادت حاصل کرتا تو یہ لوگ کہتے فلاں مرگیا اور اس کے مرنے پر اظہار افسوس کرکے دوسروں کے اضطراب کا سامان کرتے۔ خداوند عالم ایسی زہریلی گفتگو کے جواب میں ایک عظیم حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے اور صراحت سے کہتا ہے کہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کو مردہ کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں اور بارگاہ خدا سے معنوی غذا اور روزی حاصل کرتے ہیں، ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور وہ اپنی کامیاب سرنوشت سے مکمل طور پر خوش و خرم ہیں لیکن تم لوگ جو عالم مادہ کی محدود چار دیواری میں محبوس و مقید ہو ان حقائق کا ادراک نہیں کرسکتے۔

چند اہم نکات

(۱) شہداء کی ابدی زندگی: شہداء کی زندگی کیسی ہے اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ شہداء ایک طرح کی برزخی اور روحانی زندگی رکھتے ہیں کیونکہ ان کا جسم تو عموماً منتشر ہو جاتا ہے۔ امام صادقؑ کے ارشاد کے مطابق ان کی زندگی ایک مثالی جسم کے ساتھ ہے (وہ بدن جو عام مادے سے ماوراء ہے لیکن اس بدن کے مشابہ ہے جس کی تفصیل سورہ مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں آئے گی جس میں فرمایا گیا ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ)[1]۔

بعض مفسرین اسے شہداء کے ساتھ مخصوص ایک غیبی زندگی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس زندگی کی کیفیت اور انداز کا زیادہ علم نہیں رکھتے۔

کچھ مفسرین اس مقام پر حیات کو ہدایت اور موت کو جہالت کے معنی میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت کا معنی ہے کہ جو شخص راہ خدا میں قتل ہو جائے اسے گمراہ نہ کہو بلکہ وہ ہدایت یافتہ ہے۔

بعض شہداء کی دائمی زندگی کا مفہوم یہ قرار دیتے ہیں کہ ان کا نام اور مقصد زندہ رہے گا۔

جو تفسیر ہم بیان کرچکے ہیں اس کی طرف نظر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی احتمال بھی قابل قبول نہیں نہ اس کی ضرورت ہے کہ مجازی معنی میں آیت کی تفسیر کی جائے اور نہ برزخ کی زندگی کو شہداء سے مخصوص قرار دینے کی ضرورت ہے بلکہ شہداء ایک خاص قسم کی برزخی اور روحانی زندگی کے حامل ہیں انہیں رحمت پروردگار کی قربت

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۲، ص ۵۵۹۔ سورہ مومنون آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں۔



کا امتیاز حاصل ہے اور وہ طرح طرح کی نعمات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

(ii) مکتبِ شہید پرور: مسئلہ شہادت کی زیرِ نظر آیت اور قرآن کی دیگر آیات کے ذریعے اسلام نے ایک نہایت اہم اور تازہ عامل کے لئے میدان تیار کیا ہے۔ یہ وہ عامل ہے جس سے حق کے لئے باطل کے مقابلے میں جنگ کی سکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسا عامل ہے جس کی کارکردگی ہر قسم کے ہتھیار سے بڑھ کر ہے اور یہ ہر چیز سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ یہ عامل ہر دور کے خطرناک ترین اور وحشت ناک ترین ہتھیاروں کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے ملک ایران میں انقلاب اسلامی کی پوری تاریخ میں بڑی وضاحت سے دیکھی ہے کہ عشقِ شہادت ہر قسم کے ظاہری اسباب کی کمی کے باوجود مجاہدین اسلام کی کامیابی کا عامل بنا۔

اگر ہم تاریخِ اسلام اور ہمیشہ رہنے والے انقلابات میں اسلامی جہاد اور مجاہدین کے ایثار و قربانی کی تفصیلات پر غور کریں جنہوں نے اپنے پورے وجود سے اس دین پاک کی سربلندی کے لئے جانفشانی دکھائی ہے، تو ہمیں نظر آئے گا کہ ان تمام کامیابیوں کی ایک اہم وجہ اسلام کا یہ عظیم درس ہے کہ راہِ خدا اور طریقِ حق و عدالت میں شہادت کا معنی فنا، نابودی اور مرنا نہیں بلکہ اس کا مطلب ہمیشگی کی زندگی اور ابدی افتخار و اعزاز ہے۔

جن مجاہدین نے اس مکتبِ عظیم سے ایسا درس یاد کیا ہے ان کا مقابلہ کبھی عام جنگجوؤں سے نہیں کیا جا سکتا۔ عام سپاہی اپنی جان کی حفاظت کی فکر میں رہتا ہے لیکن حقیقی مجاہد کا مقصد اپنے مکتب کی حفاظت ہوتا ہے اور وہ پروانہ وار جان دیتا، قربان ہوتا اور فخر کرتا ہے۔

(iii) برزخ کی زندگی اور روح کی بقاء: اس آیت سے انسان کی حیاتِ برزخ (موت کے بعد اور دنیا سے پہلے کی زندگی) کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے جواب ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کی بقاء اور برزخ کی زندگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی۔

اس موضوع کی مزید تشریح، شہدا کی حیاتِ جاودانی، خدا کے ہاں اس کا بدلہ اور راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کا عظیم مرتبہ تفسیر نمونہ جلد سوم (سورہ آل عمران آیہ ۱۶۹ کے ذیل) میں پڑھیے گا۔

۱۵۵۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ۙ

۱۵۶۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ۭ

۱۵۷۔ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝



ترجمہ

۱۵۵۔ یقیناً ہم تم سب کی خوف، بھوک، مالی و جانی نقصان اور پھلوں کی کمی جیسے امور سے آزمائش کریں گے اور صبر و استقامت دکھانے والوں کو بشارت دیجئے۔

۱۵۶۔ وہ جنہیں جب کوئی مصیبت آپہنچے تو کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ جائیں گے۔

۱۵۷۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ الطاف و رحمتِ الٰہی جن کے شاملِ حال ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

طرح طرح کی خدائی آزمائش

راہِ خدا میں شہادت، شہداء کی ابدی زندگی اور صبر و شکر جن میں سے ہر ایک خدائی آزمائش کے مختلف رُخ ہیں کے ذکر کے بعد اس آیت میں بطور کلی آزمائش اور اس کی مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے یقینی اور غیر مبدل ہونے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ امر مسلم ہے کہ ہم تمہیں چند ایک امور مثلاً خوف، بھوک، مالی جانی نقصان اور پھلوں کی کمی کے ذریعے آزمائیں گے (ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ط)۔

چونکہ ان امتحانات میں کامیابی صبر و پائیداری کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا: اور بشارت دیجئے صبر و استقامت دکھانے والوں کو (وبشر الصٰبرین)۔

اور یہ ایسے افراد ہیں جو ان سخت آزمائشوں سے خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ انہیں بشارت دینا چاہیے۔ باقی رہے سست مزاج اور بے استقامت لوگ تو وہ آزمائشوں کے مقامات سے روسیاہ ہو کر واپس آتے ہیں۔ بعد کی آیت صابرین کے بارے میں زیادہ تشریح کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے اشخاص ہیں کہ جب کسی مصیبت کا سامنا کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم خدا کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے (الذین اذآ اصابتھم مصیبۃ" قالوآ انا للہ وانآ الیہ راجعون ط)۔

اس حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے کہ ہم اس کے لئے ہیں ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ نعمات زائل ہونے سے ہمیں کوئی دکھ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ تمام نعمتیں بلکہ خود ہمارا وجود اس سے تعلق رکھتا ہے۔ آج وہ ہمیں کوئی چیز بخشتا ہے اور کل واپس لے لیتا ہے، ان دونوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔

اس واقعیت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ ہم سب اسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جائیں گے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔ ان نعمتوں کا زوال اور ان عطیات کی کمی بیشی سب کچھ بہت جلد گذر جانے والی چیزیں ہیں اور یہ تکامل کا ذریعہ ہیں لہٰذا ان دو بنیادی اصولوں کی طرف توجہ کرنا صبر و استقامت کے جذبے کو بہت تقویت بخشتا



ہے۔

واضح ہے انا للہ و انا الیہ راجعون سے مراد صرف زبانی ذکر نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور روح کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اس کے مفہوم میں توحید و ایمان کی ایک دنیا آباد ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں عظیم امتحانات میں صبر کرنے والوں اور پامردی دکھانے والوں کے لیے خدا تعالیٰ کے عظیم لطف و کرم کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا لطف و کرم اور درود و صلوات ہے (اولئك عليهم صلوات من ربهم و رحمة)[1]۔

یہ الطاف اور رحمتیں انہیں قوت بخشتی ہیں کہ وہ اس پر خوف و خطر راستے میں اشتباہ اور انحراف میں گرفتار نہ ہوں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا: اور وہی ہدایت یافتہ ہیں (و اولئك هم المهتدون)۔

ان چند آیات میں خدا کی طرف سے عظیم امتحان اور اس کے مختلف رُخ نیز کامیابی کے عوامل اور امتحان کے نتائج کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) خدا لوگوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے: آزمائش اور امتحان کے مسئلے پر بہت گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے پہل جو سوال ذہن میں ابھرتا ہے یہ ہے کہ کیا آزمائش اور امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو چیزیں غیر واضح ہیں وہ واضح ہو جائیں اور ہماری جہالت و نادانی کے پلڑے میں کمی ہو سکے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر خداوند عالم جس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے اور جو ہر شخص اور ہر شے کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین و آسمان کے غیوب کو اپنے بے پایاں علم سے جانتا ہے، کیوں امتحان لیتا ہے۔ کیا کوئی چیز اُس سے مخفی ہے جو امتحان کے ذریعے آشکار ہو جائے گی۔

اس اہم سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔

آزمائش اور امتحان کا مفہوم خدا کے بارے میں اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو ہمارے درمیان مرّوج ہے۔ ہماری آزمائشوں کا مقصود وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی مزید معلومات حاصل کرنا اور ابہام و جہل کو دور کرنا لیکن خدا کی آزمائش در حقیقت پرورش و تربیت ہی کا دوسرا نام ہے جس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآن میں بیس سے زیادہ مقامات پر امتحان کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ یہ ایک قانون کلی ہے اور پروردگار کی دائمی سنت ہے کہ وہ پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے (جسے قوت سے فعل تک پہنچنے کا عمل کہتے ہیں)۔ وہ بندوں کو

---

[1] المنار کا مؤلف لکھتا ہے کہ صلوات سے مراد بہت زیادہ تکریم، کامیابیاں، خدا کے ہاں مقام بلند اور بندگانِ خدا میں سربلندی ہے اور ابن عباس سے منقول ہے کہ اس سے مراد گناہوں کی بخشش ہے (المنار، ج ۲، صفحہ ۴۰) لیکن واضح ہے کہ صلوات کا مفہوم وسیع ہے اس میں یہ تمام امور، رحمت کا سایہ اور نعمات الٰہی بھی شامل ہیں۔



تربیت دینے کے لئے آزماتا ہے جیسے فولاد کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اسے آب دینا کہتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ آدمی کو شدید حوادث کی بھٹی میں پرورش و تربیت کے لئے ڈالتا ہے اور اسے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

دراصل خدا کا امتحان اس تجربہ کار باغبان کی مانند ہے جو مستعد دانوں کو تیار زمینوں میں ڈالتا ہے۔ یہ دانے طبیعی عطیات سے استفادہ کرتے ہوئے نشوونما پاتے ہیں اور آہستہ آہستہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں، حوادث سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور سخت طوفان، کمر توڑ سردی اور جلا دینے والی گرمی کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاخوں پر خوبصورت پھول کھلتے ہیں یا وہ تنومند اور پرثمر درخت بن جاتے ہیں۔

فوجی جوانوں کو جنگی نقطۂ نظر سے طاقت ور بنانے کے لئے مصنوعی جنگی مشقیں کرائی جاتی ہیں اور انہیں طرح طرح کی مشکلات بھوک، پیاس، گرمی، سردی، دشوار حوادث اور سخت مسائل سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ قوی اور پختہ کار ہو جائیں۔ خدا کی آزمائشوں کی رمز بھی یہی ہے۔

قرآن مجید ایک مقام پر اس حقیقت کی تصریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

جو تمہارے سینوں میں ہے خدا اس کی آزمائش کرتا ہے تاکہ تمہارے دل مکمل طور پر خالص ہو جائیں اور وہ تمہارے سب اندرونی رازوں سے واقف ہے۔ (آل عمران-۱۵۴)

حضرت امیرالمومنین علیؑ نے امتحاناتِ الٰہی کی بڑی پُرمغز تعریف فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

و ان کان سبحانہ اعلم بھم من انفسھم ولکن لتظھر الافعال التی بھا یستحق الثواب والعقاب۔

اگرچہ بندوں کی نفسیات خود ان سے زیادہ جانتا ہے۔ پھر بھی انہیں آزماتا ہے تاکہ اچھے اور برے کام ظاہر ہوں جو جزا و سزا کا معیار ہیں[۱]

یعنی انسان کی اندرونی صفات ہی ثواب و عقاب کا معیار نہیں جب تک کہ وہ انسان کے عمل و کردار سے ظاہر نہ ہوں۔ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے تاکہ جو کچھ ان کی ذات میں پنہاں ہے وہ عمل میں آجائے اور استعداد، قوت سے فعل تک پہنچ جائے اور یوں وہ جزا یا سزا کا مستحق ہو جائے۔ اگر خدا کی آزمائش نہ ہوتی تو یہ استعدادیں ظاہر نہ ہوتیں اور انسانی شجر کی شاخوں پر اعمال کے پھل نہ لگتے۔ اسلامی منطق میں یہی خدائی آزمائش کا فلسفہ ہے۔

(۱۱) خدا کی آزمائش ہمہ گیر ہے: جہانِ ہستی کا نظام چونکہ تکامل، پرورش اور تربیت کا نظام ہے اور تمام موجودات تکامل کے سفر میں ہیں۔ درخت اپنی مخفی استعداد پھل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں تو سمندر کی لہریں طرح

---

[۱] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۹۳



طرح کی معدنیات کو ظاہر کرتی ہیں جس سے سمندر کی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

اس عمومی قانون کے مطابق انبیاء سے لے کر عامۃ الناس تک تمام لوگوں کی آزمائش ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی استعداد ظاہر کریں۔ خدا کے امتحانات کی مختلف صورتیں ہیں بعض مشکل ہیں اور بعض آسان ہیں لہذا ان کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بہرحال آزمائش اور امتحان سب کے لئے ہے۔

قرآن مجید انسانوں کے عمومی امتحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝

کیا لوگوں کا گمان ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔

(عنکبوت۔ ۲)

قرآن نے انبیاء کے امتحانات کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتا ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ

خدا نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ (بقرہ۔ ۱۲۴)

ایک اور مقام پر ہے:

فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ

جب سلیمانؑ کے پیروکار نے پلک جھپکنے میں دور کی مسافت سے تخت بلقیس حاضر کر دیا تو سلیمانؑ نے کہا یہ لطف خدا ہے تاکہ میرا امتحان کرے کہ کیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کفران نعمت کرتا ہوں: (سورۂ نمل۔ ۴۰)

(iii) **آزمائش کے طریقے:** مندرجہ بالا آیت میں ان امور کے چند نمونے بیان ہوئے ہیں جن سے انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ ان میں خوف، بھوک، مالی نقصان، جان دینا شامل ہیں لیکن آزمائش انہی طریقوں میں منحصر نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی قرآن میں الٰہی آزمائش کے کچھ طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً اولاد، انبیاء، احکام الٰہی حتیٰ کہ بعض خواب بھی آزمائش ہی کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح تمام نیکیاں اور برائیاں بھی خدائی آزمائشوں میں شمار ہوتی ہیں:

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ۔ (انبیاء۔ ۳۵)

اس بناء پر زیر نظر آیت میں امتحانات کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ انہی پر بس نہیں بلکہ یہ خدائی آزمائشوں کے واضح نمونے ہیں۔

ظاہر ہے کہ امتحانات کے نتیجے میں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے ایک جو امتحانات میں کامیاب ہو جائے گا اور دوسرا جو رہ جائے گا۔ مثلاً اگر کہیں مرحلۂ خوف درپیش ہو تو ایک گروہ اپنے تئیں اس سے دور رکھتا ہے تاکہ اُسے کوئی تھوڑا سا ضرر بھی نہ پہنچے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسئولیت اور جواب دہی سے بچتے ہیں۔ دوستی کے وسیلے نکال کر یا بہانے بنا کر جنگوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ان کی بات نقل کی گئی ہے:

نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ



ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی ضرر نہ پہنچے۔ (مائدہ - ۵۲)

یہ کہہ کر وہ خدائی ذمہ داری سے روگردانی کر لیتے ہیں۔

کامیاب ہونے والے وہ لوگ ہیں جو خوف کے عالم میں ڈٹے رہتے ہیں اور ایمان و توکل کے ساتھ بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو جانثاری کے لئے پیش کرتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○

جب لوگ اہل ایمان سے کہتے تھے کہ حالات خطرناک ہیں اور تمہارے دشمن تیار ہیں تم عقب نشین ہو جاؤ تو ان کے ایمان و توکل میں اضافہ ہو جاتا اور وہ کہتے ہمارے لئے خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔ (آل عمران - ۱۷۳)

مشکلات اور آزمائشی عوامل جن کا ذکر زیر بحث آیت میں آیا ہے مثلاً بھوک اور مالی و جانی نقصان، ان میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس سلسلے کے کچھ نمونے متن قرآن میں آئے ہیں جنہیں اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

(۱۷) آزمائشوں میں کامیابی کا راز: یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام انسان ایک وسیع خدائی امتحان میں شریک ہیں تو ان میں کامیابی کا راستہ کونسا ہے۔

محل بحث آیت اس سوال کا جواب دیتی ہے اور قرآن کی کئی ایک دیگر آیات بھی اس مسئلے کو واضح کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں اہم ہیں جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ امتحانات میں کامیابی کے لئے پہلا قدم وہی ہے جو اس چھوٹے سے پرمعنی جملے میں بیان کیا گیا ہے: وبشر الصٰبرین۔ یہ جملہ صراحت کرتا ہے کہ اس راہ میں صبر و استقامت کامیابی کی رمز ہے اسی لئے صابرین اور با استقامت لوگوں کو کامیابی کی بشارت دی جارہی ہے۔

۲۔ اس جہان کے حوادث، سختیاں اور مشکلیں گزر جانے والی ہیں اور یہ دنیا گزرگاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس امر کی طرف توجہ کامیابی کا دوسرا عامل ہے۔ جسے اس جملے میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْن

ہم خدا کے لئے ہیں اور ہماری بازگشت اسی کی طرف ہے۔

اصولی طور پر یہ جملہ جسے "کلمہ استرجاع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انقطاع الی اللہ یعنی تمام چیزوں اور تمام اوقات میں اس کی ذات پاک پر بھروسہ کرنا، کے عالی ترین درس کا نچوڑ ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بزرگان دین بڑے بڑے مصائب کے وقت قرآن سے الہام لیتے ہوئے یہ جملہ زبان پر جاری کرتے تھے تو یہ اس لئے ہوتا تھا کہ مصائب کی شدت انہیں ہلا نہ سکے اور خدا کی مالکیت اور تمام موجودات کی اس کی طرف بازگشت پر ایمان کے نتیجے میں وہ ان تمام حوادث کو گوارا کر لیں اور با استقامت رہیں۔



امیرالمومنین علیؑ اس جملے کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

ان قولنا "انا للّٰه" اقرار علی انفسنا بالملك و قولنا "و انا الیه راجعون" اقرار علی انفسنا بالهلك.

یہ جو ہم کہتے ہیں" انا للّٰه " تو یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اس کی ملکیت ہیں اور یہ جو کہتے ہیں" و انا الیه راجعون" تو یہ اس کا اقرار ہے کہ ہم فنا اور ہلاک ہوجائیں گے۔

۳- قوتِ الٰہی اور الطاف الٰہی سے مدد طلب کرنا ایک اور اہم عامل ہے کیونکہ عام لوگ جب حوادث سے دوچار ہوتے ہیں تو توازن برقرار نہیں رکھ پاتے اور اضطراب میں گرفتار ہوجاتے ہیں لیکن خدا کے دوستوں کا چونکہ واضح پروگرام اور ہدف ہوتا ہے لہذا وہ متحیر اور سرگرداں ہونے کی بجائے اطمینان و آرام سے اپنی راہ چلتے رہتے ہیں اور خدا بھی انہیں زیادہ روشن بینی عطا فرماتا ہے تاکہ انہیں صحیح راستے کے انتخاب میں اشتباہ نہ ہو جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

(عنکبوت - ۶۹)

۴- گذشتہ لوگوں کی تاریخ پر نظر رکھنا اور ان کے حالات کو سمجھنا خدائی آزمائشوں میں روح انسانی کی آمادگی اور ان امتحانوں میں کامیابی کے لئے بہت مؤثر ہے۔

انسان در پیش آنے والے مسائل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے تو اس سے مقابلے کی قوت کمزور پڑجاتی ہے لیکن اگر اس حقیقت کی طرف توجہ دی جائے کہ تاریخ کے طویل دور میں سب اقوام کے لئے تمام طاقت فرسا مشکلات اور خدا کی سخت آزمائشیں موجود رہی ہیں تو ہر قوم تلخ کے امتحانات کا نتیجہ انسان کی استقامت میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

اسی بناء پر قرآن مجید پیغمبر کو رغبت دلانے نیز ان کی اور مومنین کی روحانی تقویت کے لئے گذشتہ لوگوں کی تاریخ اور ان کی زندگی کے دردناک حوادث کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے :

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ

اگر آپ سے طنز و استہزاء کیا جاتا ہے تو گھبرائیے نہیں گذشتہ پیغمبروں سے بھی جاہل لوگ ایسا کرتے رہے ہیں۔ (انعام - ۱۰)

ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا

اگر آپ کی تکذیب کی جاتی ہے تو تعجب کی بات نہیں۔ گذشتہ انبیاء کی بھی تکذیب کی گئی ہے لیکن انہوں نے مخالفین کی اس تکذیب کے مقابلے میں اور جب انہیں آزار و تکلیف پہنچائی گئی پامردی و استقامت دکھائی۔ آخرکار ہماری نصرت و مدد ان تک آپہنچی۔ (انعام - ۳۴)



۵۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا کہ یہ تمام حوادث خدا کے سامنے رونما ہو رہے ہیں اور وہ تمام امور سے آگاہ ہے پائیداری کے لئے ایک اور عامل ہے۔ جو لوگ کسی سخت مقابلے میں شریک ہوں جب انہیں احساس ہو کہ ہمارے کچھ دوست میدانِ مقابلہ کے اطراف میں موجود ہیں، مشکلات برداشت کرنا ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ شوق وذوق سے مشکلات کا مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

جب چند تماشائیوں کا وجود روحِ انسانی کو اتنا متاثر کر سکتا ہے تو اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا کہ خداوندِ عالم میدانِ آزمائش میں میری کاوشوں کو دیکھ رہا ہے، اس جہاد کو جاری رکھنے کے لئے کس قدر عشق وولولہ پیدا کرے گا۔

قرآن کہتا ہے: جب حضرت نوح کو اپنی قوم کی طرف سے نہایت سخت ردِ عمل کا سامنا ہوا تو انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا گیا۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا

ہمارے سامنے کشتی بناؤ۔ (ہود۔ ۳۷)

باعیننا (ہمارے علم کی آنکھوں کے سامنے) اس لفظ نے حضرت نوح کو اس قدر قلبی قوت عطا کی کہ دشمنوں کا سخت رویہ اور استہزاء ان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہ کر سکا۔

سید الشہداء، مجاہدینِ راہِ خدا کے سردار حضرت امام حسینؑ سے یہی مفہوم منقول ہے۔ میدانِ کربلا میں جب آپؑ کے کچھ عزیز دردناک طریقے سے جامِ شہادت نوش کر چکے تو آپؑ نے فرمایا:

هون علیّ ما نزل بی انه بعین الله

میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ علمِ خدا کی نگاہوں کے سامنے انجام پا رہا ہے لہٰذا انہیں برداشت کرنا میرے لئے آسان ہے[1]

(۷) **نعمت وبلا کے ذریعے امتحان**: یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ خدا کے امتحانات ہمیشہ سخت اور ناگوار حوادث کے ذریعے ہی ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات خدا فراواں نعمتوں اور زیادہ کامیابیوں کے ذریعے بھی اپنے بندوں کو آزماتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ

اور ہم تمہارا امتحان برائیوں اور اچھائیوں کے ذریعے لیں گے۔ (انبیاء۔ ۳۵)

ایک اور مقام پر حضرت سلیمانؑ کا قول ہے:

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ

یہ میرے پروردگار کا فضل ہے۔ وہ چاہتا ہے مجھے آزمائے کہ میں اس نعمت پر اس کا شکر بجا لاتا

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۵ ص ۴۶



ہوں کہ کفرانِ نعمت کرتا ہوں۔ (نمل۔ ۴۰)

چند دیگر نکات بھی اس مقام پر قابلِ توجہ ہیں :

(الف) یہ ضروری نہیں کہ سب لوگوں کو سب طریقوں سے آزمایا جائے بلکہ ممکن ہے ہر گروہ کا ایک چیز سے امتحان ہو کیونکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر حالات اور طبائع کا لحاظ ضروری ہے۔

(ب) ہو سکتا ہے کہ ایک انسان کچھ امتحانات سے تو احسن طور پر کامیاب ہو جب کہ کچھ امتحانات میں سخت ناکامی سے دوچار ہو۔

(ج) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا امتحان دوسرے شخص کے امتحان کا ذریعہ ہو۔ مثلاً خداوند عالم کسی کو اس کے فرزند دلبند کی مصیبت میں ڈال کر آزماتا ہے اور یہی آزمائش دوسروں کو بھی میدان امتحان میں لے آتی ہے کہ وہ اس سے ہمدردی کے تقاضے پورے کرتے ہیں یا نہیں اور مصیبت زدہ کے درد والم میں اس کی کمک کی کوشش کرتے ہیں یا نہیں

(د) جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے خدائی امتحانات ہمہ گیر ہوتے ہیں یہاں تک کہ انبیاء بھی ان سے مستثنیٰ نہیں بلکہ ان کی آزمائش، ان کی مسئولیت اور جواب دہی کی سنگینی کے پیشِ نظر دوسروں سے کئی گنا سخت ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی کئی سورتوں کی آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انبیاء میں سے ہر کوئی اپنے حصے کے مطابق آزمائشوں کی گرم بھٹی میں ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں بعض تو مقامِ رسالت پر فائز ہونے سے پہلے ایک طویل عرصہ تک مختلف آزمائشوں میں مبتلا رہے۔ تاکہ مکمل طور پر قوی ہو جائیں اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی تیاری مکمل کر لیں[1]

مکتب انبیاء کے پیروکاروں میں بھی میدان امتحان میں صبر و استقامت کی ایسی درخشاں مثالیں موجود ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن سکتی ہیں۔

ام عقیل ایک دیہاتی مسلمان عورت تھی۔ اُس کے پاس دو مہمان آئے۔ اُس وقت اس کا بیٹا اونٹوں کے ساتھ صحرا کی طرف گیا ہوا تھا۔ اسی وقت اسے اطلاع ملی کہ ایک غضب ناک اونٹ نے اس کے بیٹے کو کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور وہ مر گیا ہے۔ بیٹے کی موت کی خبر لانے والے شخص کو اس مومنہ نے کہا سواری سے اترآؤ اور مہمانوں کی پذیرائی میں میری مدد کرو۔ اس کے پاس ایک بھیڑ تھی اس نے وہ اس شخص کو ذبح کرنے کے لئے دی۔ کھانا تیار ہو گیا اور مہمانوں کے پاس رکھ دیا گیا۔ وہ کھانا کھاتے اور اس کے صبر و استقامت پر تعجب کرتے۔ حاضرین میں سے ایک شخص کہتا ہے جب ہم کھانا کھانے سے فارغ ہو لئے تو وہ مومنہ ہمارے پاس آئی اور پوچھنے لگی تم میں سے کوئی شخص ہے جو قرآن سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایک شخص کہنے لگا ! جی ہاں، میں علم رکھتا ہوں۔ وہ کہنے لگی : قرآن کی کچھ ایسی آیات تلاوت کرو جو میرے بیٹے کی موت پر میرے دل کی تسلی کا باعث بنیں۔ وہ کہتا ہے : میں نے ان آیات کی تلاوت کی :

---

[1] "مقامِ رسالت پر فائز ہونے سے پہلے" یہاں مراد "اعلانِ رسالت سے قبل" ہے۔ (مترجم)



وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○

اس عورت نے ان سے رخصت چاہی اور پھر قبلہ رُخ کھڑی ہوگئی اور چند رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد بارگاہِ الٰہی میں یوں گویا ہوئی۔

اللھم انی فعلت ما امرتنی فانجزلی ما وعدتنی

خدایا! میں نے وہ کچھ کیا جس کا تو نے حکم دیا ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور تو نے جس رحمت وصلوات کا وعدہ کیا ہے وہ مجھے عطا فرما۔

اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر ایسا ہوتا کہ کوئی اس جہاں میں کسی کے لئے زندہ رہ سکتا۔

حاضرین میں سے ایک کہتا ہے: میں نے سوچا کہے گی، میرا بیٹا میرے لئے رہ جاتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کہہ رہی ہے: پیغمبر اسلام اپنی امت کے لئے باقی رہ جاتے۔[1]

۱۵۸۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۵۸۔ صفا و مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو لوگ خانہ خدا کا حج کریں یا عمرہ بجا لائیں ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کریں (اور سعی کریں اور مشرکین نے غیر مناسب طور پر ان پر جو بُت نصب کر رکھے ہیں ان سے دونوں مقاماتِ مقدسہ کی عظمت و حیثیت میں ہرگز کوئی کمی نہیں ہوئی) اور جو لوگ حکم خدا کی بجا آوری کے لئے اعمال خیر بجا لائیں خدا ان کا قدر دان ہے اور ان کے کردار سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

ظہور اسلام سے قبل اور اسی طرح بعد تک بت پرست مشرکین مناسک حج ادا کرنے مکہ آتے تھے اور وہ مراسم

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲ ص ... (مادہ صبر)



حج جس کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی، ان کے ساتھ کچھ خرافات اور شرک آلود افعال بھی بجالاتے تھے۔ مراسم حج میں عرفات میں قیام، قربانی، طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا شامل تھا لیکن ان اعمال کی صورت کافی بگڑ چکی تھی۔ اسلام نے پھر سے اس پروگرام کی اصلاح کی۔ صحیح اور شرک سے پاک مراسم کو تو باقی رکھا لیکن خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا۔ ان اعمال و مناسک میں جو انجام دیے جاتے تھے دو مشہور پہاڑیوں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا، یعنی چلنا بھی شامل تھا۔

شیعہ اور اہل تسنن دونوں کی بہت سی روایات میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین نے کوہ صفا پر ایک بہت بڑا بت نصب کر رکھا تھا جس کا نام اساف تھا۔ کوہ مروہ پر ایک اور بت گاڑا گیا تھا۔ جس کا نام نائلہ تھا۔ سعی کرتے وقت وہ ان دونوں پہاڑیوں پر چڑھتے اور ان بتوں کو متبرک سمجھتے ہوئے مس کرتے۔ مسلمان اس وجہ سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا کوئی ٹھیک بات نہیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ صفا و مروہ اللہ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں اگر کچھ نادان اور بیوقوف لوگوں نے انہیں بتوں کی نجاست سے آلودہ کر رکھا ہے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ مسلمان سعی جیسے فریضہ کو ترک کر دیں۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی۔ کچھ روایات کی بنا پر عمرۃ القضا (سات ہجری) کے وقت نازل ہوئی۔ اس سفر میں پیغمبرؐ کی مشرکین کے ساتھ ایک شرط یہ تھی کہ وہ ان دونوں بتوں کو صفا و مروہ سے اٹھا لیں گے انہوں نے اس شرط پر عمل کیا لیکن دوبارہ اسی جگہ نصب کر دیا۔ اس وجہ سے بعض مسلمان صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اس آیہ شریفہ نے انہیں منع کیا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع (پیغمبر اکرمؐ کے آخری حج سنہ ۱۰ھ) کے موقع پر نازل ہوئی۔ اگر یہ احتمال تسلیم کر لیا جائے۔ تو دوسری طرف یہ بھی مسلم ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ صفا و مروہ پر کوئی بت نہ تھا بلکہ مکہ کے گرد و پیش کہیں بھی بتوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔

لہٰذا ـــ قابل تسلیم بات یہ ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں مسلمانوں کی یہ ناراضی پہلے کی بات ہے جب اساف اور نائلہ بت ان پر رکھے ہوئے تھے۔

تفسیر

جاہلوں کے اعمال تمہارے مثبت اعمال میں حائل نہ ہوں

مخصوص نفسیاتی حالات میں یہ آیت نازل ہوئی، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے پہلے تو مسلمانوں کو خبر دی گئی کہ صفا و مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں (ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ)۔

اس مقدمہ اور تمہید کے بعد نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا ہے: جو لوگ خانہ خدا کا حج یا عمرہ بجالائیں ان کیلئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان طواف اور سعی کریں (فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان



یطوف بھما) مشرکین نے غلط طور پر ان خدائی شعائر کو جو بتوں سے آلودہ کر رکھا ہے ان سے ان دو مقدس مقامات کی اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ اطاعت خدا کے لئے نیک کام انجام دیں تو خدا بھی شاکر و علیم ہے (ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم ـــــ)

اللہ تعالیٰ اطاعت اور نیک کاموں کی انجام دہی کے بدلے اچھے عوض کے ذریعے بندوں کے اعمال کی قدردانی کرتا ہے اور شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کی نیتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون لوگ بتوں سے وابستگی رکھتے ہیں اور کون ان سے بیزار ہیں۔

چند اہم نکات

(۱) صفا و مروہ: صفا و مروہ مکہ کی دو چھوٹی سی پہاڑیوں کے نام ہیں۔ مسجد الحرام کی توسیع کے باعث آج کل یہ مسجد کے مشرقی حصے میں حجر الاسود اور مقام ابراہیم کی سمت میں واقع ہیں۔

یہ دونوں پہاڑیاں ایک دوسرے سے تقریباً ۴۲۰ میٹر کے فاصلے پر ہیں۔ اس وقت یہ فاصلہ ایک چھتے ہوئے بڑے ہال کی شکل میں ہے اور حجاج کرام اس چھت کے نیچے سعی کرتے ہیں۔ صفا پہاڑی کی بلندی پندرہ میٹر اور مروہ کی آٹھ میٹر ہے۔

صفا اور مروہ اس وقت دو پہاڑیوں کے نام ہیں (اصطلاح میں علَم کو کہتے ہیں) لیکن لغت میں صفا کا معنیٰ ہے مضبوط اور صاف پتھر جس میں مٹی، ریت اور سنگریزے نہوں اور مروہ کا معنیٰ ہے مضبوط اور درشت پتھر۔

شعائر جمع ہے شعیرہ کی، جس کا معنیٰ علامت اور نشانی ہے۔ شعائر اللہ وہ علامات ہیں جو انسان کو خدا کی یاد دلائیں اور کسی مقدس چیز کو نظروں میں نئے سرے سے اجاگر کر دیں۔

اعتمر، عمرہ کے مادہ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے کسی عمارت کے وہ اضافی حصے جو اس کے ساتھ ملائے جائیں تو اس کی تکمیل کا سبب بنیں۔ لیکن اصطلاح شریعت میں عمرہ ان مخصوص اعمال کو کہا جاتا ہے جو حج کے موقع پر اضافے کے طور پر اور کبھی جداگانہ طور پر عمرہ مفردہ کے نام پر انجام دیئے جاتے ہیں۔ عمرہ کئی ایک پہلوؤں سے حج سے مشابہت رکھتا ہے۔

(۲) صفا و مروہ کے کچھ اسرار و رموز: یہ صحیح ہے کہ عظیم لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھنا اور سننا انسان کو کمال کی طرف لے جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ صحیح، زیادہ عمیق اور گہرا طریقہ بھی موجود ہے اور وہ ہے ان مقامات کا مشاہدہ کرنا اور دیکھنا جہاں مردان خدا نے راہ خدا میں قیام کیا اور وہ مراکز جہاں ایسے واقعات عملاً رونما ہوئے۔

یہ مقامات و مراکز بذات خود زندہ اور جاندار تاریخ ہیں، تاریخ کی کتابیں تو خاموش اور بے جان ہیں۔ ایسے مقامات پر انسان کے لئے زمانی فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور وہ خود کو **اصل واقعہ** میں شریک محسوس کرتا ہے اور اسے یوں لگتا ہے کہ وہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

ایسے مشاہدات کا تربیتی اثر گفتگو اور مطالعہ کتب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ مقام احساس ہے منزل ادراک نہیں۔ یہ



سرِ بلا تصدیق ہے مقام تصور نہیں اور یہ عینیت ہے ذہنیت نہیں۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عظیم پیغمبروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح جہاد کے مختلف میدانوں اور شدید آزمائشوں سے گزرے ہوں یہاں تک کہ قرآن نے ان کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝

یقیناً یہ بہت واضح اور عظیم امتحان اور آزمائش ہے۔ (الصّٰفّٰت - ۱۰۶)

یہی مبارزات اور سخت آزمائشیں تھیں کہ جن نے حضرت ابراہیمؑ کی ایسے تربیت و پرورش کی کہ "امامت" کا تاج [illegible] ان کے سر پر رکھا گیا۔

مراسم حج درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کے مبارزات کے میدانوں، توحید، بندگی، فداکاری اور اخلاص کی منازل کی دلوں پر پوری منظر کشی کرتے ہیں۔

ان مناسک کی ادائیگی کے وقت اگر مسلمان ان کی روح اور اسرار سے واقف ہوں اور ان کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دیں تو یہ تربیت کی ایک بڑی درس گاہ اور خداشناسی، پیغمبر شناسی اور انسان شناسی کا ایک مکمل دورہ ہے۔

اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے واقعے اور صفا و مروہ کے تاریخی پہلوؤں کی طرف لوٹتے ہیں۔

ابراہیمؑ بڑھاپے کی منزل کو جا پہنچے تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے خدا سے اولاد کی درخواست کی۔ عالم پیری ہی میں ان کی کنیز ہاجرہ کے بطن سے انہیں فرزند عطا ہوا جس کا نام انہوں نے اسماعیل رکھا۔

آپ کی پہلی بیوی سارہ کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے علاوہ کسی خاتون کے بطن سے ابراہیمؑ کو فرزند ملے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ ماں بیٹے کو مکہ لے جا کر ٹھہرائیں جو اس وقت ایک بے آب و گیاہ بیابان تھا۔

ابراہیمؑ نے حکم خدا کی اطاعت کی اور انہیں سرزمین مکہ میں لے گئے جو ایسی خشک اور بے آب و گیاہ تھی کہ وہاں کسی پرندے کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ جب ابراہیمؑ انہیں چھوڑ کر تنہا واپس ہوئے تو ان کی اہلیہ نے لگیں کہ ایک عورت اور ایک شیرخوار بچہ اس بے آب و گیاہ بیابان میں کیا کریں گے۔

اس خاتون کے گرم آنسو اور ادھر بچے کا نالہ و زاری۔ اس منظر نے ابراہیمؑ کا دل ہلا کے رکھ دیا۔ انہوں نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا۔

خداوندا! میں تیرے حکم پر اپنی بیوی اور بچے کو اس جلا دینے والے بے آب و گیاہ بیابان میں تنہا چھوڑ رہا ہوں، تاکہ تیرا نام بلند اور تیرا گھر آباد ہو۔

یہ کہہ کر غم و اندوہ اور شدید محبت کے عالم میں الوداع ہوئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ماں کے پاس آب و غذا کا جو توشہ تھا ختم ہو گیا اور اس کی چھاتی کا دودھ بھی خشک ہو گیا۔ شیرخوار بچے کی بے تابی اور تضرع و زاری نے ماں کو ایسا مضطرب کر دیا کہ وہ اپنی پیاس بھول گئی۔ وہ پانی کی تلاش



میں اٹھ کھڑی ہوئی پہلے کوہِ صفا کے قریب گئی تو پانی کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا۔ سراب کی چمک نے اسے کوہِ مروہ کی طرف کھینچا تو وہ اس کی طرف دوڑی لیکن وہاں بھی پانی نہ ملا۔ وہاں ویسی چمک صفا پر دکھائی دی تو پلٹ کر آئی۔ زندگی کی بقاء اور موت سے مقابلے کے لئے اس نے ایسے سات چکر لگائے۔ آخر شیر خوار بچہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگا کہ اچانک اس کے پاؤں کے پاس انتہائی تعجب خیز طریقے سے زمزم کا چشمہ اُبلنے لگا۔ ماں اور بچے نے پانی پیا اور موت جو یقینی ہو گئی تھی اس سے بچ نکلے۔

زمزم کا پانی گویا آبِ حیات تھا۔ ہر طرف سے پرندے اُس چشمے کی طرف آنے لگے۔ قافلوں نے پرندوں کی پرواز دیکھی تو اپنے رُخ اس طرف موڑ دیئے اور بظاہر اً ایک چھوٹے سے خاندان کی فداکاری کے سلسلے میں ایک عظیم مرکز وجود میں آگیا۔

آج خانہ خدا کے پاس اس خاتون اور اس کے فرزند اسماعیلؑ کا مسکن ہے۔ ہر سال تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد اطرافِ عالم سے آتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس مسکن کو جسے مقام اسماعیلؑ کہتے ہیں اپنے طواف میں شامل کریں گویا اس خاتون اور اس کے بیٹے کے مدفن کو کعبہ کا جزو سمجھیں۔

صفا و مروہ کی سعی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ حق کا نام زندہ کرنے اور عظمت، استقلال اور آبادی کے لئے شیر خوار بچے تک کو جان کی بازی لگا دینا چاہیئے۔ صفا و مروہ کی سعی میں یہ سبق بھی پنہاں ہے کہ ناامیدیوں کے بعد بھی کئی امیدیں ہیں اسماعیلؑ کی والدہ جناب ہاجرہؑ نے وہاں پانی کی تلاش جاری رکھی جہاں وہ دکھائی نہ دیتا تھا تو خدا نے بھی ایسے راستے سے انہیں سیراب کیا جس کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صفا و مروہ ہم سے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب ہمارے اوپر بت نصب تھے لیکن آج پیغمبرِ اسلام کی مسلسل کوششوں اور جدوجہد سے شب و روز ہمارے پہلو میں لا الٰہ الا اللہ کی صدا گونج رہی ہے۔

صفا و مروہ کی پہاڑیاں حق رکھتی ہیں کہ وہ فخر کریں اور کہیں کہ ہم پیغمبرِ اسلام کی تبلیغات کی پہلی منزل ہیں۔ جب مکہ شرک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا تو آفتابِ ہدایت یہیں سے طلوع ہوا۔ اے صفا و مروہ کی سعی کرنے والو تمہارے دل میں یہ بات رہے کہ اگر آج ہزاروں افراد اس پہاڑی کے قریب پیغمبرؐ کی دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں تو ایک وقت وہ بھی تھا کہ نبی اکرمؐ اس پہاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے رہے تھے اور کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔ تم بھی حق کی راہ میں قدم اٹھاؤ اور اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملے جن سے مستقبل میں امید کی جا سکتی ہے تو مایوس نہ ہو جاؤ اور اپنے کام کو اسی طرح جاری رکھو۔

صفا و مروہ کی سعی ہمیں درس دیتی ہے کہ توحید کے اس مرکز اور آئین کی قدر و منزلت پہچانو کہ کتنوں نے اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر کے آج اس مرکزِ توحید کو تمہارے لئے محفوظ رکھا۔

اسی لئے خداوندِ عالم نے سب زائرینِ خانہ کعبہ پر واجب قرار دیا کہ مخصوص لباس اور مخصوص وضع قطع کے ساتھ جو ہر قسم کے امتیاز اور تشخص سے پاک ہو سات مرتبہ ان امور کی تجدید کے لئے ان دو پہاڑیوں کے درمیان چلیں۔ جو لوگ کبر



غرور کی وجہ سے عام لوگوں کے گزرنے کی جگہ پر ایک قدم اٹھانے کو تیار نہیں اور جو سڑکوں پر تیز رفتاری سے چلنا پسند نہیں کرتے وہی فرمان خدا کی اطاعت کے لئے کبھی آہستہ اور کبھی تیزی سے دوڑتے ہیں روایات کے مطابق یہ وہ جگہ ہے جہاں کے بارے میں دیے گئے احکامات متکبرین کو بیدار کرنے کے لئے ہیں۔

فمن حج البیت اواعتمر فلا جناح علیه ان یطوف بهما۔۔۔۔ لغت میں حج کا معنی قصد بیان کیا گیا ہے لیکن قرآن اور احادیث میں اس کا مفہوم وہ مخصوص اعمال اور مناسک ہیں جو مسلمان کا بین انجام دیتے ہیں۔

جب قرآن یہ بتا چکا کہ صفا و مروہ دو عظیم نشانیاں ہیں، لوگوں کی بندگی کا مرکز اور شعائر الٰہی ہیں۔ مزید کہتا ہے:

جو شخص خانہ خدا کا حج کرے یا عمرہ انجام دے اس کے لئے کوئی حرج نہیں کہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان چکر لگائے یہ عمل طواف کے لغوی معنی کے خلاف نہیں کیونکہ کسی طرح کا بھی چلنا ہو اگر انسان واپس وہیں آ جائے جہاں سے ابتداء کی تھی تو یہ طواف ہے چاہے وہ حرکت دائرہ کی صورت میں ہو جیسے خانہ کعبہ کے گرد طواف یا دائرہ کی صورت میں نہ ہو جیسے صفا و مروہ کے درمیان۔

(iii) **ایک سوال کا جواب:** یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے چاہے حج کے اعمال بجا لا نا ہوں یا عمرہ کے۔ لیکن "لاجناح" کے لفظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔

اس سوال کا جواب ان روایات سے واضح طور پر مل جاتا ہے جو شان نزول کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہیں۔ مسلمان یہ گمان کرتے تھے کہ ان دو پہاڑیوں پر ایک مدت تک اساف اور نائلہ بت رکھے رہے ہیں اور کفار سعی کرتے وقت انہیں مس کرتے تھے لہٰذا یہ اس قابل نہیں کہ مسلمان ان کے درمیان سعی کریں۔ اس آیت میں ان سے کہا گیا ہے کہ کوئی حرج نہیں تم سعی کرو چونکہ یہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہیں۔ لہٰذا "لاجناح"[1] دراصل اس کراہت اور ناپسندیدگی کو واضح طور پر دور کرنے کے لئے آیا ہے تاکہ اس کی اصل شرعی حیثیت واضح کرے۔ علاوہ ازیں قرآن میں بہت سے واجب احکام اس انداز سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً نماز مسافر کے بارے میں ہے:

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ

اگر سفر میں ہو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز قصر کر لو۔ (نساء - ۱۰۱)

حالانکہ یہ واقع ہے کہ مسافر پر نماز قصر واجب ہے نہ یہ کہ قصر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ قاعدۃً لفظ "لاجناح" ان مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں سننے والے کا ذہن پہلے سے اس چیز کے بارے میں پریشان ہو اور وہ منفی احساسات رکھتا ہو لہٰذا قرآن کی یہ روش بعض واجب احکام بیان کرنے کے بارے میں بھی ہے۔

---

[1] "جناح" کا اصل معنی ہے ایک طرف میلان، چونکہ گناہ انسان کو حق سے منحرف اور باطل کی طرف مائل کر دیتا ہے اس لئے اسے جناح کہا جاتا ہے۔



امام باقرؑ نے بھی ایک حدیث میں اس روش کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو کتاب من لا یحضرہ میں منقول ہے۔

(۶) تطوع کسے کہتے ہیں: لغت میں تطوع کا معنیٰ ہے اطاعت قبول کرنا اور احکام ماننا۔ عرف فقہاء میں تطوع مستحب اعمال کو کہا جاتا ہے اسی بناء پر اکثر مفسرین اسے مستحب حج، عمرہ یا طواف اور ہر قسم کے نیک مستحب عمل کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی جو شخص فرمانِ خدا کے تحت نیک عمل انجام دے تو خدا تعالیٰ اس کے کام سے آگاہ ہے اور اس کے بدلے میں اسے ضرور جزا دے گا۔

احتمال ہے کہ یہ لفظ گذشتہ جملوں کی تکمیل اور تاکید ہو اور تطوع سے مراد وہاں اطاعت کرنا جہاں انسان کے لیے مشکل ہو۔

اس بناء پر اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو حج یا عمرۂ واجب میں صفا و مروہ کی سعی اس کی پوری زحمت کے ساتھ انجام دیں اور عربوں کے جاہلانہ اعمال کی وجہ سے پیدا شدہ باطنی میلان کے برخلاف اپنا حج مکمل کریں تو خدا انہیں ضرور جزا دے گا۔

(۷) "خدا شاکر ہے" کا مفہوم: ضمناً اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ شاکر کا لفظ پروردگار کے لئے لطیف تعبیر ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے نیک اعمال کے انتہائی احترام کی مظہر ہے اور جب خدا بندوں کے اعمال کے پیشِ نظر شکرگزار ہوتا ہے تو اس سے بندوں کی ایک دوسرے کے بارے میں اور خدا کے بارے میں ذمہ داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۵۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ
لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝

۱۶۰۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ

۱۵۹۔ جو لوگ ان واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے نازل کیا جب کہ اُن لوگوں کے لئے ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور نفرین کرتے ہیں۔

۱۶۰۔ مگر وہ جو توبہ کرتے ہیں اور لوٹ آتے ہیں اپنے بُرے اعمال کی اصلاح کر کے نیک اعمال انجام دیتے ہیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اُسے آشکار کرتے ہیں تو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں کہ میں تواب و رحیم ہوں۔



شانِ نزول

جلال الدین سیوطی نے اسباب النزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد جن میں معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید شامل تھے نے علماء یہود سے تورات کے چند مطالب کے متعلق سوالات کئے جو پیغمبر کے ظہور سے مربوط تھے۔ انہوں نے اصل واقعے کو چھپایا اور وضاحت کرنے سے احتراز کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

ویسے تو روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن اس سے آیت کا کلی اور عمومی مفہوم محدود نہیں ہوتا اور یہ سب حقائق چھپانے والوں کے لئے عام ہے۔

یہ آیت شریفہ حقائق چھپانے والوں کی شدید مذمت اور سرزنش کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے کتاب الٰہی کے ذریعے نازل کیا ہے اور جو ان لوگوں کے سامنے ہیں ان پر خدا لعنت بھیجتا ہے اور خدا ہی نہیں بلکہ تمام لعنت کرنے والے انہیں لعنت کرتے ہیں (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنھم اللہ و یلعنھم اللّٰعنون)۔

یہ آیت بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے کہ خدا کے تمام بندے اور فرشتے اس کام سے بیزار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حق کو چھپانا ایسا عمل ہے جو حق کے تمام طرف داروں کے غم و غصے کو ابھارتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہو گی کہ علماء آیاتِ خدا کو اپنے شخصی منافع کے لئے چھپائیں اور لوگوں کو گمراہ کریں جب کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہیں۔

"من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب" اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد درحقیقت زحمات انبیاء اور مردانِ خدا کی فداکاریوں کو برباد کرتے ہیں جو وہ آیات الٰہی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لئے انجام دیتے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ "یلعن" آیت میں دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے فعل مضارع میں استمرار کا معنی شامل ہے۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ خدا اور تمام لعنت کرنے والے ہمیشہ ایسے لوگوں پر لعنت اور نفرین کرتے رہتے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں اور یہ شدید ترین سزا ہے جو کسی انسان کو دی جا سکتی ہے۔

"بینات" اور "ہدیٰ" کا ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد وہ تمام روشن دلائل اور ہدایت کے وسائل ہیں جو لوگوں کی آگاہی، بیداری اور نجات کا سبب ہیں۔

---

[1] لباب النقول فی اسباب النزول صفحہ ۲۴



قرآن کتاب ہدایت ہے لہٰذا یہ کبھی لوگوں کے لئے امید اور بازگشت کا دریچہ بند نہیں کرتی۔ اس لئے بعد کی آیت میں راہ نجات اور گناہوں کی تلافی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسے شدید سزا کے مقابلے میں یوں بیان کیا گیا ہے : مگر وہ جو توبہ کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں، اپنی برائیوں کی تلافی اور اعمال کی اصلاح کریں اور جو حقائق انہوں نے چھپا رکھے تھے لوگوں کے سامنے آشکار کردیں، بے شک میں ایسے لوگوں کو بخش دوں گا اور ان کے لئے اپنی اس رحمت کی تجدید کردوں گا جو ان سے منقطع کی جا چکی ہے کیونکہ میں بازگشت کنندہ اور مہربان ہوں (الا الذین تابوا و اصلحوا و بینوا فاولئك اتوب علیھم و انا التواب الرحیم)۔

اگر دیکھا جائے "فاولئك اتوب علیھم" کے بعد "انا التواب الرحیم" کا آنا توبہ کرنے والوں کے لئے پروردگار عالم کی انتہائی محبت اور کمال مہربانی پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی فرماتا ہے : اگر وہ پلٹ آئیں تو میں بھی رحمت کی طرف پلٹ آؤں گا اور اپنی عنایات و نعمات جو ان سے منقطع کرچکا ہوں پھر سے انہیں عطا کروں گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یوں نہیں کہا کہ تم توبہ کرو تو میں تمہاری توبہ قبول کرلوں گا بلکہ کہتا ہے : تم توبہ کرو اور پلٹ آؤ تو میں بھی پلٹ آؤں گا۔ ان دونوں جملوں میں جو فرق ہے واضح ہے۔

علاوہ ازیں "و انا التواب الرحیم" کے ہر لفظ اور انداز میں اتنی مہربانی اور شفقت پائی جاتی ہے کہ یہ مفہوم کسی اور عبارت میں سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "انا" واحد متکلم کی ضمیر ہے جس کا معنیٰ ہے "میں خود"۔ یہ ایسے مقامات پر آتا ہے جہاں کہنے والا براہ راست سننے والے سے ربط رکھتا ہو۔ خصوصاً اگر کوئی بزرگ ہستی یہ کہے کہ "میں خود یہ کام تمہارے لئے کروں گا" بجائے اس کے کہ وہ کہے "ہم اس طرح کریں گے"، تو اس میں بہت فرق ہے۔ پہلے انداز میں جو لطف و کرم ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لفظ "تواب" بھی مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے بہت زیادہ پلٹ کر آنے والا۔ یہ انداز اس طرح امید کی روح انسان میں پھونک دیتا ہے کہ اس کی زندگی کے آسمان سے یاس و ناامیدی کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور جب لفظ "رحیم" بھی ساتھ ہو جو پروردگار کی خصوصی رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **حق کو چھپانے کے نقصانات :** وہ بات جو قدیم زمانے سے بہت مفاسد اور حق کشی کا باعث بنتی آرہی ہے اور جس کے مہلک اثرات آج تک جاری و ساری ہیں وہ ہے حق کو چھپانا۔ زیر بحث آیت اگرچہ ایک خاص واقعے کے متعلق نازل ہوئی لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا مفہوم ان سب پر محیط ہے جو ایسا کچھ بھی کردار ادا کرتے ہیں۔

جیسی منحصر بفرد تشدید و تہدید اور مذمت زیر نظر آیت میں حق کو چھپانے والوں کے لئے آئی ہے کسی اور کے لئے نہیں آئی اور کیوں نہ ہو، کیا ایسا نہیں کہ یہ قبیح عمل قوموں اور نسلوں کو گمراہی میں مبتلا کئے رکھتا ہے جیسا کہ اظہار حق امتوں کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔



انسان فطری طور پر حق کو چاہتا ہے اور جو حق کو چھپاتے ہیں وہ در حقیقت انسانی معاشرے کو فطری کمال تک پہنچنے سے باز رکھتے ہیں۔ ظہور اسلام کے وقت اور اس کے بعد اگر علماء یہود و نصاریٰ دونوں عہدوں (تورات، انجیل اور دیگر کتب مقدسہ) کی بشارتوں کو اظہار حقیقت کے طور پر افشاء کر دیتے اور اس سلسلے میں وہ جو کچھ جانتے تھے لوگوں تک پہنچا دیتے تو ہو سکتا تھا کہ تھوڑی سی مدت میں تینوں ملتیں ایک ہی پرچم تلے جمع ہو جائیں اور اس وحدت کی برکات حاصل کرتیں اور یہی کام پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد اہل اسلام کے بعض علماء نے انجام دیا۔ وہ حق کو چھپاتے رہے ان کی وجہ سے ملت اختلاف کا شکار ہوئی اور اس میں شگاف پڑ گئے۔ آج تک ہم اسی کے نتیجے میں مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ یقیناً حق پوشی صرف اسی کا نام نہیں کہ آیات الٰہی اور علامات نبوت کو چھپایا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ چیز چھپانا ہے جس سے لوگ حقیقت و واقعیت تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کا مفہوم وسیع ہے۔

یہاں تک کہ کبھی وہاں بھی حق پوشی کا اطلاق ہوتا ہے جہاں بات کرنے کی ضرورت ہو اور خاموش رہا جائے۔ یہ اس مقام کے لئے ہے جہاں لوگوں کو سخت ضرورت ہو کہ انہیں حقیقت حال سے باخبر کیا جائے اور علماء اور آگاہ دانشور اس یقینی ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کو درپیش مسائل کے بارے میں حقائق کو مخفی رکھنا اس لئے کہ لوگ سوال کریں درست نہیں۔ تفسیر المنار کے مؤلف نے بعض لوگوں کے حوالے سے یہ جو لکھا ہے کہ سوال کی خاطر حقائق کو چھپایا جا سکتا ہے درست نظر نہیں آتا۔ خصوصاً یہ اس بناء پر بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن فقط حق کو چھپانے کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ وہ حقائق کے بیان اور اظہار کو ضروری شمار کرتا ہے۔

شاید اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض علماء نے حقائق بیان کرنے سے منہ بند کر رکھے ہیں۔ ان کا عذر ہے کہ ان سے تو کسی نے سوال نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ

خدا نے جنہیں کتاب عطا کی ہے اُن سے عہد و میثاق لیا ہے کہ وہ اسے ضرور لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اُسے چھپائیں گے نہیں۔ (آل عمران - ۱۸۷)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات فرعی مسائل میں سرگرم رہنا جس سے لوگ زندگی کے حقیقی مسائل کو فراموش کر بیٹھیں یہ بھی ایک قسم کی حق پوشی ہے۔ اگرچہ حق پوشی کا معنی یہ نہیں لیکن حقائق کو مخفی رکھنے کا فلسفہ اس پر بھی محیط ہے۔ احادیث اسلامی میں بھی ان علماء پر شدید ترین حملے کئے گئے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں۔ پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

من سئل عن علم يعلمه فكتم الجم يوم القيامة بلجام من النار

اگر کسی شخص سے ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت



کے دن آتش جہنم کی ایک لگام اس کے منہ میں دی جائے گی۔[1]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض اوقات ضرورت اور لوگوں کا کسی مسئلے میں مبتلا ہونا خلات خود سوال بن جاتا ہے۔

ایک اور حدیث جو امیرالمومنین علیؑ سے مروی ہے، بیان کی جاتی ہے۔

لوگوں نے آپؑ سے پوچھا:

من شر خلق اللہ بعد ابلیس و فرعون

ابلیس اور فرعون کے بعد بدترین خلائق کون ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

العلماء اذا فسدوا هم المظهرون للاباطیل الکاتمون للحقائق وفیهم قال اللہ عزوجل اولٰئك یلعنهم اللہ ویلعنهم اللعنون۔

وہ بگڑے ہوئے علماء ہیں جو باطل کا اظہار اور حق کا اخفاء کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق خدا فرماتا ہے: ان پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی نفرین ہو گی۔[2]

(ii) **لعنت کیا چیز ہے:** لعن کا اصلی معنی ہے غصے سے دھتکارنا اور دور کرنا۔ اس بناء پر خدا کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ بندوں سے اپنی وہ رحمت اور تمام عنایات و برکات دور کرے جو اس کی جانب سے انہیں پہنچتی ہیں۔

بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ لعنت، آخرت میں عذاب و عقاب اور دنیا میں سلب توفیق کا نام ہے۔ یہ دراصل لعنت کا ایک مصداق ہے نہ یہ کہ یہ لفظ فقط ان دو معانی میں منحصر ہے۔

"لاعنون" یعنی لعنت کرنے والے۔ اس کا ایک وسیع معنی ہے۔ اس میں نہ صرف فرشتے اور مومنین شامل ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ہر وہ موجود جو زبان حال یا مقال سے کلام کرتا ہے اس میں داخل ہے۔ اس سلسلے کی چند روایات میں تو یہاں تک ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات حتیٰ کہ دریا کی مچھلیاں بھی طالبانِ علم و علماء کے لئے دعائے خیر اور استغفار کرتی ہیں:

و انه یستغفر لطالب العلم من فی السماء و من فی الارض حتی الحوت فی البحر۔[3]

تو جہاں وہ موجودات طالب علموں کے لئے استغفار کرتے ہیں وہاں علم کو چھپانے والوں کے لئے یقیناً لعنت بھی کرتے ہیں۔

(iii) **تواب:** اس لفظ کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر انسان شیطانی وسوسوں سے فریب کھا کر توبہ توڑ دے تو بھی اس پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔ چاہیئے کہ وہ پھر توبہ

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۱۳۹ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[3] اصول کافی، ج ۱، باب "ثواب العالم والمتعلم" حدیث اول۔

کرے اور خدا کی طرف پلٹے اور حق کو ظاہر کرے۔ کیونکہ خدا بہت زیادہ بازگشت کرنے والا ہے۔ اس کی رحمت و بخشش سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

۱۶۱۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

۱۶۲۔ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝

۱۶۳۔ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ

۱۶۱۔ جو لوگ کافر ہو جائیں اور حالتِ کفر ہی میں مر جائیں ان پر خدا، فرشتے اور تمام انسان لعنت کرتے ہیں۔

۱۶۲۔ وہ ہمیشہ کے لئے زیرِ لعنت اور رحمتِ خدا سے دور رہیں گے۔ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔

۱۶۳۔ تمہارا خدا اور معبود وہ اکیلا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں کیونکہ وہی بخشنے والا اور مہربان ہے (رحمت عام اور رحمت خاص کا مالک وہی ہے)۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم حق کو چھپانے کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ زیرِ نظر آیات میں بھی انہی کفار کی طرف اشارہ ہے جو ہٹ دھرمی، حق پوشی، کفر اور تکذیبِ حق کا سلسلہ موت آنے تک جاری رکھتے ہیں۔

فرمایا: وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور حالتِ کفر میں دنیا سے چل بسے ہیں ان پر خدا، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہوگی (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولٰئک علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین)۔

یہ گروہ بھی حق کو چھپانے والوں کی طرح خدا، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کیونکہ یہ آخر عمر تک کفر پر مصر رہے۔

مزید فرمایا: یہ ہمیشہ خدا اور بندگانِ خدا کی لعنت کے زیرِ سایہ رہیں گے۔ ان پر عذابِ الٰہی کی تخفیف نہ ہوگی، نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی (خٰلدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون)۔

ان بدبختیوں کی وجہ سے چونکہ اصل توحید ختم ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر آخری آیت میں فرمایا: تمہارا معبود اکیلا خدا ہے۔ (والٰھکم الٰہ واحد)۔ مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں (لا الٰہ الا ھو)۔



آیت کے آخر میں دلیل وعلت کے طور پر فرماتا ہے: وہ خدا بخشنے والا مہربان ہے (الرحمن الرحیم) بے شک وہ جس کی عام وخاص رحمت سب پر محیط ہے۔ جس نے مومنین کے لئے خصوصی امتیازات قرار دیئے ہیں یقیناً وہی لائق عبادت ہے نہ کوئی اور جو سرتا پا احتیاج ہے۔

چند اہم نکات

(۱) حالت کفر میں مرنا: قرآن مجید کی بہت سی آیات سے یہ نکتہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ حالت کفر اور حق سے دشمنی کرتے ہوئے دنیا سے جائیں ان کے لئے کوئی راہِ نجات نہیں ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے، کیونکہ آخرت کی سعادت یا بدبختی تو براہِ راست ان ذخائر اور وسائل کا نتیجہ ہے جو ہم اس دنیا سے اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ جس شخص نے اپنے پر وبال کفر اور حق دشمنی میں جلا دیئے ہیں وہ یقیناً اُس جہان میں طاقتِ پرواز نہیں رکھتا اور دوزخ کے گڑھوں میں اس کا گرنا یقینی ہے کیونکہ دوسرے جہاں میں اعمال بجالانے کا کوئی موقع نہ ہوگا لہٰذا ایسا شخص ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص شہوت رانیوں اور ہوس بازیوں کی وجہ سے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں کھو بیٹھے اور آخری عمر تک نابینا رہے۔

واضح ہے کہ یہ بات ان کفار سے مخصوص ہے جو جان بوجھ کر کفر اور حق دشمنی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مسئلہ خلود کے بارے میں مزید توضیح سورہ ہود کی آیت ۱۰۷ اور ۱۰۸، جلد ۹ کے ذیل میں پڑھیے گا۔

(۲) خدا اپنی یکتائی میں یکتا ہے: مندرجہ بالا تیسری آیت میں خدا کی ایسی یکتائی بیان کی گئی ہے جو ہر قسم کے انحراف اور شرک کی نفی کرتی ہے۔ کبھی ایسے موجودات بھی نظر آتے ہیں جو ایسی صفات کے حامل ہیں جو منحصر بفرد ہیں اور اصطلاح کے مطابق یکتا ہیں۔ لیکن کہے بغیر واضح ہے کہ وہ سب موجودات ایک یا چند صفات مخصوصہ میں تو ممکن ہے منحصر بفرد اور یکتا ہوں جب کہ خدا ذات وصفات اور افعال میں یکتا و اکیلا ہے۔ عقلی طور پر خدا کی یکتائی قابل تعدد نہیں۔ وہ ازلی وابدی یکتا ہے۔ وہ ایسا یکتا ہے کہ اس پر حوادث اثر انداز نہیں ہوتے۔ اُس کی یکتائی ذہن میں بھی ہے اور خارج از ذہن بھی۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی یکتائی میں بھی یکتا ہے۔

(۳) کیا خدا کی لعنت کافی نہیں ہے: مندرجہ بالا آیات کے مطابق خدا کے علاوہ حق پوشی کرنے والوں پر سب لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑتی ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا خدا کی لعنت کافی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے کہ درحقیقت یہ ایک طرح کی تاکید ہے اور ایسے قبیح اور بُرے افعال انجام دینے والوں کے لئے تمام جہانوں کی طرف سے تنفر و بیزاری کا اظہار ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں لفظ "ناس" بطور عموم کیوں استعمال ہوا ہے جب کہ جرم میں شریک لوگ تو کم از کم ایسے ایسے مجرموں پر لعنت نہیں کرتے۔

ہم کہیں گے ـــــ حالت تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے اس عمل قبیح سے متنفر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص خود ان



کے بارے میں حق پوشی کرے تو یقیناً انہیں تکلیف ہوگی اور وہ اس پر نفرین کریں گے لیکن جہاں ان کے اپنے منافع کا معاملہ ہو وہاں یہ لوگ استثنائی طور پر چشم پوشی کرتے ہیں۔

۱۶۴- إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ص وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۴- آسمانوں اور زمین کی خلقت میں رات دن کے آنے جانے میں، انسانوں کے فائدے کے لئے دریا میں چلنے والی کشتیوں میں، خدا کی طرف سے آسمان سے نازل ہونے والے اس پانی میں جس نے زمین کو موت کے بعد زندگی دی ہے اور ہر طرح کے چلنے والے اس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہواؤں کے چلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہیں (خدا کی ذات پاک اور اس کی یکتائی کی) ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر رکھتے ہیں۔

تفسیر

آسمان و زمین میں اس کی ذات پاک کے جلوے ہیں

گذشتہ آیت سے توحید پروردگار کی بحث شروع ہوتی ہے۔ زیر نظر آیت درحقیقت خدا کی توحید کے مسئلے اور اس کی ذات پاک کی یکتائی پر ایک دلیل ہے۔

مقدمہ اور تمہید کے طور پر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ نظم و ضبط، علم، دانش اور عقل کے وجود کی دلیل ہے۔ خداشناسی کی کتب میں ہم اس بنیاد کی تشریح کر چکے ہیں کہ عالم ہستی میں جب نظم و ضبط کے مظاہر نظر پڑتے ہیں اور نظام قدرت کی ہم آہنگی اور وحدت عمل پر نگاہ جاتی ہے تو فوراً توجہ ایک اکیلے مبداء علم و قدرت کی مائل ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

مثلاً جب ہم آنکھ کے سات پردوں میں سے کسی ایک بناوٹ پر بھی غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ امر کسی بے شعور، اندھی اور بہری فطرت سے محال ہے کہ وہ ایسے اثر کا مبداء بن سکے اور جب ان سات پردوں کے باہمی ربط اور ہم آہنگی پھر آنکھ کی ساری مشینری کی انسانی بدن سے ہم آہنگی اور پھر ایک انسان کی دیگر انسانوں سے ہم آہنگی اور پھر پوری



انسانی برادری کی پورے نظام ہستی سے ہم آہنگی دیکھتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ہے اور یہ سب ایک ہی ذاتِ پاک کے آثارِ قدرت ہیں۔

ایک عمدہ اور اچھا اور پرمعنی شعر کیا ہمیں شاعر کے اعلیٰ ذوق اور سرشار طبیعت کا پتہ نہیں دیتا اور کیا ایک دیوان میں موجود چند قطعات کی کامل ہم آہنگی اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ سب ایک قادر الکلام شاعر کی طبیعت اور ذوق کے آثار ہیں۔

اس تمہید کو نظر میں رکھتے ہوئے اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اس آیت میں جہانِ ہستی کے نظم و ضبط کے چھ قسم کے آثار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس عظیم مبداء کے وجود کی نشانی ہے۔

۱۔ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں (ان فی خلق السمٰوٰت والارض) جی ہاں — اس پُرشکوہ اور ستاروں بھرے آسمان کی خلقت، یہ عالم بالا کے کرات جن میں کروڑوں آفتاب درخشاں، کروڑوں ثابت و سیار ستارے جو تاریک رات میں پرمعنی اشاروں سے ہم سے بات کرتے ہیں اور وہ جنہیں بڑی بڑی دوربینوں سے دیکھا جائے تو ایک دقیق اور عجیب نظام دکھائی دیتا ہے ایسا نظام جس نے ایک زنجیر کے حلقوں کی طرح انہیں ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا ہے۔

اسی طرح زمین کی خلقت —— جہاں قسم قسم کے مظاہر حیات ہیں۔ جہاں مختلف انواع اور صورتوں میں لاکھوں نباتات اور جانور موجود ہیں۔ یہ سب اس ذاتِ پاک کی نشانیاں اور اس کے علم، قدرت اور یکتائی کے واضح دلائل ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ انسان کا علم و ادراک جتنا بڑھتا جا رہا ہے اتنی ہی اس عالم کی عظمت و وسعت اس کی نظر میں زیادہ ہوتی جا رہی ہے اور معلوم نہیں یہ وسعتِ علم کب تک جاری رہے گی۔

اس وقت کے علماء کہتے ہیں کہ عالمِ بالا میں ہزاروں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہمارا نظام شمسی ایک کہکشاں کا حصہ ہے۔ صرف ہماری کہکشاں میں کروڑوں آفتاب اور چمکتے ستارے موجود ہیں۔ علماء عصر کے اندازے کے مطابق ان میں لاکھوں مسکونی سیارے ہیں جن میں اربوں موجودات ہیں —— کیا ہی عظمت و قدرت ہے۔

۲۔ رات دن کے آنے جانے میں (واختلاف الیل والنہار)۔

جی ہاں — یہ رات دن کا اختلاف[1] اور ایک مخصوص تدریجی نظام کے ساتھ یہ روشنی اور تاریکی کی آمد و شد۔ اس سے پھر چار موسم وجود پاتے ہیں۔ نباتات اور دیگر زندہ موجودات اسی نظام کی وجہ سے تدریجی طور پر مراحل تکامل طے کرتے ہیں۔ اس ذاتِ پاک اور اس کی بلند صفات کے لئے یہ ایک اور نشانی ہے۔

۳۔ انسانوں کے نفع کی چیزیں لے کر کشتیاں دریا میں چلتی ہیں: (والفلك التی تجری فی البحر بما ینفع الناس)۔

چھوٹی بڑی کشتیوں کے ذریعے انسان وسیع سمندروں میں چلتا ہے اور اپنے مقاصد کے لئے ان کے

---

[1] لفظ "اختلاف" ممکن ہے "آمد و شد" (آنے جانے) کے معنی میں استعمال ہوا ہو کیونکہ یہ "خلف" اور "خلافت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کا جانشین ہونا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اختلاف رات اور دن کی کمی بیشی کی طرف اشارہ ہو اور دونوں معانی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ خاص نظام جو بہت سے واضح آثار کا حامل ہے اتفاقاً اور بغیر کسی عالم و قادر ذات کے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔



ذریعے زمین کے مختلف حصوں میں جاتا ہے۔ یہ سفر خصوصاً بادبانی کشتیوں کا سفر چند نظاموں کی وجہ سے ہے۔

و۔ وہ ہوائیں جو ہمیشہ سطح سمندر پر رہتی ہیں۔ یہ ہوائیں عموماً زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی سے خطِ استواء کی طرف اور خطِ استواء سے قطب شمالی اور جنوبی کی طرف چلتی ہیں انہیں آلیزہ اور کاؤنٹر آلیزہ کہتے ہیں۔

ب۔ کچھ ہوائیں علاقوں کے لحاظ سے ایک معین پروگرام کے تحت چلتی ہیں اور کشتیوں کو یہ سہولت بہم پہنچاتی ہیں کہ وہ اس فراواں طبیعی دولت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھیں (اسی طرح لکڑی کی خاص طبیعی خاصیت ہے جس کی وجہ سے وہ پانی میں نہیں ڈوبتی یہ بھی پانی پر اجسام کے تیرنے کا سبب بنتی ہے)۔

زمین کے دونوں قطبوں میں غیر مبدل مقناطیسی خاصیت ہے جن کے حساب سے قطب نما کی سوئیاں حرکت کرتی ہیں۔ یہ بھی پانی پر چیزوں کی آمدورفت میں مددگار ہوتی ہے۔

ان سب کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب تک یہ سب نظام ایک دوسرے سے متحد نہ ہوں کشتیوں کی حرکت سے وہ بھرپور فوائد حاصل نہیں کئے جاسکتے جو کئے جارہے ہیں۔[1]

یہ بات حیران کن ہے کہ دورِ حاضر میں مشینی کشتیوں کے بننے سے ان امور کی عظمت نہ فقط یہ کہ کم نہیں ہوئی بلکہ ان کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

آج کی دنیا میں دیوہیکل سمندری جہاز اہم ترین ذریعہ نقل و حمل شمار ہوتے ہیں۔ بعض جہاز تو شہروں کی طرح وسیع ہیں۔ ان میں میدان، سیر و تفریح کے مراکز یہاں تک کہ بازار بھی موجود ہیں۔ ان کے عرشہ پر ہوائی جہازوں کے اترنے کے لئے بڑے بڑے ایئرپورٹ تک موجود ہیں۔

۴۔ پانی جسے خدا آسمان سے نازل کرتا ہے، اس کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے اور اسی نے ان میں طرح طرح کے جانور پھیلا رکھے ہیں (وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دآبۃ)۔

بارش کے حیات بخش، تازہ اور بابرکت موتی اور اس طبیعی صاف و شفاف پانی کے قطرے ہر جگہ گرتے ہیں اور گویا زندگی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں اور اپنے ساتھ حرکت و برکت، آبادی اور نعمتوں کی فراوانی لاتے ہیں۔ یہ پانی جو ایک خاص نظام کے تحت گرتا ہے، تمام موجودات اور جاندار اس بے جان سے جان پاتے ہیں۔

یہ سب اس کی عظمت و قدرت کے پیغام بر ہیں۔

۵۔ ہواؤں کا ایک منظم طریقے سے چلنا (وتصریف الریاح)۔

ہوائیں نہ صرف سمندروں پر چلتی اور کشتیوں کو چلاتی ہیں بلکہ خشک زمینوں، پہاڑوں، دروں اور جنگلوں کو بھی اپنی جولان گاہ بناتی ہیں۔ کبھی یہ ہوائیں نر گھاس کے چھوٹے چھوٹے دانوں کو مادہ سبزہ زاروں پر چھڑکتی ہیں اور پیوندکاری و بارآوری میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ ہمارے لئے پھلوں کا تحفہ لاتی ہیں اور طرح طرح کے بیجوں کو وجود دیتی ہیں۔

---

[1] لفظ "فلک" کا معنی ہے کشتی، اس کا واحد اور جمع ایک ہی وزن پر ہے۔



بعض اوقات یہ ہوائیں سمندروں کی موجوں کو حرکت دے کر پانیوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ملاتی ہیں کہ سمندری موجودات کو حیات نو مل جاتی ہے۔

کبھی ہوائیں گرم علاقوں کی تپش سرد علاقوں میں کھینچ لاتی ہیں اور کبھی سرد علاقوں کی خنکی گرم علاقوں میں منتقل کر دیتی ہیں اور یوں زمین کی حرارت کو معتدل کرنے میں مؤثر مدد کرتی ہیں۔

کبھی یہ ہوائیں شہروں کی بادسموم کو جس میں آکسیجن نہیں ہوتی بیابانوں اور جنگلوں میں منتشر کر دیتی ہیں اور یوں نوع بشر کی زندگی کا سامان کرتی ہیں۔

گویا ہواؤں کا چلنا جس میں یہ تمام فوائد و برکات ہیں، اُس کے بے انتہا لطف و حکمت کی ایک اور نشانی ہے۔

۶۔ وہ بادل جو زمین و آسمان کے درمیان معلق و مسخر ہیں (والسحاب المسخر بین السماء والارض)۔

ایک دوسرے سے ٹکرانے والے یہ بادل جو ہمارے سروں کے اوپر گردش میں ہیں۔ اربوں ٹن پانی اٹھائے کشش ثقل کے قانون کے برعکس آسمان و زمین کے درمیان معلق ہیں اور اس پانی کو بغیر کوئی خطرہ پیدا کئے اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں۔ یہ اس کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے۔

علاوہ ازیں پانی کا یہ خزانہ اگر پانی نہ برساتا تو زمین خشک ہوتی، پینے کو ایک قطرہ پانی نہ ہوتا، سبزہ زاروں کے اگنے کے لئے کوئی چشمہ اور نہر نہ ہوتی ہر جگہ ویران ہوتی اور ہر مقام پر مردہ خاک پھیلی ہوتی ہوتی۔

یہ بھی اس کے علم و قدرت کا ایک اور جلوہ ہے۔

جی ہاں ـــــ یہ سب اس کی ذات پاک کی نشانیاں اور علامتیں ہیں لیکن ایسے لوگوں کے لئے جو عقل و ہوش رکھتے ہیں اور غور و فکر کرتے ہیں (لاٰیٰت لقوم یعقلون) ان کے لئے نہیں جو بے خبر اور کم ذہن ہیں، نہ ان کے لئے جو آنکھیں رکھتے ہوئے بے بصیرت ہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے ہیں۔

۱۶۵۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

۱۶۶۔ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝

۱۶۷۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ



كَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ترجمہ

۱۶۵۔ بعض لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے لئے کسی اور معبود کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح دوست رکھتے ہیں جیسے خدا کو رکھنا چاہیئے، اور ان سے محبت کرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں انہیں (اس محبت کی نسبت جو مشرکین کو اپنے معبودوں سے ہے) خدا سے شدید عشق و محبت ہے اور جنہوں نے ظلم کیا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی اور کو معبود قرار دے لیا ہے) جب وہ عذاب خدا کو دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ ہے (نہ کہ ان خیالی معبودوں کے ہاتھ جن سے وہ ڈرتے ہیں) اور خدا کا عذاب اور سزا شدید ہے۔

۱۶۶۔ اس وقت (انسانی و شیطانی معبود اور) رہبر اپنے پیروکاروں سے بیزار ہوں گے، وہ عذاب خدا کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔

۱۶۷۔ تب پیروکار کہیں گے کاش ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تاکہ ہم بھی ان سے اسی طرح بے بیزاری اختیار کریں جس طرح آج یہ ہم سے بیزار ہیں۔ (ہاں) یونہی خدا انہیں ان کے اعمال حسرت دکھائے گا (اور انہیں اپنے اعمال سراپا یاس دکھائی دیں گے) اور وہ ہرگز (جہنم کی) آگ سے خارج نہیں ہوں گے۔

تفسیر

پہلے کی دو آیات میں وجود خدا اور اس کی توحید و یگانگت کو نظام خلقت اور اس کی ہم آہنگی کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے محل بحث آیات میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے ان واضح اور قطعی براہین سے چشم پوشی کی، شرک و بت پرستی اختیار کی اور متعدد خدا قرار دے لئے۔ یہ گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے خشک لکڑی کے زوال پذیر معبودوں کے سامنے سر تعظیم خم کیا ہے ان سے ایسا عشق کرتے ہیں جیسا عشق صرف خدا تعالیٰ کے لائق ہے جو تمام کمالات کا منبع و مرکز ہے اور تمام نعمات بخشنے والا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ اپنے لئے خدا کے علاوہ معبود انتخاب کرتے ہیں (ومن الناس من يتخذ من دون الله اندادا)[1] انہوں نے نہ صرف بتوں کو اپنا معبود قرار دے لیا تھا بلکہ ان کے اس طرح عاشق ہو گئے تھے جیسے خدا سے

---

[1] "انداد" جمع ہے "ند" کی جس کا معنی ہے "مثل" لیکن بعض اہل لغت کے بقول اس مثل کو ند کہتے ہیں جو دوسری چیز سے جوہری و اصلی شباہت رکھتی ہو جبکہ مثل کا مفہوم عمومی ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی یوں ہو گا کہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بت جو ہر ذات میں خدا سے شباہت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جہالت و نادانی کی وجہ سے ان کے لئے خدائی صفات کے قائل تھے۔



محبت کی جاتی ہے (یحبونھم کحب اللہ)۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں (والذین اٰمنوا اشد حبا للہ) کیونکہ وہ فکر و نظر اور علم و دانش کے حامل ہیں اور وہ اس کی ذات پاک کو ہرگز نہیں چھوڑتے جو تمام کمالات کا منبع و مخزن ہے وہ اِس کے اور اُس کے پیچھے نہیں جاتے۔ ان کے نزدیک خدا کی محبت، عشق اور لگاؤ کے مقابلے میں ہر چیز بے قیمت، ناچیز اور حقیر ہے وہ غیر خدا کو اس محبت کے بالکل لائق نہیں سمجھتے مگر یہ کہ یہ محبت اس کے لئے اور اُسی کی راہ میں ہو لہٰذا وہ عشق کے بحرِ بیکراں میں اس طرح غوطہ زن ہیں کہ بقول حضرت علیؑ:

فھبنی صبرت علی عذابك فكيف اصبر على فراقك

پس فرض کیا کہ تیرے عذاب پر صبر کر لوں گا مگر تیرا فراق و جدائی کیسے برداشت کروں گا۔[1]

اصولی طور پر حقیقی عشق و محبت ہمیشہ کسی کمال سے ہوتا ہے۔ انسان کبھی عدم اور ناقص کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ وجود اور کمال کی جستجو میں رہتا ہے۔ اس لئے وہ ذات جس کا وجود اور کمال سب سے برتر، وسیع اور بے انتہا ہے عشق و محبت کے لئے سب سے زیادہ سزاوار ہے۔

خلاصہ یہ کہ جیسے مندرجہ بالا آیت کہتی ہے صاحبان ایمان کی خدا سے محبت، عشق اور وابستگی بت پرستوں کی اپنے خیالی معبودوں کی نسبت زیادہ حقیقی، گہری اور شدید ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، کیونکہ جس نے حقیقت کو پا لیا ہے اور اس سے محبت کی ہے وہ ہرگز اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو خرافات و خیالات میں گرفتار ہو۔ مومنین کے عشق کا سرچشمہ عقل، علم اور معرفت ہے اور کفار کے عشق کی بنیاد جہالت، خرافات اور خواب و خیال ہے۔ اسی لئے پہلی قسم کی محبت کبھی متزلزل نہیں ہو سکتی لیکن مشرکین کے عشق میں ثبات و دوام نہیں۔ لہٰذا آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ ظالم جب عذاب خدا کو دیکھیں گے اور جان لیں گے کہ تمام قدرتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی عذاب شدید کا مالک ہے اس وقت اپنے اعمال کی پستی و حقارت اور اپنے کرتوتوں کے بُرے انجام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اعتراف و اقرار کریں گے کہ ہم عاجز اور منحرف لوگ تھے (ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للہ جمیعا لا و ان اللہ شدید العذاب)۔[2]

بہر حال اس وقت جہالت، غرور اور غفلت کا پردہ اُن کی آنکھوں سے اُٹھ جائے گا اور وہ اپنے اشتباہ اور غلطی کو جان لیں گے لیکن چونکہ اُن کے لئے کوئی پناہ گاہ اور سہارا نہ ہوگا لہٰذا سخت بے چارگی میں وہ بے اختیار اپنے معبودوں اور رہبروں کے دامن تھامنے کو لپکیں گے مگر اس وقت ان کے گمراہ رہبران کو پیچھے دھکیل دیں گے اور وہ اپنے پیرو

---

[1] دعائے کمیل میں ہے۔

[2] بعض مفسرین نے لفظ "لو" کو تمنائی سمجھا ہے لیکن بہت سے اسے شرطیہ سمجھتے ہیں اس صورت میں اس کی جزا محذوف ہوگی اور جملہ یوں ہوگا۔ "لرأوا اسوء فعلھم وسوء عاقبتھم"



کاروں سے اظہار بیزاری کریں گے (اذ تبرا الذین اتبعوا من الذین اتبعوا)۔
اسی حالت میں وہ اپنی آنکھوں سے عذاب الٰہی دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے (ورأوا العذاب وتقطعت بھم الاسباب)۔
واضح ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد پتھر اور لکڑی کے بت نہیں بلکہ وہ جابر و قاہر انسان اور شیاطین ہیں کہ مشرکین اپنے تئیں دست بستہ جن کے اختیار میں دے چکے ہیں لیکن وہ بھی اپنے پیروکاروں کو دھتکار دیں گے۔
ایسے میں جب یہ گمراہ پیروکار اپنے معبودوں کی یہ کھلی بے وفائی دیکھیں گے تو اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہیں گے: کاش ہم دنیا میں پلٹ جائیں تو ان سے بیزاری اختیار کریں گے جیسے وہ آج ہم سے بیزار ہیں (وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرأ منھم کما تبرؤا منا)۔
لیکن اب کیا فائدہ معاملہ تو ختم ہو چکا ہے۔ اب دنیا کی طرف پلٹنا ممکن نہیں رہا۔ ایسی ہی گفتگو سورہ زخرف آیہ ۳۸ میں ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِىْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝

قیامت کے دن جب وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو گمراہ کرنے والے رہبر سے کہیں گے:
اے کاش تیرے میرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ہاں اسی طرح ان کے اعمال ان کے لئے سبب حسرت و یاس بنا کر پیش کرے گا (کذلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم) اور وہ کبھی جہنم کی آگ سے نہیں نکلیں گے (وما ھم بخارجین من النار)۔
واقعاً وہ حسرت و یاس میں گرفتار ہونے کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں۔ ان اموال پر حسرت جو انہوں نے جمع کئے اور فائدہ دوسروں نے اٹھایا، ان بے پناہ وسائل پر حسرت جو نجات و کامیابی کیلئے ان کے ہاتھ میں تھے مگر انہوں نے ضائع کر دیے اور ان معبودوں کی عبادت پر حسرت خدائے قادر و متعال کی عبادت کے مقابلے میں جن کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن یہ حسرت کس کام کی کیونکہ اب نہ عمل کا موقع ہوگا اور نہ یہ کمی کو پورا کر سکے گی بلکہ وہ تو سزا اور اعمال کا نتیجہ و ثمرہ دیکھنے کا وقت ہوگا۔

۱۶۸۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

۱۶۹۔ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝



ترجمہ

۱۶۸- اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے نشانِ پا کی پیروی نہ کرو بلکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۱۶۹- وہ تمہیں فقط برائیوں اور انحرافات کا حکم دیتا ہے۔ نیز (کہتا ہے کہ) جن امور کو تم نہیں جانتے انہیں خدا کی طرف منسوب کر دو۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ عرب کے بعض قبیلوں مثلاً ثقیف، خزاعہ وغیرہ نے بعض زرعی اجناس اور جانوروں کو بغیر کسی دلیل کے اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا (یہاں تک کہ ان کی تحریم کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے) اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں انہیں اس ناروا عمل سے روکا گیا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں شرک و بت پرستی کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ شرک کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کو قانون ساز سمجھ لے اور نظام تشریع اور حلال و حرام اس کے اختیار میں قرار دیدے۔ محل بحث آیات میں ایسے عمل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ (یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیباً ؎)۔

اور شیطان کے نقوشِ قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا واضح دشمن ہے (ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مختلف غذاؤں سے فائدہ اٹھانے سے مربوط آیات قرآن میں کئی مقام پر ہیں اور عموماً ان میں دو قیود کا ذکر ہے حلال اور طیب۔ حلال وہ ہے جس سے روکا نہ گیا ہو اور طیب ان چیزوں کو کہتے ہیں جو پاک و پاکیزہ اور انسان کی طبع سلیم کے مطابق ہوں۔ طیب کے مدمقابل خبیث ہے جس سے مزاج انسانی نفرت کرتا ہے۔

خطوات جمع ہے خطوہ (بر وزن "قربہ") کی۔ اس کا معنی ہے قدم۔ خطوات الشیطان سے مراد وہ قدم ہیں جو شیطان اپنے مقصد تک پہنچنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اٹھاتا ہے۔

"لا تتبعوا خطوات الشیطان" قرآن میں پانچ مقامات پر دکھائی دیتا ہے۔ دو مقامات پر غذا اور خدائی رزق سے استفادہ کرنے کے ضمن میں ہے۔ دراصل انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حلال نعمتوں کو بے محل استعمال نہ کریں اور نعمات الٰہی کو خدا کی اطاعت و بندگی کا ذریعہ قرار دیں نہ کہ طغیان، سرکشی اور فساد کا۔



شیطان کے نقوش پا کی پیروی حقیقت میں وہی بات ہے جو دیگر آیات میں حلال غذاؤں سے استفادہ کرنے کے حکم کے بعد ذکر ہوئی ہے۔ مثلاً

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

رزق الٰہی میں سے کھاؤ پیو مگر زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ (بقرہ - ۶۰)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ

وہ پاکیزہ رزق جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کھاؤ مگر اس میں طغیان و سرکشی نہ کرو۔ (طٰہٰ - ۸۱)

خلاصہ یہ کہ یہ عطیات اور اسباب اطاعت کے لئے تقویت بخش ہونے چاہئیں گناہ کا ذریعہ نہیں۔

"انه لکم عدو مبین" قرآن مجید میں دس سے زیادہ مرتبہ شیطان کے ذکر کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس واضح دشمن کے مقابلے میں اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں یکجا کرے۔

شیطان جس کا مقصد انسان کی بدبختی اور شقاوت کے سوا کچھ نہیں اگلی آیت اس کی انسان سے شدید ترین دشمنی کو بیان کرتی ہے۔ فرمایا: وہ صرف تمہیں طرح طرح کی برائیوں اور قباحتوں کا حکم دیتا ہے (انما یامرکم بالسوء والفحشاء) نیز تمہیں آمادہ کرتا ہے کہ خدا پر افترا باندھو اور جو چیز تم نہیں جانتے ان کی خدا کی طرف نسبت دو (و ان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون)۔

ان آیات سے ظاہر ہوا کہ شیطان کے پروگراموں کا خلاصہ یہی تین امور ہیں۔ برائیاں، قباحتیں اور ذات پروردگار سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنا۔

"فحشاء" کا مادہ ہے "فحش" جس کا مطلب ہر وہ چیز ہے جو حد اعتدال سے خارج ہو کر فاحش کی شکل اختیار کرلے اس لحاظ سے تمام منکرات اور واضح قباحتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہ جو آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ عفت و پاکدامنی کے منافی افعال کے لئے استعمال ہوتا ہے یا ان گناہوں پر بولا جاتا ہے جو حد شرعی رکھتے ہیں تو یہ لفظ کے کلی مفہوم کے بعض واضح مصادیق ہیں۔

ان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون — ممکن ہے یہ ان حلال غذاؤں کی طرف اشارہ ہو جنہیں زمانہ جاہلیت کے عربوں نے حرام قرار دے رکھا تھا اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے بلکہ بعض بزرگ مفسرین کے بقول اس طرز فکر کی رسومات تازہ مسلمانوں کے بعض گروہوں میں بھی باقی رہ گئی تھیں [1]

خدا کی طرف شریک شبیہ کی نسبت دینا اس آیت کا زیادہ وسیع معنی ہے اور یہ بھی آیت کے مفاہیم میں شامل ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱ ص ۴۲۵



بہر حال یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے امور کا مطلب علم کے بغیر بات کرنا ہے اور وہ بھی خدا کے مقابلے میں جب کہ یہ کام کسی منطق اور عقل و خرد کی رو سے صحیح نہیں۔

اگر لوگ اصولی طور پر اس بات کے پابند ہوں کہ وہ وہی بات کریں گے جس کا کوئی قطعی اور یقینی مدرک ہے تو انسانی معاشرے سے بہت سی بدبختیاں اور تکالیف دور ہو سکتی ہیں در حقیقت خدائی مذاہب میں جو خرافات شامل ہو گئے ہیں وہ اسی طرح بے منطق افراد کے ذریعے ہوئے ہیں۔ بگڑے ہوئے اعتقادات اور اعمال اسی بنیاد کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے ہیں لہذا خطوات شیطان کے مستقل عنوان کے تحت مندرجہ بالا آیت میں برائیوں اور قباحتوں کے ساتھ اس عمل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) اصل حلیت : یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ روئے زمین پر موجود تمام غذائیں بنیادی طور پر حلال ہیں اور حرام غذائیں صرف استثنائی پہلو رکھتی ہیں لہذا کسی چیز کا حرام ہونا دلیل کا محتاج ہے نہ کہ حلال ہونا۔ دوسری طرف قوانین تشریعی کو چونکہ قوانین تکوینی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے لہذا آفرینش و خلقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ زیادہ وضاحت سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے یقیناً اس میں کوئی فائدہ ہے اور وہ بندوں کے استفادہ کے لیے ہے لہذا اس کی کوئی وجہ نہیں کہ کوئی چیز بنیادی طور پر حرام ہو۔ لہذا ہر وہ غذا جس کی حرمت پر کوئی صحیح دلیل موجود نہ ہو جب تک وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر باعث فساد اور ضرر رساں نہ ہو اس آیت شریفہ کی روشنی میں حلال ہے

(۲) تدریجی انحرافات : خطوات الشیطان (شیطان کے نقوش پا) — یہ الفاظ ایک دقیق تربیتی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ کجرویاں اور تباہ کاریاں آہستہ آہستہ انسان میں نفوذ کرتی ہیں نہ کہ دفعتاً — مثلاً جب کوئی نوجوان منشیات، قمار اور شراب سے آلودہ ہوتا ہے تو یہ مقام کئی مراحل کے بعد آتا ہے۔ پہلے وہ ایک تماشائی کے طور پر ایسے لوگوں میں شریک ہوتا ہے اور اس کے انجام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

دوسرے مرحلے پر وہ قمار بازی میں بغیر نفع یا نقصان کے شریک ہوتا ہے اور اسی طرح منشیات سے تکان دور ہونے یا علاج کے بہانے استفادہ کرتا ہے۔

تیسرے مرحلے میں وہ ان امور سے تھوڑا بہت فائدہ حاصل کرنے لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ بہت جلد ان سے صرف نظر کر لوں گا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے قدم اٹھتے ہیں۔

اور بالآخر وہ شخص ایک قمار باز اور نشے کا خطرناک عادی مجرم بن جاتا ہے۔ یہ شیطانی وسوسے عموماً آہستہ آہستہ، تدریجاً ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ کام فقط وہ ایک مشہور شیطان نہیں کرتا بلکہ شیطانی قوتیں اپنے غلط منصوبوں کو اسی طرح عملی جامہ پہناتی ہیں اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ پہلے قدم پر ہی ہوش میں آ کر شیطان کی ہمراہی سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔



احادیث اسلامی میں بے ہودہ خرافات اور بے منطق کاموں کو خطوات شیطان قرار دیا گیا ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کے لئے ذبح کرے گا۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

ذلك من خطوٰت الشیطان۔

یہ شیطانی اقدامات میں سے ہے۔ [1]

ایک اور روایت میں امام صادقؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

جو شخص کسی ایسی چیز کو ترک کرنے کی قسم کھائے کہ جس کا انجام دینا بہتر ہے تو وہ ایسی قسم کی پرواہ نہ کرے اور اس کار خیر کو بجا لائے۔ اس کا کفارہ بھی نہیں ہے اور وہ خطوات شیطان میں سے ہے۔ [2]

ایک اور حدیث امام باقرؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

کل یمین بغیر الله فهو من خطوٰت الشیطان

جو قسم غیر خدا کی کھائی جائے وہ خطوات شیطان میں سے ہے۔ [3]

(iii) **شیطان پرانا دشمن ہے:** آیت کے آخر میں شیطان کو واضح دشمن قرار دیا گیا ہے۔ یہ یا تو اس دشمنی کی بنا پر ہے جو اسے پہلے دن سے حضرت آدمؑ سے تھی جب کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکم کی نافرمانی کرکے ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھا یا اس لئے ہے کہ قتل، جارحیت اور تباہ کاری پر مبنی اس کی دعوتیں، کرتوت اور طریقے سب پر واضح ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ایسے کام کسی دوست کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔ ایسے کام جن کا نتیجہ بدبختی اور پشیمانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ان کی دعوت ایک خطرناک دشمن کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے۔

یہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان سے اپنی دشمنی کا صراحت سے اعلان کیا ہے اور اس نے انسان کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ:

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ

مجھ سے ہو سکا تو سب کو گمراہ کر دوں گا۔ (حجر-۳۹)

(iv) **شیطانی وسوسوں کی کیفیت:** یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت کہتی ہے شیطان تمہیں حکم دیتا ہے کہ برائیوں اور قباحتوں کی طرف جاؤ اور یہ بھی مسلم ہے کہ امر سے مراد شیطانی وسوسہ ہی ہے۔ حالانکہ برائی انجام دیتے وقت ہمیں اپنے وجود سے باہر سے کسی امر اور تحریک کا احساس نہیں ہوتا اور ہمیں شیطان کے گمراہ کرنے کی کسی کوشش کا داخلی احساس نہیں ہوتا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جیسے لفظ وسوسہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ ایک طرح کی وجود انسانی میں شیطانی تاثیر ہے۔

---

[1]، [2]، [3] المیزان، ج ۱، صہ ۴۲۸



جو مخفی اور نامعلوم قسم کی ہے۔ بعض آیات میں اسے "وحی" اور "ایماء" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۲۱ میں ہے :

وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ

شیاطین اپنے دوستوں اور ان لوگوں کو جو ان کے احکام قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں وحی کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وحی مخفی اور مرموز آواز ہے جس کی تاثیرات اکثر نامعلوم طرح کی ہیں۔

البتہ انسان خدائی الہامات اور شیطانی وسوسوں میں واضح تمیز کر سکتا ہے کیونکہ خدائی الہامات کی پہچان کی واضح علامت موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ خدائی الہامات چونکہ انسان کی پاک فطرت اور اس کے جسم و روح کی ساخت سے آشنا ہیں اس لئے جب وہ دل میں پیدا ہوتے ہیں تو انبساط و نشاط کی کیفیت بخشتے ہیں جب کہ شیطانی وسوسے انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہیں اس لئے جب وہ دل میں پیدا ہوتے ہیں اس وقت ایک طرح کی گھٹن، تکلیف اور سنگینی کا احساس پیدا ہوتا ہے اگر انسان کے رجحانات یہاں تک جا پہنچیں کہ برا کام انجام دیتے وقت اس میں یہ احساس پیدا نہ ہو تب بھی کام انجام دینے کے فوراً بعد یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے فرق شیطانی اور رحمانی الہامات کے درمیان۔

۱۷۰۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ○

۱۷۱۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ○

ترجمہ

۱۷۰۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں: ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ و اجداد کو پایا ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباء و اجداد نہ کسی چیز کو سمجھتے ہیں اور نہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۱۷۱۔ کافروں کو دعوت دینے میں (تمہاری) مثال اس شخص کی سی ہے جو (بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو خطرات سے بچانے کے لئے) آواز دیتا ہے لیکن وہ صدا اور پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے (اور اس کی بات کی حقیقت اور مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے) وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لئے کچھ نہیں سمجھ سکتے۔



تفسیر

آباء و اجداد کی اندھی تقلید

یہاں مشرکین کی کمزور منطق، حلال غذاؤں کی بلا جواز تحریم یا بطور کلی بت پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہم نے جس طریقے پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے اُسی کی پیروی کریں گے (و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا)[1]

قرآن اس بیہودہ اور خرافاتی منطق کی فوراً خبر لیتا ہے جو آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے (اولو کان اٰباءھم لا یعقلون شیئاً و لا یھتدون)۔ یعنی اگر وہ پڑھے لکھے اور ہدایت یافتہ لوگ ہوتے تو گنجائش تھی ان کی پیروی کی جاتی لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ان پڑھ، نادان اور توہم پرست تھے کیا تک ہے کہ ان کی پیروی کی جائے کیا یہ جاہل کی تقلید کا مصداق نہیں؟

قومیت اور قومی تعصبات کا مسئلہ بالخصوص جو آباؤ اجداد سے مربوط ہو مشرکین میں خصوصاً اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں میں عموماً پہلے دن سے موجود تھا اور آج تک جاری و ساری ہے لیکن خدا پرست اور صاحبانِ ایمان اس منطق کو رد کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے بہت سے مواقع پر آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور تعصب کی شدید مذمت کی ہے اور اس نے آنکھ کان بند کر کے آباؤ اجداد کی تقلید کرنے کو رد کر دیا ہے۔

اصولی طور پر اپنی عقل و فکر کو دست بستہ بڑوں کے سپرد کر دینے کا نتیجہ قیانوسی رجعت پسندی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ عموماً بعد والی نسلیں گذشتہ نسلوں سے زیادہ علم و آگہی رکھتی ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ جاہلانہ طرز فکر آج بھی بہت سے افراد اور ملل پر حکمرانی کرتی ہے اور وہ لوگ اپنے بڑوں کی بتوں کی طرح پرستش کرتے ہیں اور بعض خرافاتی آداب و رسوم کو فقط اس لئے بے چون و چرا مان لیتے ہیں کہ یہ بزرگوں کے آثار ہیں اور انہیں دلفریب لباس پہنا دیتے ہیں مثلاً قومیت کی حفاظت، تاریخی اسناد کا تحفظ وغیرہ۔ یہ طرز فکر ایک نسل کے خرافات دوسری نسل میں منتقل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ آنے والی نسلیں گذر جانے والوں کے آداب و سنن کا تجزیہ کریں اور ان میں سے جو عقل و منطق کے مطابق ہوں ان کی بڑے احترام سے حفاظت کریں اور جو بے بنیاد خرافات و موہومات ہوں انہیں دور پھینک دیں۔ اس سے بہتر کون سا کام ہو سکتا ہے اور ایسی تنقید گذشتہ لوگوں کے آداب و سنن میں ملی و تاریخی

---

[1] "الفینا" کا معنی ہے "ہم نے پایا اور پیروی کی۔"



اہمیت کی حامل چیزوں کی حفاظت کہلانے کی اہل ہے لیکن ہر پہلو سے انہیں قبول کر لینا اور اندھی تقلید کرنا سوائے خرافات پرستی اور رجعت پسندی کے کچھ نہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کے متعلق مندرجہ بالا آیت میں خدا فرماتا ہے: وہ نہ کسی چیز کو سمجھ سکتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔ یعنی دو قسم کے افراد کی پیروی کی جا سکتی ہے ایک وہ شخص جو علم اور عقل و دانش رکھتا ہو، دوسرا وہ جو خود صاحب علم نہیں تاہم اس نے کسی عالم کے علم و دانش کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن ان کے آباؤ اجداد خود صاحبان علم و دانش تھے نہ ان کا کوئی ہادی و رہبر تھا اور یہ واضح ہے نادان و جاہل جب نادان و جاہل کی تقلید کرتا ہے۔ تو یہی تقلید مخلوق کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔ ایسی تقلید پر ہزار لعنت ہے۔

بعد کی آیت کہتی ہے کہ یہ گروہ ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے کیوں حق کی طرف نہیں پلٹتا اور کیوں گمراہی و کفر پر اصرار کرتا ہے۔ فرمایا: اس کافر قوم کو ایمان لانے اور اندھی تقلید چھوڑنے کی دعوت دیتے ہوئے تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جو بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو (خطرے سے نجات دلانے کے لیے) آواز دیتا ہے لیکن وہ ایک پکار اور صدا کے سوا کچھ نہیں سمجھ پاتے (ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء و نداء)۔

واقعاً وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں جو خیر خواہ اور دلسوز چرواہے کی داد و فریاد کو ایک تولے سر کے علاوہ نہیں سمجھتے جو ان کے لئے ایک وقتی تحریک ہی ہو سکتی ہے۔ آیت کے آخر میں تاکید اور مزید وضاحت کے لئے فرماتا ہے: وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے (صم بکم عمی فھم لا یعقلون)۔

جبھی تو وہ اپنے آباؤ اجداد کی غلط رسموں اور خرافاتی طریقوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور ہر اصلاحی دعوت سے انہوں نے منہ موڑ رکھا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے۔ ان کے مطابق یہ اس طرح ہے: ان لوگوں کی مثال جو بتوں اور مصنوعی خدا کو پکارتے ہیں اس شخص کی سی ہے جو بے شعور جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ نہ وہ جانور چرواہے کی کسی بات کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ یہ مصنوعی معبود اپنے عبادت گذاروں کی باتیں سمجھتے ہیں کیونکہ یہ بت بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔

لیکن اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو منتخب کیا ہے اور روایاتِ اسلامی بھی اسی کی موید ہیں۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق آیت تقدیر کی محتاج ہے۔ گویا اصل میں یوں ہے "مثل الداعی للذین کفروا ..." یعنی کافروں کو ایمان کی دعوت دینے والے کی مثال اس چرواہے کی سی ہے۔ اس بناء پر صم بکم عمی فھم لا یعقلون ایسے لوگوں کی توصیف ہے جنہوں نے ادراک کے تمام آلات عملاً ضائع کر دیئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی آنکھ، کان اور زبان نہیں ہے بلکہ وہ اس سے چونکہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے گویا نہیں ہے۔



چند اہم نکات

(۱) پہچان کے آلات: اس میں شک نہیں کہ باہر کی دنیا سے انسان کا رابطہ آلات کا محتاج ہے جنہیں پہچان کے آلات کہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم آنکھ، کان اور زبان ہیں جو دیکھنے، سننے اور بولنے کے کام آتے ہیں۔ اس لئے مندرجہ بالا آیت میں آلاتِ تمیز سے استفادہ نہ کرنے والوں کو بہرا، گونگا اور اندھا قرار دینے کے بعد فاء تفریع کا استعمال نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور بلافاصلہ ارشاد ہوتا ہے: اسی لئے وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔ اس طرح قرآن گواہی دیتا ہے کہ بنیادی طور پر علم و دانش کے اسباب آنکھ، کان اور زبان ہیں۔ آنکھ اور کان براہِ راست ادراک کے لئے اور زبان دوسروں سے استفادہ کے لئے ہے۔

فلسفے میں بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ غیر حسی علوم کا سرچشمہ بھی ابتداً علوم حسی ہیں۔ یہ ایک وسیع بحث ہے اور یہ مقام اس کی تشریح کا نہیں ہے۔

آلات تمیز کی نعمت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کی گیارھویں جلد میں سورۂ نحل آیہ ۷۸ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۲) ینعق کا مفہوم: اس کا مادہ "نعق" ہے۔ اصل میں یہ کوّے کی اس آواز کو کہتے ہیں جس میں شور نہ ہو۔ جب کہ "نغق" کوّے کی اس آواز کو کہتے ہیں جس میں شور و غل ہو اور کوا گردن بھی بلند کئے ہو۔[1]

بعدازاں "نعق" کے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اب اس کا معنی وہ آوازیں ہیں جو جانوروں کے سامنے نکالی جائیں۔ واضح ہے کہ وہ تو کلمات کے مفاہیم سے آگاہ نہیں ہوتے اور اگر ان پر کچھ بھی اثر ہوتا ہے تو آواز اور الفاظ کی ادائیگی کے طرز و طریقہ سے ہوتا ہے۔

۱۷۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ
إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ○

۱۷۳۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ
لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

[1] مجمع البیان، آیت محل بحث کے ذیل میں۔



ترجمہ

۱۷۲۔ اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک و پاکیزہ چیزیں (شوق سے) کھاؤ اور اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر بجالاؤ۔

۱۷۳۔ اُس نے تم پر مُردہ جانور، خون، سُوّر کا گوشت اور وہ جانور جس پر (ذبح کرتے وقت) غیر خدا کا نام لیا گیا ہو حرام کیا ہے۔ پس جو شخص مجبور ہو کر، اگر وہ سرکشی و زیادتی کرنے والا نہ ہو ان میں سے کچھ کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

وہ کجرویاں جو جڑ پکڑ چکی ہیں ان کی اصلاح کے لئے قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ مختلف طرزوں اور طریقوں کی تاکید و تکرار سے استفادہ کرتا ہے۔ ان آیات میں زمانہ جاہلیت میں مشرکین کی حرام کردہ حلال غذاؤں کے بارے میں دوبارہ گفتگو کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب روئے سخن مومنین کی طرف ہے جب کہ گذشتہ آیات میں تمام لوگ (یا ایھا الناس) مخاطب تھے۔ فرماتا ہے: اے ایمان والو ان پاکیزہ نعمتوں میں سے جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے اسے کھاؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم)۔ اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو (واشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون)

یہ پاک و حلال نعمتیں جو ممنوع نہیں ہیں، انسان کی فطرت سلیم کے موافق ہیں اور تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں تم ان سے کیوں استفادہ نہیں کرتے۔ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے یہ تمہیں قوت بخشتی ہیں علاوہ ازیں یہ تمہیں شکر و عبادت کے لئے پروردگار کی یاد دلاتی ہیں۔

اسی سورہ کی آیت ۱۶۸ — یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض — کا اگر اس آیت سے تقابل کیا جائے تو دو لطیف نکتے سمجھ میں آتے ہیں۔

۱۔ یہاں فرماتا ہے: من طیبٰت ما رزقنٰکم (پاک غذاؤں میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے) جب کہ وہاں فرماتا ہے: مما فی الارض (جو کچھ زمین میں ہے) یہ فرق گویا اس طرف اشارہ ہے کہ پاکیزہ نعمتیں اصل میں ایماندار افراد کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور بے ایمان لوگ ان کے صدقے میں روزی حاصل کرتے ہیں۔ جیسے باغبان پانی تو پھلوں اور پھولوں کے لئے دیتا ہے لیکن کانٹے اور فضول گھاس پھوس بھی اس سے فائدہ اٹھالیتی ہے۔

۲: عام لوگوں سے کہتا ہے: کھاؤ لیکن شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ جب کہ مومنین سے زیر نظر آیت میں کہتا ہے: کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔ یعنی صرف نعمتوں سے سوءِ استفادہ سے نہیں روکتا بلکہ حسنِ استفادہ کی شرط عاید کرتا ہے۔ درحقیقت عام لوگوں سے صرف یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ گناہ نہ کریں لیکن صاحبانِ ایمان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان نعمتوں کا بہترین استعمال کریں۔

ممکن ہے پاکیزہ غذاؤں سے استفادہ کرنے کے بارے میں متعدد آیات میں بار بار کی تائید بعض لوگوں کے لئے تعجب



کا باعث ہو لیکن اگر زمانہ جاہلیت کی تاریخ پر نظر کی جائے تو یہ حیرت نہیں رہتی۔ ان لوگوں نے بیہودہ رسومات و آداب اختیار کر رکھے تھے۔ بغیر کسی دلیل کے جائز نعمتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا اور یہ بات اُن میں اس طرح راسخ تھی کہ وہ ان امور کو وحی آسمانی کی طرح سمجھتے تھے بلکہ بعض اوقات تو بالصراحت ایسی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ اس لئے قرآن نے اتنی تاکید و تکرار کی ہے کیونکہ قرآن یہ بے بنیاد اور بے ہودہ افکار ان کے ذہنوں سے پوری طرح نکال دینا چاہتا ہے۔

طیب غذاؤں کا ذکر سب کو اس اسلامی حکم کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ آلودہ اور ناپاک غذاؤں سے پرہیز کریں جن میں سور کا گوشت، درندے، حشرات الارض اور نشہ آور چیزیں شامل ہیں اور یہ چیزیں اُس زمانے کے لوگوں میں شدت و کثرت سے مروج تھیں۔

اس تفسیر کی چھٹی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۳۲ کے ضمن میں مومنین کے لئے پاکیزہ غذاؤں اور معقول زینتوں سے استفادہ کرنے کے متعلق تفصیلی بحث آئے گی۔

اگلی آیت میں حرام اور ممنوع غذاؤں کو واضح کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ہر طرح کے بہانوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے مردار کا گوشت، خون، سور کا گوشت اور اس جانور کا گوشت جسے ذبح کرتے ہوئے غیر خدا کا نام لیا جائے حرام کیا ہے (انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ)۔

یہاں پر چار طرح کے گوشت اور خون کی حرمت کا حکم ہے۔ یاد رہے کہ خون ان لوگوں کو بہت مرغوب تھا۔ ان میں سے بعض چیزوں میں تو ظاہری نجاست ہے جیسے مردار، خون اور سور کا گوشت اور بعض میں معنوی نجاست ہے جیسے وہ قربانیاں جو وہ بتوں کے لئے کیا کرتے تھے۔

آیت سے بالعموم اور لفظ "انما" جو کلمہ حصر ہے اور اصطلاحی طور پر حصر اضافی ہے سے بالخصوص ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد تمام محرمات کو بیان کرنا نہیں بلکہ اصل غرض بدعات کی نفی ہے جو بعض حلال غذاؤں کو حرام قرار دے کر انہوں نے جاری کی ہوئی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے کچھ پاکیزہ اور حلال گوشت خرافات اور توہمات کے نتیجے میں اپنے اوپر حرام قرار دیئے ہوئے تھے۔ لیکن غذا کی کمی کے وقت وہ مردار، سور کا گوشت اور خون تک استعمال کر لیتے تھے۔ قرآن انہیں بتاتا ہے کہ یہ تمہارے لئے حرام ہیں نہ کہ وہ (اور یہی حصر اضافی کا مطلب ہے)۔

بعض اوقات ایسی ضروریات پیش آتی ہیں کہ انسان بعض حرام چیزوں کے استعمال پر بھی مجبور ہو جاتا ہے لہٰذا قرآن اس استثنائی پہلو کے بارے میں کہتا ہے: لیکن جو شخص (اپنی جان کے تحفظ کے لئے) مجبور ہو کر انہیں کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ ظالم و متجاوز نہ ہو (فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ)۔ اس بنا پر کہ کہیں اضطرار کو بہانہ ہی نہ بنا لیا جائے ان حرام غذاؤں کے کھانے میں زیادتی اور تجاوز روکنے کے لئے "غیر باغ ولا عاد" فرمایا گیا ہے۔

یعنی یہ اجازت صرف ان افراد کے لئے ہے جو ان محرمات کو لذت کے لئے نہ کھانا چاہیں اور اتنا ہی کھائیں جتنا حفظ جان کے لئے ضروری ہو اس سے تجاوز نہ کریں۔ باغ اور عاد اصل میں باغی اور عادی ہیں۔ باغی کا مادہ ہے "بغی"



جس کا معنی ہے طلب کرنا یہاں مقصود طلبِ لذت ہے اور عادی متجاوز کے معنی میں ہے۔

"غیر باغ ولا عاد" کی ایک اور تفسیر بھی مذکور ہے جو پیش کردہ مفہوم سے متضاد نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں معانی آیت کے مفہوم میں شامل ہوں۔ وہ تفسیر یہ ہے کہ "بغی" کا ایک معنی ظلم و ستم بھی ہے۔ لہٰذا مقصد یہ ہوا کہ حرام گوشت کھانے کی اجازت فقط ان لوگوں کے لئے ہے جو ظلم و ستم اور گناہ کا سفر نہ کر رہے ہوں (سفر کا ذکر اس لئے ہے کہ عموماً اضطراری کیفیت اور مجبوری کی حالت سفر میں ہی درپیش ہوتی ہے) لہٰذا اگر سفر گناہ کے لئے ہو اور مسافر حالتِ مجبوری کو پہنچ جائے کہ حفظِ جان کے لئے اسے حرام غذا کھانی پڑے تو اس کا گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اگرچہ ان ستمگروں کے لئے بحکم عقل واجب ہے کہ جان کی حفاظت کے لئے ایسے حرام گوشت کھائیں لیکن یہ وجوب اُن کی مسئولیت اور ذمہ داری میں کمی نہیں کر سکے گا۔

وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں ہے جو امام مسلمین کے خلاف اقدام نہ کریں دراصل ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جیسے نمازِ مسافر کے احکام میں آیا ہے کہ نمازِ قصر صرف ان مسافروں کے لئے ہے جن کا سفر حرام نہ ہو۔ اسی لئے "غیر باغ ولا عاد" سے روایات میں دونوں احکام کے لئے استدلال کیا گیا ہے (یعنی نمازِ مسافر اور حالتِ اضطرار میں گوشت کھانے کے احکام)۔[1]

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا غفور و رحیم ہے (ان اللہ غفور رحیم) وہی خدا جس نے یہ گوشت حرام قرار دیے ہیں اسی نے اپنی رحمتِ خاص سے شدید ضرورت کے وقت ان سے استفادہ کرنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **حرام گوشت کی تحریم کا فلسفہ:** اس میں شک نہیں کہ زیرِ نظر آیت میں جو غذائیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ وہ دیگر خدائی محرمات کی طرح ایک خاص فلسفے کی حامل ہیں۔ انسانی جسم و جان اور اس کی کیفیت اور وضع کی تمام تر خصوصیات کو پیشِ نظر رکھ کر انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ روایاتِ اسلامی میں ان میں سے ہر ایک کے نقصانات اور حرمت کے مضرات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نیز علوم انسانی کی پیش رفت نے بھی ان سے پردہ اٹھایا ہے۔

کتاب کافی میں مردار کے گوشت کے متعلق امام صادقؑ سے مروی ہے:

اما المیتة فانه لم ینل منها احد الا ضعف بدنه وذهبت قوته وانقطع نسله ولا یموت آكل المیتة الا فجأة

---

[1] امام صادقؑ سے ایک روایت ہے کہ آپؑ نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرمایا:

باغی سے مراد وہ ہے جو شکار کے پیچھے سیر و تفریح کے طور پر (نہ کہ ضرورت و احتیاج کے لئے) جائے اور عادی سے مراد چور ہے۔ یہ دونوں حق نہیں رکھتے کہ مردار کا گوشت کھائیں وہ ان کے لئے حرام ہے اور یہ نماز قصر بھی نہیں پڑھ سکتے۔ (وسائل الشیعہ ج ۵، ص ۵۰۹)



(یہ فرمانے کے بعد کہ یہ تمام احکام مصالح بشر کے ماتحت ہیں امام فرماتے ہیں) باقی رہا مردار کا گوشت تو جو کوئی بھی اُسے کھائے گا اس کا بدن کمزور ہوگا اور تکالیف میں مبتلا ہوگا۔ اس کی قوت وطاقت ختم ہوجائے گی اور نسل منقطع ہوجائے گی اور جو ہمیشہ مردار کا گوشت کھاتا رہے گا سکتے کے عالم میں مرے گا۔ [1]

ممکن ہے یہ نقصانات اس لئے ہوں کہ مردار سے غذا ہضم کرنے کا نظام صحیح خون نہیں بنا سکتا۔ علاوہ ازیں مردار طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اسلام نے نہ صرف مردار گوشت کو حرام کہا ہے بلکہ اسے نجس بھی قرار دیا ہے تاکہ مسلمان مکمل طور پر اس سے دُور رہیں۔

دوسری چیز جو آیت میں حرام قرار دی گئی ہے خون ہے (والدم)۔ خون کو استعمال کرنا جسم کے لئے بھی نقصان دہ ہے اور اخلاقی طور پر بھی بد اثر ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ ایسے مختلف جراثیم کی پرورش کرتا ہے جو پورے بدن میں داخل ہو کر انسانی خون پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسے اپنی کارگزاری کا مرکز بناتے ہیں۔ سفید رنگ کے گلبول [2] جو ملک بدن کے محافظ ہیں ہمیشہ اس کے خون کے علاقے کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ جراثیم اس حساس علاقے میں نہ پہنچنے پائیں کیونکہ یہ بدن کے تمام حصوں سے قریبی رابطہ رکھتا ہے۔ خصوصاً جب جریانِ خون رک جائے اور اصطلاح کے مطابق مرجائے تو سفید گلبول بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ اس وجہ سے جب جراثیم میدان خالی دیکھتے ہیں تو بڑی تیزی سے انڈے دیتے ہیں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ خون کا جریان رک جائے تو یہ انسان اور حیوان کے بدن کا غلیظ ترین حصہ ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

دوسری طرف آج علم غذا شناسی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ غذائیں غدودوں پر اثر انداز ہونے کے علاوہ انسانی نفسیات اور اخلاق پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں جب کہ خون انسان میں ہارمون پر اثر انداز ہو کر سنگدلی پیدا کرتا ہے۔ یہ بات تو قدیم زمانے سے مسلمہ ہے کہ خونخواری انسان میں قساوت وسنگدلی پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بات ضرب المثل ہوگئی ہے کہ سنگدل کو خونخوار کہتے ہیں اسی لئے ایک حدیث میں ہے۔

جو لوگ خون پیتے ہیں وہ اس قدر سنگدل ہوجاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور اولاد تک کو قتل کر ڈالیں [3]

تیسری چیز جس کا کھانا آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے سور کا گوشت (ولحم الخنزیر) ہے۔

اہل یورپ زیادہ تر خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ گوشت بے غیرتی کا نشان بن گیا ہے۔ یہ ایسا گھٹیا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۶، صفحہ ۳۱۰

[2] خون کے خلیے (WHITE BLOOD CELLS) جو جراثیم کو بدن میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ (مترجم)

[3] وسائل شیعہ، ج ۱۶، صفحہ ۳۱۰



جانور ہے کہ علم جدید کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا کھانا جنسی امور میں بے حیائی اور لاابالی کا باعث ہے اور یہی اس کی نفسیاتی تاثیر ہے جو مشاہدے میں آچکی ہے۔

شریعتِ حضرت موسیٰؑ میں بھی سؤر کا گوشت حرام تھا۔ موجودہ اناجیل میں گناہگاروں کو سؤر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ داستانوں میں سؤر کو مظہرِ شیطان کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ سؤر غلیظ چیزیں کھاتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنا ہی پاخانہ کھا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی سب پر واضح ہو چکا ہے کہ اس پلید جانور میں دو قسم کے خطرناک جراثیم پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کو تریشین (TRICHIN) اور دوسرے کو کرم کدو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کا گوشت کھانے پر مصر ہیں۔

صرف ایک تریشین (TRICHIN) ہر ماہ پندرہ ہزار انڈے دیتا ہے اور انسان میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے مثلاً خون کی کمی، سر درد، ایک مخصوص بخار، اسہال، درد رماتیسمی، اعصاب کا تناؤ، جسم میں خارش، بدن میں چربی کی کثرت، تھکن کا احساس، غذا چبانے اور نگلنے میں دشواری، سانس کا رکنا وغیرہ۔

ایک کلو گوشت میں چالیس کروڑ تک نوزائیدہ تریشین (TRICHINS) ہو سکتے ہیں۔

انہی وجوہ کے پیشِ نظر چند سال پیشتر حکومت روس نے اپنے ایک علاقے میں سؤر کا گوشت کھانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

جی ہاں ——— روشن بینی کے یہ احکام کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جن کے تازہ جلوے نمایاں ہوتے ہیں ہمیشہ رہنے والے دینِ اسلام ہی کا حصہ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آج کے جدید وسائل کے ذریعے ان تمام جراثیم کو مارا جا سکتا ہے اور سؤر کا گوشت ان سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صحت کے جدید وسائل کے ذریعے یا سور کے گوشت کو زیادہ حرارت دے کر پکانے کے ذریعے یہ کیڑے کا طاً ختم بھی کر دیئے جائیں تو بھی سور کے گوشت کا نقصان دہ اور مضر ہونا قابلِ انکار نہیں ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ تو مسلم ہے کہ ہر جانور کا گوشت اس کی صفات کا حامل ہوتا ہے اور غدودوں (GLANDS) اور ہارمونز (HORMONES) کے ذریعے کھانے والے اشخاص کے اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا ممکن ہے سور کھانے والے پر سور کی بے لگام جنسی صفات اور بے حیائی جو اس کی واضح خصوصیات میں سے ہے اثر انداز ہو جائے۔ مغربی ممالک میں جو شدید جنسی بے راہ روی پائی جاتی ہے اس کا ایک اہم سبب اس گندے جانور کے گوشت کا استعمال بھی ہو سکتا ہے۔

چوتھی چیز جسے زیرِ نظر آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ گوشت ہیں جن پر ذبح کرتے وقت غیر خدا کا نام لیا جائے (وما اھل بہ لغیر اللہ)۔ وہ گوشت جنہیں کھانے سے منع کیا گیا ہے ان میں ان جانوروں کا گوشت بھی شامل ہے جو زمانہ جاہلیت کی طرح غیر خدا (بتوں) کے نام پر ذبح ہوتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذبح کے وقت خدا یا غیر خدا کا نام لینا بھی صحت و سلامتی کے نقطۂ نظر سے جانور کے گوشت

پر اثر انداز ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ضروری نہیں کہ خدا یا غیر خدا کا نام صحت کے نقطۂ نظر سے گوشت پر اثر انداز ہو کیونکہ اسلام میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اس کے مختلف پہلو ہیں۔ بعض اوقات کسی چیز کو صحت اور بدن کی حفاظت کے لئے کبھی تہذیب روح کے لئے اور کبھی نظام اجتماعی کے تحفظ کے لئے حرام قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بتوں کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کے گوشت کی حرمت در حقیقت معنوی، اخلاقی اور تربیتی پہلو سے ہے۔

(ii) **تکرار و تاکید:** جن چار چیزوں کی حرمت کا ذکر یہاں کیا گیا ہے قرآن میں چار مقامات پر اسی طرح آیا ہے۔ دو مرتبہ مکہ میں (انعام۔ ١٤٥ اور نحل۔ ١١٥) اور دو مرتبہ مدینہ میں (بقرہ ١٧٣ اور مائدہ ٣) یہ حکم نازل ہوا۔

یوں لگتا ہے کہ پہلی مرتبہ اوائل بعثت کا زمانہ تھا جب ان کی حرمت کی خبر دی گئی۔ دوسری مرتبہ پیغمبرؐ کے مکہ میں قیام کے آخری دن تھے۔ تیسری مرتبہ ہجرت مدینہ کے ابتدائی ایام تھے اور چوتھی دفعہ پیغمبرؐ کی عمر کے آخری دن تھے کہ سورہ مائدہ میں اسے بیان کیا گیا جو قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

نزولِ آیات کا یہ انداز جو بے نظیر یا کم نظیر ہے اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہے اور ان چیزوں میں موجود بہت زیادہ بدنی اور روحانی خطرات کی وجہ سے ہے اور اس بنا پر بھی کہ لوگ ان کے کھانے میں زیادہ مبتلا تھے۔

(iii) **بیمار کو خون دینا:** شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ مندرجہ بالا آیت میں خون کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ خون پینا حرام ہے لہٰذا اس سے مناسب فائدہ حاصل کرنے میں کوئی اشکال نہیں مثلاً کسی مجروح یا بیمار کو موت سے بچانے کے لئے خون دینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ان مقاصد کے لئے خون کی خرید و فروخت کی حرمت کے لئے بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کیونکہ یہ تو عقلی طور پر صحیح ہے اور عمومی احتیاج کے موقع پر فائدہ اٹھانے کے ضمن میں آتا ہے۔

١٧٤۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا
قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝
١٧٥۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ
اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝
١٧٦۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ
لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ۝ ع الربع



ترجمہ

۱۷۴۔ وہ لوگ جو اُسے چھپاتے ہیں جسے خدا نے کتاب میں نازل کیا ہے اور وہ اُسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ سوائے آگ کے کچھ نہیں کماتے (یہ تحفے اور اموال جو وہ اس ذریعے سے حاصل کرتے ہیں درحقیقت ایک جلانے والی آگ ہے) اور قیامت کے دن خدا ان سے بات نہیں کرے گا۔ نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۱۷۵۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت اور عذاب کو بخشش کی بجائے خرید لیا ہے۔ عذاب الٰہی کے مقابلے میں واقعاً یہ کتنے بے پرواہی اور سرد مہری کا شکار ہیں۔

۱۷۶۔ یہ (سب کچھ) اس لئے ہے کہ خدا نے (آسمانی) کتاب کو حق (کی نشانیوں اور واضح دلائل) کے ساتھ نازل کیا ہے اور جو اس میں اختلاف کرتے ہیں (اور حق کو چھپاتے ہیں اور اس میں تحریف کرکے اختلاف پیدا کرتے ہیں) گہرے شگاف (اور پراگندگی) میں پڑے ہیں۔

شانِ نزول

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ بیشتر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات خاص طور پر ان علماء یہود کے بارے میں ہیں جو پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے پیشتر لوگوں کو اپنی کتابوں میں سے آپ کی صفات اور نشانیاں بیان کرتے تھے لیکن ظہورِ پیغمبرؐ کے بعد جب انہوں نے لوگوں کو آپ کی طرف مائل و راغب ہوتے ہوئے دیکھا تو خوفزدہ ہوگئے کہ اگر انہوں نے اپنی روش کو برقرار رکھا تو ان کے منافع خطرے میں پڑ جائیں گے اور وہ تحفے اور دعوتیں جو انہیں مہیا ہیں ختم ہو جائیں گی تو وہ پیغمبرؐ کے وہ اوصاف جو توراۃ میں نازل ہو چکے تھے چھپانے لگے۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کی سخت مذمت کی گئی۔

تفسیر

دوبارہ حق پوشی کی مذمت

حق کو چھپانے کے بارے میں جو موضوع اسی سورہ کی آیہ ۱۵۹ میں گزر چکا ہے۔ زیر نظر آیات اس کی تاکید میں ہیں اگرچہ ان میں روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن جیسا کہ بارہا یاد دہانی کرائی جا چکی ہے کہ آیات کا مفہوم کسی مقام پر بھی شانِ نزول سے مخصوص نہیں ہے۔ شانِ نزول تو حقیقت میں کلی اور عمومی مفہوم بیان کرنے کا ذریعہ ہے اور آیات کا ایک مصداق ہے۔ لہٰذا وہ تمام افراد جو احکام خدا اور لوگوں کی ضرورت کے حقائق کو چھپاتے ہیں اور مقام و مرتبہ یا دولت و ثروت کے حصول کے لئے اس عظیم خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں جان لینا چاہیئے کہ انہوں نے گراں بہا حقیقت ناچیز قیمت کے بدلے بیچ دی ہے کیونکہ حق پوشی کا ساری دنیا سے بھی مقابلہ کیا جائے تو سودا خسارے کا ہی ہوگا۔



ہیں اور لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرتے ہیں۔ اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں اور وہ ان چیزوں کو حقیر مادی فوائد پر قربان نہیں کرتے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن خدا کچھ مجرمین اور کفار سے باتیں کرے گا۔ مثلاً

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ٥

دُور ہو جاؤ، جہنم کی آگ میں دفع ہو جاؤ اور اب مجھ سے بات نہ کرو۔ (مومنون۔ ۱۰۸)

یہ گفتگو خدا ان لوگوں سے کرے گا جو آتش جہنم سے چھٹکارے کی درخواست کریں گے اور کہیں گے خداوندا! ہمیں اس سے نکال دے اور اگر ہم دوبارہ پلٹ گئے تو ہم ظالم و ستمگار ہیں (جاثیہ — ۳۱،۳۰)۔ اسی طرح مجرمین کے ساتھ بھی خدا کی گفتگو نظر آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محلِ بحث آیات میں گفتگو کرنے سے مراد وہ گفتگو ہے جو محبت اور خاص لطف و کرم سے ہوگی۔ اس سے حقارت سے ٹھکرانے اور راندۂ درگاہ کرنے اور سزا کے طور پر خطاب مراد نہیں جو بجائے خود ایک دردناک عذاب ہے۔

یہ نکتہ بھی زیادہ وضاحت کا محتاج نہیں کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آیاتِ الٰہی کو کم قیمت پر نہ بیچو تو اس سے یہ مراد نہیں کہ زیادہ قیمت پر بیچو بلکہ مقصد یہ ہے کہ حق پوشی کے مقابلے میں جو چیز بھی لی جائے وہ بے قدر و قیمت، ناچیز اور حقیر ہے۔

بعد کی آیت اس گروہ کی کیفیت کو زیادہ واضح طور پر بیان کرتی ہے اور اس کے نقصان دہ انجام اور نتیجۂ کار کی خبر دیتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں جو گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے عوض خرید لیتے ہیں (اولٰئك الذين اشتروا الضللة بالهدٰى والعذاب بالمغفرة)۔

اس طرح وہ دو طرفہ نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک طرف ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی انتخاب کرنا اور دوسری طرف رحمت و بخشش الٰہی کو ہاتھ سے دے کر اس کی جگہ دردناک عذابِ خدا کو حاصل کرنا اور یہ ایسا سودا ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس کے پیچھے نہیں جاتا۔

اسی لئے آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے: واقعاً تعجب کی بات ہے کہ (وہ عذابِ خدا کے سامنے کتنی بیباکی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں (فما اصبرهم على النار)۔

زیر بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ دھمکیاں اور عذاب کی وعیدیں جو حق کو چھپانے والوں کے لئے بیان کی گئی ہیں اس لئے ہیں کہ خدا نے آسمانی کتاب قرآن کو حقیقت اور واضح دلائل کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ ان خیانت کاروں کے لئے کسی شک اور ابہام کی گنجائش باقی نہ رہے (ذالك بان الله نزل الكتب بالحق)۔

اس کے باوجود لوگ نہیں چاہتے کہ اپنے مادی فوائد کی خاطر اس بُرے عمل سے دست بردار ہوں وہ توجیہ و تحریف میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی آسمانی کتب میں اختلاف پیدا کرتے ہیں تاکہ بزعم خود پانی کو گدلا کر کے اس میں سے مچھلیاں



پکڑ سکیں۔ اور ایسے لوگ جو کتاب آسمانی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں حقیقت سے کافی دور ہیں (وان الذین اختلفوا فی الکتاب لفی شقاق بعید)۔

لفظ شقاق کا معنی ہے شگاف اور جدائی۔ یہ تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ایمان و تقویٰ اور اظہارِ حق انسانی معاشرے میں وحدت و اتحاد کی رمز ہے جب کہ کفر و خیانت اور اخفائے حقائق پراگندگی، جدائی اور شگافتگی کا سبب ہے اور اس سے مراد سطحی جدائی اور شگاف نہیں کہ جس سے صرف نظر کیا جا سکے بلکہ ایسی جدائی، پراگندگی اور شگاف ہے جس میں گہرائی ہو۔

۱۷۷۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۷۔ نیکی یہی نہیں کہ (نماز کے وقت) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو (اور تمام گفتگو قبلہ اور اس کی تبدیلی کے بارے میں کرتے رہو اور اپنا سارا وقت اسی میں صرف کر دو) بلکہ نیکی (اور نیکوکار) وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتاب اور انبیاء پر ایمان لے آئیں اور (اپنا) مال اس سے پوری محبت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، ضرورتمند مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں پر خرچ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، جب عہد و پیمان باندھیں تو اسے پورا کریں اور بے کسی، محرومی، بیماری اور میدان جنگ غرض ہر عالم میں استقامت و صبر کا مظاہرہ کریں یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بولتے ہیں (اور ان کی گفتار، کردار اور اعتقاد میں ہم آہنگی ہے) اور یہی پرہیزگار ہیں۔

شان نزول

قبلہ کی تبدیلی سے عام لوگوں میں بالعموم اور یہود و نصاریٰ میں بالخصوص شور و غوغا بپا ہو گیا تھا اور یہودیوں کے نزدیک



یہ بڑی سند افتخار تھی (کہ مسلمان ان کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں) اور اب یہ ہاتھ سے جاتی رہی تھی لہذا انھوں نے زبان اعتراض دراز کی۔ قرآن نے اس سورہ کی آیت ۱۴۲ — سیقول السفہاء — میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت اس کی تائید میں نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ قبلہ کے مسئلے پر اتنی باتیں بنانا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر مسائل ہیں جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں ان مسائل کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

تفسیر

تمام نیکیوں کی اساس

جیسا کہ قبلہ کی تبدیلی سے متعلق آیات کے ذیل میں گذر چکا ہے عیسائی عبادت کے وقت مشرق کی طرف اور یہودی مغرب کی طرف منہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔ جو ان دونوں کے درمیان واقع ہے اور اس علاقے میں جنوب کی طرف تھا۔ ہم نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ مخالفین اسلام ایک طرف سے شور بلند کرتے تھے اور نووارد مسلمان دوسری طرف متحیر تھے۔ مندرجہ بالا آیت کا رخ سخن ان دونوں کی طرف ہے فرمایا: نیکی صرف یہ نہیں کہ نماز کے وقت منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو اور اپنا سارا وقت اسی مسئلے پر بحث کرتے گزار دو (لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب)۔

بِرّ (بروزن ضد) — اس کا اصل معنیٰ وسعت ہے۔ بعد ازاں نیکیوں، خوبیوں اور احسان کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ امور وجود انسانی میں محدود نہیں رہتے بلکہ وسعت پیدا کرکے دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

لفظ بَرّ (بروزن نر) وصفی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا معنیٰ ہے وہ شخص جو نیکوکار ہے۔ اصل میں اس کا معنیٰ ہے بیابان اور وسیع مکان چونکہ نیکوکار روحانی وسعت اور کھلے دل کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس خصوصیت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایمان، اخلاق اور عمل کے لحاظ سے نیکیوں کے اہم ترین اصول چھ عنوانات کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: لیکن نیکی (اور نیک افراد) وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتب اور انبیاء پر ایمان لے آئے ہیں (ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملائکۃ والکتٰب والنبیین)۔

نیکیوں اور خوبیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ انسان ایمان لائے مبداء و معاد پر، تمام خدائی پروگراموں پر، پیغمبروں پر (جو ان پروگراموں کی تبلیغ و اجراء پر مامور تھے) اور فرشتوں پر (جو اس دعوت کی تبلیغ کا واسطہ شمار ہوتے ہیں) یہ وہ اصول ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان کا سارا وجود روشن ہو جاتا ہے اور یہی ایمان تمام اصلاحی پروگراموں اور اعمالِ صالح کی طرف تحریک پیدا کرنے کے لئے قوی عامل ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ نیکوکار وہ لوگ ہیں... بلکہ فرمایا: نیکی — وہ لوگ ہیں...، یہ اس لئے



کہ ادبیاتِ عرب میں جب کسی چیز میں مبالغے اور تاکید کے آخری درجے کو بیان کرنا ہو تو اسے مصدر کی شکل میں لاتے ہیں نہ کہ صفت کے طور پر کہتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ عالم انسانیت کا عدل ہیں۔ یعنی آپ ایسے عدالت پیشہ تھے کہ گویا سراپا عدل تھے اور سر سے پاؤں تک عدالت میں ڈوبے ہوئے تھے اس طرح کہ اگر آپ کی طرف نگاہ کی جائے تو عدل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ان کے مقابل میں کہا جاتا ہے کہ بنی امیہ ذلتِ اسلام ہیں گویا ان کا پورا وجود ذلت و خواری میں ڈھل چکا تھا۔ اس لئے زیر نظر تعبیر سے ایمانِ محکم اور ایمان کی بلند تر قوت و طاقت مراد ہے۔

ایمان کے بعد انفاق، ایثار اور مالی بخششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: چاہت و محبت کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو دیدیتے ہیں (واٰتی المال علی حبه ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب)۔

اس میں شک نہیں کہ مال و دولت کی پرواہ نہ کرنا سب کے لئے آسان کام نہیں خصوصاً جب مقام ایثار ہو۔ کیونکہ اس کی محبت سب دلوں میں ہے۔ "علی حبه" اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس دلی خواہش کے باوجود استقامت دکھاتے ہیں اور خدا کے لئے اس خواہش سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہاں حاجت مندوں کے چھ طبقے بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے درجے میں وابستگان اور آبرومند رشتہ دار ہیں، دوسرے طبقے میں یتیم اور مسکین ہیں۔ اس کے بعد وہ ہیں جن کی ضرورت وقتی ہے۔ مثلاً جن کا خرچ سفر میں ختم ہو جائے۔ اس کے بعد سائلین کا تذکرہ ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ تمام ضرورت مند سوال نہیں کیا کرتے بلکہ بعض ایسے غیرت مند ہیں جو ظاہراً اغنیاء کی طرح ہیں جب کہ باطنی طور پر بہت ضرورت مند ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن ایک اور مقام پر کہتا ہے:

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

ناواقف لوگ ان کی عفت و پاکدامنی کی وجہ سے انہیں اغنیاء اور تونگر خیال کرتے ہیں۔

(بقرہ - ۲۷۳)

آخر میں غلاموں کا ذکر ہے کہ اگرچہ ظاہراً ان کی مادی ضروریات ان کے مالک کے ذریعے پوری ہو رہی ہوتی ہیں لیکن وہ آزادی و استقلال کے محتاج ہیں۔

نیکیوں کی تیسری بنیاد قیام نماز شمار کی گئی ہے (واقام الصلوٰة)۔ نماز تمام شرائط اور اخلاص و خضوع سے ادا کی جائے تو انسان کو ہر قسم کے گناہ سے باز رکھتی ہے اور خیر و سعادت کا شوق پیدا کرتی ہے۔

چوتھا پروگرام زکوٰۃ اور دیگر واجب مالی حقوق کی ادائیگی ہے (واٰتی الزکوٰة)۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کئی مقامات پر ضرورت مندوں کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن واجب حقوق کی ادائیگی میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو واجب حقوق کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد کو تیار نہیں ہوتے اور وہ ایک پیسہ بھی کسی ضرورت مند کو دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ زیر بحث آیت میں ایک طرف مستحب امور پر خرچ کرنے والوں اور دوسری طرف واجب



حقوق ادا کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کو نیک لوگوں کی صف سے نکال دیتی ہے اور حقیقی نیک اسے قرار دیتی ہے جو اپنی ذمہ داری دونوں میدانوں میں ادا کرے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مستحب خرچ کے سلسلے میں علیٰ حبہ (باوجودیکہ وہ مال و ثروت سے محبت رکھتے ہیں) کا ذکر ہے لیکن واجب زکوٰۃ کے ضمن میں یہ بات نہیں کیونکہ واجب مالی حقوق کی ادائیگی ایک الٰہی و اجتماعی ذمہ داری ہے اور منطق اسلام کی رُو سے اصولی طور پر حاجت مند زکوٰۃ اور دیگر واجبات کی مقدار کے مطابق دولت مندوں کے اموال میں شریک ہیں اور شریک کو اس کے مال کی ادائیگی کے لئے ایسی تعبیر کی ضرورت نہیں۔

پانچویں خصوصیت ایفائے عہد و پیمان گردانی گئی ہے۔ فرمایا: وہ لوگ جو وعدہ کرلیں تو اپنے عہد و پیمان کو نبھاتے ہیں (والموفون بعھدھم اذا عٰھدوا)۔ کیونکہ باہمی اعتماد اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہے۔ وہ گناہ جو اطمینان اور اعتماد کے رشتے کو توڑ چھوڑ دیتے ہیں اور اجتماعی روابط کی بنیاد کو نیچے سے کمزور کر دیتے ہیں ان میں وعدے کی عدم پاسداری ہے۔ اسی لئے اسلامی روایات میں مسلمانوں کی ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ تین امور سب لوگوں کے بارے میں انجام دیں چاہے ان کے سامنے مسلمان ہو یا کافر اور نیک ہو یا بد، وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ ایفائے عہد

۲۔ ادائے امانت اور

۳۔ ماں باپ کا احترام

ان نیک لوگوں کی چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو محرومیت، فقر و فاقہ، بیماری اور رنج و مصیبت کے وقت اور اسی طرح جنگ میں دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان سخت حوادث کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے (والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس)[1]۔

آیت کے آخر میں بات کو مجتمع کرتے ہوئے اور ان چھ بلند صفات پر تاکید کے طور پر فرماتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بات کرتے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں (اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون)۔

ان کی راست گوئی تو یہاں سے واضح ہوتی ہے کہ ان کے اعمال اور ان کا کردار ہر طرح سے ان کے اعتقاد اور ان کے ایمان سے ہم آہنگ ہے۔ ان کا تقویٰ و پرہیزگاری اس بات سے عیاں ہے کہ وہ ضرورتمندوں، محروموں، انسانی معاشرہ اور اپنی ذات کے بارے میں اپنی الٰہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا چھ برجستہ صفات اصولِ اعتقاد و اخلاق اور عملی پروگراموں پر مشتمل ہیں۔ اصولِ اعتقاد کے سلسلے میں تمام بنیادی امور کا تذکرہ ہے اور عملی پروگراموں میں سے انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہے جو مخلوق کے

---

[1] باساء کا مادہ ہے بؤس، اس کا معنیٰ ہے فقر و فاقہ، ضراء کا معنیٰ ہے درد و بیماری اور حین الباس کا معنیٰ ہے وقتِ جنگ (المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔



خالق سے اور مخلوق کے مخلوق سے رابطے کا نمونہ ہے۔ اخلاقی امور میں سے ایفائے عہد اور استقامت و پائداری کا تذکرہ ہے جو تمام تر اعلیٰ اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۷۸۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ
الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ
بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ
فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○
۱۷۹۔ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۸۔ اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پس اگر کوئی اپنے (دینی) بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے (اور حکم قصاص خونبہا سے بدل جائے) تو اسے چاہیئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اور دیت کی وصولی میں دیت دینے والے کی حالت کو پیشِ نظر رکھے) اور قاتل بھی ولی مقتول کو اچھے طریقے سے دیت ادا کرے (اور اس کی ادائیگی میں حیل وحجت سے کام نہ لے) تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے اور اس کے بعد بھی جو تجاوز کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔
۱۷۹۔ اور قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے، اے صاحبانِ عقل و خرد! تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنا چاہیئے۔

شانِ نزول

زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی عادت تھی کہ ان کے قبیلے کا ایک آدمی قتل ہو جاتا تو وہ پختہ ارادہ کر لیتے کہ حتی المقدور اس کا انتقام لیں گے اور یہ فکر یہاں تک آگے بڑھ چکی تھی کہ وہ تیار رہتے کہ ایک شخص کے بدلے قاتل کا سارا قبیلہ قتل کر ڈالیں مندرجہ بالا آیت کے ذریعے قصاص کا عادلانہ حکم بیان کیا گیا۔
اس زمانے کے دو مختلف دستوروں میں اسلام کا یہ حکم حد وسط تھا۔ اس دور میں بعض لوگ قصاص کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو جائز اور درست نہ جانتے تھے جب کہ بعض لوگ صرف دیت اور خونبہا کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اسلام نے مقتول کے اولیاء کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قصاص کا حکم دیا اور طرفین کی رضا اور قصاص کی معافی پر دیت کو ضروری قرار دیا۔



تفسیر

قصاص تمہاری حیات کا سبب ہے

ان آیات سے لے کر آگے کی کچھ آیات تک احکام اسلام کے ایک سلسلے کو واضح کیا گیا ہے۔ گذشتہ آیات نیکی کے بارے میں تھیں اور ان میں کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت بھی کی گئی تھی۔ زیر نظر آیات اس سلسلۂ بیان کی تکمیل کرتی ہیں۔

سب سے پہلے احترام خون کی حفاظت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو ربط معاشرہ کے ضمن میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کا یہ حکم جاہلیت کے رسم و رواج پر خط بطلان کھینچتا ہے۔ مومنین کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں قصاص کا حکم تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے (یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ)۔

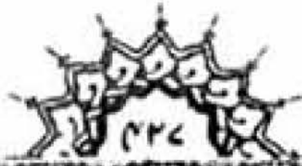
قرآن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی لازم الاجراء قوانین کو "کتب علیکم" (تم پر لکھ دیا گیا ہے) کے الفاظ سے بیان کرتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی انہی میں سے ہے۔ آئندہ کی آیات جو وصیت اور روزہ کے بارے میں ہیں، ان میں بھی یہی تعبیر نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ الفاظ اہمیت اور تاکید مطلب کو پورے طور پر ادا کرتے ہیں کیونکہ ہمیشہ ان الفاظ کو رقم کیا جاتا ہے جو نگاہِ قدر و قیمت میں قطعیت رکھتے ہوں۔

قصاص مادہ قص (بروزن سد) سے ہے۔ اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کے آثار کی تلاش کرنا اور جو چیز پے در پے اور یکے بعد دیگرے آئے اُسے قصہ کہتے ہیں چونکہ قصاص ایسا قتل ہے جو پہلے قتل کے بعد قرار پاتا ہے اس لئے یہاں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

جیسا کہ شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے یہ احکام افراط و تفریط کے اُن رویوں کے اعتدال پر لانے کے لئے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں کسی قتل کے بعد رونما ہوتے تھے۔ لفظ قصاص اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء مقتول حق رکھتے ہیں کہ وہ قاتل سے وہی سلوک کریں جس کا وہ ارتکاب کر چکا ہے لیکن آیت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آیت کا آخری حصہ مساوات کے مسئلہ کو زیادہ واضح کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ)۔

بعد میں ہم واضح کریں گے کہ یہ مسئلہ مرد کے خون کی عورت کے خون پر برتری کی دلیل نہیں ہے بلکہ قاتل مرد سے بھی (خاص شرائط کے ساتھ) مقتول عورت کے بدلے قصاص لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ واضح کرنے کے لئے کہ قصاص اولیاء مقتول کا ایک حق ہے مگر یہ کوئی التزامی حکم نہیں ہے بلکہ اگر اولیاء مائل ہوں تو قاتل کو بخش سکتے ہیں اور خون بہا لے سکتے ہیں یا چاہیں تو خون بہا بھی نہ لیں۔ مزید فرمایا کہ اگر کوئی اپنے دینی بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے (اور قصاص کا حکم طرفین کی رضا سے خون بہا میں بدل جائے) تو اُسے چاہیئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اور اس خون بہا کے لینے میں دوسرے پر سختی و تنگی روا نہ رکھے) اور ادا کرنے والا بھی



دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے (فمن عفی لہ من اخیہ شیئ فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان)۔

ایک طرف اولیاء مقتول کو وصیت کی گئی ہے کہ اب اگر اپنے بھائی سے قصاص لینے سے صرف نظر کر چکے ہو تو خونبہا لینے میں زیادتی سے کام نہ لو شائستہ اور اچھے طریقے سے اور عدل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جسے اسلام نے ضروری قرار دیا ہے ایسی اقساط میں جن میں وہ ادائیگی کی قدرت رکھتا ہے وصول کرو۔

دوسری طرف "اداء الیہ باحسان" کے جملے میں قاتل کو بھی وصیت کی گئی ہے کہ وہ خونبہا کی ادائیگی میں نیکی اور اچھائی کی روش اختیار کرے اور بغیر کسی غفلت کے کامل اور بر محل ادا کرے۔ اس طرح دونوں کے لئے ذمہ داری اور راستے کا تعین کر دیا گیا ہے۔

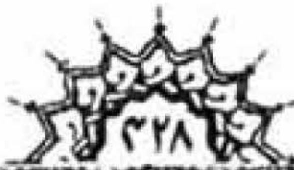
آیت کے آخر میں بطور تاکید اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس کسی کی طرف سے حد سے تجاوز کیا جائے گا وہ شدید سزا کا مستحق ہو گا۔ فرمایا: تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے اور اس کے بعد بھی جو شخص حد سے تجاوز کرے، تو دردناک عذاب اس کے انتظار میں ہے (ذالك تخفيف من ربكم ورحمة فمن اعتدى بعد ذالك فله عذاب اليم)۔

انسانی اور منطقی نقطۂ نظر سے قصاص اور عفو کا یہ ایک عادلانہ دستور ہے۔ ایک طرف اس حکم سے زمانہ جاہلیت کی فاسد روش کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں لوگ قصاص کے لحاظ سے کسی قسم کی برابری کے قائل نہ تھے اور ہمارے زمانے کے جلادوں کی طرح ایک شخص کے بدلے سینکڑوں افراد کو خاک و خون میں لوٹا دیتے تھے۔ دوسری طرف لوگوں کے لئے عفو و بخشش کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس حکم میں احترام خون میں کمی نہیں آنے دی گئی اور قاتلوں میں جسارت و بے باکی پیدا نہیں ہونے دی گئی اور اس آیت کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ معاف کرنے اور خون بہا لینے کے بعد طرفین میں سے کوئی بھی تجاوز کا حق نہیں رکھتا جب کہ زمانہ جاہلیت میں اولیاء مقتول معاف کر دینے اور خونبہا لینے کے باوجود بعض اوقات قاتل کو قتل کر دیتے تھے۔

بعد کی آیت مختصر اور پر معنی عبارت سے مسئلہ قصاص سے متعلق بہت سے سوالوں کا جواب دیتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے صاحبان عقل و خرد! قصاص تمہارے لئے حیات بخش ہے، ہو سکتا ہے تم تقوی و پرہیزگاری اختیار کرو (ولكم فى القصاص حياة يا اولى الالباب لعلكم تتقون)۔

دس الفاظ پر مشتمل یہ آیت انتہائی فصیح و بلیغ ہے یہ ایک شعار اسلامی کی صورت میں ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی عمدگی سے نشاندہی کرتی ہے کہ اسلامی قصاص میں کسی قسم کا انتقامی پہلو نہیں بلکہ یہ حیات و زندگی کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔

ایک طرف تو یہ معاشرے کی حیات ہے کیونکہ اگر قصاص کا حکم کسی طور پر بھی موجود نہ ہوتا اور سنگدل لوگ بے پرواہ ہوتے تو بے گناہ لوگوں کی جان خطرے میں رہتی۔ جن ملکوں میں قصاص کا حکم ختم کر دیا گیا ہے وہاں قتل کی وارداتوں میں تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ حکم قاتل کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کا تصور اسے قتل انسانی کے ارادے سے کافی حد تک باز رکھے گا اور اسے کنٹرول کرے گا۔ تیسری طرف برابری کا لزوم پے در پے کئی افراد کے قتل کو روکے گا۔ اور زمانہ



جاہلیت کے ان طور طریقوں کو ختم کرے گا جن میں ایک قتل کے بدلے کئی افراد کو قتل کر دیا جاتا تھا اور پھر اس کے نتیجے میں آگے بہت سے افراد قتل ہوتے تھے اور اس طرح سے یہ حکم معاشرے کی زندگی کا سبب ہے۔

اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ قصاص کا مطلب ہے معاف نہ کرنا۔ یہ خود ایک دریچہ حیات کھلنے کے مترادف ہے نیز لعلکم تتقون ہر قسم کے تجاوز و تعدی سے پرہیز کرنے کے لئے تنبیہ ہے جس سے اسلام کے اس حکیمانہ حکم کی تکمیل ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **قصاص عفو ایک عادلانہ نظام ہے:** ہر مقام و محل پر اسلام مسائل کی واقعیت اور ان کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اس نے بے گناہوں کا خون بہانے کے مسئلے میں ہر طرح سے افراط و تفریط سے بالاتر ہو کر حق مطلب ادا کیا ہے۔ اس نے یہودیوں کے تحریف شدہ دین کی طرح صرف قصاص کا سہارا نہیں لیا اور نہ ہی ایسی عیسائیت کی طرح صرف عفو و دیت کی راہ دکھائی ہے کیونکہ پہلا حکم انتقام جوئی کا باعث ہے اور دوسرا قاتلوں کی جرأت کا سبب ہے۔

فرض کریں قاتل و مقتول ایک دوسرے کے بھائی ہوں یا ان میں دوستی و اجتماعی تعلقات رہے ہوں تو اس صورت میں قصاص پر مجبور کرنا اولیاء مقتول کے لئے ایک نئے رنج کا باعث ہوگا۔ خصوصاً ایسے لوگ جو انسانی جذبات سے سرشار ہوں انہیں قصاص پر مجبور کرنا ایک اور سختی شمار ہوگا جب کہ اس حکم کو عفو و دیت میں محدود و محصور کر دینا بھی ظالموں کو مزید جری و بیباک بنانے کا باعث ہوگا۔

لہٰذا اسلام نے قصاص کو اصلی حکم قرار دیا ہے اور اسے معتدل بنانے کے لئے اس کے ساتھ عفو کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں مقتول کے اولیاء کو ان تین راستوں میں سے ایک اختیار کرنے کا حق ہے۔

۱۔ قصاص لے لیں۔

۲۔ خونبہا لئے بغیر معاف کر دیں۔

۳۔ خونبہا لے کر معاف کر دیں (البتہ اس صورت میں ضروری ہے کہ قاتل بھی راضی ہو)۔

(۲) **کیا قصاص عقل اور انسانیت کے خلاف ہے:** بعض لوگوں نے غور و فکر کئے بغیر اسلام کے جزا و سزا کے کچھ قوانین پر تنقید کی ہے۔ قصاص کے مسئلے پر خصوصاً بہت شور و غل ہے۔ مسئلہ قصاص پر مخالفین کے اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قاتل کا یہی جرم ہے کہ اس نے ایک انسان کو ختم کر دیا۔ قصاص لیتے وقت اسی عمل کا تکرار کیا جاتا ہے۔

۲۔ قصاص ایک انتقامی کارروائی اور سنگدلی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ صفت لوگوں میں سے ختم کی جانا چاہیئے جبکہ قصاص کے طرفدار انتقام جوئی کی اس ناپسندیدہ صفت میں نئی روح پھونکتے ہیں۔

۳۔ انسان کشی ایسا گناہ نہیں جسے عام اور صحیح و سالم لوگ انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا قاتل نفسیاتی طور پر کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ قصاص ایسے مریضوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔



۴۔ وہ مسائل جن کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے ان کا رشد اور نشوونما انسانی معاشرے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ وہ قانون جو آج سے چودہ سو سال پہلے جاری ہوا اسے آج کے ترقی یافتہ معاشرے میں جاری نہیں ہونا چاہیئے۔

۵۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ قصاص لینے کی بجائے قاتلوں کو قید کر دیا جائے۔ اور قید خانے میں ان کے وجود سے جبراً معاشرے کے فائدے کے لئے کام لیا جائے۔ اس طرح ایک طرف معاشرہ ان کے شر سے محفوظ رہے گا اور دوسری طرف ان سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

یہ ان اعتراضات کا خلاصہ ہے جو مسئلہ قصاص پر کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کا **جواب** پیش کیا جاتا ہے۔

آیاتِ قصاص میں غور و خوض کرنے سے یہ اشکالات دور ہو جاتے ہیں (ولکم فی القصاص حیاۃ یآ اولی الالباب)۔

۱۔ بعض اوقات خطرناک افراد کو ختم کر دینا معاشرے کے رشد و تکامل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر مسئلہ قصاص حیات اور بقائے موجودات کا ضامن ہے۔ اس لئے قصاص کا جذبہ انسان اور حیوان کے مزاج اور طبیعت میں رکھ دیا گیا ہے۔

نظامِ طب ہو یا زراعت سب اسی عقلی اصول پر مبنی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بدن کی حفاظت کے لئے بعض اوقات فاسد اور خراب عضو کو کاٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح درخت کی نشوونما میں مزاحم شاخوں کو بھی قطع کر دیتے ہیں۔

جو قاتل کے قتل کو ایک شخص کا نقصان سمجھتے ہیں ان کی نظر انفرادی ہے اگر وہ اجتماعی نظر رکھتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ قانون قصاص باقی افراد کی حفاظت اور تربیت کا باعث ہے تو وہ اپنی گفتگو میں تجدید نظر کرتے۔ معاشرے میں سے ایسے خونخوار افراد کا خاتمہ مضر عضو اور شاخ کو کاٹنے کی طرح ہے جسے حکم عقل کے مطابق لازماً قطع کرنا چاہیئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج تک مضر اعضا اور شاخوں کو کاٹنے پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

۲۔ اصولی طور پر تشریع قصاص کا جذبۂ انتقام سے کوئی ربط نہیں کیونکہ انتقام کا معنی ہے غضب کی آگ کو کسی شخصی مسئلے کی خاطر ٹھنڈا کرنا جب کہ قصاص کا مقصد معاشرے پر ظلم و ستم کے تکرار کو روکنا ہے اور اس کا ہدف اور غرض طلبِ عدل اور باقی بے گناہ افراد کی حمایت ہے۔

۳۔ تیسرا اعتراض ہے کہ قاتل یقیناً کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے اور عام لوگ ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں کہنا چاہیئے کہ بعض اوقات تو یہ بات بالکل صحیح ہے ایسی صورت میں اسلام نے بھی دیوانہ اور ایسے افراد کے لئے قصاص کا حکم نہیں دیا لیکن قاتل کو ہمیشہ بیمار قرار دینا بہت خطرناک ہے کیونکہ ایسے فساد کو ایسی بنیاد فراہم کرنا معاشرے کے ظالموں کو ایسی جرأت دلاتا ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ استدلال کسی صحیح قاتل کے بارے میں ہے تو پھر یہی استدلال سب تجاوز کرنے والوں اور دوسروں کے حقوق چھیننے والوں کے لئے بھی صحیح ہونا چاہیئے کیونکہ عقل کامل رکھنے والا شخص کبھی دوسروں پر تجاوز نہیں کرتا۔ اس طرح تو سزا کے تمام قوانین کو ختم کر دینا چاہیئے اور تجاوز و تعدی کرنے والے سب افراد کو قید خانوں اور مقاماتِ سزا سے نکال کر نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں داخل کر دینا چاہیئے۔

۴۔ رہا یہ سوال کہ معاشرے کی ترقی قانونِ قصاص کو قبول نہیں کرتی اور قصاص صرف قدیم معاشرے میں اثر رکھتا تھا لیکن



اس ترقی کے زمانے میں اقوامِ عالم قصاص کو خلافِ وجدان سمجھتی ہیں۔

اس کا جواب صرف ایک جملے میں یوں دیا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ ان وسیع وحشت ناک جرائم اور میدان جنگ وغیرہ کے مقتولین کی تعداد کے مقابلے میں بہت بے وزن ہے اور خیالی پلاؤ کی طرح ہے۔ فرض کیا کہ ایسی دنیا وجود میں آجائے تو اسلام نے بھی قانونِ عفو کو قصاص کے ساتھ ہی صراحت سے بیان کر دیا ہے اور قصاص ہی کو اس سلسلے میں آخری طریقہ کار قرار نہیں دیا۔ مسلم ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں لوگ قاتل کو معاف کر دینے کو ہی ترجیح دیں گے لیکن موجودہ دنیا میں جس کے کئی تہوں میں چھپے ہوئے جرائم گذشتہ زمانوں سے زیادہ اور انتہائی وحشیانہ ہیں اس میں قانون قصاص کے خاتمہ کا مطلب جرائم و مظالم کے دامن کو وسعت دینے کے اور کچھ نہ ہوگا۔

۵۔ جیسا کہ قرآن کی تصریح موجود ہے۔ قصاص کی غرض و غایت صرف حیاتِ عمومی و اجتماعی اور قتل و فساد کے تکرار سے بچنا اور اسے روکنا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ قید خانہ اس سلسلے میں مطلوبہ کردار ادا نہیں کر سکتا (خصوصاً موجودہ زمانے کے قید خانے جن میں سے بعض کی کیفیت تو مجرموں کے گھروں سے کہیں بہتر ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مجرم کے قتل کا حکم ختم کر دیا گیا ہے وہاں تھوڑی ہی مدت میں جرائم اور قتل کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور قید یو کو بخش ہی دیا جائے اور انہیں آزاد کر دیا جائے تو جرائم پیشہ لوگ بڑے اطمینان اور آرام سے اپنے ہاتھ قتل اور ظلم سے رنگین کرتے رہیں۔

(iii) کیا مرد کا خون عورت کے خون سے زیادہ قیمتی ہے: ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں کہ آیاتِ قصاص میں حکم دیا گیا ہے کہ عورت کے قتل کے بدلے مرد سے قصاص نہ لینا چاہیے تو کیا مرد کا خون عورت کے خون سے گراں تر اور زیادہ قیمتی ہے۔ آخر ایک ظالم مرد سے عورت کے قتل پر قصاص کیوں نہ لیا جائے جب کہ دنیا کی نصف سے زیادہ انسانی آبادی عورتوں پر ہی مشتمل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ مرد سے عورت کے قتل کے بدلے قصاص نہ لیا جائے بلکہ جیسا کہ فقہ اسلامی میں تفصیل و تشریح سے موجود ہے عورت کے اولیاء عورت کے قتل کی صورت میں قصاص لے سکتے ہیں بشرطیکہ دیت کی آدھی مقدار ادا کر دیں۔ دوسرے لفظوں میں عورت کے قتل کی صورت میں قصاص نہ لینے سے مراد وہ قصاص ہے جو بلا کسی شرط کے ہو لیکن آدھی دیت ادا کرنے کی صورت میں مرد سے قصاص لینا اور اسے قتل کرنا جائز ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ حکم اس لئے نہیں کہ عورت مرتبہ انسانیت پر فائز نہیں یا اس کا خون کم قیمت ہے۔ یہ ایک بیجا اور غیر منطقی توہم ہے اور شاید یہ مفہوم خون بہا (خون کی قیمت) سے پیدا ہوا ہے۔ آدھی دیت تو صرف اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ہے جو مرد سے قصاص لینے کی صورت میں مرد کے خاندان کو پہنچا ہے (غور کیجئے گا)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیادہ تر مرد ہی خاندان کا اقتصادی عضو مؤثر ہوتا ہے اور مرد ہی خاندان کے اخراجات اٹھاتا ہے اور مرد ہی اپنی اقتصادی کارکردگی سے خاندان کی زندگی کا کارخانہ چلاتا ہے۔ اس بناء پر مرد اور عورت کے ختم ہونے میں اقتصادی پہلو کا جو فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو مقتول مرد کے بیگناہ



پسماندگان اور آل اولاد آخر کس جرم میں خسارہ اٹھائیں گے۔ اسلام نے مرد سے عورت کے قتل کا قصاص لینے کی صورت میں آدھی دیت دینے کا قانون معین کر کے سب لوگوں کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے اور اس طرح ایک خاندان کو جو نا قابل تلافی نقصان ہو رہا تھا اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ لفظ مساوات کے بہانے دوسرے کے حقوق پائمال ہوں جیسے اس شخص کی اولاد کے حقوق جس سے قصاص لیا جا رہا ہے۔

(۱۷) اس مقام پر لفظ "اخیہ" کا استعمال: ایک اور نکتہ جو یہاں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہاں لفظ اخیہ کا استعمال ہے۔ قرآن برادری کے رشتے کو انسانی معاشرے میں اتنا محکم سمجھتا ہے کہ اس کے نزدیک خون ناحق بہانے کے باوجود یہ برقرار رہتا ہے لہٰذا اولیاء مقتول کے انسانی جذبات کو ابھارنے کے لئے انہیں قاتل کے بھائی کہہ کر متعارف کراتا ہے اور اس طرح انہیں عفو و مدارات کا شوق دلاتا ہے۔ البتہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ہیجان اور غضب و غصے کی حالت میں ایسے عظیم گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اس پر پشیمان ہوں لیکن وہ مجرم جو اپنے کام پر فخر کریں اور نادم نہ ہوں، بھائی کہلانے کے لائق نہیں اور نہ ہی عفو و درگذر کے مستحق ہیں۔

۱۸۰۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

۱۸۱۔ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

۱۸۲۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۸۰۔ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو چاہیئے کہ وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے شائستہ طور پر وصیت کرے۔ یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

۱۸۱۔ پھر جس نے وصیت سن کر اسے بدل ڈالا اس کا گناہ (وصیت بدلنے والے پر ہے۔ خدا تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۸۲۔ جس شخص کو خوف ہو کہ وصیت کرنے والا انحراف (بعض ورثہ کی طرف یک طرفہ میلان) یا گناہ (کسی غلط چیز



کے لئے وصیت) سے کام لیا ہے اور وہ ورثہ کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں (اور اس پر وصیت کی تبدیلی کا قانون لاگو نہ ہوگا) خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

شائستہ اور مناسب وصیتیں

گذشتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بعض مسائل بیان کرنے کے بعد ان آیات میں ایک لازمی حکم کے طور پر مالی معاملات میں وصیت کے کچھ احکام بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آجائے تو اپنے مال و منال کے سلسلے میں والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں مناسب اور شائستہ وصیت کرے (کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف)۔ آیت کے آخر میں مزید فرمایا: یہ پرہیزگاروں کے ذمے ایک حق ہے (حقا علی المتقین)۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے "کتب علیکم" ظاہراً وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے وصیت کے بارے میں مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگرچہ قوانین اسلام کی رو سے وصیت ایک عمل مستحب ہے لیکن چونکہ ایسا مستحب ہے جس کی تائید بہت زیادہ ہے لہٰذا "کتب علیکم" کے جملہ سے اس کا حکم بیان کیا گیا ہے اس لئے آیت کے آخر میں "حقا علی المتقین" آیا ہے اگر یہ وجوبی حکم ہوتا تو فرمایا جاتا "حقا علی المومنین"۔

کچھ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت میراث کے احکام نازل ہونے سے پہلے کی ہے۔ اس وقت اموال کے بارے میں وصیت کرنا واجب تھا۔ تاکہ ورثہ میں اختلاف و نزاع نہ ہو لیکن آیات میراث نازل ہونے کے بعد یہ وجوب منسوخ ہوکر ایک مستحبی حکم کی صورت میں باقی رہ گیا۔

حدیث جو تفسیر عیاشی میں اس آیت کے ذیل میں آئی ہے اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ آیت کا یہ حکم ضرورت کے ان مواقع کے لئے ہو جہاں وصیت کرنا ضروری ہے۔

لیکن ان تمام تفاسیر میں پہلی تفسیر حق و حقیقت کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں مال کی جگہ لفظ خیر استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی اچھی چیز اپنے ترکے میں چھوڑے تو وصیت کرے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں وہ دولت و ثروت جو شرعی طریقے سے حاصل کی جائے اور معاشرے کے فائدے کے لئے اچھی راہ پر صرف کی جائے خیر و برکت ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے غلط افکار پر خط بطلان کھینچتی ہے جو مال و دولت ہی کو بری چیز سمجھتے ہیں۔ اسلام ان کجرو زاہدوں سے بیزار ہے جو روح اسلام کو نہیں سمجھ سکے اور وہ زہد کو فقر و فاقہ کا دوسرا نام سمجھے ہوئے ہیں اور ان کے افکار اسلامی معاشرے میں جمود اور ذخیرہ اندوزوں کے سر اٹھانے کا سبب بنتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس ثروت و دولت کے مشروع اور جائز ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہے جس کے بارے میں وصیت



کا حکم دیا گیا ہے ورنہ انسان کا چھوڑا ہوا غیر شرعی ناجائز مال تو خیر نہیں بلکہ شر ہی شر ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اموال کافی تعداد میں ہوں ورنہ مختصر مال تو وصیت کا محتاج نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مختصر مال تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ انسان چاہے کہ اس کا تیسرا حصہ وصیت کے ذریعے الگ کر دیا جائے۔[1]

ضمناً "اذا حضر احدکم الموت" (جب تم میں سے کسی کے پاس موت آ پہنچے) وصیت کے لئے فرصت کے آخری لمحات کو بیان کرتا ہے اگر تاخیر ہو جائے تو موقع جاتا رہے گا ورنہ کوئی مضائقہ نہیں کہ انسان پہلے سے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا وصیت نامہ تیار کرے بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل انتہائی مستحسن ہے۔

یہ انتہائی کوتاہ نظری ہے کہ انسان خیال کرے کہ وصیت کرنا فالِ بد ہے اور اپنی موت کو سامنے لانے کے مترادف ہے بلکہ وصیت تو ایک دوراندیشی اور ناقابلِ انکار حقیقت کی پہچان ہے اور اگر یہ طولِ عمر کا سبب نہ بنے تو عمر میں کمی کا تو ہرگز سبب نہیں ہے۔

زیرِ نظر آیت میں وصیت کو "بالمعروف" سے مقید کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وصیت ہر لحاظ سے عقل مندانہ ہو، لیکن معروف کا معنی ہے عقل و خرد کی پہچانی ہوئی (عرفِ عقلاء)۔

جس شخص کے لئے وصیت کی جا رہی ہو اس کے لئے مقدار کے لحاظ سے اور دیگر جہات سے ایسی ہو کہ عقلا اسے مدبرانہ سمجھیں نہ یہ کہ وہ تفرقہ اور نزاع کا باعث بن جائے۔

جب وصیت تمام مذکورہ صفات کی جامع ہو تو وہ ہر لحاظ سے محترم اور مقدس ہوگی اور اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل حرام ہے۔ اسی لئے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو کوئی وصیت سننے کے بعد اس میں تبدیلی کرے اس کا گناہ تبدیلی کرنے والے کے سر ہے (فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ) اور اگر ان کا گمان ہے کہ خدا ان کی سازشوں اور مخفی کارروائیوں سے بے خبر ہے تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں کیونکہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (ان اللہ سمیع علیم)۔

ممکن ہے یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ وصی (وہ شخص جو وصیت کرنے والے کی موت کے بعد وصیتوں پر عملدرآمد کے لئے ذمے دار ہے) کی خلاف ورزی کبھی وصیت کرنے والے کے اجر و ثواب کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہ اپنا اجر پا چکا ہے۔ گناہ کا طوق فقط وصی کی گردن کے لئے ہے جس نے وصیت کی مقدار، کیفیت یا اصلی وصیت میں تبدیلی کی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مقصد یہ ہو کہ اگر وصی کی خلاف ورزی کی وجہ سے میت کا مال ایسے افراد کو دے دیا جائے جو اس کے مستحق نہیں اور وہ اس سے بے خبر بھی ہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ گناہ صرف وصی کو ہوگا جس نے دانستہ طور پر یہ غلط کام انجام دیا ہے۔

توجہ رہے کہ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے متضاد نہیں اور ممکن ہے آیت ان دونوں مفاہیم کے لئے ہو۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، صفحہ ۱۵۹



اب یہ حکم اسلامی واضح ہو گیا کہ وصیتوں میں ہر طرح کا تغیر و تبدل جس صورت میں ہو اور جس قدر ہو گناہ ہے۔ لیکن ہر قانون میں کچھ استثنائی پہلو ہوتے ہیں۔ لہٰذا زیر نظر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: جب وصی کو وصیت کرنے والے میں انحراف اور کجروی کا اندیشہ ہو، یہ انحراف چاہے بے خبری سے ہو یا جان بوجھ کر آگاہی کے باوصف ہو اور وہ اس کی اصلاح کرے تو وہ گنہ گار نہ ہوگا اور وصیت کی تبدیلی کا قانون اس پر لاگو نہ ہوگا۔ خدا بخشنے والا مہربان ہے (فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم)۔

اس بناء پر استثناء صرف ان مواقع کے لئے ہے جہاں وصیت شائستہ و مناسب نہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں **وصی تغیر** کا حق رکھتا ہے۔ اگر وصیت کرنے والا زندہ ہے تو اپنا نقطہ نظر اس کے گوش گزار کرے تاکہ وہ خود تبدیلی کرے اور اگر وہ مرگیا ہو تو خود یہ تبدیلی کرے اور تبدیلی کا یہ اختیار مندرجہ ذیل مواقع کے لئے منحصر ہے۔

۱۔ اگر وصیت کل ترکے کے ایک تہائی سے زیادہ ہو کیونکہ رسول اکرمؐ اور اہل بیتؑ سے بہت سی روایات میں منقول ہے کہ انسان ایک تہائی تک کے مال کی وصیت کرنے کا مجاز ہے اور اس سے زیادہ ممنوع ہے۔ ہمارے فقہا نے بھی فقہی کتب میں یہی فتویٰ دیا ہے[1]

اس بناء پر جن ناواقف لوگوں کا یہ معمول ہے کہ وہ تمام اموال وصیت کے ذریعے تقسیم کر دیتے ہیں کسی طرح بھی قوانین اسلام کی رُو سے صحیح نہیں اور وصی پر لازم ہے کہ وہ اس کی اصلاح کرے اور ایک تہائی سے زیادہ اس طرح سے تقسیم نہ کرے۔

۲۔ اگر وصیت ظلم، گناہ اور غلط کام سے متعلق ہو۔ مثلاً کوئی وصیت کرے کہ اس کے مال کا کچھ حصہ مراکزِ فساد کو وسیع کرنے میں صرف کیا جائے اور اسی طرح اگر وہ وصیت کسی ترکِ واجب کا سبب بنے۔

۳۔ اگر وصیت پر عمل درآمد، نزاع، فساد اور خون ریزی کا سبب ہو تو یہاں بھی حاکم شرع کے حکم سے اصلاح ہو سکتی ہے۔
جنف (بروزن کنف) کا معنیٰ ہے حق سے انحراف اور باطل کی طرف میلان۔ یہ وصیت کرنے والے کے جاہلانہ انحرافات اور کجرویوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور "اثم" گناہ عمد کی طرف اشارہ ہے۔

جملہ "ان اللہ غفور رحیم" جو اس آیت کے آخر میں آیا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وصی وصیت کرنے والے کے غلط کام کی اصلاح کے لئے اقدام کرے اور راہِ حق کو کھول دے تو خدا اس کی خطا سے صرف نظر کرے گا۔

چند اہم نکات

(۱) وصیت کا فلسفہ: قانونِ میراث سے صرف کچھ معین رشتے دار بہرہ مند ہوتے ہیں جب کہ ممکن ہے خاندان کے اور افراد یا بعض اوقات قریبی دوست احباب مالی امداد کی سخت احتیاج رکھتے ہوں اسی طرح ورثہ میں سے بھی کبھی ارث

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۶۱ (کتاب احکام الوصایا، باب ۱۱)۔



کا حصہ کسی کی ضروریات کی کفالت نہیں کر سکتا لہٰذا قانونِ اسلام کی جامعیت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ خلاء پر نہ ہو اسی لئے اس نے قانونِ میراث کے ساتھ ساتھ قانونِ وصیت بھی رکھا ہے اور مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصے کے متعلق اپنے بعد کے لئے کوئی مستحکم پروگرام بنائیں اور اسے اپنے مقصد میں صرف کریں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کوئی اچھا کام انجام دے۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اپنی مالی ضروریات کے پیشِ نظر ایسا نہیں کر پاتا تو عقل منطق واجب قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے ان اموال سے جن کے حصول کے لئے اس نے زحمت اٹھائی ہے کارِ خیر کے انجام دینے سے بالکل محروم نہ ہو۔

ان سب امور کی وجہ سے اسلام میں قانونِ وصیت رکھا گیا ہے اور اس کی اس حد تک تاکید کی گئی ہے کہ اسے ایک وجوبی اور ضروری حکم کی حد تک پہنچا دیا گیا ہے اور "حقا علی المتقین" کے جملے سے اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

وصیت صرف مندرجہ بالا امور میں منحصر نہیں بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے قرض اور ان امانتوں کے متعلق جو اسے سپرد کی گئی ہیں اور دیگر امور کے بارے میں اپنی وصیت کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس طرح سے کہ حقوق الناس اور حقوق اللہ میں سے اس کی کوئی ذمہ داری مبہم نہ رہ جائے۔

روایاتِ اسلامی میں وصیت کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ما ینبغی لامرء مسلم ان یبیت لیلة الا وصیته تحت رأسه

کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ رات سوئے مگر اس کا وصیت نامہ اس کے سر کے نیچے نہ ہو۔[1]

سر کے نیچے ہونا، یہاں تاکید کے لئے ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وصیت نامہ تیار رکھنا چاہیئے۔

ایک اور روایت میں ہے:

من مات بغیر وصیة مات میتة جاهلية

جو شخص بغیر وصیت کے مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔[2]

(۱۱) وصیت میں عدالت: مندرجہ بالا آیت میں وصیت میں تعدی و تجاوز نہ کرنے کا حکم آپ نے ملاحظہ کیا۔

اس سلسلے میں اسلامی روایات میں بھی ظلم و جور اور ضرر نہ پہنچانے کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ ان روایات کے اجتماعی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وصیت کرنے کی بہت اہمیت ہے اسی طرح وصیت میں ظلم روا رکھنا بہت برا عمل ہے اور گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۵۲

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۵۲



من عدل فی وصیۃ کان کمن تصدق بھا فی حیاتہ ومن جار فی وصیتہ لقی اللہ عزوجل یوم القیامۃ وھو عنہ معرض۔

جو شخص اپنی وصیت میں عدل کرے وہ ایسے ہے جیسے اس نے اپنی زندگی میں یہ مال راہ خدا میں صدقہ کر دیا ہو اور جو اپنی وصیت میں ظلم و تعدی کرے قیامت کے دن پروردگار کی طرف سے نگاہِ لطف و کرم اس سے اٹھالی جائے گی[1]

وصیت میں ظلم و جور اور ضرر رسانی یہ ہے کہ انسان اپنے ترکے کے تیسرے حصے سے زیادہ وصیت کرے اور ورثہ کو ان کے جائز حق سے محروم کر دے یا بلا وجہ محبت و دشمنی کی بناء پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دے۔ اسی لئے اگر ورثہ زیادہ ضرورت مند ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ تیسرے حصے کی بھی وصیت نہ کی جائے اور ایسے مقام پر وصیت میں چوتھے یا پانچویں حصے تک کمی کی جا سکتی ہے[2]

وصیت میں عدالت کے بارے میں اسلام کے پیشواؤں نے اپنے ارشادات میں اس حد تک تاکید کی ہے کہ ایک حدیث میں ہے:

انصار میں سے ایک شخص فوت ہو گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے باقی رہ گئے لیکن وہ مرتے وقت سارا مال راہ خدا میں صرف کر گیا یہاں تک کہ کچھ باقی نہ رکھا۔

پیغمبر اسلام اس واقعے سے آگاہ ہوئے تو فرمایا:

اس شخص سے تم نے کیا سلوک کیا۔

لوگوں نے عرض کیا:

ہم نے (اس کی نماز جنازہ پڑھ کر) اسے دفن کر دیا ہے۔

آپ نے فرمایا:

مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں اجازت نہ دیتا کہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ دیے ہیں تاکہ وہ گدائی کرتے پھریں[3]

(iii) **واجب اور مستحب وصیت:** وصیت ذاتی طور پر مستحب ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے ممکن ہے بعض اوقات وجوب کی شکل اختیار کر لے مثلاً کسی نے واجب حقوق اللہ (زکوٰۃ و خمس وغیرہ) کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہو یا لوگوں کی کچھ امانتیں اس کے پاس پڑی ہوں اور عدم وصیت کی صورت میں احتمال ہو کہ ان کا حق ضائع ہو جائے گا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، صفحہ ۳۵۹

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، صفحہ ۳۶۰

[3] سفینۃ البحار، ج ۲، صفحہ ۶۵۹، مادہ وصیت



اوران سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شخص کا معاشرے میں ایسا مقام ہے کہ اگر وہ وصیت نہ کرے تو ممکن ہے ناقابلِ تلافی نقصان ہو اور صحیح اجتماعی یا دینی نظام میں سخت نقصان و ضرر کا اندیشہ ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں وصیت کرنا واجب ہو جائیگا۔

(۱۷) زندگی میں وصیت کو بدلا جا سکتا ہے: قوانین اسلام کی رو سے وصیت کرنے والا اپنی پہلے سے کی گئی وصیت کا پابند نہیں بلکہ اپنی زندگی میں وہ اسے بدل بھی سکتا ہے۔ وہ وصیت کی مقدار اور کیفیت اور اپنے وصی کے سلسلے میں نظر ثانی کر سکتا ہے کیونکہ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ اس بارے میں مصلحتیں بدل گئی ہوں۔

(۷) وصیت — اصلاح کا ذریعہ: اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی وصیت کو اپنی گذشتہ کوتاہیوں کی اصلاح اور ان کے ازالے کا ذریعہ قرار دے۔ یہاں تک کہ اس کے عزیز و اقارب اور وابستگان میں سے اگر کچھ اس کی طرف سے سرد مہری اور بے رغبتی کا شکار تھے تو وصیت کے ذریعے ان سے اظہار محبت کرے۔

روایات میں ہے کہ ہادیانِ دین اپنے ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص طور پر وصیت کرتے تھے جو ان سے سرد مہری سے پیش آتے تھے اور مال کی کچھ مقدار وصیت کے ذریعے ان کے لئے مختص کر دیتے تھے تاکہ ٹوٹے ہوئے رشتے محبت کے ذریعے پھر سے جوڑ دیں۔ اسی طرح اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتے یا انہیں آزاد کرنے کی وصیت کر دیتے تھے۔

۱۸۳۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

۱۸۴۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ
اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ
خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

۱۸۵۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ
وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۸۳۔ اے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا، تاکہ تم پرہیزگار



بن جاؤ۔

۱۸۴۔ چند گنے چنے دن (روزہ رکھو) اور تم میں سے جو لوگ بیمار ہوں یا مسافر ہوں وہ ان کی بجائے دوسرے دنوں میں (روزوں کی) گنتی پوری کرلیں اور جو لوگ یہ کام انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً دائمی مریض اور بوڑھے مرد عورتیں) ضروری ہے کہ وہ کفارہ ادا کریں اور مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو لوگ کارِ خیر بجالائیں تو وہ ان کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

۱۸۵۔ (وہ چند گنے چنے دن) ماہِ رمضان کے ہیں، اس میں قرآن نازل ہوا جس میں لوگوں کے لئے راہنمائی اور ہدایت کی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ پس جو شخص ماہِ رمضان میں حضر میں ہو وہ روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو وہ دوسرے دنوں میں بجالائے۔ خدا تمہارے لئے راحت و آرام چاہتا ہے، زحمت و تکلیف نہیں، تم یہ دن پورے کرو اور خدا کی اس لئے بزرگی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ ہو سکتا ہے تم شکر گزار ہو جاؤ۔

تفسیر

روزہ تقویٰ کا سرچشمہ ہے:

چند اہم اسلامی احکام کے بیان کے بعد زیرِ نظر آیات میں ایک اور حکم بیان کیا گیا ہے جو چند اہم ترین اسلامی عبادات میں شمار ہوتا ہے اور وہ روزہ ہے۔ اسی تاکید سے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے اس طرح سے لکھ دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کی امتوں کے لئے لکھا گیا تھا (یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم)۔

ساتھ ہی اس انسان ساز اور تربیت آفرین عبادت کا فلسفہ چھوٹے سے پُر معنی جملے میں یوں بیان کرتا ہے: ہو سکتا ہے تم پرہیزگار بن جاؤ (لعلکم تتقون)۔

جی ہاں ــــ جیسا کہ اس کی تشریح میں آگے بیان کیا جائے گا کہ روزہ روحِ تقویٰ اور پرہیزگاری کی تربیت کے لئے تمام جہات سے ایک مؤثر عامل ہے۔

اس عبادت کی انجام دہی چونکہ مادی لذائذ سے محرومیت اور مشکلات سے وابستہ ہے خصوصاً گرمیوں میں یہ زیادہ مشکل ہے اس لئے روحِ انسانی کو مائل کرنے اور اس حکم کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کے لئے مندرجہ بالا آیات میں مختلف تعبیرات کو استعمال کیا گیا ہے۔

پہلے "یا ایھا الذین اٰمنوا" سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ روزہ تمہی سے مخصوص نہیں بلکہ گذشتہ امتوں میں بھی تھا اور آخر میں اس کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق اس پُر منفعت خدائی فریضہ کے اثرات سو فیصد خود انسان کے فائدے میں ہیں اس طرح اسے ایک پسندیدہ اور خوشگوار موضوع بنا دیا گیا ہے۔ ایک حدیث



میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لذة ما فی النداء ازال تعب العبادة والعناء۔

یعنی ـــــ یا ایھا الذین اٰمنوا کے خطاب کی لذت نے اس عبادت کی تھکان، سختی اور مشقت کو ختم کر دیا ہے۔[1]

روزے کی سنگینی اور مشکل میں کمی کے لئے بعد کی آیت میں چند احکام اور بیان کئے گئے ہیں۔

ارشاد فرمایا: چند گنے چنے دن روزہ رکھو (ایاما معدودات) ایسا نہیں کہ تم پورا سال روزہ رکھنے پر مجبور ہو یا یہ سال کا کوئی بڑا حصہ ہے بلکہ یہ تو سال کے ایک مختصر سے حصے میں تمہیں مشغول رکھتا ہے۔

دوسری بات جو اس آیت میں ہے یہ ہے کہ تم میں سے جو افراد بیمار ہیں یا مسافر ہیں کہ جن کے لئے روزہ باعث مشقت و زحمت ہے انہیں اس حکم میں رعایت دی گئی ہے کہ وہ ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھیں (سفر ختم ہو جانے اور بیماری سے صحت یابی کے بعد) (فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر)۔

تیسری بات یہ کہ جنہیں روزہ رکھنے میں انتہائی زحمت و تکلیف ہوتی ہے (مثلاً بوڑھے مرد بوڑھی عورتیں اور دائمی مریض جن کے تندرست ہونے کی امید نہیں) ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں، بلکہ اس کی بجائے کفارہ ادا کرنے کے لئے مسکین کو کھانا کھلا دیں (وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین)[2]

جو شخص اس سے زیادہ راہ خدا میں کھانا کھلانا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے (فمن تطوع خیرا

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "یطیقونه" کا مادہ ہے "طوق" جس کا اصلی معنی ہے وہ حلقہ جو گلے میں ڈالتے ہیں یا جو طبعی طور پر گردن میں ہوتا ہے (جیسے رنگدار حلقہ جو بعض پرندوں کے گلے میں ہوتا ہے) بعد ازاں یہ لفظ انتہائی توانائی اور قوت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یطیقونه کی آخری ضمیر روزے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنہیں روزے کے لئے انتہائی قوت اور توانائی خرچ کرنا پڑے اور روزہ رکھنے میں انہیں سخت زحمت اٹھانا پڑے جیسا کہ بڑے بوڑھے اور ناقابل علاج بیمار ہیں، روزہ ان کے لئے معاف ہے اور وہ اس کی جگہ صرف فدیہ ادا کریں۔ لیکن بیمار اگر تندرست ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری ہے کہ قضا روزہ رکھیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یطیقونه کا معنی ہے کہ جو گذشتہ زمانے میں قوت و توانائی رکھتے تھے (کانوا یطیقونه) اور اب طاقت نہیں رکھتے (بعض روایات میں بھی یہ معنی کیا گیا ہے)۔

بہر حال مندرجہ بالا حکم منسوخ نہیں ہوا اور آج بھی پوری طاقت سے باقی ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ پہلے روزہ واجب تخییری تھا اور لوگوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا فدیہ دیں، آیت میں موجود قرائن اس کی تائید نہیں کرتے اور اس پر کوئی واضح دلیل بھی موجود نہیں ہے۔



فھو خیر لہ) [1]

آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ روزے کا تمہیں ہی فائدہ پہنچے گا: اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو (وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

بعض چاہتے ہیں کہ اس جملے کو اس امر کی دلیل قرار دیں کہ روزہ ابتداء میں واجب تخییری تھا مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا اس کی بجائے فدیہ دے دیں تاکہ آہستہ آہستہ روزے کی عادت پڑ جائے بعد ازاں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور روزے نے وجوب عینی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ آیت روزے کے فلسفے کی تاکید کے طور پر آئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ عبادت بھی دوسری عبادات کی طرح خدا کے جاہ و جلال میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ اس کا تمام فائدہ خود انسانوں کو ہے۔ اس کی شاہد وہ تعبیرات ہیں جو قرآن کی دیگر آیات میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً:

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

یہ تمہارے لئے ہی بہتر ہے اگر تم جان سکو۔ (جمعہ-۹)

یہ آیت نماز جمعہ کے وجوب عینی حکم کے بعد (اجتماع شرائط کی صورت میں) آئی ہے۔

سورہ عنکبوت کی آیت ۱۶ میں ہے:

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اور جب ابراہیم نے بت پرستوں کی طرف رُخ کر کے کہا کہ خدا کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "ان تصوموا خیر لکم" سب روزہ داروں کے لئے خطاب ہے نہ کہ کسی خاص طبقے کے لئے۔

زیر نظر آخری آیت روزے کے زمانے، اس کے کچھ احکام اور فلسفے کو بیان کرتی ہے۔ فرمایا: وہ چند گنے چنے دن جن میں روزہ رکھنا ہے ماہ رمضان کے ہیں (شھر رمضان) وہی مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا ہے (الذی انزل فیہ القرآن)۔ وہی قرآن جو لوگوں کی ہدایت کا سبب ہے، جو ہدایت کی نشانیاں اور واضح دلیلیں لئے ہوئے ہے اور جو حق و باطل کے امتیاز اور ان کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا معیار رکھتا ہے (ھدی للناس و بینات من الھدیٰ والفرقان)۔

اس کے بعد مسافروں اور بیماروں کے بارے میں روزے کے حکم کو دوبارہ تاکیداً بیان کیا گیا ہے: جو لوگ ماہ رمضان میں حاضر ہوں انہیں تو روزہ رکھنا ہو گا مگر جو مسافر یا بیمار ہوں وہ اس کے بدلے بعد کے دنوں میں روزہ رکھیں (فمن شھد

---

[1] "من تطوع خیراً" کو بعض نے مستحبی روزوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ روزے کی اہمیت اور فلسفے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے چاہیئے کہ رغبت کے ساتھ روزہ رکھا جائے نہ کہ اکراہ و جبر سے روزہ رکھا جائے۔



منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضا او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر.
مسافر اور بیمار کے حکم کا تکرار اس سے پہلی اور اس آیت میں ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ مطلقاً روزہ نہ رکھنا کوئی اچھا کام نہیں اور ان کا اصرار ہے کہ بیماری اور سفر میں بھی روزہ رکھا جائے لہٰذا قرآن اس حکم کے تکرار سے لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جیسے صحیح و سالم افراد کے لئے روزہ رکھنا ایک فریضۂ الٰہی ہے ایسے ہی بیماروں اور مسافروں کے لئے افطار کرنا بھی فرمانِ الٰہی ہے جس کی مخالفت گناہ ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ روزے کی تشریع اور فلسفے کا بیان ہے۔ فرمایا: خدا تمہارے لئے راحت و آرام اور آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے زحمت و تکلیف اور تنگی نہیں چاہتا: (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ روزہ رکھنا اگرچہ ظاہراً سختی و پابندی ہے لیکن انجام کار انسان کے لئے راحت و آسائش اور آرام کا باعث ہے۔

ممکن ہے یہ جملہ اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ احکام الٰہی ستمگر اور ظالم حاکموں کے سے نہیں جنہیں بلا مشروط بجا لانے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن جہاں انسان کے لئے کوئی حکم بجا لانا سخت مشقت کا باعث ہو وہاں حکم الٰہی کے تحت انسانی ذمہداری کو سہل تر کر دیا جاتا ہے اسی لئے روزے کا حکم اپنی پوری اہمیت کے باوجود بیماروں اور مسافروں کے لئے اٹھا دیا گیا ہے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: غرض اور مقصد یہ ہے کہ تم ان روزوں کی تعداد کو مکمل کرو (ولتکملوا العدۃ) یعنی ہر صحیح و سالم انسان پر لازم ہے کہ وہ سال میں ایک ماہ کے روزے رکھے کیونکہ روزہ اس کے جسم و روح کی پرورش کے لئے ضروری ہے۔ اسی بنا پر ماہِ رمضان میں اگر تم بیمار تھے یا سفر میں تھے تو ضروری ہے کہ اتنے ہی دنوں کی بعد میں قضا کرو تاکہ وہ تعداد مکمل ہو جائے یہاں تک کہ عورتوں پر ایامِ حیض کی نماز کی قضا تو معاف ہے لیکن روزے کی قضا معاف نہیں ہے۔

آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: تاکہ اس بناء پر کہ خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے تم اس کی بزرگی بیان کرو اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو (ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون)۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خدا کی بزرگی بیان کرنے کے مسئلے کا ذکر بطور قاطع ہے (لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم) جب کہ شکر گذاری کے لئے لعل (شاید) کہا گیا ہے۔

تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس لیے ہو کہ اس عبادت کی انجام دہی بہر حال مقامِ پروردگار کی تعظیم ہے لیکن شکر کا مفہوم ہے نعماتِ الٰہی کو ان کی جگہ پر صرف کرنا اور روزے کے عملی آثار اور فلسفوں سے فائدہ حاصل کرنا۔ اس کی کئی ایک شرائط ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں شکر انجام نہیں پاتا اور ان میں سے زیادہ اہم حقیقتِ روزہ کی پہچان، اس کے فلسفوں سے آگاہی اور خلوص کامل ہے۔

لہ بعض نے "فمن شھد منکم الشھر" کی رویتِ ہلال کے ساتھ تفسیر کی ہے یعنی جو چاند دیکھے اس پر روزہ واجب ہے لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے حق وہی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں کہا گیا ہے اور جو قبل و بعد کے جملوں سے بھی ہم آہنگ ہے اور روایاتِ اسلامی کے بھی مطابق ہے۔



چند اہم نکات

(۱) روزے کے تربیتی و اجتماعی اثرات: روزے کے کئی جہات سے گوناگوں مادی اور روحانی آثار ہیں۔ جو اس کے ذریعے وجود انسانی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم اس کا اخلاقی پہلو اور تربیتی فلسفہ ہے۔ روح انسانی کو لطیف تر بنانا ارادہ انسانی کو قوی کرنا اور مزاج انسانی میں اعتدال پیدا کرنا روزے کے اہم فوائد میں سے ہے۔

روزے دار کے لئے ضروری ہے کہ حالت روزہ میں آب و غذا کی دستیابی کے باوجود اس کے قریب نہ جائے اور اسی طرح جنسی لذات سے چشم پوشی کرے اور عملی طور پر ثابت کرے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی چراگاہ اور گھاس پھوس کی قید میں نہیں ہے۔ سرکش نفس کی لگام اس کے قبضے میں ہے اور ہوا و ہوس اور شہوات و خواہشات اس کے کنٹرول میں ہیں۔

حقیقت میں روزے کا سب سے بڑا فلسفہ یہی روحانی اور معنوی اثر ہے۔ وہ انسان کہ جس کے قبضے میں طرح طرح کی غذائیں اور مشروبات ہیں۔ جب اسے بھوک یا پیاس لگتی ہے وہ ان کے پیچھے جاتا ہے۔ وہ درخت جو باغ کی دیوار کی پناہ میں نہر کے کنارے اگے ہوتے ہیں نازپروردہ ہوتے ہیں یہ حوادث کا مقابلہ بہت کم کر سکتے ہیں۔ ان میں باقی رہنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ اگر انہیں چند دن پانی نہ ملے تو پژمردہ ہو کر خشک ہو جائیں جب کہ وہ درخت جو پتھروں کے درمیان پہاڑوں اور بیابانوں میں اگتے ہیں۔ اُن کی شاخیں شروع سے سخت طوفانوں، تمازت آفتاب اور کڑاکے کی سردی کا مقابلہ کرنے کی عادی ہوتی ہیں اور طرح طرح کی محرومیوں سے دست و گریبان رہتی ہیں۔ ایسے درخت ہمیشہ مضبوط، سخت کوش اور سخت جان ہوتے ہیں۔

روزہ بھی انسان کی روح اور جان کے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ یہ وقتی پابندیوں کے ذریعے انسان میں قوت مدافعت اور قوت ارادی پیدا کرتا ہے اور اسے سخت حوادث کے مقابلے کی طاقت بخشتا ہے۔ چونکہ روزہ سرکش طبائع و جذبات پر کنٹرول کرتا ہے لہٰذا اس کے ذریعے انسان کے دل پر نور و ضیا کی بارش ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ روزہ انسان کو عالم حیوانیت سے بلند کر کے فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ لعلکم تتقون (ہو سکتا ہے تم پرہیزگار بن جاؤ) ان تمام مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

مشہور حدیث ہے:

الصوم جنة من النار

روزہ جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے ڈھال ہے۔[۱]

ایک اور حدیث حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے پوچھا گیا کہ ہم کون سا کام کریں جس کی وجہ سے شیطان ہم سے دور رہے۔ آپؐ نے فرمایا:

الصوم یسود وجهه والصدقة تکسر ظهره والحب فی الله والمواظبة علی العمل الصالح

---

[۱] بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۲۵۶



یقطع دابرہ والاستغفار یقطع وتینہ

روزہ شیطان کا منہ کالا کر دیتا ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ خدا کے لئے محبت اور دوستی نیز عمل صالح کی پابندی سے اس کی دم کٹ جاتی ہے اور استغفار سے اس کی رگِ دل قطع ہو جاتی ہے۔[۱]

نہج البلاغہ میں عبادات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے حضرت امیرالمومنین روزے کے بارے میں فرماتے ہیں:

والصیام ابتلاءً لاخلاص الخلق

اللہ تعالیٰ نے روزے کو شریعت میں اس لئے شامل کیا تاکہ لوگوں میں روحِ اخلاص کی پرورش ہو۔[۲]

پیغمبر اکرمؐ سے ایک اور حدیث مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

ان للجنۃ باباً یدعی الریان لایدخل منہا الا الصائمون

بہشت کا ایک دروازہ ہے جس کا نام ہے ریان (یعنی۔ سیراب کرنے والا) اس میں سے صرف روزہ دار ہی داخلِ جنت ہوں گے۔

حضرت صدوق مرحوم نے معانی الاخبار میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے اس دروازے کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ روزہ دار کو چونکہ زیادہ تکلیف پیاس کی وجہ سے ہوتی ہے جب روزہ دار اس دروازے سے داخل ہوگا تو وہ ایسا سیراب ہوگا کہ اسے پھر کبھی بھی تشنگی کا احساس نہ ہوگا۔[۳]

(۷) **روزے کے معاشرتی اثرات:** باقی رہا روزے کا اجتماعی اور معاشرتی اثر تو وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ روزہ انسانی معاشرے کے لئے ایک درس مساوات ہے۔ کیونکہ اس مذہبی فریضے کی انجام دہی سے صاحبِ ثروت لوگ بھوکوں اور معاشرے کے محروم افراد کی کیفیت کا احساس کر سکیں گے اور دوسری طرف شب و روز کی غذا میں بچت کرکے ان کی مدد کے لئے جلدی کریں گے۔

البتہ ممکن ہے بھوکے اور محروم لوگوں کی توصیف کرکے خداوند عالم صاحبِ قدرت لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو اور اگر یہ معاملہ حسی اور عینی پہلو اختیار کرلے تو اس کا دوسرا اثر ہو۔ روزہ اس اہم اجتماعی موضوع کو حسی رنگ دیتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ ہشام بن حکم نے روزے کی علت اور سبب کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا:

انما فرض اللہ الصیام لیستوی بہ الغنی والفقیر ذلک ان الغنی لم یکن لیجد مس الجوع

---

[۱] بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۲۵۵
[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۲۵۲
[۳] بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۲۵۲



فیرحم الفقیر وان الغنی کلما اراد شیئا قدر علیه فاراد الله تعالیٰ ان یسوی بین خلقه وان یذیق الغنی مس الجوع والالم لیرق علی الضعیف ویرحم الجائع۔

روزہ اس لئے واجب ہوا ہے کہ فقیر اور غنی کے درمیان مساوات قائم ہو جائے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ غنی بھی بھوک کا مزہ چکھ لے اور فقیر کا حق ادا کرے کیونکہ مالدار عموماً جو کچھ چاہتے ہیں ان کے لئے فراہم ہوتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان مساوات ہو اور مالداروں کو بھی بھوک اور درد و رنج کا ذائقہ چکھائے تاکہ وہ کمزور اور بھوکے افراد پر رحم کریں۔[1]

(iii) روزے کے طبی اثرات: طب کی جدید اور قدیم تحقیقات کی روشنی میں امساک (کھانے پینے سے پرہیز) بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے معجزانہ اثر رکھتا ہے جو قابلِ انکار نہیں۔ شاید ہی کوئی حکیم ہو جس نے اپنی مشرح تالیفات اور تصنیفات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہ کیا ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سی بیماریاں زیادہ کھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چونکہ مواد اضافی بدن میں جذب نہیں ہوتا جس سے مزاحم اور مجتمع چربیاں پیدا ہوتی ہیں یا یہ چربی اور خون میں اضافی شوگر کا باعث بنتی ہے عضلات کا یہ اضافی مواد درحقیقت بدن میں ایک متعفن بیماری کے جراثیم کی پرورش کے لئے گندگی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

ایسے میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین حل یہ ہے کہ گندگی کے ان ڈھیروں کو امساک اور روزے کے ذریعے ختم کیا جائے۔ روزہ ان اضافی غلاظتوں اور بدن میں جذب نہ ہونے والے مواد کو جلا دیتا ہے۔ درحقیقت روزہ بدن کو صفائی شدہ مکان بنا دیتا ہے۔

علاوہ ازیں روزے سے معدے کو ایک نمایاں آرام ملتا ہے اور اس سے ہاضمے کی مشینری کی سروس ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ بدنِ انسانی کی حساس ترین مشینری ہے جو سارا سال کام کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ایسا آرام بہت ضروری ہے۔ یہ واضح ہے کہ حکم اسلامی کی رو سے روزہ دار کو اجازت نہیں کہ وہ سحری اور افطاری کی غذا میں افراط اور زیادتی سے کام لے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ اس حفظانِ صحت اور علاج سے مکمل نتیجہ حاصل کیا جا سکے ورنہ ممکن ہے کہ مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ کیا جا سکے۔

ایک روسی دانشور الکسی سوفرین لکھتا ہے:

روزہ ان بیماریوں کے علاج کے لئے خاص طور پر مفید ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۷، باب اول، کتاب صوم، ص ۳



خون کی کمی، انتڑیوں کی کمزوری، التہاب زائدہ[1] (APPENDICITIS) خارجی و داخلی قدیم پھوڑے، تپ دق (T.B)، اسکلیروز، نقرس[2]، استسقاء[3]، جوڑوں کا درد[4]، نوراستنی، عرق النساء[5]، خراز (جلد کا گرنا) امراض چشم، شوگر، امراض جلد، امراض گردہ، امراض جگر اور دیگر بیماریاں۔

اساک اور روزے کے ذریعے علاج صرف مندرجہ بالا بیماریوں سے مخصوص نہیں بلکہ وہ بیماریاں جو بدنِ انسان کے اصول سے مربوط ہیں اور جسم کے خلیوں سے چمٹی ہوئی ہیں مثلاً سرطان، سفلین اور طاعون کے لئے بھی یہ شفا بخش ہے۔

ایک مشہور حدیث پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

صوموا تصحوا

روزہ رکھو تاکہ صحت مند رہو۔[6]

پیغمبر اکرمؐ سے ایک اور حدیث مروی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

المعدة بیت کل داء والحمیة رأس کل دواء

معدہ ہر بیماری کا گھر ہے اور امساک (فاقہ) اعلیٰ ترین دوا ہے۔[7]

(۱۷) **روزہ گذشتہ امتوں میں:** موجودہ توراۃ اور انجیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزہ یہود و نصاریٰ میں بھی تھا جیسا کہ "قاموس کتاب مقدس" میں ہے:

روزہ کلیتہً تمام اوقات اور تمام زمانوں میں ہر گروہ، امت اور مذہب میں اندوہ و غم اور اچانک مصیبت کے موقع پر معمول تھا۔[8]

توراۃ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے چالیس دن تک روزہ رکھا۔ جیسا کہ لکھا ہے:

جب میں پہاڑ پر گیا تاکہ پتھر کی تختیاں یعنی وہ عہد والی تختیاں جو خدا نے تمہارے ساتھ منسلک کر دی ہیں حاصل کروں اس وقت میں پہاڑ میں چالیس راتیں رہا۔ وہاں میں نے نہ روٹی کھائی نہ

---

[1] ایک مرض جس میں اندھی آنت سوج جاتی ہے اور اس میں سوزش ہوتی ہے۔ (مترجم)

[2] ایک قسم کا گنٹھیا۔ ایک شدید درد جو پاؤں کی انگلیوں سے اٹھا کرتا ہے۔ (مترجم)

[3] جلندر کی بیماری جس میں بہت پیاس لگتی ہے اور پیٹ دن بدن بڑھتا رہتا ہے۔ (مترجم)

[4] اسے وجع مفاصل کہتے ہیں۔ (مترجم)

[5] چڈوں سے ٹخنوں تک پہنچنے والا درد۔ (مترجم)

[6] کتاب روزہ روش نوین، ص ۶۵، اشاعت اول

[7] بحار الانوار، ج ۱۴ (قدیم)

[8] قاموس کتاب مقدس، ص ۴۲۷



پانی پیا۔[1]

یہودی جب توبہ کرتے اور رضائے الٰہی طلب کرتے تو روزہ رکھتے تھے:

اکثر اوقات یہودی جب موقع پاتے کہ خدا کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تواضع کا اظہار کریں تو روزہ رکھتے تاکہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے روزہ اور توبہ کے ذریعے حضرتِ اقدسِ الٰہی کی رضا و خوشنودی حاصل کریں۔[2]

احتمال ہے کہ روزہ اعظم یا کفارہ سال میں مخصوص ایک دن کے لئے ہو جس کا یہودیوں میں رواج تھا۔ البتہ وہ دوسرے موقتی روزے بھی رکھتے تھے مثلاً اور شلیم کی بربادی کے وقت رکھا گیا روزہ وغیرہ۔[3]

جیسا کہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے حضرت عیسٰی نے بھی چالیس دن روزے رکھے:

اس وقت عیسٰی قوت روح کے ساتھ بیابان میں لے جائے گئے تاکہ ابلیس انہیں آزمائے پس انہوں نے چالیس شب و روز روزہ رکھا اور وہ بھوکے رہے۔[4]

انجیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی کے بعد حواریین روزہ رکھتے تھے جیسا کہ انجیل میں ہے:

انہوں نے اس سے کہا کیا بات ہے کہ یحییٰ کے شاگرد ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں اور دعا کرتے رہتے ہیں جب کہ تمہارے شاگرد ہمیشہ کھاتے پیتے رہتے ہیں لیکن ایک زمانہ آئے گا جب داماد ان میں سے اٹھا لیا جائے گا اور وہ اس وقت روزہ رکھیں گے۔[5]

کتاب مقدس میں یہ بھی ہے:

اس بناء پر حواریین اور گذشتہ زمانے کے مومنین کی زندگی انکارِ لذات، بے شمار زحمات اور روزہ داری سے بھری پڑی تھی۔[6]

(۷) **رمضان مبارک کی خصوصیت اور امتیاز:** کیا سبب ہے کہ ماہِ رمضان روزے رکھنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے بلکہ اسی بناء پر اسے دوسرے مہینوں پر برتری حاصل ہے۔ زیر نظر آیت میں اس کی برتری کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن جو ہدایت اور انسانی رہبری کی کتاب ہے جس نے اپنے احکام اور قوانین کی صحیح روش کو غیر صحیح راستے سے

---

[1] تورات، سفر تثنیہ، فصل ۹، شمارہ ۹
[2] قاموس کتاب مقدس، ص ۴۲۸
[3] قاموس کتاب مقدس ص ۴۲۸
[4] انجیل متی، باب ۴، شمارہ ۱ و ۲
[5] انجیل لوقا، باب ۵، شمارہ ۳۳-۳۵
[6] قاموس کتاب مقدس ص ۴۲۸



جدا کر دیا ہے اور جو انسانی سعادت کا دستور لے کر آئی ہے اسی مہینے میں نازل ہوئی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ تمام عظیم آسمانی کتب تورات، انجیل، زبور، صحیفے اور قرآن اسی مہینے میں نازل ہوئیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

تورات چھ رمضان، انجیل بارہ رمضان، زبور اٹھارہ رمضان اور قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے[1]۔

اس طرح ماہ رمضان عظیم آسمانی کتب کے نزول اور تعلیم و تدریس کا مہینہ ہے کیونکہ صحیح تربیت تعلیم اور کچھ سیکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

روزے کا تربیتی پروگرام زیادہ سے زیادہ اور گہری آگاہی کے ساتھ آسمانی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ اس سے انسانی روح و بدن کی آلودگی گناہ دھل جائے۔

ماہ شعبان کے ایک آخری جمعہ کو پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اصحاب کو اس ماہ کے استقبال کے لئے آمادہ کرنے کی خاطر خطبہ دیا۔ اور اس کی اہمیت اس طرح ان کے گوش گزار کی:

> اے لوگو! خدا کی برکت، بخشش اور رحمت کا مہینہ تمہاری جانب آ رہا ہے۔ یہ مہینہ تمام مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے دن دوسرے مہینوں کے دنوں سے اور اس کی راتیں دوسرے مہینوں کی راتوں سے بہتر ہیں۔ اس ماہ کے لحظے اور گھڑیاں دوسرے مہینوں کے لحظوں اور گھڑیوں سے برتر ہیں۔
>
> یہ ایسا مہینہ ہے جس میں تمہیں خدا نے مہمان بننے کی دعوت دی ہے اور تمہیں ان لوگوں میں سے قرار دیا گیا ہے جو خدا کے اکرام و احترام کے زیر نظر ہیں۔ اس میں تمہاری سانسیں تسبیح کی مانند ہیں، تمہارا سونا عبادت ہے اور تمہارے اعمال اور دعائیں مستجاب ہیں۔ لہٰذا خالص نیتوں اور پاک دلوں کے ساتھ خدا سے دعا کرو تاکہ وہ تمہیں روزہ رکھنے اور تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ بدبخت ہے وہ شخص جو اس مہینے میں خدا کی بخشش سے محروم رہ جائے۔ اس ماہ میں اپنی بھوک اور پیاس کے ذریعے قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔ اپنے فقراء اور مساکین پر احسان کرو۔ اپنے بڑے بوڑھوں کا احترام کرو اور چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ رشتہ داری کے ناتوں کو جوڑ دو۔ اپنی زبانیں گناہ سے روکے رکھو۔ اپنی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھنے سے بند رکھو جن کا دیکھنا حلال نہیں۔ اپنے کانوں کو ان چیزوں کے سننے سے روکے رکھو جن کا سننا حرام ہے اور لوگوں کے یتیموں پر شفقت و مہربانی کرو تاکہ وہ بھی تمہارے یتیموں سے یہی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۷، ابواب احکام شہر رمضان باب ۱۸، حدیث ۱۶



سلوک کریں۔[1]

(۷) قاعدۂ لاحرج : مندرجہ بالا آیات میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ خدا تمہارے لئے آسانی اور آرام چاہتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ تم زحمت و مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔

مسلماً یہ بات یہاں روزے اور اس کے فوائد نیز مسافر اور بیمار سے متعلق ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ ایک کلی قاعدہ ہے تمام اسلامی احکام کے بارے میں ایک اصول معلوم ہو جاتا ہے اور یہی بات ایک مشہور قاعدہ جسے قاعدۂ لاحرج کہتے ہیں کے لئے ایک ماخذ و مدرک ہے۔

اس قاعدے کے مطابق احکام اسلام کی بنیاد سخت گیری پر نہیں۔ اگر کوئی حکم کسی مقام پر شدید مشقت کا باعث ہو تو وقتی طور وہ حکم اٹھ جائے گا جیسا کہ ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ جب کبھی وضو کرنا یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا یا ایسا کوئی اور عمل انسان کے لئے سخت زحمت کا سبب ہو تو وضو کا حکم تیمم سے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم بیٹھ کر نماز پڑھنے سے بدل جائے گا۔

سورہ حج کی آیت ۷۸ میں ہے:

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

اسی نے تمہیں چن لیا اور اس نے تمہارے لئے دین کے سلسلے میں کوئی مشقت نہیں رکھی۔

پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث ہے:

بعثت علی الشریعۃ السمحۃ السهلۃ۔

میں ایسے دین و شریعت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں جسے انجام دینا اور اس پر عمل کرنا آسان ہے۔

---

[1] یہ وسائل الشیعہ جلد ۷، ابواب احکام شہر رمضان کے باب ۱۸ کی بیسویں حدیث ہے اس کا عربی متن یہ ہے:

فقال — ایها الناس انه قد اقبل الیکم شهر الله بالبرکة والرحمة والمغفرة شهر هو عند الله افضل الشهور، وایامه افضل الایام ولیالیه افضل اللیالی، وساعاته افضل الساعات، هو شهر دعیتم فیه الی ضیافة الله، وجعلتم فیه من اهل کرامة الله، انفاسکم فیه تسبیح، ونومکم فیه عبادة، وعملکم فیه مقبول، ودعائکم فیه مستجاب، فاسئلوا الله ربکم بنیات صادقة وقلوب طاهرة: ان یوفقکم لصیامه وتلاوة کتابه، فان الشقی من حرم غفران الله فی هذا الشهر العظیم، واذکروا بجوعکم وعطشکم فیه جوع القیٰمة وعطشه وتصدقوا علی فقرائکم ومساکینکم، ووقروا کبارکم وارحموا صغارکم، وصلوا ارحامکم، واحفظوا السنتکم، وغضوا عما لا یحل النظر الیه ابصارکم، وعما لا یحل الاستماع الیه اسماعکم، وتحفظوا علی ایتام الناس یتحنن علی ایتامکم۔



یہ بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۱۸۶۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ
فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ○

ترجمہ

۱۸۶۔ اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو (ان سے کہو کہ) میں قریب ہوں پکارنے والے کی پکار پر میں اسے جواب دیتا ہوں۔ پس وہ میری دعوت اور پکار کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لے آئیں تاکہ انہیں راستہ مل سکے۔

شان نزول

کسی نے نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ کیا ہمارا خدا نزدیک ہے کہ ہم اس سے آہستہ سے مناجات کرسکیں یا دور ہے کہ بلند آواز سے پکاریں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور جواب دیا گیا کہ خدا اپنے بندوں کے نزدیک ہے[1]

تفسیر

دعا اور تضرع وزاری

خدا کے ساتھ بندوں کے ارتباط کا ایک وسیلہ دعا اور تضرع وزاری ہے لہٰذا گذشتہ آیات میں چند اہم اسلامی احکام بیان کرنے کے بعد زیر بحث آیت میں اس کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ دعا خدا سے مناجات کرنے والے سب لوگوں کے لئے اپنے اندر ایک عمومی پروگرام لئے ہوئے ہے لیکن روزے سے مربوط آیات کے درمیان اس کا ذکر اسے ایک نیا مفہوم عطا کرتا ہے۔

روزہ داروں کی ذمہ داریاں بیان کرنے سے قبل اس آیت کے ذریعے قرآن روزے کے ایک اور راز کی طرف اشارہ کرتا ہے جو وہی قرب الٰہی ہے اور اس سے راز و نیاز کرنا ہے۔

اس آیت کا روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف ہے۔ فرمایا: جس وقت میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو کہدو کہ میں نزدیک ہوں (واذا سألك عبادی عنی فانی قریب۔)

اس سے زیادہ قریب کہ جس کا تم تصور کرسکتے ہو، تم سے تمہاری نسبت بھی زیادہ نزدیک اور تمہاری رگ حیات سے بھی

---

[1] مجمع البیان، محل بحث آیت کے ذیل میں



زیادہ قریب

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ o

اور ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (ق۔ ۱۶)

اس کے بعد مزید فرمایا: جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) اس لئے میرے بندوں کو چاہیئے کہ وہ میری دعوت قبول کریں (فلیستجیبوالی) اور مجھ پر ایمان لے آئیں (ولیؤمنوابی)۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی راہ پالیں اور مقصد تک جا پہنچیں (لعلھم یرشدون)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ خدا نے اس مختصر سی آیت میں سات مرتبہ اپنی ذاتِ پاک کی طرف اور سات ہی مرتبہ بندوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس طرح اللہ نے بندوں سے اپنی انتہائی وابستگی، قربت، ارتباط اور ان سے اپنی محبت کی عکاسی کی ہے عبداللہ بن سنان کہتا ہے میں نے امام صادقؑ سے سنا آپؑ نے فرمایا۔

دعا کیا کرو کیونکہ وہ خدا کی بخشش کی چابی ہے۔ اور ہر حاجت تک پہنچنے کے لئے وسیلے کی قوت ہے سب نعمتیں اور رحمتیں پروردگار کے پاس ہیں جن تک دعا کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا۔ کسی دروازے کو کھٹکھٹاتے رہو تو بالآخر وہ کھل جائے گا۔[1]

جی ہاں ــــ وہ ہم سے نزدیک ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سے دور ہو حالانکہ اس کا مقام ہمارے اور ہمارے دل کے درمیان ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ

اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ (انفال۔ ۲۴)

چند اہم نکات

(۱) دعا اور زاری کا فلسفہ: جو لوگ دعا کی حقیقت، اس کی روح، اس کے تربیتی و نفسیاتی اثرات کو نہیں سمجھتے وہ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ اعصاب کو کمزور اور بے حس کر دیتی ہے کیونکہ ان کی نظر میں دعا لوگوں کو فعالیت، کوشش، پیش رفت اور کامیابی کے وسائل کی بجائے اسی راہ پر لگا دیتی ہے اور انہیں سبق دیتی ہے کہ کوششوں کے بدلے اسی پر اکتفا کرو۔

معترضین کبھی کہتے ہیں کہ دعا اصولی طور پر خدا کے معاملات میں بے کار دخل اندازی ہے۔ خدا جیسی مصلحت دیکھے گا اسے انجام دے گا۔ وہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمارے مصالح کو جانتا ہے پھر کیوں ہر وقت ہم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس سے سوال کرتے رہیں۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۴۶۶



کبھی کہتے ہیں کہ ان تمام امور کے علاوہ دعا، ارادہ الٰہی پر راضی رہنے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے منافی ہے۔

جو لوگ ایسے سوالات کرتے ہیں وہ دعا اور تضرع وزاری کے نفسیاتی، اجتماعی، تربیتی اور معنوی وروحانی آثار سے غافل ہیں۔ انسان ارادے کی تقویت اور دکھ درد کے دور ہونے کے لئے کسی سہارے کا محتاج ہے اور دعا انسان کے دل میں چراغِ امید روشن کر دیتی ہے۔ جو لوگ دعا کو فراموش کئے ہوئے ہیں وہ نفسیاتی اور اجتماعی طور پر ناپسندیدہ عکس العمل سے دوچار ہوتے ہیں۔

ایک مشہور ماہر نفسیات کا قول ہے کہ "کسی قوم میں دعا وزاری کا فقدان اس ملت کی تباہی کے برابر ہے۔ وہ قوم جو احتیاج دعا کا گلا گھونٹ دے وہ عموماً فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

"البتہ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ صبح کے وقت دعا وزاری کرنا اور باقی سارا دن ایک وحشی جانور کی طرح گزارنا، بے ہودہ اور فضول ہے۔ دعا کو مسلسل جاری رہنا چاہیئے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اس کے گہرے اثر سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"[1]

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا کاہلی وسستی کا سبب بنتی ہے۔ وہ دعا کا معنیٰ ہی نہیں سمجھے کیونکہ دعا کا یہ مطلب نہیں کہ طبیعی وسائل واسباب سے ہاتھ کھینچ لیا جائے اور ان کی بجائے بس دست دعا بلند رکھا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ تمام موجود وسائل کے ذریعے اپنی پوری کوشش بروئے کار لائی جائے اور جب معاملہ انسان کے بس میں نہ رہے اور وہ مقصد تک نہ پہنچ پا رہا ہو تو دعا کا سہارا لے، توجہ کے ساتھ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر امید اور حرکت کی روح کو بیدار کرے اور اس مبداء عظیم کی بے پناہ نصرتوں میں سے اپنے لئے مدد حاصل کرے۔ لہٰذا دعا مقصد تک پہنچ پانے اور رکاوٹوں کی صورت میں ہے نہ کہ یہ طبیعی عوامل کے مقابلے میں کوئی عامل ہے۔ مذکورہ ماہر نفسیات مزید لکھتا ہے:

"اس کے علاوہ کہ دعا اطمینان پیدا کرتی ہے یہ انسان کی فکر میں ایک طرح کی شگفتگی پیدا کرتی ہے اور باطنی انبساط کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات یہ انسان کے لئے بہادری اور دلاوری کی روح کی بیداری کے لئے تحریک کا کام بھی دیتی ہے دعا کے ذریعے انسان پر بہت سے علامات ظاہر ہوتے ہیں۔ نگاہ کی پاکیزگی، کردار کی متانت، باطنی انبساط و مسرت، پُر اعتماد چہرہ، استعدادِ ہدایت اور استقبالِ حوادث سب دعا کے مظاہر ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو دعا کرنے والے کی روح کی گہرائی اور اس کے جسم میں چھپے ہوئے ایک خزانے کی ہمیں خبر دیتی ہیں۔ دعا کی قدرت سے پسماندہ اور کم استعداد لوگ بھی اپنی عقلی اور اخلاقی قوت کو بہتر طریقے سے کارآمد بنا لیتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو دعا کے حقیقی رخ کو پہچان سکیں۔"[2]

---

[1] نیایش الکیس کارل

[2] نیایش الکیس کارل



جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ دعا تسلیم و رضا کے منافی ہے کیونکہ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ہم تشریح کر چکے ہیں دعا پروردگار کے فیض بے پایاں سے زیادہ سے زیادہ کسبِ کمال کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان دعا کے ذریعے پروردگار کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور فیض کے حصول کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے اور واضح ہے کہ تکامل کی کوشش اور زیادہ سے زیادہ کسبِ کمال کی سعی قوانین آفرینش کے سامنے تسلیم و رضا ہے نہ کہ اس کے منافی۔

علاوہ ازیں دعا ایک طرح کی عبادت، خضوع اور بندگی ہے۔ انسان دُعا کے ذریعے ذاتِ الٰہی کے ساتھ ایک نئی وابستگی پیدا کر لیتا ہے اور جیسے تمام عبادات تربیتی اثر رکھتی ہیں دعا بھی ایسے اثر کی حامل ہوتی ہے۔ چاہے قبولیت تک پہنچے یا نہ پہنچے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دعا امورِ الٰہی میں مداخلت ہے اور جو کچھ مصلحت کے مطابق ہو خدا دیتا ہے وہ اس طرف متوجہ نہیں کہ عطیاتِ خداوندی استعداد اور لیاقت کے مطابق تقسیم ہوتے ہیں، جتنی استعداد و لیاقت زیادہ ہوگی انسان کو عطیات بھی اسی قدر نصیب ہوں گے۔ امام صادق فرماتے ہیں:

ان عند الله عزوجل منزلة لا تنال الا بمسألة

خدا کے ہاں ایسے مقامات و منازل ہیں جو مانگے بغیر نہیں مل سکتے۔[1]

ایک صاحبِ علم کا قول ہے:

جب ہم دعا کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ایک ایسی لامتناہی قوت سے متصل و مربوط کر لیتے ہیں جس نے ساری کائنات کی اشیاء کو ایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھا ہے۔[2]

اسی صاحبِ علم کا کہنا ہے:

آج کا جدید ترین علم یعنی علمِ نفسیات (PSYCHOLOGY) بھی یہی تعلیم دیتا ہے جو انبیاء دیا کرتے تھے چنانچہ نفسیات کے ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دعا، نماز اور دین پر محکم ایمان — اضطراب، تشویش، ہیجان اور خوف کو دور کر دیتا ہے جو ہمارے دکھ درد کا آدھے سے زیادہ حصہ ہے۔[3]

(۱۱) دعا کا حقیقی مفہوم: ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ دعا کا مقام وہ ہے جہاں قدرت و طاقت جواب دے جائے نہ وہ کہ جہاں طاقت و توانائی کی رسائی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اجابت و قبولیت کے قابل وہ دعا ہے جو اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ

---

[1] اصول کافی، ج ۲، صہ ۳۳۸

[2] آئین زندگی، صہ ۱۵۶

[3] آئین زندگی صہ ۱۵۲



اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ [1] (نمل - ۶۲) کے مطابق اضطرار اور تمام کوششوں اور مساعی کے بے کار ہو جانے پر ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ دعا ان اسباب و عوامل کی فراہمی کے لئے کی جاتی ہے جو انسانی بساط سے باہر ہوں اور ان کا تقاضا اس کی بارگاہ میں کیا جاتا ہے جس کی قدرت لامتناہی ہے اور جس کے لئے ہر فعلِ ممکن آسان ہے۔ لیکن چاہیئے کہ یہ درخواست فقط انسان کی زبان سے نہ نکلے بلکہ اس کے تمام وجود سے نکلے اور زبان اس سلسلے میں تمام ذراتِ ہستی اور اعضاء و جوارح کی نمائندگی کرے اور قلب و روح دعا کے ذریعے اُس سے قریبی تعلقات پیدا کرلے۔ اُس قطرے کی طرح جو بے کنار سمندر سے مل جاتا ہے قدرت کے اس عظیم مبداء کے ساتھ اتصالِ معنوی حاصل کرلے۔ ہم جلد ہی اس ارتباط اور تعلق کے روحانی اثرات پر بحث کریں گے۔

البتہ متوجہ رہنا چاہیئے کہ دعا کی ایک قسم وہ بھی ہے جو قدرت و توانائی کے ہوتے ہوئے انجام پاتی ہے تاہم وہ دعا بھی اسباب ممکنہ کی قائم مقام نہیں ہوسکتی اور وہ دعا وہ ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس جہان کی تمام قدرتیں اور توانائیاں پروردگار عالم کی قدرت کے مقابلے میں استقلال نہیں رکھتیں دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف متوجہ رہا جائے کہ طبیعی عوامل اور اسباب کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اُس ذات بابرکات کی طرف سے ہے اور اس کے حکم و فرمان سے ہے۔ اگر کوئی دوا کے ذریعے شفا کا خواہاں ہوتا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ اس نے دوا کو یہ تاثیر بخشی ہے (یہ بھی ایک قسم کی دعا ہے جس کی طرف احادیث اسلامی میں اشارہ ہوا ہے) مختصر یہ کہ یہ دعا کی وہ قسم ہے جسے خود آگاہی اور فکر و نظر اور دل و دماغ کی بیداری کہا جا سکتا ہے یہ اس ذات سے ایک باطنی رشتہ ہے جو تمام نیکیوں اور خوبیوں کا مبداء و مصدر ہے۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات میں ہے:

لا یقبل اللّٰہ عزّ و جلّ دعاء قلب لاہ

خدا غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا [2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے یہی مضمون مروی ہے:

ان اللّٰہ عزّ و جلّ لا یستجیب دعاء بظھر قلب ساہ۔ [3]

یہ خود دعا کے فلسفوں کی ایک اساس ہے جس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

(iii) دعا کی قبولیت کی شرائط: دعا کی قبولیت کی شرائط کی طرف توجہ کرنے سے بھی بظاہر دعا کے پیچیدہ مسئلے کے سلسلے میں نئے حقائق آشکار ہوتے ہیں اور اس کے اصلاحی اثرات واضح ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چند احادیث

---

[1] اس آیت کا مفہوم یہ ہے: "کون ہے جو کسی مصیبت زدہ اور بے قرار کی دعا سنتا ہے اور اس کی فریادرسی کرکے اسے مصیبت سے نجات دلاتا ہے؟" (مترجم)

[2] و [3] اصول کافی، ج ۲، ص ۴۷۳



پیش خدمت ہیں:

۱: دعا کی قبولیت کے لئے ہر چیز سے پہلے دل اور روح کی پاکیزگی کی کوشش، گناہ سے توبہ اور اصلاح نفس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں خدا کے بھیجے ہوئے رہنماؤں اور رہبروں کی زندگی سے الہام وہدایات حاصل کرنا چاہئیں امام صادقؑ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ایاکم ان یسئل احدکم ربه شیئا من حوائج الدنیا والآخرة حتی یبدء بالثناء علی الله والمدحة له والصلوٰة علی النبی وآله ثم الاعتراف بالذنب ثم المسألة۔

جب تم میں سے کوئی اپنے رب سے دنیا و آخرت کی کوئی حاجت طلب کرنا چاہے تو پہلے خدا کی حمد و ثنا اور مدح کرے پیغمبر اور ان کی آل پر درود بھیجے پھر گناہوں کا اعتراف اور اس کے بعد سوال کرے۔[1]

۲: اپنی زندگی کی پاکیزگی کے لئے غصبی مال اور ظلم و ستم سے بچنے کی کوشش کرے اور حرام غذا نہ کھائے۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من احب ان یستجاب دعائه فلیطیب مطعمه ومکسبه

جو چاہتا ہے کہ اُس کی دعا قبول ہو اُس کے لیے ضروری ہے اس کی غذا اور کسب و کار پاک و پاکیزہ ہو۔[2]

۳: فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے اور حق کی دعوت دینے میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک دیتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے:

لتأمرون بالمعروف ولتنهن عن المنکر او لیسلطن الله شرارکم علی خیارکم فیدعوا خیارکم فلا یستجاب لهم۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرو ورنہ خدا تم سے بُروں کو تمہارے اچھے لوگوں پر مسلط کر دے گا پھر تمہارے اچھے لوگ دعا کریں گے تو وہ اُن کی دعا قبول نہیں کرے گا۔[3]

حقیقت میں یہ عظیم ذمہ داری جو ملت کی نگہبانی ہے اسے ترک کرنے سے معاشرے میں بد نظمی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں بدکاروں کے لئے میدان خالی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں دعا اس کے نتائج کو زائل کرنے کے لئے بے اثر ہے کیونکہ یہ کیفیت ان کے اعمال کا قطعی اور حتمی نتیجہ ہے۔

۴: خدائی عہد و پیمان کو وفا کرنا بھی دعا کی قبولیت کی شرائط میں شامل ہے ایمان، عمل صالح، امانت اور صحیح کام

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱ صہ ۴۴۸ و صہ ۴۸۹

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ صہ ۴۴۸ و صہ ۴۴۹

[3] سفینۃ البحار، ج ۱ صہ ۴۴۹



اس عہد و پیمان کا حصہ ہیں۔ جو شخص اپنے پروردگار سے کئے گئے عہد کی پاسداری نہیں کرتا اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ پروردگار کی طرف سے اجابت دعا کا وعدہ اس کے شامل حال ہوگا۔

کسی شخص نے امیرالمؤمنین کے سامنے دعا قبول نہ ہونے کی شکایت کی۔ وہ کہنے لگا: خدا کہتا ہے کہ دعا کرو تو میں قبول کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی۔ اس کے جواب میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

ان قلوبکم خان بثمان خصال:

اولها انكم عرفتم الله فلم تؤدوا حقه كما اوجب عليكم فما اغنت عنكم معرفتكم شيئا۔

والثانية انكم آمنتم برسوله ثم خالفتم بسنته وامتم شريعته فاين ثمرة ايمانكم۔

والثالثه انكم قرأتم كتابه المنزل عليكم فلم تعملوا به وقلتم سمعنا واطعنا ثم خالفتم۔

والرابعة انكم قلتم تخافون من النار وانتم فى كل وقت تقدمون اليها بمعاصيكم فاين خوفكم۔

والخامسة انكم قلتم ترغبون فى الجنة وانتم فى كل وقت تفعلون ما يباعدكم منها فاين رغبتكم فيها۔

والسادسة انكم اكلتم نعمة المولى فلم تشكروا عليها۔

والسابعة ان الله امركم بعداوة الشيطان وقال ان الشيطان لكم عدو فاتخذوه عدوا فعاديتموه بلا قول وواليتموه بلا مخالفة۔

والثامنة انكم جعلتم عيوب الناس نصب اعينكم وعيوبكم وراء ظهوركم تلومون من انتم احق باللوم منه فاى دعاء يستجاب لكم مع هذا وقد سددتم ابوابه وطرقه فاتقوا الله واصلحوا اعمالكم واخلصوا سرائركم وامروا بالمعروف وانهوا عن المنكر فيستجيب لكم دعائكم۔

تمہارے دل و دماغ نے آٹھ چیزوں میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے تمہاری دعا قبول نہیں ہوتی:

پہلی: تم نے خدا کو پہچان کر اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لئے تمہاری معرفت نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔



دوسری: تم اس کے بھیجے ہوئے پیغمبرؐ پر ایمان تو لے آئے ہو مگر اس کی سنت کی مخالفت کرتے ہو۔ ایسے میں تمہارے ایمان کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

تیسری: تم اس کی کتاب کو تو پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ زبانی تو کہتے ہو کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی مگر عملاً اس کی مخالفت کرتے ہو۔

چوتھی: تم کہتے ہو کہ ہم خدا کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی نافرمانیوں کی طرف قدم بڑھاتے ہو۔ تو پھر خوف کہاں رہا۔

پانچویں: تم کہتے ہو کہ ہم جنت کے شائق ہیں حالانکہ کام ایسے کرتے ہو جو تمہیں اس سے دور لے جاتے ہیں تو پھر رغبت و شوق کہاں رہا۔

چھٹی: خدا کی نعمتیں تو کھاتے ہو مگر شکر کا حق ادا نہیں کرتے ہو۔

ساتویں: اس نے تمہیں حکم دیا کہ شیطان سے دشمنی رکھو ——— اور تم اس سے دوستی کی طرح ڈالتے ہو۔

آٹھویں: تم نے لوگوں کے عیوب کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور اپنے عیوب پس پشت ڈال دیے ہیں۔

ان حالات میں تم کیسے امید رکھتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو جب کہ تم نے خود اس قبولیت کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو۔ اپنے اعمال کی اصلاح کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، تاکہ تمہاری دعا قبول ہو سکے ۱؎

اس سے ظاہر ہے کہ قبولیت دعا کا وعدہ خدا کی طرف سے مشروط ہے نہ کہ مطلق۔ شرط یہ ہے کہ تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو حالانکہ تم آٹھ طرح سے پیمان شکنی کر چکے ہو۔

مندرجہ بالا آٹھ احکام جو اجابت دعا کی شرائط ہیں انسان کی تربیت، اس کی توانائیوں کو اصلاح یافتہ بنانے اور ثمر بخش راہ پر ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

۵۔ دعا کی قبولیت کی ایک شرط یہ ہے کہ دعا عمل اور کوشش کے ہمراہ ہو۔ امیر المؤمنینؑ کے کلمات قصار میں ہے:

الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر

عمل کے بغیر دعا کرنے والا بغیر کمان کے تیر چلانے والے کی مانند ہے ۲؎

۱؎ سفینۃ البحار، ج ۱، صفحہ ۴۴۸ و صفحہ ۴۴۹

۲؎ نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۳۳۷



اس طرف توجہ رکھی جائے کہ چلّہ کمان تیر کے لئے عامل حرکت اور ہدف کی طرف پھینکنے کا وسیلہ ہے تو اس سے تاثیر دُعا کے لئے عمل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا پانچوں شرائط یہ واضح کر دیتی ہیں۔ کہ نہ صرف یہ کہ طبیعی سنن و اسباب کی بجائے دعا نہیں ہوتی بلکہ قبولیت دعا کے لئے دعا کرنے والے کی زندگی میں ایک مکمل تبدیلی بھی ضروری ہے۔ اس کی فکر کو نئے سانچے میں ڈھلنا چاہیے اور اسے اپنے گذشتہ اعمال میں تجدید نظر کرنا چاہیے۔

ان سب کی روشنی میں کیا دعا، کو اعصاب کمزور کرنے والی اور کاہل کا سبب قرار دینا بے خبری نہیں اور کیا یہ بعض مخصوص مقاصد کو بروئے کار لانے کی دلیل نہیں۔

۱۸۷۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۱۸۷۔ تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو (دونوں ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی حفاظت کا باعث ہو) خدا کے علم میں تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے (اور اس ممنوع کام کو تم میں سے کچھ لوگ انجام دیتے تھے) پس خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں بخش دیا۔ اب ان سے ہمبستری کرو اور تمہارے لئے جو کچھ مقرر کیا گیا ہے اسے طلب کرو اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو اور جب تم مساجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ یہ حدودِ الٰہی ہیں ان کے نزدیک نہ جانا خدا اس طرح اپنی آیات کو لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ پرہیزگار ہو جائیں۔



شانِ نزول

روایاتِ اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ جب شروع میں روزے کا حکم نازل ہوا تو مسلمان صرف یہ حق رکھتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے کھانا کھالیں چنانچہ اگر کوئی شخص کھانا کھائے بغیر سو جاتا اور پھر بیدار ہوتا اس کے لئے کھانا پینا حرام تھا۔

ان دنوں ماہ رمضان کی راتوں میں بھی ان کے لئے اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا مطلقاً حرام تھا۔ اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک شخص جس کا نام مطعم بن جبیر تھا ایک کمزور انسان تھا۔ ایک مرتبہ افطار کے وقت گھر گیا۔ اس کی بیوی اس کے افطار کے لئے کھانا لینے لگی تو تھکان کی وجہ سے وہ سو گیا۔ جب بیدار ہوا تو کہنے لگا اب افطار کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ وہ اسی حالت میں رات کو سو گیا۔ صبح کو روزے کی حالت میں اطراف مدینہ میں خندق کھودنے کے لئے (جنگ احزاب کے میدان میں) حاضر ہو گیا۔ کام کے دوران میں کمزوری اور بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ اس کے سرہانے تشریف لائے اور اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے۔

نیز بعض جوان مسلمان جو اپنے آپ پر ضبط نہیں کر سکتے تھے ماہ رمضان کی راتوں کو اپنی بیویوں سے ہم بستری کر لیتے تھے۔

ان حالات میں یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ رات بھر کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور اپنی بیویوں سے ہم بستری بھی کر سکتے ہیں۔

تفسیر

حکم روزہ میں وسعت

جیسا کہ آپ شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں ابتدائے اسلام میں ماہ رمضان کے دن اور رات دونوں میں مسلمانوں کے لئے اپنی بیویوں سے اختلاط کرنا مطلقاً ممنوع تھا اور اسی طرح رات کو ایک مرتبہ سو جانے کے بعد کھانا پینا بھی ناجائز تھا اور شاید یہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کو آزمایا جائے اور انہیں احکام روزہ قبول کرنے کے لئے مائل کیا جائے۔

زیر نظر آیت روزے اور اعتکاف کے سلسلے میں چار اسلامی احکام پر مشتمل ہے پہلے مسلمانوں کے لئے وسعت پیدا کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ماہِ رمضان کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی بیویوں سے جنسی میل جول حلال کر دیا گیا ہے (احل لکم لیلة الصیام الرفث[1] الی نسائکم)۔

اس کے بعد اس موضوع کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو (ھن لباس لکم و انتم لباس لھن)۔

---

[1] رفث (بروزن طلبس) کا معنی ہے جنسی مسائل پر گفتگو کرنا۔ اسی مناسبت سے خود جنسیات کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہاں اسی مفہوم میں ہے۔



لباس ایک طرف تو انسانی بدن کی سردی گرمی اور خطرناک چیزوں کے اثرات سے حفاظت کرتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے عیوب چھپاتا ہے اور پھر یہ انسانی بدن کی زینت ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں استعمال ہونے والی تشبیہ ان سب نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میاں بیوی ایک طرف سے ایک دوسرے کو کجرویوں سے بچاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے راحت و آرام کا سبب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے لئے زیب و زینت بھی بنتا ہے۔

یہ تعبیر میاں بیوی کے انتہائی معنوی و روحانی ربط و قربت کو بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں ان کی برابری کو بھی پورے طور پر واضح کرتی ہے۔ وہ تعبیر جو مرد کیلئے ہے وہی بغیر کسی تبدیلی کے عورت کے لئے بھی ہے۔

اس کے بعد اس قانون الٰہی کی تبدیلی کی علت اور سبب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ خدا جانتا تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے ہو اور تم میں سے بعض ممنوع کام انجام دیتے تھے۔ خدا نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں بخش دیا (علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم)۔ ہاں اس بنا پر کہ تم کہیں زیادہ گناہ سے آلودہ نہ ہو جاؤ خدا نے اپنے لطف و رحمت سے تمہارے لئے اس پروگرام کو آسان بنا دیا ہے۔ اس کی مدت و حدود میں کمی کر دی ہے۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے وہ طلب کر سکتے ہو (فالئٰن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم)۔

یہ مسلم ہے کہ اس آیت میں امر کا صیغہ وجوب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اجازت ہے اور ممنوعیت جسے اصولیین کی اصطلاح میں "امر عقیب حظر" کہتے ہیں کے جواز کی دلیل ہے۔

وابتغوا ما کتب اللہ لکم اس طرف اشارہ ہے کہ اس کے بعد اس وسعت اور تخفیف حکم سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ قوانین آفرینش کے مطابق حفظ نظام اور بقائے نسل کی راہ ہے۔

اس کے بعد دوسرا حکم بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے تمہارے لئے نمایاں ہو جائے (وکلوا واشربوا حتّٰی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر)۔ اس طرح اب مسلمان حق رکھتے ہیں کہ وہ تمام رات کھانے پینے کی چیزوں سے استفادہ کریں۔

تیسرے حکم کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو (ثم اتموا الصیام الی الیل)۔ یہ جملہ روزہ داروں کے لئے دن بھر کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے باز رہنے کی تاکید کے طور پر ہے نیز یہ جملہ روزے کے آغاز اور انجام کی خبر بھی دیتا ہے اور وہ یہ کہ روزہ طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور رات کے آنے پر ختم ہوتا ہے۔

آخر میں چوتھا اور آخری حکم بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: مساجد میں اعتکاف کے دوران میں اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت نہ کرو (ولا تباشروھن وانتم عٰکفون فی المسٰجد)۔ اس حکم کا بیان گذشتہ حکم میں استثناء سے مشابہ ہے کیونکہ اعتکاف میں جس کی مدت کم از کم تین دن ہے روزہ رکھا جاتا ہے اس عرصے میں عورتوں سے نہ دن کو مباشرت کی اجازت ہے نہ رات کو۔



آخر میں تمام احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ خدائی حدود ہیں ان کے نزدیک نہ جانا (تلک حدود اللہ فلا تقربوھا) کیونکہ سرحد کے قریب جانا وسوسے پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات سبب بنتا ہے کہ انسان حدود سے تجاوز کرکے مبتلائے گناہ ہو جائے۔

ہاں ــــ خدا تو اسی طرح لوگوں کے لئے اپنی آیات کو واضح کرتا ہے کہ شاید وہ پرہیزگار ہو جائیں (کذلک یبین اللہ اٰیٰتہ للناس لعلھم یتقون)۔

چند اہم نکات

(۱) **حدود الٰہی:** جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں ہم نے پڑھا ہے روزے اور اعتکاف کے کچھ احکام بیان کرنے کے بعد انہیں خدائی سرحدیں قرار دیا گیا ہے۔ حلال و حرام کے درمیان سرحد، مجاز و ممنوع کے درمیان سرحد۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ سرحدوں کو عبور نہ کرنا بلکہ کہا گیا ہے ان کے قریب نہ جانا کیونکہ سرحد کے قریب ہونے سے کبھی شہوت کی زیادتی کے باعث اور کبھی شک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انسان ان سے آگے گزر جاتا ہے۔ لہذا فرمایا گیا ہے "فلا تقربوھا" اور شاید اسی بناء پر قوانین اسلامی میں ایسی جگہوں میں قدم رکھنے سے منع کیا گیا ہے جو انسان کی لغزش اور گناہ کا موجب اور سبب ہیں مثلاً مجالس گناہ میں شرکت حرام ہے چاہے خود انسان ظاہراً آلودۂ گناہ نہ ہو۔ اسی طرح اجنبی عورت سے خلوت کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی کسی اجنبی خاتون کے ساتھ ایسی تنہائی جو مکمل طور پر علیحدہ ہو اور جہاں دوسرے لوگ آ جا نہ سکتے ہوں۔

یہی مفہوم دوسری احادیث میں حمایتِ حمی (ممنوعہ علاقے کی چار دیواری کی حفاظت) کے عنوان سے بیان ہوا ہے پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

> ان حمی اللہ محارمہ فمن وقع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ
>
> محرماتِ الٰہی اس کی چار دیواریاں ہیں اگر کوئی شخص ان حدودِ خانہ کے گرد اپنی بھیڑ بکریاں لے جائے تو اس کا ڈر ہے کہ وہ ممنوعہ علاقے میں چلی جائیں [1]

اسی لئے اصولِ تقویٰ کے پابند اور پرہیزگار لوگ نہ صرف یہ کہ محرمات کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ حرام کے نزدیک بھی قدم نہیں رکھتے۔

(۲) **اعتکاف:** اعتکاف کا اصل معنی ہے محبوس ہونا اور کسی چیز کے پاس لمبی مدت تک رہنا شریعت کی اصطلاح میں مساجد میں عبادت کے لئے ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں جس کی کم از کم مدت تین دن ہے اور اس کی شرط روزہ دار ہونا اور بعض لذائذ کو ترک کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



یہ عبادت رُوح کی پاکیزگی اور پروردگار کی طرف خصوصی توجہ کے لئے گہرا اثر رکھتی ہے۔ اس کے آداب و شرائط فقہی کتب میں مذکور ہیں۔ یہ عبادت ذاتی طور پر تو مستحب ہے لیکن چند ایک استثنائی مواقع پر وجوب کی شرط اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال زیر بحث آیت میں اس کی صرف ایک شرط کی طرف اشارہ ہوا ہے یعنی عورتوں سے مجامعت نہ کرنا۔ (دن اور رات دونوں میں منع) اور وہ بھی اس لئے کہ اعتکاف کا تعلق بھی روزے کے مسائل سے ہے۔

(iii) **طلوع فجر:** فجر کا اصل معنی ہے شگاف کرنا۔ طلوع صبح کو فجر اس لئے کہتے ہیں کہ گویا رات کا سیاہ پردہ پہلی صبح کی سفیدی سے چاک ہو جاتا ہے۔

زیر بحث آیات میں علاوہ ازیں "حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

> عدی بن حاتم نے پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے سیاہ اور سفید دھاگے رکھے ہوئے تھے اور انہیں دیکھتا تھا تاکہ پہچان کرنے کے اول وقت کا اندازہ کر سکوں۔ پیغمبرؐ اکرم اس گفتگو سے اتنے ہنسے کہ آپ کے دندان مبارک دکھائی دیئے۔
>
> آپؐ نے فرمایا: فرزندِ حاتم! اس سے مراد ہے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے جو کہ وجوب روزہ کی ابتدا ہے۔[1]

ضمناً توجہ کرنی چاہیئے کہ اس تعبیر سے ایک اور نکتہ بھی واضح ہوتا ہے اور وہ ہے صبح صادق کو صبح کاذب سے پہچاننا۔ رات کے آخری حصے میں پہلے ایک بہت کم رنگ کی سفیدی آسمان پر عمودی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ جسے لومڑی کی دُم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اسی کو صبح کاذب کہتے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک صاف و شفاف سفیدی افق کے طور پر اور وہ بھی طول افق میں ظاہر ہوتی ہے جو سفید دھاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہی صبح صادق ہے جو روزے کے وقت کا آغاز اور ابتدائے نمازِ صبح کا وقت ہے۔

(iv) **ابتدا و انتہا تقویٰ ہی تقویٰ ہے:** یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ احکام روزہ سے مربوط پہلی آیت میں بھی ہم نے اس کا آخری مقصد تقویٰ پڑھا ہے اور بعینہ یہی بات آخری آیت کے آخر میں بھی آئی ہے (لعلھم یتقون)۔

---

[1] مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔



یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ سارا پروگرام روحِ تقویٰ کی پرورش، اپنے آپ کو گناہ سے بچانے اور ملکۂ پرہیزگاری پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسانی میں شرعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس اجاگر کیا جائے۔





اِشارِیَہ

تفسیر نمونہ جلد اوّل کا اُردو ترجمہ

ترتیب و تدوین —— سید شکیل حسین موسوی

عنوانات — صفحات



اصولِ عقائد

توحید

اسماء باری تعالیٰ



نبوت

امامت

قیامت

دعا

شفاعت



احکام

فروعِ دین

نماز

روزہ

حج

زکوٰۃ

اکلِ حلال

اکلِ حرام









صابئین

نصاریٰ

عمالقہ

شخصیات

آدم علیہ السلام









ہاجرہ

ہارون علیہ السلام

ہاروت وماروت

ہلال بن محسن صابی

عُلماء اور دانشور



کتب آسمانی

انجیل

توراۃ

قرآن

قرآن اور سائنس

کتب تاریخ وتفاسیر وسیرت


۴۷۹



لُغاتِ قرآن



خسران

فسق وفجور

کتمان حق

کفر

کذب

نفاق

اقوام گزشتہ

بنی اسرائیل۔ یہود





متفرق موضوعات

آیات

ابتلا و امتحان

بحر و انہار اور کشتی

جادو



ابراھیم علیہ السّلام

ابلیس۔ شیطان اول

ابوالعلا مصری

ابن صوریا، یہودی عالم







۴۔ پالومار کی رصدگاہ

۵۔ زمزم

۶۔ کوہ طور

مسجد

مقربینِ خدا

۱۔ تائبین

۲۔ خاشعین

۲۔ صالحین وصدیقین وشہداء

۴۔ متقین

۵۔ مفلحون

۶۔ مومنین



یُوقِنُونَ

